قدیم بلوچ قبائل

اور

بلوچستان کی قدیم تاریخ

تحریر و تحقیق

ڈاکٹر فاروق بلوچ

بلوچی اکیڈمی

عدالت روڈ کوئٹہ

www.balochiacademy.org

(c) All rights are reserved.

جملہ حقوق بحق بلوچی اکیڈمی محفوظ ہیں

قدیم بلوچ قبائل

اور

بلوچستان کی قدیم تاریخ

(تحقیق)

ڈاکٹر فاروق بلوچ

2021

ISBN # 978-969-680-137-5

قیمت:300روپے

بلوچی اکیڈمی نے یہ کتاب میراث پرنٹنگ پریس کراچی سے چھپوائی اور شائع کی۔

انتساب !

اپنے ہونہار فرزند

محمد تاشفین

کے نام

فہرست

پیش لفظ v

باب اول: 1

لفظ بلوچ اور بلوچستان کا قدیم تاریخی کتب میں استعمال 1

باب دوم: 21

قدیم بلوچ قبائل 21

باب سوم: 115

بلوچ قوم اور بلوچستان کے جغرافیائی حدود 115

باب چہارم: 132

بلوچ خطہ کا سیاسی پس منظر 132

باب پنجم: 423

بلوچستان کے ساتھ قدیم باشندوں اور حملہ آور اقوام کا سلوک 423

کتابیات: 460

نقشہ جات 467

پیش لفظ

یہ کہنے اور اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرنا چاہیے کہ ماضی قریب میں یعنی صدی دو صدی قبل بلوچستان کی جو تواریخ لکھی گئی ہیں وہ اکثر و بیشتر خود اختراع کردہ نظریات اور بغیر تحقیق کے لکھی گئی تحریریں پر مشتمل ہیں جو کسی خاص مقصد اور منصوبہ کے تحت لکھی گئی ہیں۔ برطانوی مداخلت سے قبل بلوچستان کے باشندوں میں تاریخ نویسی کا کوئی رواج یا طریقہ کار موجود نہیں تھا بلکہ قبائل اپنے مشاہیر اور دیگر اہم واقعات کو زبانی اور منظوم انداز میں ازبر کر لیتے اور ان اشعار کو نسل در نسل منتقل کرتے رہتے تھے۔ بلوچستان کے اپنے باشندوں کی تاریخ نویسی بس اسی حد تک محدود تھی۔ تاریخی شخصیات اور واقعات پر مشتمل اس طرح کی تاریخ بیانیہ کو بلوچ قوم کی کُل تاریخ خیال کیا جاتا تھا اور اسی کو "بلوچی راج دپتر" کا نام دیا جاتا تھا۔

پھر انگریز آگئے اور حالات بالکل تبدیل ہو گئے۔ انگریزوں نے ان سادہ لوح پہاڑی و ریگستانی خطے میں آباد قدیم لوگوں کی تاریخ لکھنی شروع کی۔ اس کے بعد اس خطے میں مقامی لوگ بھی تعلیم حاصل کرنے لگے اور کتب بینی کی جانب راغب ہونے لگے۔ اسی طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں بلوچستان میں دیگر کچھ علوم کی اہمیت بڑھ گئی تو وہیں تاریخ نویسی نے بھی انگریزی عہد میں ہی مقبولیت حاصل کی اور بعض اس علم کے فروغ کی جانب متوجہ ہوئے۔ ان مقامی علماء تاریخ کا موضوع بحث (بلوچ قوم اور بلوچستان کی تاریخ) رہا اور کئی مقامی دانشوروں نے اس سلسلے میں اپنے قائم کردہ مفروضات پر مشتمل کتب اور مضامین شائع کیے جس میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔

اس طرح بلوچستان میں علم تاریخ نویسی پروان چڑھتا رہا۔ جس حد تک تاریخ نویسی میں اضافہ ہوتا رہا اس سے کئی زیادہ تیزی کے ساتھ اس کے مطالعہ کرنے والوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ جب پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا تو اس موضوع پر سوالات کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ شروع میں شاید لکھی ہوئی تحریروں اور بیان کردہ مفروضات پر مِن و عَن یقین کر لیا جاتا تھا مگر جوں جوں بلوچستان میں تعلیم کسی حد تک عام ہوتی گئی تو بلوچ قوم کی تاریخ پر سابقہ لکھی ہوئی تحریروں اور مفروضات پر سوالات اور اعتراضات اٹھانے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔

دورِ حاضرہ میں حالات بہت ہی تبدیل ہو چکے ہیں۔ لوگوں کے رویے اور اُن کی باتیں زیادہ تنقیدی ہو گئی ہیں۔ اب قاری حضرات براہِ راست محققین سے سوالات کرتے ہیں اور ان کی تحریروں میں موجود کمی اور خلا پر بات کرتے ہیں۔ وہ اِن سے نئی اور بہتر تحقیق کی امید کرتے ہیں۔ وہ لغو، مبالغہ آرائی خود اختراع کردہ نظریات اور مفروضوں پر مشتمل تحریروں کی بجائے تحقیقی بنیادوں پر قائم مستند مفروضات کے متمنی ہیں جن میں درست حقائق بیان کئے گئے ہوں نہ کہ خود اختراع کردہ نظریات کو مطالعہ کا حصہ بنایا گیا ہو۔

برطانوی مصنفین کی سامراجی مقاصد کے لیے لکھی گئی تحریروں کو مقامی مورخین نے دلائل اور حقائق کی روشنی میں رد کرنے اور حقیقی تاریخ کو منظر عام پر لانے کے بجائے انہی کے پیش کردہ فرسودہ اور من گھڑت مفروضوں کی اندھا دھند تقلید کی گئی۔ لہٰذا قارئین میں اس موضوع پر بیزاری اور اعتراضات میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ ان گذشتہ کتب میں تحقیقی بنیادوں کی بجائے برطانوی مصنفین کی خود اختراع کردہ اور من گھڑت نظریات کی پیروی کی گئی ہے۔ ان تحریروں میں سے چند ایک کے سوا زیادہ تر کتب میں قدیم تحریروں کی بجائے برطانوی

عہد میں لکھی گئی تحریروں سے استفادہ کیا گیا ہے اور ان کی روشنی میں کوئی نیا مستند اور قابلِ یقین مفروضہ قائم کرنے کی بجائے ان ہی کتب میں بیان کردہ نظریات اور مفروضات کی پیروی کی گئی ہے۔ یہ بات ذہن نشین ہو کہ برطانوی مورخین کی سامراجی منصوبہ بندی کے ساتھ تحریر کردہ ان تحریروں میں بلوچ قوم کو اُن کی اپنی ہی قدیم اور آبائی سرزمین پر مہاجر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قارئین ان کتب میں بیان کردہ نظریات اور مفروضوں پر مکمل یقین کرنے کی بجائے ہمیشہ شک و شبہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بلوچستان کی قدیم تاریخ کے بارے میں مبہم اور غیر واضح خیالات ان کے ذہن میں آتے رہتے ہیں۔

میں بطور معلم جب اپنے طلبا کو یہ مضمون پڑھاتا ہوں تو اکثر اوقات اپنے طلبا اور ریسرچ سکالرز کی جانب سے بلوچ قوم اور بلوچستان کی قدیم سیاسی تاریخ اور جغرافیائی حدود کے بارے میں کئی طرح کے سوالات کا سامنا کرتا ہوں۔ طلبا اور سکالرز کی بڑی تعداد اس بات پر اعتراض کرتے ہیں کہ بلوچستان کی تاریخ پر لکھنے والے اکثر حضرات کا تعلق علم تاریخ نویسی سے نہیں ہے اور نہ ہی اُن میں کوئی اعلیٰ درجے کا عالم فاضل مصنف ہے کہ جس نے تاریخ کو تاریخ نویسی کے اصولوں کے مطابق تحریر کیا ہو۔ جتنے بھی مورخین ہیں اُن میں کوئی بھی باقاعدہ مورخ نہیں اور نہ ہی اس معیار پر پورا اترتا ہے لہٰذا ان کے بیان کردہ مفروضوں پر کس حد تک یقین کیا جاسکتا ہے۔ یہ یقیناً ایک اہم سوال ہے جو ہمیشہ طلبا اور سکالرز کی جانب سے سامنے آتا ہے یہ سوال اور یہ اعتراض بالکل درست ہے کہ انگریز دور سے لے کر اب تک بلوچستان کی تاریخ اور باشندوں کی بارے میں لکھنے والے حضرات کا علم تاریخ سے دور دور تک کا واسطہ نہیں۔ کوئی سیاستدان ہے تو کوئی شاعر، کوئی میڈیکل ڈاکٹر تو کوئی ماہرِ لسانیات، کوئی مولوی تو کوئی جج۔ اس صورتحال میں تاریخ کا حشر نشر تو ضرور ہو گا اعتراضات اور سوالات تو بہر صورت سامنے آئیں گے۔

زیر نظر تحریر ایسی تحقیق پر مشتمل ہے جس کی تیاری میں برطانوی سامراجی مواد کے بجائے قدیم تاریخی کتب جو بڑے بڑے مورخین کی تحریروں پر مشتمل ہیں، سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ علماء تاریخ یونانی، عربی اور فارسی زبانوں میں تحریر کردہ شہرہ آفاق کتب تحریر کرنے والے مورخین ہیں۔ جن کا کام مقامی سطح پر نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر مستند حیثیت رکھتا ہے اور صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی بڑے بڑے علماء تاریخ، سیاسیات اور سماجی علوم ان ہی کتب سے استفادہ کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں بعض ایسے مصنفین و مورخین کی کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے کہ جو مغربی دنیا سے تو تعلق رکھتے ہیں مگر ان کی لکھی گئی تحریریں بلوچوں کے بارے میں نہیں ہیں بلکہ بلوچوں کا ذکر اُن کی کتب میں ضمناً آیا ہے۔ لہٰذا ایسے مورخین نے بطور ضمنی موضوع کے ان قبائل کا تذکرہ کیا اور جو بیان کیا ہے اُن کی وجہ سے بلوچ تاریخ کے بہت سے پوشیدہ حقائق سے پردہ اٹھ جاتا ہے اور تاریخ کی کئی گمشدہ کڑیاں مل جاتی ہیں۔ ان مغربی علماء تاریخ میں ونسنٹ اے سمتھ اور ہیرلڈلیم جیسے بڑے مورخین شامل ہیں۔

بلوچستان کی قدیم تاریخ جو قدیم مستند تاریخی کتب میں مرقوم ہے مکمل حقائق پر مبنی ہونے کے باوجود ایسے لگتا ہے جیسے کہ وہ قدیم زمانے اور اس سماج کے کرداروں پر مشتمل ایک کہانی یا ایک افسانہ ہے۔ اس کا ہر کردار ماورائی اور اساطیری انداز کا لگتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ یہ تمام کردار عام انسانوں سے مختلف اور کئی طرح کی لافانی قوتوں اور طاقتوں کے مالک ہیں۔ وہ خطہ زمین جو آج سرزمین ایران اور آرین اقوام سے ماخوذ ہے کسی زمانے میں ایرانیوں یعنی آرین کے لیے اجنبی سرزمین تھی۔ اس سرزمین کے قدیم باشندے آریائی اقوام نہیں تھے بلکہ وہ غیر آرین اور اس سرزمین کی قدیم تہذیب کے نمائندے تھے جو آرین کی اس خطے میں آمد سے قبل ہی سیاسی و سماجی طور پر انتہائی مربوط نظام کے تحت ایک وسیع و عریض خطہ زمین پر حاکمیت

کرتے تھے۔ اس خطے کے باشندے دو طرح کے جغرافیائی ماحول میں رہتے تھے ایک وہ لوگ جو صحراؤں میں آباد تھے اور نخلستانوں میں رہتے تھے جہاں اُن کے گاؤں، قلعے اور قصبات ہوتے تھے جبکہ دوسرے لوگ وہ تھے جو پہاڑوں اور پہاڑی وادیوں میں آباد تھے۔ بعض قبائل ساحلی علاقوں میں بھی آباد تھے جن کا پیشہ ماہی گیری ہوا کرتا تھا کیونکہ ایران کے جنوبی ساحلی علاقے اور بلوچستان کسی بھی طرح کے زرعی پیداوار سے عاری تھے اور یہاں کی سب سے بڑی پیداوار مچھلی تھی جبکہ بعض آثارِ قدیمہ کے ذرائع اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ساحلی علاقوں سے مختلف ممالک کی تجارت بھی ہوتی تھی اور ان ساحلوں پر غیر ملکی جہاز بھی لنگرانداز ہوتے تھے۔ اس وسیع و عریض خطے کے باشندوں کو یونانی مورخین ان کے علاقائی و قبائلی ناموں جبکہ عرب و فارسی مورخین ان کے قومی ناموں سے اپنی کتب میں تحریر کرتے ہیں عرب و فارسی مورخین بسا اوقات اُن کے قبائلی و شہریتی نام بھی تحریر کرتے ہیں مگر کثرت کے ساتھ انہوں نے ان کے قومی نام یعنی بلوص، بلوس، بلوچ، کوچ و بلوچ، قفص و بلوص، کفاج، کفج و بلفج وغیرہ اپنی کتابوں میں تحریر کیے ہیں۔

ایران کے مشرق میں وسیع و عریض صحرا ہے جبکہ مزید مشرق میں موجودہ پاکستانی بلوچستان کا وسیع علاقہ واقع ہے جو کچھی کے میدانوں اور سندھ کے سرحدی علاقوں تک پھیلا ہوا ہے۔ شمالاً جنوباً خراسان اور سیستان سمیت موجودہ رخشان ڈویژن اور مکران تک کے علاقے قدیم تاریخی کتب میں خصوصی طور پر زیرِ بحث آئے ہیں جبکہ یہاں کے باشندوں کے تذکروں سے قدیم تاریخی کتب بھرے پڑے ہیں۔ انہی باشندوں اور ان کے حکمرانوں کی تواریخ پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ اساطیری اور مافوق الفطرت لوگ تھے جو ماورا العقل قوتوں کے مالک تھے۔ ان قبائل کی تاریخ پڑھنے سے کئی ایسی باتوں کا انکشاف ہوتا ہے جن کا تعلق بلوچستان کے قبائل سے

براہِ راست بنتا ہے کیونکہ ان قدیم قبائل میں اکثر قبائل اب بھی اپنے قدیم ناموں سے موجود ہیں جو بلوچ قوم میں مضبوط جمعیت رکھتے ہیں اور اب بھی ان قبائل میں سے بعض کے مشاہیر سیاسی و سماجی میدانوں سمیت زندگی کے مختلف شعبہ جات میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں انہی قدیم قبائل کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور تاریخ کی قدیم کتب کے مطالعہ اور مماثلتی و تجزیاتی طریقہ تحقیق کے ذریعے ان قدیم قبائل کا کھوج لگایا گیا ہے جو بلوچ قوم کے حقیقی بنیاد گزار اور اجداد تھے۔

میں بارہا اس بات کا اعادہ کر چکا ہوں کہ بلوچ ایک قوم ہے جو یہاں کے قدیم اور حقیقی باشندوں سے تعلق رکھتی ہے اور بلوچستان کی قدیم ثقافت کے نمائندے دورِ حاضر میں بلوچ قوم کے افراد ہیں۔ بلوچ قوم ایک ایسی یونین کا نام ہے جس میں سینکڑوں مقامی اور قدیم قبائل شامل ہیں جبکہ یہ نام بحیثیت ایک قومی گروہ کے تین ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ پہلے اُس نے پایا تھا۔ یعنی ان قبائل کو یہ قومی نام تین ہزار سال پہلے ہی مل چکا تھا اور وہ مجموعی طور پر اپنے گروہی اور قومی نام سے ہی جانے جاتے تھے۔ یہ قبائل قدیم کتب میں مرقوم ہوئے ہی جنہیں مورخین نے ان کی زبردست اور سرگرم سیاسی و سماجی کردار کے پیش نظر اپنی قیمتی اور مستند کتب میں بھرپور جگہ دی ہے۔ چونکہ بلوچستان اور ایرانی خطے سمیت جنوبی افغانستان (سیستان و خراسان) کے قدیم حالات پر لکھنے والے مورخین مختلف اقوام سے تعلق رکھتے ہیں جن کے لسان میں بھی فرق پایا جاتا ہے اور اُن کے لہجے بھی مختلف ہیں لہٰذا مخصوص ناموں اور مقامات کو انہوں نے اپنے اپنے لسانی لہجوں میں ادا اور تحریر کیا ہے جن کو پڑھنے کے لیے عمیق مطالعہ کی ضرورت ہے ضروری یہ ہے کہ اُن قبائل اور مقامات کے قدیم نام قارئین کو معلوم ہوں تاکہ ان کا مماثلتی جائزہ لینے اور انہیں موجودہ قبائل اور مقامات کے ساتھ تشبیہہ دینا آسان ہو۔ قدیم کتب میں بیسیوں ایسے قبائل کے

نام اور ان کے بودوباش رکھنے والے علاقوں کے بارے میں کافی اہم معلومات ملتی ہیں جن کی تفصیلات اس کتاب میں دی گئی ہیں۔

اس کتاب میں قدیم قبائل کے ساتھ ساتھ ان اقوام و قبائل کے بھی تذکرے شامل کئے گئے ہیں جنہوں نے بلوچستان پر حاکمیت کی اور ساتھ ہی عظیم سلطنتوں کی بنیادیں بھی رکھیں۔ ان اقوام میں کچھ بیرونی حملہ آور شامل تھے جنہوں نے بلوچستان اور اس سے متصل علاقوں پر اپنا تسلط قائم کیا جبکہ بعض مقامی قبائل بھی تھے جو ان حملہ آور اقوام کے سامنے ڈٹ گئے اور بالآخر اپنے علاقوں کی قیادت اور حاکمیت خود سنبھالی۔ ان اقوام اور قبائل کی حاکمیتوں کی تاریخ بھی قدیم کتب میں مرقوم ہے جہاں سے انہیں انتہائی عرق ریزی اور محنت سے تلاش کر کے اس کتاب کی زینت بنایا گیا ہے تا کہ قارئین بلوچستان کی قدیم تاریخ اور یہاں کے سیاسی حالات سے آگاہی حاصل کر سکیں اور جید علماء تاریخ کی لکھی گئی مستند ترین تاریخی کتب میں بلوچ قوم کے بارے میں دیے گئے بیانات سے مستفید ہو سکیں۔

ہمیں مرہون منت ہونا چاہیے اُن قدیم مورخین کا جنہوں نے اپنی قیمتی تحریروں اور شہرہ آفاق کتب میں بلوچ قبائل اور ان کے قومی و ثقافتی وجود کے تذکرے کیے اور انہیں اپنی قیمتی اور شہرہ آفاق تحریروں میں بھرپور جگہ دے کر انہیں اور ان کے ماضی کو محفوظ کیا ہے۔ یقیناً یہ قدیم غیر ملکی عرب، فارسی اور یونانی مورخین تہہ دل سے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے اپنی تحریروں میں بلوچوں کے لازوال تاریخی کردار کو تسلیم کیا اور انہیں تحریر کر کے ان کی حفاظت کا بہترین انتظام کیا۔ آج یہی تحریریں بلوچوں کے ماضی سے پردہ کشائی کرتے ہیں اور اس کی قومی و ثقافتی گروہ کی اصل اور حقیقی تاریخ کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ ان ہی قدیم تحریروں کی بدولت آج

بلوچ قوم کی حقیقی تاریخ واضح ہوتی جارہی ہے مبالغہ آرائی اور خود اختراع کردہ دقیانوسی نظریات پر مشتمل لکھی گئی تاریخیں خود بخود دم توڑتی اور دفن ہوتی جارہی ہیں۔

یہاں ایک عرض کرتا چلوں کہ ماضی کی تاریخ جس طرح بیان کی گئی ہے اور جس طرح بلوچ قبائل کے تذکرے کتب میں ملتے ہیں اُن کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ماضی کے بلوچ زیادہ منظم، طاقتور، کثیر التعداد، سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے اور وسیع و عریض جغرافیائی حدود کے مالک تھے۔ اس مطالعہ سے یہ بات بھی شنید میں آتی ہے کہ ماضی میں بلوچ قبائل نے بارہا اپنی حاکمیت بھی قائم کی ہے اور اگر دیگر اقوام کی حاکمیت قائم ہوئی تو بلوچ قبائل اس حاکمیت کے لیے یا تو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے یا پھر ان کے سب سے طاقتور حریف اور گلے کی ہڈی بن جاتے تھے۔ علاوہ ازیں اس مطالعہ سے یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ گذشتہ تین ہزار سالوں بلکہ اس سے بھی زیادہ طویل عرصہ سے مختلف بلوچ قبائل موجودہ ایران اور بلوچستان کے مختلف شہروں کو مراکز بنا کر حکومت کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس طرز حکومت اور سلسلے کا آغاز آٹھویں صدی قبل مسیح سے قبل ہو چکا تھا۔ آٹھویں صدی قبل مسیح میں بلوچ قبائل کی دوسری بلکہ تیسری حکومت کا آغاز ہوا۔ جسے عرف عام میں مید حکومت کہا جاتا ہے۔ میدوں سے قبل بھی بلوچ قبائل کی حکومتوں کے تذکرے قدیم تاریخی کتب میں مرقوم ہیں جنہیں اس کتاب میں جگہ دینے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کتب کے مذکورہ بیانات پر مزید سیر حاصل مباحث بھی کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں کتاب میں بلوچستان کے قدیم اور جدید جغرافیائی خدوخال کے علاوہ بلوچستان کے ساتھ مختلف اوقات میں یہاں حاکمیت کرنے والے حکمرانوں کے سلوک پر بھی ایک تنقیدی باب شامل کیا گیا ہے۔

میری اس تحقیقی کاوش کا مقصد تاریخی حقائق کی روشنی میں قدیم بلوچ قبائل کو منظر عام پر لانا اور خطہ میں ان کے سیاسی کردار کو تحقیقی کتب کے بیانات کی روشنی میں واضح کرنا ہے۔ میں نے اپنے اس کتاب میں اپنی طرف سے حتی الوسع کوشش کی ہے کہ اصل حقائق کو سامنے لاسکوں مبالغہ آرائی، چرب زبانی اور ادبی مرچ و مصالحہ سے کام لینے کے بجائے سادہ طرز تحریر اور تکلم اختیار کروں۔ میں علم تاریخ میں اپنی کم علمی، کوتاہی، کم فہمی اور کمزوری سے آگاہ ہوں لیکن یہ ایک ایسا علم ہے جو سمندر سے بھی زیادہ گہرا ہے جسے سارے علوم کی ماں کہا جاتا ہے۔ اگر انسان ساری زندگی تاریخ کے کسی ایک موضوع یا پہلو پر تحقیق کرے تو شاید اپنی زندگی میں اس ایک ہی تاریخی موضوع کو انجام تک نہ پہنچا سکے۔ لہٰذا میں بھی ایک کمزور انسان ہوں لیکن ان تمام تر کمزوریوں کے باوجود یہ میری ایک ادنیٰ سی کوشش ہے جو نذر قارئین ہے اور میں فیصلہ بھی انہی پر چھوڑتا ہوں۔

فاروق بلوچ

باب اول:

لفظ بلوچ اور بلوچستان کا قدیم تاریخی کتب میں استعمال

بلوچستان اور اس کے باشندوں کی تاریخ پر بے شمار کتابیں تحریر ہوئی ہیں اور بڑے بڑے دانشوروں نے اس سلسلے میں اپنی تحقیقی اور تجزیاتی آرآ سے تحریری طور پر بلوچستان اور یہاں کے باشندوں کی تاریخ پڑھنے والے قارئین کی تشنگی دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ اس موضوع پر برطانوی عہد اور مابعد لکھنے والے اکثر مصنفین علم تاریخ کے شعبہ سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ وہ دیگر مضامین اور شعبہ جات سے متعلق ہیں لہٰذا ان کی تاریخ نویسی کی وجہ سے بلوچ تاریخ مزید گنجلک اور پیچیدہ ہوتی گئی۔ ان میں کئی مورخین ایسے ہیں کہ جن کی اس موضوع پر کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

بلوچستان ایشیاء میں ایک ایسے مقام پر واقع ہے کہ جہاں سے ایشیاء سمیت پوری دنیا کے لیے بحری و بری راستے نکلتے ہیں۔ ماہرین تاریخ و جغرافیہ اس خطے کو مشرق و مغرب کے مابین مقامِ اتصال قرار دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ شمال کی جانب افغانستان، وسط ایشیاء اور وہاں سے مزید آگے روسی خطے تک جبکہ جنوب کی جانب بذریعہ سمندر بلوچستان ایشیاء اور افریقہ کے ممالک کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی قدیم سے لے کر اب تک یہ خطہ طاقتور قوتوں اور سامراجی ممالک کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ شمالی اور مغربی خطوں سے ہندوستان میں داخل ہونے والی ہر قوم بلوچستان سے گزر کر ہندوستان میں داخل ہوئی۔ آرین اقوام کی یلغار یعنی

1600 ق م سے لے کر اٹھارہویں صدی میں انگریزوں کے نو آبادیاتی نظام کی آمد و قیام تک اس خطے نے بے شمار طاقتور اقوام کی یلغاروں کا سامنا کیا ہے۔

گذشتہ ساڑھے تین ہزار سال سے زیادہ کی تاریخ میں تحریر شدہ کتب اور دیگر تحریری مواد جو ہندوستان یا اس خطے سے متعلق ہیں اور جو حوادثِ زمانہ کے دستبرد سے اب تک محفوظ ہیں اُن میں اس خطے اور یہاں کے باشندوں کے تذکرے ضرور ملتے ہیں۔ ان کتب میں نہ صرف اُن خطوں کے نام تحریر ہیں کہ جو آج بھی اپنے انُہی قدیم ناموں یا تبدیل شدہ ناموں کے ساتھ موجود ہیں بلکہ اِن کتب میں اس خطے کی سیاسی اکائیوں اور یہاں کے قدیم قبائل کے نام بھی تحریر ہیں۔ بعض کتب ایسے ہیں کہ جن میں یہاں کے قدیم باشندوں کے علاقائی و قبائلی نام تحریر ہیں جبکہ بعض تحریروں میں ان کے قومی نام ملتے ہیں۔ اِن قدیم کتب کے مطالعہ سے بلوچستان اور یہاں کے باشندوں کی مستند تاریخ کی بہتر وضاحت ہوتی ہے۔

دورِ حاضر میں بلوچستان کی تاریخ پر لکھی گئی کتب کے مطالعہ سے بلوچستان کی تاریخ کی وضاحت ہونے کی بجائے مزید الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں اور واضح ہونے کی بجائے کئی شکوک و شبہات جنم لیتے ہیں۔ کیونکہ ان کتب میں نہ تو یہاں کے باشندوں کی قومی ارتقاء کا تذکرہ کیا گیا ہے اور نہ ہی ان کی سیاسی تاریخ کی وضاحت کی گئی ہے۔ ان میں بلوچستان کے اصل سیاسی و قومی جغرافیائی حدود کو بھی بیان نہیں کیا۔ البتہ بعض مورخین نے یہاں کے باشندوں کے قومی نام یعنی بلوچ لفظ کی اپنے اپنے طرز پر یا لغات و کتب کی تحریروں کے حوالوں کے ذریعے معانی و طالب بیان کیے ہیں۔

مندرجہ ذیل سطور میں لفظ "بلوچ" کے معنی، لفظ بلوچستان اور لفظ بلوچ کے تاریخی کتب میں تذکروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تاکہ ان مبہم، مشکوک اور غیر واضح سوالات کو بہتر طریقے

سے حل کیا جاسکے۔ مقامی اور غیر مقامی مورخین اپنے اپنے مطالعہ کے مطابق ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں اور اس لفظ کو مختلف معنی دیتے ہیں۔

ان سوالوں کے جواب دینے سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ بلوچستان کے باشندے جنہیں بلوچ کہا جاتا ہے ایشیاء کی ایک وسیع و عریض سرزمین کے مالک ہیں۔ دورِ حاضرہ میں بلوچ پاکستان کے چاروں صوبوں میں کثیر تعداد میں آباد ہونے اور وسیع و عریض قطعات کے مالک ہونے کے علاوہ جنوبی افغانستان، مشرقی اور شمال مشرقی ایران، عرب ممالک، شمالی اور شمال مشرقی افریقی ممالک وغیرہ میں کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ ان ممالک میں وسیع و عریض موروثی جائیدادوں اور وسیع قطعات ارضی کے بھی مالک ہیں۔ اگر دورِ حاضر میں قبائلی بنیادوں پر پاکستان کی آبادی کا جائزہ لیا جائے تو سب سے بڑی آبادی بلوچوں کی ہوگی۔ پنجاب اور سندھ کی دوسری بڑی آبادی بلوچوں جبکہ بلوچستان کی بڑی اکثریتی آبادی بھی انہی قبائل پر مشتمل ہے۔ صوبہ کے پی کے اور کشمیر میں بھی بلوچ قبائل کی اچھی خاصی تعداد آباد ہے۔

لفظ بلوچ کے معانی اور مطلب :

اس سلسلے میں مختلف مصنفین اپنی اپنی رائے بیان کرتے ہیں۔ جیسا کہ،

ڈاکٹر بیلیو (Bellew) لکھتا ہے کہ لفظ بلوچ دراصل "بل اوچھا" سے لیا گیا۔ بل اوچھا ایک راجپوت قبیلہ چوہان کی ایک شاخ ہے۔ لفظ بل اوچھا کے معنی انتہائی طاقتور کے ہیں۔ جن کے خیال میں بلوچ دراصل اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں اور لفظ بلوچ اسی لفظ بل اوچھا سے مشتق ہے (بیلیو 1891:171-78) ۔ انگریز مورخ پروفیسر ایچ۔ جی۔ راؤلنسن وہ پہلا شخص ہے کہ جس نے بلوچوں کے بارے میں سامی النسل نظریہ پیش کیا اور بلوچوں کو مشرقِ وسطیٰ کے افسانوی بادشاہ نمرود کی اولاد قرار دیا۔ وہ لکھتا ہے کہ نمرود کا لقب بلوس تھا اور اس کی اولاد

بعد ازاں بلوچ کے نام سے موسوم ہوئی اور بلوچستان میں وارد ہونے کے بعد یہ لوگ بلوچ کہلائے اور اسی نام سے تاریخ میں موسوم ہوئے (بلوچ، 1958:16)۔

بلوچ مورخ محمد سردار خان بھی راؤلنسن کے نظریے کی حمایت کرتا ہے اور بلوچ لفظ کو نمرود کے لقب بلوس کا نعم البدل یا اس کی بگڑی ہوئی شکل تحریر کرتا ہے (بلوچ، 1958:5-27)۔

میر گل خان نصیر اس حوالے سے متفرق بیانات دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں بلوچ تین مختلف حصوں میں تقسیم تھے جو مختلف اوقات اور مختلف واقعات کی وجہ سے اپنے اپنے آبائی علاقوں سے نکل کر موجودہ بلوچستان میں داخل ہوئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کی۔ وہ لکھتا ہے کہ بلوچوں کا ایک طائفہ شمالی ایران کے پہاڑ کوہِ البُرز کے دامنوں اور اس سے متصل شہروں میں آباد تھا۔ اس طائفے کو 531ء میں ساسانی ایرانی حکمران نوشیروان نے شکست دی جس کے نتیجے میں یہ قبائل وہاں سے ہجرت کر کے وسطی بلوچستان میں آکر آباد ہوئے اور بُرزکوہی کہلائے۔ اسی طرح اُن کے مطابق بلوچوں کا ایک بڑا طائفہ مشرق وسطیٰ کے علاقوں سے بنو امیہ کے دور میں حجاج بن یوسف گورنر عراق کے خلاف لڑائی کی پاداش میں نکال دیے گئے اور وہ قبائل پہلے سیستان اور بعد ازاں مکران، قلات اور کچھی سے ہوتے ہوئے پنجاب تک حملہ آور ہوئے اور ایک وسیع و عریض خطے پر دسترس حاصل کی۔ یہ قبائل تاریخ بلوچستان میں رند و لاشار کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ جبکہ بلوچوں کا تیسرا طائفہ وہ تھا کہ جو عرصہ دراز سے ہی ایران کے مشرقی صحراؤں یعنی دشت لوط میں آباد تھا۔ یہ طائفہ ناہروئی کہلاتا ہے (نصیر 2000:2-8) مگر میر گل خان نصیر یہ نہیں لکھتا کہ یہ قبائل بلوچ کیسے کہلائے۔ جبکہ موصوف اپنی ایک اور تحریر میں راؤلنسن ہی کے نظریے کی حمایت کرتا ہے اور بلوچوں کے سامی النسل ہونے کی تائید کرتا ہے (نصیر 1984:29-30)۔

سرٹی ہولڈچ نسلی بنیادوں پر تو بلوچوں کی سامی النسل نظریے کا حامی ہے مگر اُن کے نام کے مطلب سے راؤلنسن سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ لفظ بلوچ دراصل بعل دیوتا سے منسوب ہے کہ جو بابلیوں کا سب سے بڑا دیوتا تھا۔ ان کے بیان کے مطابق لفظ بلوچ دراصل بعل سے ماخوذ ہے جو پہلے بعلوث اور بعد ازاں بلوچ بنا (بلوچ 1958: 5-27)۔

مولانا نور احمد فریدی لکھتا ہے کہ بلوچ سامی النسل ہیں وہ شام کی وادی البلوص کے باشندے ہیں جو وہاں سے ہجرت کر کے موجودہ خطے میں وارد ہوئے اور اپنے قدیم مرزبوم کی وجہ سے پہلے بلوص اور بعد ازاں بلوچ کہلائے (فریدی سال اشاعت ندارد: 67)۔

آغا میر نصیر خان احمد زئی لفظ 'بلوچ' کے معنی یہ بیان کرتا ہے کہ چونکہ بلوچ قبائل بڑی تعداد میں ایرانی افواج میں شامل تھے، میدی، ہخامنشی اور ساسانی حکمرانوں کی افواج کا اہم ترین حصہ ہوتے تھے جن کے کچھ امتیازی نشانات بھی تھے۔ وہ اپنے سر پر مرغے کی کلغی کی مانند خود (Helmit) یا فوجی ٹوپی پہنتے تھے۔ اُن کے مطابق مرغے کی کلغی (تارجِ خُروس) کو فارسی میں بلوچ کہا جاتا ہے لہٰذا اپنے اس امتیازی فوجی نشان کی وجہ سے یہ لوگ بلوچ کہلائے (کمبرانی 1984:3-25)۔

الغرض مورخین اور مصنفین نے اس لفظ کو مختلف معانی دیے ہیں جبکہ بعض مورخین نے اپنی کتب میں اس لفظ کے معنی بیان کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

اس لفظ کو کبھی تحقیقی بنیادوں پر تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی بس چند انگریزوں کے انتہائی مشکوک اور غیر مستند حوالے دیے گئے اور بلوچ لفظ کے معانی اخذ کر لیے گئے۔ قدیم تاریخی کتب میں مرقوم اس ثقافتی گروہ کی قومی اور سماجی ارتقا کے مراحل کا مطالعہ نہیں کیا گیا۔ ان کتب میں اس لفظ کے معنی اور مطلب موجود ہیں۔ فارسی کے لغات میں بھی اس

لفظ کی وضاحت کی گئی ہے اور معنی بیان کیے گئے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ اس نام کی ابتدا آرین قبائل کی مشرق اور ایران پر حملوں کے بعد ہوئی اور آرین قبائل نے ہی یہاں یعنی موجودہ ایرانی، افغانستانی اور پاکستانی بلوچستان میں وسیع و عریض رقبے پر آباد قبائل کو اس نام سے موسوم کیا۔ جبکہ ان حملہ آوروں کے وارد ہونے سے قبل اس وسیع و عریض خطے میں جو ثقافتی گروہ آباد تھے وہ ایک تو علاقائی بنیادوں پر تقسیم تھے دوم یہ کہ وہ اپنے اپنے علاقوں کے ناموں سے منسوب تھے۔ قدیم تاریخی کتب میں کئی ایسے قبائل کے نام تحریر ہیں کہ جو اڑھائی ہزار سال گزرنے کے باوجود اب بھی بلوچ قوم کے بڑے قبائل شمار ہوتے ہیں اور اپنے اُنہی قدیمی ناموں سے جانے جاتے ہیں۔ اس خطے اور یہاں کے باشندوں کے بارے میں یونانی، عرب اور فارسی مورخین نے اہم بیانات تحریر کیے ہیں اور ان کے بارے میں بیش بہا معلومات فراہم کیے ہیں۔ ساتھ ہی یہ قدیم مورخین اس لفظ کے معنی اور مطالب بھی بیان کرتے ہیں۔ ان مورخین کے بیانات سے اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ اڑھائی ہزار سے تین ہزار سال پہلے تک یہ قبائل کثیر تعداد میں تھے اور ان کے کئی ذیلی طائفے یا قبائل مختلف خطوں پر حاکمیت بھی کرتے تھے۔ ان قبائل کے اپنے اپنے علاقے تھے کہ جن کے اپنے اپنے نام تھے اور وہ قبائل بھی اپنے انہی شہریتی ناموں سے منسوب تھے۔ ذیل میں فارسی لغات اور فارسی، عربی اور یونانی مورخین کے بیانات کی روشنی میں اس لفظ کے معنی اور مطلب کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دنیا کے اولین مورخ اور یونانی دانشور ہیروڈوٹس نے ان قبائل کے بارے میں کافی تفصیل کے ساتھ بیانات تحریر کیے ہیں اور ان قبائل کے نام اور اُن کے علاقے بھی تحریر کیے ہیں۔ اہم بات تو یہ ہے کہ وہ قبائل جن کا تذکرہ ہیروڈوٹس نے کیا ہے۔ دورِ حاضرہ میں بھی وہ اپنے انہی قدیم ناموں سے بلوچ قوم میں کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ یہ واضح ہو کہ یونانی مورخ نے

اپنے لہجے (Dialect) میں ان قبائل کے نام تحریر کیے ہیں۔ وہ قبائل جن کے نام ہیروڈوٹس نے بیان کیے ہیں اُن میں:

۱۔ مید۔ ۲۔ پرکانی (پیریکانی)۔ ۳۔ ڈایہ۔ ۴۔ کلاچی (کوچی یا کلیچی)۔ ۵۔ کرمانی۔ ۶۔ ساجدی (سجیدین) saggedian۔ ۷۔ مائشی۔ ۸۔ ہوت (یوت)۔ ۱۰۔ میکوئی۔ ۱۱۔ میکرونی (مکرانی)۔ ۱۲۔ سراپروئے (سرپرہ)۔ ۱۳۔ زرنجی (زرنگی۔ سیستان کے دارالخلافہ زرنج کے باشندے)۔ ۱۴۔ کاسپی (بحیرہ کیسپیئن اور کوہ البرُز کے گرد باشندے)۔ ۱۵۔ ایشیائی حبشی (ایڈولف ہومز کے مطابق یہ جھلاوان کے براہوئی قبائل تھے)۔ ۱۶۔ دابانی (ایک مشہور کرد قبیلہ جس کا ذکر ابنِ خلدون نے بھی کیا ہے)۔ ۱۷۔ مہردی یامردیانی۔ ۱۸۔ الرودین (بلاشبہ قبیلہ رودینی)۔ ۱۹۔ ہیرکانی (بحیرہ ہیرکانیہ یعنی کیسپیئن کا ایک معروف کُرد قبیلہ جن کے نام نامی کی وجہ سے شمالی ایران اور بحیرہ کیسپیئن کا نام عرصہ دراز تک بحیرہ ہیرکانیہ کے نام سے موسوم رہا)۔ ۲۰۔ سیگارتی، (یہ قبیلہ اب نامعلوم ہے اس کا تذکرہ سیستان کے مشرق کے علاقوں کے قبائل میں ملتا ہے)۔ ۲۱۔ تھامانی۔ ۲۲۔ تیبارینی (تورانی) وغیرہ (ہیروڈوٹس 2001:59-258)۔

اس فہرست میں مزید بھی کئی ایسے قبائل ہیں جو اب اپنے قدیم ناموں سے وجود نہیں رکھتے ممکن ہے کہ اپنی طاقت زائل کرنے کے بعد وہ کسی بڑے قبیلے میں ضم ہوگئے ہوں۔ بلوچ تاریخ اور رسوم و رواجات میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ جہاں چھوٹے اور نسبتاً کمزور قبائل اپنی دفاع اور اہمیت بڑھانے کی خاطر کسی بڑے قبیلے میں شامل ہوتے رہے ہیں۔

اسی طرح مشہور یونانی مورخ ایرین سکندر یونانی کی تاریخ اور ان کی فتوحات اور مقبوضات کے بارے میں کافی اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ سکندر اپنے ہندوستانی مہم سے واپسی پر بلوچستان کے مختلف علاقوں سے ہوکر گزرا۔ یونان کا یہ فاتح پنجاب سے واپسی پر پہلے سندھ میں

رُکا اور بعد ازاں اپنی فوج کو تین حصوں میں منقسم کر کے اُس کے ہر حصے کو بلوچستان کے مختلف راستوں سے ایران پہنچنے کی ہدایت کی۔ فوج کا ایک حصہ جو مالِ غنیمت، قیدیوں اور ناکارہ سپاہیوں پر مشتمل تھا، کو اپنے سالار کریٹیرس کی سربراہی میں بلوچستان کے راستے ایران کی جانب روانہ کیا۔ دوسرے دستے کو اپنے امیر البحر نیروخس کی سربراہی میں سمندر کے راستے ایران کی جانب روانہ کیا جو بلوچستان کے ساحلوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہوا ایران روانہ ہوا جبکہ فوج کا وہ دستہ جو جنگجوؤں پر مشتمل تھا کو اپنی سربراہی میں لے کر وسطی اور مغربی بلوچستان کو عبور کرتا ہوا ایران پہنچا۔ اس سفر کے دوران سکندر کی سربراہی میں جانے والے اور نیروخس کی سربراہی میں بحری دستوں کو اس خطے کو عبور کرتے وقت شدید مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ بھوک اور پیاس کے علاوہ ان لشکروں کو مقامی قبائل کے حملوں نے بھی خاصا پریشان کیا۔ سکندر دو ماہ کے مشکل اور تکلیف دہ سفر کے بعد بصد مشکل ایران پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ مورخ ایرین نے پہلی صدی عیسوی کے اواخر اور دوسری صدی عیسوی کے اوائل میں سکندر کے اس تمام سفر کو قلمبند کیا ہے۔ وہ بلوچستان کے سفر کے دوران سکندر کا سامنا کرنے والے قبائل کا بھی تذکرہ کرتا ہے اور اپنے انداز اور لہجے میں ان کے نام بھی تحریر کرتا ہے۔ موصوف لکھتا ہے کہ جس پہلے قبیلہ کے ساتھ سکندر کا واسطہ پڑا وہ اربوئی قبیلہ تھا۔ علاوہ ازیں وہ اوریتائی (ہوت)، گیدروشیائی (گدرو قبیلہ۔ جو اب محدود تعداد میں بیلہ اور مکران میں آباد ہے)، اچھیتافیگوئی (ساحلی مکران کے مید باشندوں کو ان کی خوراک یعنی مچھلی کے کثرت استعمال کی وجہ سے یہ نام دیا) قبائل کا تذکرہ کرتا ہے۔ اربوئی قبیلہ یقیناً موجودہ براہوئی قبیلہ کا نام ہے جن کا پہاڑی سلسلہ آج بھی سلسلہ ہربوئی کہلاتا ہے جبکہ اسی نام کا ایک تفریحی مقام بھی اسی سلسلہ کوہ میں موجود ہے۔ اس سلسلہ خیال کو یہ بات مزید تقویت فراہم کرتا ہے کہ ماضی کے اربوئی قبائل بلاشبہ دور حاضر کے براہوئی

قبائل کو کہا گیا ہے کہ جو جھلاوان و سراوان کے پہاڑی سلسلے ہر بوئی کے قدیم باشندے تھے۔ اسی طرح موصوف نے مقامی ہوت قبیلہ کو اوریتائی کا نام دیا اور ان کے خطے کو بھی اسی نام سے موسوم کیا۔ اُن کا سمندر بھی اریتھیرین سمندر کہلاتا تھا جس کی تطبیق موجودہ بحیرہ عرب سے ہوئی ہے۔

یہ بات ذہن نشین ہو کہ یونانی مورخین نے اپنی تحریروں میں جن خطوں کا تذکرہ کیا ہے وہاں کے باشندوں کو بھی ان کا علاقائی نام دیا ہے۔ یا پھر باشندوں کے ناموں سے اُن کے علاقوں کے نام منسوب کیے ہیں۔ اِن قدیم قبائل میں سے کوئی بھی نام اجدادی نہیں ہے بلکہ یہ صرف شہریتی نام ہیں۔ بعض نام اسم صفت ہیں کہ جو کسی خصوصیت کی بنا پر ان قبائل نے اختیار کیے یا دیگر اقوام نے انہیں متعلقہ نام دیا۔ پیریکانی نام علاقہ پیریکان سے لیا گیا ہے۔ یہ علاقہ سیستان کے قریب واقع تھا جس کی شہادت قدیم نقشوں سے ہوتی ہے۔ عجیب اتفاق تو یہ ہے کہ یہ قبیلہ آج بھی اسی علاقے میں آباد ہے اور وہاں اُن کی موروثی زمینیں ہیں جبکہ بلوچستان کے دیگر علاقوں میں جتنے بھی پرکانی قبیلے کے لوگ آباد ہیں وہاں اُن کی موروثی زمینیں نہیں ہیں بلکہ اُن کی زرخرید جائیدادیں ہیں۔ اسی طرح مید قبیلہ جو کبھی شمالی ایران میں مرکز بنا کر موجودہ ایرانی خطے سمیت ایک وسیع و عریض سرزمین کے حاکم تھے۔ دورِ حاضرہ میں یہ قبیلہ مکران میں آباد ہے۔ اس قبیلہ کے باشندے زیادہ تر ماہی گیری کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ البتہ اسلامی عہد میں جبکہ اسلامی ممالک پر ترکوں کو فوقیت حاصل تھی تو مکران پر اس خاندان کی حاکمیت قائم تھی۔ غزنوی عہد میں اس خاندان میں انتقال اقتدار کی خاطر خانہ جنگی ہوئی تو غزنوی ترکوں نے مکران میں مداخلت کی۔ جس کے نتیجے میں مکران میں خونریز جنگیں ہوئیں اور اس خاندان کے اقتدار کو زوال ہوا۔ مید خاندان کی اولین حاکمیت کے تذکرے تفصیل کے ساتھ ہیروڈوٹس نے جبکہ مکران میں ان کے اقتدار کا ذکر ابن خلدون نے کیا ہے۔ یہ بھی واضح ہو کہ مید جہاں بھی ہیں خود کو بلوچ کہتے ہیں۔

علاوہ ازیں بلوچوں کا ایک اہم ترین قبیلہ ہوت کے نام سے موسوم ہے جو ایک بہت ہی قدیم قبیلہ ہے اور اولین بلوچ قبائل میں شمار ہوتا ہے۔ اس قبیلہ کو یونانی، عرب اور فارسی مورخین نے اپنے اپنے لسانی لہجے میں اپنی تحریروں میں جگہ دی ہے۔ اس مشہور قبیلہ نے بلوچستان کی تاریخ کے اولین ادوار سے تاحال بلوچستان کی سیاسی و سماجی ارتقاء میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس قبیلے نے سندھ، پنجاب اور کے پی کے کے بعض علاقوں پر بھی حاکمیت کی ہے اور تاریخ میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ مید حاکمیت (854 BC-550BC) کے دوران مکران پر ہوت خاندان کی حاکمیت قائم تھی جسے یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے یوت تحریر کیا ہے اور جمع کے طور پر اسے (Utian) تحریر کیا ہے۔ جبکہ ان کے سمندر کو اریتھیرین (Eritherian) لکھا ہے۔ ہیروڈوٹس کے لگ بھگ اڑھائی صدیاں بعد جب ایرین نے اس علاقے کے بارے میں تحریر کیا تو سمندر کا تو یہی نام تحریر کیا جبکہ قبیلہ کو یوت یا یوتین کی بجائے اوریتائی تحریر کیا۔ عربوں نے اس قبیلہ کو زط، الزط، ہوت، الہوت کے نام سے اپنی تحریروں میں جگہ دی ہے جبکہ فارسی مورخین انہیں جت تحریر کرتے ہیں۔ بلوچ قوم میں یہ قبیلہ ہوت کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مشہور صوفی شعر آ ہاشم شاہ اور شاہ عبداللطیف بھٹائی اس قبیلہ کو ہوت کے نام سے اپنی منظوم کلام میں یاد کرتے ہیں۔ ہوت قبیلہ کی وجہ سے ہیروڈوٹس نے ان کی ریاست کو بھی (Utian) کے نام سے یاد کیا ہے ممکن ہے کہ اس ریاستی نام کی وجہ سے یہ قبیلہ بھی ہوت یا یوت کہلاتا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے نام کی وجہ سے ان کا علاقہ اس نام سے منسوب ہو۔ بہرحال پیریکان، یوتین، ماکا، مادستان وغیرہ کے نقشے اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ بلوچ قبائل ماضی میں بہت طاقتور تھے اور یونانی مورخین نے انہیں ان کے قومی نام کی بجائے علاقائی اور شہریتی ناموں سے یاد کیا ہے۔ ہیروڈوٹس، ایرین، سٹریبو وغیرہ نے اپنی تحریروں میں بلوچوں کے

قومی نام کی بجائے مختلف قبائل کے نام تحریر کیے ہیں۔ یہ بات بھی واضح ہو کہ وہ قبائل جنہیں ان یونانی مورخین نے اپنی تحریروں میں جگہ دی ہے ان کی بڑی اکثریت اب بھی بلوچ قوم میں موجود ہے۔ جیسا کہ مید، پیریکانی، ہوت، ڈایہ، میکرونی، میکوئی (مکران کے باشندوں کے علاقائی و شہریتی نام) ساجدی، کولاچی، رودینی وغیرہ آج بھی بلوچ قوم میں مضبوط جمعیت کے مالک ہیں۔

عرب دور کے مورخین، وقائع نگار، روزنامچہ نویس اور سیاح بھی اس خطے کے بارے میں گراں بہا معلومات اور تاریخ بیان کرتے ہیں۔ ان کی تحریر کردہ کتب علم کا بیش بہا خزانہ ہیں اور اُن کے اپنے جید ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ ان علماء تاریخ میں کہ جنہوں نے بلوچ قوم اور بلوچستان کے مختلف خطوں اور ان سے منسلک واقعات کو اپنی تحریروں میں جگہ دی ہے اُن کی فہرست کافی طویل ہے۔ ان میں بابائے عمرانیات اور بابائے مسلم تاریخ نویسی علامہ عبدالرحمن ابنِ خلدون، علامہ ابو الفدا ابنِ کثیر، ابنِ حوقل، ابنِ مسکویہ، عبدالقاہر البغدادی، علامہ بیہقی، علامہ ناصر خسرو، علامہ طبری، المقدسی البشاری، علامہ ابنِ خردادبہ، البلاذری، محمد ابنِ سعد، ابوالقاسم فردوسی، ملک الشعرآ بہار، عبداللہ یاقوت، یعقوبی، ابنِ رُستہ، ناصر خسرو اور کئی دیگر نام شامل ہیں۔ ان علماء نے بلوچستان کے مختلف علاقوں اور یہاں کے باشندوں کے بارے میں بیش بہا معلومات فراہم کی ہیں۔ انہوں نے اپنی کتب میں ایران، افغانستان اور پاکستان میں منقسم ایک وسیع و عریض خطے کے باشندوں کو "کوچ و بلوچ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ مورخین، شعرآکرام، وقائع نویس، روزنامچہ نویس اور سیاح ان باشندوں کے لیے اپنے اپنے لسانی لہجہ کے مطابق کوچ و بلوچ، کفس و بلوس، کفاج، کفچ و بلفچ، قفص و بلوص وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ مذکورہ بالا اہل علم و دانش حضرات اپنی تحریروں میں ان باشندوں کے علاقائی و قبائلی نام بھی استعمال کرتے ہیں جو آج بھی بلوچ باشندوں میں انہی ناموں سے موسوم ہیں۔ مثلاً ان مورخین نے

میدؔ، (الھوت)، ہوتؔ (زط اور الزط)، کردؔ (جمع کی صورت میں اکراد اور الاکراد بھی تحریر کیا ہے)، الشاری (موجودہ لاشاری جو سیستان کے شہر زرنج کے باشندے تھے جسے عربوں نے شہرستان بھی تحریر کیا ہے لہٰذا وہاں کے باشندے الشاری بھی کہلاتے تھے)، الکلوہی، قیقانی (قلات کے باشندے)، تورانی، البرزیکانی، حسنوی، داھبانی، بنومادان (مید کی جمع مادان)، زرنگی یا زرنجی، کرمانی وغیرہ تحریر کیا ہے۔ یہ مورخین اُن قبائل کہ جنہیں یہ کوچ و بلوچ تحریر کرتے ہیں، کو ایران کے شمالی پہاڑ سلسلے البرز کے دامنوں، گیلان، ایلان، مازندران، شمال مغربی ایران کے پہاڑی سلسلے زوگروس یعنی کردستان کے پہاڑی دامنوں، مشرقی ایران کے صحراؤں اور صحرائی نخلستانوں، جنوبی افغانستان کے شہروں (ہیلمند، زرنج، نیمروز، بادغیس، زابل، چکنسور، گردیز، فراہ، قندھار وغیرہ)، موجودہ پاکستانی بلوچستان کے تمام تر رقبے میں آباد تحریر کرتے ہیں۔ عربوں اور بلوچستان کے باشندوں کے مابین چونکہ طویل عرصہ تک رزم آرائیاں ہوتی رہی ہیں لہٰذا عرب مورخین نے تسلسل کے ساتھ اس خطے اور یہاں کے باشندوں کے حالات اپنی کتب میں تحریر کیے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ خطہ چونکہ سندھ و ہند میں داخل ہونے کے لیے دروازے کی حیثیت رکھتا تھا لہٰذا عربوں کی آمدورفت یہاں تسلسل کے ساتھ اور صدیوں تک ہوتی رہی۔ لہٰذا انہوں نے اپنی تحریروں میں اس خطے کے مختلف شہروں کے نام اور یہاں کے باشندوں کے قومی، علاقائی اور قبائلی نام تحریر کیے ہیں۔ وہ علاقائی اور قبائلی نام آج بھی بلوچ قبائل میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے آخر ان قبائل کے لیے اجتماعی طور پر لفظ کوچ و بلوچ کیوں استعمال کیا؟ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے؟ اب اگر بغور دیکھا جائے تو اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ یہ پورا علاقہ جس میں یہ قبائل جنہیں کوچ و بلوچ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے زیادہ تر پہاڑی اور ریگستانی خطے پر مشتمل ہے۔ ان علاقوں کا زیادہ تر رقبہ بنجر اور غیر آباد ہے۔ ماضی میں

ان پہاڑی علاقوں میں چھوٹی بڑی بستیاں اور دیہات آباد ہوتے تھے جبکہ ریگستانی نخلستانوں میں بھی یہی صورتحال ہوتی تھی۔ اس تمام تر وسیع و عریض علاقے میں چونکہ پانی کی قلت تھی اور مسلسل بہنے والا پانی کا کوئی بڑا ذریعہ نہ تھا لہٰذا اس بڑے علاقے میں کوئی بڑا شہر بس نہ سکا۔ یہ پورا علاقہ چھوٹے بڑے قصبوں اور دیہاتوں سے بھرا پڑا تھا اور ریگستانوں میں جہاں نخلستان اور پہاڑوں میں جہاں وادیاں ہوتی تھیں لوگ دیہات اور قصبات بنا کر آباد تھے جبکہ کسی حد تک نیم خانہ بدوشانہ طرز زندگی بھی موجود تھی جہاں موسموں کے تغیرات کی مناسبت سے بعض قبائل یا خاندان خانہ بدوشی کرتے رہتے تھے۔ ان قدیم قبائل کی بستیاں آج بھی ہزاروں کی تعداد میں کھنڈرات کی شکل میں پورے بلوچستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور اس تمام وسیع و عریض علاقے میں ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ تو اس پورے خطے کی جغرافیائی حیثیت تھی کہ جس سے یہ ثابت ہوا کہ یہ تمام قبائل جنہیں مجموعی طور پر کوچ و بلوچ کا نام دیا گیا ایک ایسے علاقے میں آباد تھے کہ جس کا زیادہ تر رقبہ ریگستانی اور پہاڑی تھا اور زیادہ تر بنجر و بے آب و گیاہ تھا۔ لہٰذا برہانِ قاطع نامی ڈکشنری میں "کوچ و بلوچ" کے معنی "مردمانِ کوہ و صحرا" دیا گیا ہے۔ (برہانِ قاطع : فارسی ڈکشنری) اسی طرح ابنِ خلدون کی تحریر کردہ تاریخ کے اردو ترجمہ میں بھی ان الفاظ کے معنی "پہاڑی جرگہ اور بادیہ نشین" دیے گئے ہیں (عبدالرحمٰن ابن خلدون: 1971 جلد ششم: 351-52)۔ المقدسی اور ابن حوقل بھی کوچ قبائل کو پہاڑی باشندے قرار دیتے ہیں اور انہیں کُرد بھی تحریر کرتے ہیں کیونکہ وہ پہاڑوں میں رہتے تھے اور اُن کے پاس بھیڑ بکریوں کے بڑے بڑے ریوڑ ہوتے تھے (المقدسی 1898 :471، علاوہ ازیں ملاحظہ کریں: ابن حوقل 1898: 220-224، سائیکس، 1968: 131,353، بغدادی۔ یاقوت 1979: 148)۔

پروفیسر مرزا مقبول بیگ بدخشانی بھی لفظ کُرد کا مطلب پہاڑی باشندہ تحریر کرتا ہے (بدخشانی 1967: 40)۔ یہ بھی واضح ہو کہ عرب دور کے مورخین کوچ و بلوچ کو ایک ہی طرح کے لوگ تصور کرتے تھے اور انہوں نے ان کا تذکرہ ہمیشہ ایک ساتھ کیا ہے، یعنی جہاں لفظ کوچ کا ذکر آتا ہے تو اس کے ساتھ ہی لفظ بلوچ کا تذکرہ ضرور ملتا ہے۔ شاہنامہ فردوسی بھی کوہ اور صحرا کے باشندوں کے لیے کوچ و بلوچ کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ جیسا کہ وہ لکھتا ہے،

سواران جنگی و مردان دشت
بسی آفرین کردو اندر گذشت
یکی لشکر آمدز پھلو بدشت
کہ ازگرد ایشان ھواتیرہ گشت

شاہنامہ فردوسی میں جابجا پہاڑی و صحرائی باشندوں اور اُن کے جنگی کارناموں کے تذکرے ملتے ہیں۔ ان باشندوں کو ابو القاسم فردوسی کبھی مردمانِ کوہ و صحرا اور کبھی کوچ و بلوچ تحریر کرتا ہے۔ ایسے لاتعداد بیانات دیگر کتب میں بھی ملتے ہیں کہ جن میں بلوچ اور کوچ قبائل کو صحرائی اور پہاڑی باشندے تحریر کیا گیا ہے یا صحرائی و پہاڑی باشندوں کو کوچ و بلوچ کہا گیا ہے۔ ان بیانات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بلوچ قبائل کو ان کے بود و باش کی مناسبت سے مورخین اور دیگر اقوام نے ان ناموں سے موسم کیا۔ لہٰذا اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ نام دراصل بلوچوں کی بود و باش کی مناسبت سے انہیں دیا گیا تا کہ ان قبائل اور دیگر اقوام کے مابین فرق کو واضح کیا جاسکے۔ آرین اور سامی اقوام اپنے آپ کو بلوچوں سے الگ اور زیادہ متمدن تصور کرتے تھے لہٰذا ان پہاڑی اور صحرائی باشندوں کو اول تو آرین اقوام نے ان کی سرزمین میں داخل ہونے کے بعد ان ناموں سے موسوم کیا جبکہ بعد ازاں سامی اقوام کا جب ان سے واسطہ پڑا تو انہوں نے تحریری طور پر بھی ان کو کوچ و بلوچ یعنی صحرائی اور پہاڑی وادیوں میں رہنے والے لوگ تحریر کیا۔

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ بلوچ اور بلوچستان کے الفاظ کا سب سے پہلے استعمال کب کیا گیا یا ان الفاظ کو کب تحریری صورت دی گئی؟

اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں کہ لفظ بلوچ کا استعمال سب سے پہلے کب کیا گیا مگر تحریری طور پر لفظ بلوچ ایک ہزار سال قدیم کتب میں تحریری صورت میں ملتا ہے۔ ابنِ حوقل کی کتاب ''صورت الارض'' میں یہ لفظ 950ء کے لگ بھگ تحریر صورت میں ملتا ہے جبکہ شاہنامہ فردوسی میں 1000ء میں یہ لفظ تحریری صورت میں سامنے آیا۔ شاہنامہ فردوسی میں جن واقعات کے تناظر میں ان قبائل کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ واقعات ابوالقاسم فردوسی کے شاہنامہ کے تحریر سے بھی ڈیڑھ ہزار سال پہلے رونما ہو چکے تھے۔ یعنی جب موجودہ ایران پر مید اور بعد ازاں ہخامنشی خاندانوں کی حاکمیت قائم ہوئی تو ان خاندانوں کی افواج میں کوچ و بلوچ کے مسلح دستوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ فردوسی ہخامنشی اور اُن سے قبل کیانی یعنی میدی افواج میں بلوچوں کی بھاری اور طاقتور جمعیت کا تذکرہ کرتا ہے اور ان کے فوجی کارناموں سے اپنی کتاب شاہنامہ فردوسی کو زینت بخشتا ہے۔ جیسا کہ ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ:

سپاہش زگردان کوچ و بلوچ
سگالیدہ جنگندو برآوردہ خوچ
کسی درجہان پشت ایشان ندید
برہنہ یک انگشت ایشان ندید
درفشی برآوردہ پیکر پلنگ
ہمی ازدرفش بیارید جنگ

اس طرح کے کئی اشعار میں بلوچ قوم اور اس کے مسلح لشکر کا تذکرہ شاہنامہ کے صفحات پر ملتا ہے۔ یہ واقعات 854 قبل مسیح سے لے کر آمدِ اسلام تک پیش آتے رہے کہ جن میں بلوچ لشکروں نے تاریخ ساز کردار ادا کیا اور ایرانی حکمرانوں کی جانب سے شروع کردہ ہر مسلح

مہم میں اپنی بھرپور موجودگی کا احساس دلایا۔ شاہنامہ فردوسی کے خالق نے بھی ان کے بھرپور کردار کو اپنی منظوم تاریخ میں مناسب جگہ دی ہے۔ لہٰذا ان بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ تاریخ میں لفظ بلوچ کا استعمال لگ بھگ تین ہزار سال پہلے سے ہوتا تھا ان صحراؤں، پہاڑوں اور وادیوں میں رہنے والے باشندوں کو اُس زمانے میں بھی بلوچ اور کوچ و بلوچ کے نام سے جانا جاتا تھا مگر اُس زمانے کی فارسی تحریریں دستیاب نہیں ہیں کہ جس سے اس بات کو ثابت کیا جاسکے کہ آیا یہ قبائل تحریری طور پر بھی اُس زمانے میں بلوچ کہلاتے تھے یا نہیں۔ البتہ یونانی تحریروں میں اُن قبائل کے نام تحریر ہیں جو آج بھی بلوچ قوم میں موجود ہیں اور بھاری جمیعت رکھتے ہیں۔ ان قبائل میں سے اکثر نے بلوچستان اور اس خطے کی تاریخ میں زبردست کردار ادا کیا ہے جیسا کہ قبیلہ مید، قبیلہ ہوت، قبیلہ پرکانی، قبیلہ کولاچی، قبیلہ کرمانی، قبیلہ ڈایہ وغیرہ۔ گذشتہ اوراق میں ہیروڈوٹس کے حوالے سے کئی قبائل کے نام تحریر کیے گئے ہیں جن میں سے اکثر دورِ حاضرہ میں بھی بلوچ قوم میں موجود ہیں۔ ان بیانات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آرین اقوام اُن قبائل کو اجتماعی طور پر کوچ و بلوچ کہتے تھے جو زیادہ تر صحراؤں اور پہاڑوں میں جاگزین تھے جبکہ اپنے آپ کو اُن سے ممیز کرنے کی خاطر اجتماعی نام آرین یا اپنے قبائلی نام تحریر کرتے تھے۔

یہ یقیناً بلوچ قوم کے لیے فخر کی بات ہوگی کہ اُن کے بعض قبائل کے تذکرے دنیا کی اولین کتاب تاریخِ ہیروڈوٹس میں ملتے ہیں۔ اس کتاب کو تاریخ کی پہلی کتاب کا درجہ حاصل ہے جبکہ اس کے مصنف کو عرفِ عام میں بابائے تاریخ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح مجموعی طور پر ان قبائل کا قومی نام یعنی بلوچ کثرت کے ساتھ عرب دور کے مورخین کی کتب میں تسلسل کے ساتھ ملتا ہے۔ لہٰذا وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ بلوچ قبائل دنیا کی قدیم ترین ثقافت کے وارث ہیں جن کی ہمعصر اقوام آج کہیں پر بھی نظر نہیں آتے مگر بلوچ قوم اپنی قدیم ثقافت اور سیاسی و سماجی

کردار کے ساتھ تاریخ کے صفحات پر پوری تابانی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ بلاشبہ گذشتہ تین ہزار سال کی تاریخ میں بلوچ قوم کا کردار اپنی سرزمین اور ہمسایہ ممالک کی سیاست میں بھرپور رہا ہے اور اس طویل عرصہ میں بلوچوں کی سیاسی، سماجی اور عسکری سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔

اب یہ سوال کہ لفظ بلوچستان کو کب تحریری طور پر کتب میں استعمال کیا گیا؟ تو اس کا جواب زیادہ مشکل نہیں۔ جدید تحقیقات نے اس لفظ کے اولین استعمال کے بارے میں کافی اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل تک یہی خیال کیا جاتا تھا کہ سیاسی و جغرافیائی اکائی کے طور پر بلوچستان کے نام کا استعمال خوانین احمد زئی کے دور میں کیا گیا۔ ہندوستان کے پہلے مغل حکمران ظہیر الدین بابر اپنی خود نوشت نوانح ''تزک بابری'' میں لفظ بلوچستان کا استعمال کرتا ہے جو سولہویں صدی عیسوی کے ابتدائی عشروں میں لکھی گئی تصنیف ہے (بابر 1995:267)۔ جبکہ بعض اہل قلم یہ لکھتے ہیں کہ اس خطے کو اٹھارہویں صدی عیسوی کے ایرانی فاتح نادر شاہ افشار نے یہ نام بلوچوں کی بود و باش کی وجہ سے دیا (کوثر 1997:13)۔ یعنی اس سلسلے میں کوئی حتمی رائے نہیں تھی اور نہ ہی تاریخی حقائق اور قدیم کتب کے بیانات کی روشنی میں اس جانب توجہ دی گئی تھی بلکہ صرف قیاسات کی حد تک یہ دعویٰ کیا گیا تھا۔ یہ درست ہے کہ بلوچ قبائل کی بڑی اکثریت نے اس وسیع و عریض خطے پر حاکمیت کی اور مختلف قبائل یہاں طویل عرصے تک حکمرانی کرتے رہے مگر اپنی ریاستی حدود کو ان خاندانوں میں سے کوئی بھی یک قومی نام نہ دے سکا اور بلوچستان کے مختلف حدود اپنے اپنے ناموں سے موسوم ہوتے رہے۔ پہلی بلوچ ریاست کے قیام یعنی میدی سلطنت کے آغاز سے انجام تک (854BC to 550BC) یہ پورا خطہ مادستان کے نام سے موسوم ہوا جبکہ داخلی طور پر بلوچستان کا ہر حصہ اپنے قدیمی ناموں سے موسوم رہا۔ مثلاً مکران ہر دور میں مکران کے نام سے مشہور رہا، وسطی بلوچستان کو توران کے نام سے جانا جاتا

تھا، شمالی اور شمال مغربی بلوچستان سیستان کے نام سے شہرت رکھتا تھا اور اسی نام سے تاریخ میں مشہور و معروف رہا۔ کمبرانی عہد میں لفظ بلوچستان کا استعمال ہوتا تھا مگر اس نام کے خطے کی جغرافیائی اور سیاسی حدود متعین نہیں تھے۔

اس وسیع و عریض مگر نامعلوم جغرافیائی حدود پر مشتمل خطہ زمین پر کئی بلوچ قبائل اور غیر بلوچ اقوام نے مختصر یا طویل عرصہ تک حاکمیت کی مگر اس پورے خطے کو کبھی بھی وہ اس کے اصل اور قومی نام سے منسوب نہ کرسکے۔ بلاشبہ میر نصیر خان نوری وہ پہلے حکمران تھے کہ جنہوں نے بلوچی زبان بولنے والے تمام علاقوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی اور لگ بھگ تین لاکھ چالیس ہزار مربع میل کا رقبہ اپنی سلطنت میں شامل کرکے اس پورے خطے کو ایک ہی نام سے موسوم کیا یعنی بلوچستان۔ اور پہلی بار اس پورے خطے کو ایک الگ، خود مختار اور آزاد ریاست کی شکل میں دنیا کے نقشے پر متعارف کروایا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا لفظ بلوچستان کا استعمال سولہویں یا اٹھارہویں صدی میں ہوا یا اس سے قبل بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا تھا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ لفظ بلوچستان کا استعمال ماضی میں بھی ہوتا تھا۔ یہ لفظ اٹھارہویں صدی عیسوی کی پیداوار یا تخلیق نہیں ہے بلکہ ابتدائی عرب دور میں بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا تھا اور موجودہ عہد میں بلوچستان و افغانستان میں منقسم ایک مخصوص علاقے کو اس نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ عرب جغرافیہ دان اور سیاح ابنِ حوقل نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''صورت الارض'' (ابنِ حوقل 1898 :233) میں جبکہ مقدسی البشاری نے اپنی کتاب ''احسن التقاسیم فی معرفتہ الاقالیم'' میں اس لفظ کا استعمال عربی تلفظ میں کیا ہے (المقدسی 1898:486)۔ ان کے علاوہ ابنِ خرداذبہ (ابنِ خرداذبہ 1889 :55) اور اصطخری (اصطخری 1870 :178) بھی سیستان

کے حدود میں صوبہ والشتان یا بالشتان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ مشہور جغرافیہ دان قندھار، بنجوے (قندھار کے قریب ایک قدیم قصبہ) سیبی (بلوچستان کا شہر سبی) مستنج (بلوچستان کا شہر مستونگ) اور اسپان جائے (مستونگ ضلع کا مشہور قصبہ اسپلنجی) پر مشتمل علاقے کو عربی تلفظ میں بالشتان تحریر کرتے ہیں۔ جو بلاشبہ لفظ بلوچستان کا عربی لہجے میں ادائیگی ہے۔ یہی مصنفین شہر قندھار کا قدیم نام بیلوس اور بسا اوقات بالش (بلوش) کا نام دیتے ہیں۔ مشہور و معروف مصنف اور طبقات ناصری نامی قدیم کتاب کے مصنف مولانا منہاج الدین سراج بھی قندھار کا نام بیلوس تحریر کرتا ہے (منہاج الدین 1995ری پرنٹ:1018)۔ میجر ایچ جی ریورٹی اپنی مشہور و معروف کتاب Notes on Afghanistan and Balochistan میں بھی قندھار کا قدیم نام بیلوس تحریر کرتا ہے (ریورٹی 1999: 801-2)۔ یہ مصنفین کوئٹہ سے قندھار تک اس پورے خطے کو بالش، بالس، بیلوس اور بالشتان تحریر کرتے ہیں۔ بلاشبہ لفظ بالشتان عربی زبان میں بلوچستان کا تلفظ ہے جبکہ ہمسایہ افغان (پشتون) قبائل اب بھی بلوچ قبائل کے لیے لفظ بلوس استعمال کرتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ قندھار کی بیشتر آبادی منگول حملوں تک اور بعد ازاں بھی بلوچوں پر مشتمل تھی جو وہاں موروثی جائیدادوں اور زمینوں کے مالک تھے۔ منگول حملوں نے ان قبائل کو شدید نقصان پہنچایا اور یہ قبائل بڑی تعداد میں اندرونِ بلوچستان کے دیگر علاقوں کی جانب پسپا ہونے پر مجبور ہوئے مگر اس کے باوجود بلوچ قبائل قندھار اور اس سے متصل دیگر علاقوں میں بڑی تعداد میں متمکن رہے۔ اب بھی جنوبی افغانستان کی زیادہ تر آبادی بلوچ قبائل پر مشتمل ہے۔ جو اس بات کی شہادت اور گواہی دیتی ہے کہ قندھار اور اس سے متصل وسیع علاقہ ماضی میں بلوچوں کی کثیر آبادی کی وجہ سے بالشتان کہلاتا تھا۔ عرب اب بھی بلوچ کے لیے لفظ بلوس یا بلوش استعمال کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں بھی عرب دور کے اکثر مورخین

اپنی کتب میں اس علاقے کے لیے یہی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان مورخین میں ملک الشعراء بہار (ان کی تصحیح کردہ کتاب سیستان میں یہ لفظ تحریر ہے) ابن خلدون نے بھی اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی دیگر نامور مورخین اپنی تحریروں میں اس مخصوص علاقے کے لیے لفظ بالشتان کا استعمال کرتے ہیں۔

ان مستند مصنفین و مورخین اور جغرافیہ دانوں کے بیانات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لفظ بلوچستان عرب دور میں بھی مستعمل تھا اور بلوچوں کی بود و باش کی وجہ سے ایک مخصوص علاقے کو بالشتان کہا جاتا تھا جبکہ قندھار کی کثیر بلوچ آبادی کی وجہ سے یہ قصبہ یا شہر بیلوس کے نام سے موسوم تھا۔ اس سلسلے میں مزید معلومات کی خاطر عرب دور کی ان تحریروں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے جو اس خطے اور بالخصوص سیستان و خراسان کی تاریخ پر مشتمل ہیں۔

باب دوم:

قدیم بلوچ قبائل

بلوچ دراصل لاتعداد قبائل پر مشتمل ایک قدیم قومی وثقافتی گروہ ہے۔ بلوچ قوم کا قائم کردہ یہ قبائلی نظام بہت قدیم ہے، جس کے سماجی ارتقاء کی کہانی بہت طویل ہے۔ اس قومی وثقافتی گروہ میں بعض قبائل وہ ہیں جو بلوچوں کے بنیادی اور ابتدائی قبائل کہلاتے ہیں۔ جبکہ بعض قبائل ایسے بھی ہیں کہ جو بعدازاں وجود میں آتے گئے۔ ان قبائل میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو بنیادی قبائل سے تعلق نہیں رکھتے مگر وہ اپنے تحفظ اور مختلف مفادات کی خاطر بلوچ قومی وثقافتی گروہ کا حصہ بنتے گئے اور بلوچ قومی ارتقامیں اہم کردار ادا کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ بلوچ کسی ایک ہی مخصوص نسلِ انسانی سے تعلق رکھنے والا گروہ ہے تو یہ دعویٰ سراسر غلط اور من گھڑت ہوگا۔ درست حقیقت تو یہ ہے کہ بلوچ ایک قومی گروہ ہے کہ جس میں مختلف نسلوں کے لوگ شامل ہیں۔ بلوچوں کو ایک قوم کی صورت اختیار کرنے کے لیے طویل ارتقائی سفر طے کرنا پڑا ہے۔ ان کا یہ سفر ہزاروں سالوں پر مشتمل ہے۔ گذشتہ اوراق میں بیان ہوا کہ آرین اقوام کی اس خطے میں مداخلت کے بعد یہاں کے قدیم باشندوں کو ان کے علاقے کی جغرافیائی خدوخال کی بنیاد پر بلوچ اور کوچ و بلوچ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ جبکہ وہ اپنے علاقائی ناموں کی وجہ سے بھی پہچانے اور جانے جاتے تھے۔ وہ بنیادی قبائل جنہیں آرین اور بعدازاں سامی اقوام بلوچ اور کوچ و بلوچ کے ناموں سے جانتے اور موسوم کرتے تھے، ایک وسیع و عریض خطے میں آباد تھے۔ ان کا تمام تر علاقہ پہاڑی سلسلوں اور ریگستانوں پر مشتمل تھا جہاں پانی کی شدید قلت تھی لہٰذا وہ لوگ چھوٹے

چھوٹے دیہات بنا کر رہتے تھے۔ کاریزات، قدرتی چشموں اور ندی نالوں کے پانی سے اپنی ضروریات پوری کرتے تھے۔ اس پورے اور زیادہ تر بنجر و بے آب و گیاہ خطے میں کوئی بڑا اور قابلِ ذکر شہر نہ تھا اگر کہیں پانی کے ذرائع بہتر تھے تو وہاں کوئی چھوٹا سا شہر یا قصبہ قائم ہو جاتا تھا وگرنہ یہ پورا خطہ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں پر مشتمل تھا۔ آبادی کی ایک قابلِ ذکر تعداد نیم خانہ بدوشانہ زندگی گزارتی تھی اور موسموں کی تبدیلی کے مطابق اپنے رہائش تبدیل کرتی تھی۔ وگرنہ زیادہ تر لوگ اپنے اپنے دیہاتوں میں ہی اقامت رکھتے تھے۔ بلوچستان کی قدیم آبادی کے آثار اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ یہ آبادیاں ہزاروں سالوں تک ایک ہی جگہ قائم و دائم رہیں اور اجڑنے کے باوجود بار بار آباد ہوتی رہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سابقہ آبادی کی زیادہ تر تعداد مستقل سکونت پذیر تھی اور خانہ بدوشی صرف ٹھنڈے علاقوں میں ہوتی تھی جہاں شدید سردی میں نظام زندگی مفلوج ہو جاتا تو لوگ گرم علاقوں کی جانب اور بالخصوص سندھ کی جانب ہجرت کرتے اور گرمیوں میں دوبارہ اپنے اپنے علاقوں کی جانب لوٹ آتے تھے۔ یہ علاقائی مہاجرت آج بھی بلوچستان کے ٹھنڈے علاقوں میں ہوتی ہے اور بلوچستان کے ٹھنڈے اور سرد علاقوں کی تھوڑی سی آبادی کچھی اور سندھ کی جانب منتقل ہو جاتی ہے سردیاں کا موسم ختم ہوتے ہی دوبارہ یہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آتے ہیں۔

بلوچستان کے چند قدیم قبائل بھی بالکل اسی طرح کی طرز زندگی گزارتے تھے اور زیادہ تر آبادی دیہاتوں میں رہتی تھی۔ ان چھوٹے چھوٹے دیہاتوں نے برادریوں اور خاندانوں کی شکل اختیار کی اور آہستہ آہستہ مختلف جغرافیائی حدود قائم ہونے لگیں۔ یقیناً قدیم باشندوں نے اپنے اپنے علاقوں کو نام بھی دیے ہوں گے اور اپنی برادریوں کو بھی کسی نہ کسی مخصوص نام سے موسوم کرتے ہوں گے مگر افسوس زمانہ ماقبل از تاریخ کے ایسے کوئی شواہد نہیں ملے کہ جن سے

خطے کے اُن قدیم ناموں اور خاندانوں کا پتہ لگایا جاسکے۔ بلوچستان کے آثار قدیمہ سے بر آمد ہونے والی اشیاء کو ماہرینِ آثار قدیمہ نے مختلف علاقوں کی مناسبت سے نام دیے ہیں اور ان کے حدود مقرر کیے ہیں۔ مثلاً نال اور جھلاوان سمیت ایک وسیع و عریض علاقے کے آثار قدیمہ اور ان سے بر آمد ہونے والی اشیاء کو نال کلچر کا نام دیا گیا ہے کیونکہ ان اشیاء میں مکمل یکسانیت پائی گئی ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ اس کلچر کا مرکز نال کو قرار دیتے ہیں جو خضدار سے آواران جاتے ہوئے صرف چالیس کلو میٹر کی دوری پر واقع ایک مشہور و معروف قصبہ ہے۔ ماہرینِ آثار قدیمہ کے مطابق یہ قصبہ چھ ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ ایک بڑا ثقافتی مرکز ہوا کرتا تھا جس کا دائرہ کار دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ماہرین یہ بھی کہتے ہیں کہ اس ثقافتی مرکز کے مشرق و مغرب میں وجود میں آنے والی ثقافتوں سے گہرے تجارتی اور معاشی تعلقات قائم تھے۔ بلوچستان کے مختلف علاقوں میں بنائے گئے ظروف اور دیگر اشیاء مشرقِ وسطیٰ، سندھ اور افغانستان کی آثارِ قدیمہ سے دریافت ہوئے ہیں جو اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ بلوچستان کی قدیم آبادی تجارتی بنیادوں پر ایشیاء کے مختلف خطوں کے ساتھ جُڑا ہوا تھا اور اس علاقے میں پائی جانے والی ثقافتی گروہوں کے بلوچستان سے باہر پنپنے والی ثقافتی گروہوں کے ساتھ گہرے مراسم اور خارجی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ بلوچستان کی قدیم آبادی پہلے پہل برادری کے نظام سے وابستہ ہو گئی جس کا دائرہ بڑھتا گیا اور ایک وسیع و عریض علاقے کے باشندے اپنے مختلف گروہی مفادات کی خاطر یکجا ہوتے گئے۔

اسی طرح ماہرین آثارِ قدیمہ نے بلوچستان کے دیگر حصوں سے بر آمد ہونے والی آثار قدیمہ کو بھی مختلف ثقافتی ناموں سے موسوم کیا ہے۔ جیسا کہ، مکران اور کولواہ سے بر آمد ہونے والی ثقافت کو کولی و مہی کلچر کا نام دیا گیا ہے، کوئٹہ کی قدیم آبادی کو کوئٹہ کلچر کا نام دیا گیا ہے جبکہ

دیگر علاقوں کو بھی اسی طرح کے ناموں سے منسوب کیا گیا ہے۔ ان بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ بلوچستان کے مختلف علاقوں میں چھوٹی چھوٹی آبادیاں مستقل سکونت اختیار کرتی جارہی تھیں اوراس طرح بلوچستان کے مختلف خطوں میں برادریاں قائم ہونے لگی تھیں۔

اس قدیم آبادی نے بعد ازاں قبائل کی صورت اختیار کرلی۔ انہوں نے اپنے علاقوں کے نام تجویز کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے قبائلی نام بھی اختیار کیے۔ گو اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ ماقبل تاریخ دور کے بلوچستان اور اس کے مختلف علاقوں کے کیانام تھے مگر بعد ازاں جنم لینے والی تاریخ اور باہر سے بلوچستان میں وارد ہونے والی اقوام نے یہاں کے باشندوں کو اُن کے قبائلی ناموں سے یاد کیا اور اُن کے علاقائی نام بھی تحریر کیے۔ یقیناً ہیروڈوٹس نے جن قبائل اور علاقوں کے نام تحریر کیے ہیں وہ آرین حملوں سے پیشتر بھی انہی ناموں سے ماخوذ ہوں گے۔ جیسا کہ خلیجی عرب ممالک اور بالخصوص عمان اور بحرین سے برآمد ہونے والے کتبوں سے اس بات کا انکشاف ہوا ہے کہ مکران تیسری ہزارویں قبل مسیح میں بھی اپنے اسی نام سے معروف تھا یعنی مکران۔ جسے مشرقِ وسطیٰ کے سامی النسل عکادی حکمران ماگان جبکہ پہلی ہزارویں قبل مسیح کے ایرانی ماکا کے نام سے جانتے تھے۔ سندھی تہذیب اُس زمانے میں ملوہا یا میلوہا کے نام سے جانا جاتا تھا اور ملوہا کے باشندے مکران سے خوب واقف تھے کیونکہ عکادی اقوام اور سندھیوں کے مابین ماگان کی بندرگاہوں سے ہی سمندری تجارت ہوتی تھی جبکہ خشکی کی تجارت بھی مکران کے راستے ہوتی تھی۔ یقیناً مستقبل میں بلوچستان کے ماقبل تاریخ باشندوں کے قدیم قبائل کا نام منظر عام پر آنے کی توقع ہے۔ اگر بلوچستان کے آثار قدیمہ پر خصوصی توجہ دی جائے اور اس سلسلے میں وسیع پیمانوں پر سائنسی انداز میں کام کیا جائے تو یقیناً کامیابی کی امید کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر ایم آر ساہنی کے مطابق بلوچستان کے علاقہ نال کے باشندوں اور قدیم قبرستانوں سے برآمد ہونے والی ہڈیوں کے

ڈی این اے ٹیسٹ سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ باشندے قدیم باشندوں کا تسلسل ہیں اور وہی ان موجودہ باشندوں کے اجداد تھے (ساہنی 2004:191-92)۔ اسی طرح معروف محقق یحییٰ امجد کی تحقیق کے مطابق بلوچستان کے اسی علاقہ یعنی نال کے باشندے ہی وادی سندھ کی تہذیب کے بانی ہیں جنہوں نے دادو کے قریب واقع امری کا ٹیلہ بسایا تھا (امجد 1989:207) اور سندھ کی سرزمین پر تہذیب کی بنیاد رکھی تھی۔

بلوچستان کی ماضی قدیم کی تاریخی آثار پر ابھی بہت کام باقی ہے امید ہے کہ جب اس سلسلے میں دل جمعی اور لگن کے ساتھ کام کیا جائے گا تو ماضی کے باشندوں کے بارے میں بہتر اور مستند معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ البتہ پہلی ہزارویں صدی قبل مسیح کے اُن قبائل کے بارے میں کافی حد تک معلومات دستیاب ہیں کہ جو اپنے علاقائی و قبائلی ناموں کے علاوہ کوچ و بلوچ کے ناموں سے بھی موسوم تھے اور وہ آج بھی بلوچ قوم میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان قبائل کے بارے میں پہلے پہل بابائے تاریخ ہیروڈوٹس نے کافی اہم اور بیش بہا معلومات فراہم کیے اور نہ صرف اُن قبائل کا پس منظر بیان کیا بلکہ اُن کے علاقوں اور بود و باش کے بارے میں بھی کافی دلچسپ اور اہم معلومات فراہم کیے۔ اپنی کتاب میں بعض قبائل کے رہن سہن، سماجی زندگی، فنون، ملبوسات اور افرادی قوت تک کے بارے میں ہیروڈوٹس نے زبردست بیانات تحریر کیے ہیں۔ ایسے کئی قبائل کہ جن کا تذکرہ ہیروڈوٹس نے کیا ہے اب بھی بلوچ قوم میں طاقتور جمعیت کے طور پر موجود ہیں جبکہ ماضی کے بعض قبائل اپنی سابقہ طاقت گنوانے کے بعد کسی دوسرے قبیلے میں اپنے قدیمی ناموں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ یہ طریقہ کار اب بھی بلوچ قبائل میں موجود ہے کہ جہاں کوئی نسبتاً کمزور قبیلہ کسی بڑے اور طاقتور قبیلے میں شمولیت اختیار کر لیتا ہے، یا کوئی خاندان یا پھر فردِ واحد اپنے تحفظ اور دیگر مفادات کی خاطر کسی دوسرے قبیلے میں شامل ہو کر اس کا حصہ بن

جاتا ہے۔ اس طریقہ کار یا رسم کو بلوچی میں ”ہڈ پروشگ“ کہتے ہیں جبکہ براہوئی زبان میں ”ہڈ پرعنگ“ کہتے ہیں۔ اس طرح ماضی کے کئی قبائل کے حصے دیگر قبائل میں ملتے ہیں حتیٰ کہ اِن قبائل میں سے کئی ایک اپنے قدیمی ناموں کے ساتھ ملتے ہیں۔

قدیم بلوچ قبائل کے کئی طائفے جداگانہ طور پر قبائل کی صورت اختیار کر چکے ہیں اور نئے ناموں کے ساتھ وجود رکھتے ہیں جبکہ کئی قبائل ایسے بھی ہیں جو دیگر ممالک اور صوبوں میں دیگر ناموں کے ساتھ متعارف ہوئے ہیں۔ ایسے کئی قبائل افغانستان، ایران، مشرق وسطیٰ، عرب وافریقی ممالک، ہندوستان، سندھ، پنجاب اور کے پی کے میں ملتے ہیں جو بنیادی طور پر بلوچوں سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ وہ نہ صرف جداگانہ نام بلکہ جداگانہ قومیت بھی اختیار کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں اس بات سے بھی کسی طور انکار ممکن نہیں کہ بلوچوں کے کئی قبائل اور خاندان وسط ایشیائی ممالک اور روس میں بھی آباد ہیں۔ یقینا جداگانہ قومیت اختیار کرنے والے بلوچوں کی بہترین مثال مشرق وسطیٰ کے کردوں اور جنوبی پنجاب کے سرائیکیوں کی دی جاسکتی ہے۔ کُرد ایک قدیم بلوچ قبیلہ ہے اور یہ بلوچوں کے بنیادی قبائل میں شمار ہوتا ہے جبکہ سرائیکیوں کی اکثریتی تعداد بلوچ قبائل پر مشتمل ہے جن میں سے کچھ بنیادی قبائل جبکہ بعض وسطی عہد کے قبائل پر مشتمل ہیں۔ سرائیکی بولنے والوں میں معمولی تعداد افغانوں کی بھی ہے جو مختلف اوقات میں یہاں آکر آباد ہوتے گئے اور سرائیکی قومیت کا حصہ بن گئے جبکہ سرائیکیوں کی کثیر آبادی کسی مبالغے کے بغیر بلوچوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح ہندوستان سمیت دیگر متذکرہ بالا علاقوں اور ممالک میں بھی ان قدیم قبائل کی بڑی تعداد مختلف قومیتوں کے ناموں سے وجود رکھتے ہیں اور بعض قبائل دیگر اقوام میں شامل ہو چکے ہیں جنہیں عمیق و دقیق مطالعہ سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔

قدیم کتب میں ہیروڈوٹس کے علاوہ ایرین کی کتاب "انڈیکا" میں بھی قدیم عہد کے کئی بلوچ قبائل کے تذکرے ملتے ہیں۔ اسی طرح اسلامی عہد میں تحریر ہونے والی اہم تحریریں ابوالقاسم کا شاہنامہ فردوسی اور البیرونی کی مشہور زمانہ کتاب آثار الباقیہ جبکہ ابنِ خلدون، ابنِ کثیر سمیت کئی دیگر مورخین کی کتب بھی بیش بہا معلومات فراہم کرتے ہیں۔

موجودہ بلوچ قبائل میں اکثر قدیم قبائل کا تسلسل ہیں اور انہی کی نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں مگر ان قبائل میں بھی اکثر ایسے ہیں کہ جن میں باہر کے قبائل نے بھی آکر شمولیت اختیار کی ہے۔ ایک بات یہ بھی واضح ہو کہ موجودہ قبائل میں سے اکثر اپنے اجدادی ناموں سے جانے جاتے ہیں اور اپنے کسی بزرگ سے منسوب ہیں جبکہ قدیم قبائل میں سے اکثر اپنے علاقائی اور شہریتی ناموں سے جانے جاتے تھے۔ ان قبائل کے یہ قدیم نام اب بھی مستعمل ہیں۔ لہٰذا قدیم اور وسطی و جدید عہد کے قبائل کو اس طرح سے بہتر انداز میں پہچانا جا سکتا ہے۔

ذیل میں مختلف مستند علماء تاریخ کی مشہور تحریروں اور کتب کی روشنی میں قدیم اور بنیادی بلوچ قبائل کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

قدیم بلوچ قبائل:

موجودہ خطہ ایران (قدیم مادستان) کے قدیم کوچ و بلوچ (پہاڑی و صحرائی) قبائل:

تاریخ کے قدیم صفحات کے مطالعہ سے یہ بات شنید میں آتی ہے کہ پہلی ہزارویں قبل مسیح میں مید (ماد) قبیلہ شمالی اور شمال مغربی ایران میں سکونت پذیر تھا۔ ان کے ہمسائے میں ایک جانب بلوچ قبیلہ کرد جبکہ دوسری جانب قبیلہ لوری (لوڑی) کے علاقے واقع تھے۔ مزید کئی چھوٹے بڑے قبائل اور طائفے بھی ان کے ارد گرد سکونت پذیر تھے۔ اُس زمانے میں ایران پر ایک خاندان پیشدادی کی حاکمیت قائم تھی جن کی اصلیت کے بارے میں تاریخ کے صفحات

خاموش ہیں۔ فارسی تاریخی کتب کے مطابق اس خاندان کا بنیاد گذار کیومرث تھا جسے زرتشتی مذہب کے ماننے والے بابائے آدم سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ جبکہ اس خاندان میں کئی دیگر حکمران بھی گزرے ہیں جن میں ہوشنگ، طہمورث، جمشید، ضحاک، فریدوں، تور، سلم اور ایرج شامل تھے (بدخشانی 1967: 33-47)۔ فارسی تحریروں کے مطابق کیومرث وہ حکمران تھا جنہوں نے کوہِ البرز کو دیووں سے خالی کرا کے انہیں وہاں سے نکال دیا۔ دیووں نے کیومرث کے ایک بیٹے سیامک کو قتل کر کے اس کا بدلہ لیا۔ کیومرث نے لمبے عرصے تک حاکمیت کی۔ ان کی وفات کے بعد ہوشنگ برسرِ اقتدار آیا اور لوگوں کو پہاڑی غاروں کی بجائے زمین پر گھر بنا کر رہنا سکھایا۔ زراعت سے لوگوں کو مستفید کیا، جانوروں کو سدھایا اور ان کی پرورش کی۔ پہاڑوں سے مختلف اقسام کے دھات یعنی سونا، چاندی اور تانبا نکال کر لوگوں کو ان کا استعمال سکھایا۔ جانوروں کا گوشت، دودھ اور کھالوں کا استعمال سکھایا، اوزار اور ہتھیار بنائے، نئے شہر بسائے اور ملکی قوانین کی بنیاد رکھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے آگ کو دریافت کیا اور اس دریافت پر پورے ملک میں جشن منایا گیا جسے ایرانی ادب میں ''جشن سدہ'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ لہٰذا اس حوالے سے ثعالبی لکھتا ہے:

نگہ کرد ہوشنگ باہوش و سنگ
گرفتش یکی سنگ و شد پیش جنگ
بر آمد بسنگ گران سنگ خرد
ہم این و ہم آن سنگ بشکست خرد
فروغی بدید آمد از ہر دو سنگ
دل سنگ گشت از فروغ آزرنگ

نشد مار کشتہ و لیکن ز راز
پدید آمد آتش از آن سنگ باز
جہاں دیدہ پیش جہان آفرین
نیایش ہمی کرد خواند آفرین
کہ اورا فروغی چنیں ہدیہ داد
ہمیں آتش آنگاہ قبلہ نہاد
یکی جشن کرد آنشب و بادہ خرد
سدہ نام آن جشن فرخندہ کرد

(شاہنامہ ثعالبی، ترجمہ محمود ہدایت، ص۔4)

اُن کے ان عظیم الشان کارناموں اور ملکی تعمیر و ترقی کی وجہ سے اُن کی قوم نے انہیں پیشدادی کا لقب دیا۔ یہ خاندان انہی کے لقب پیشدادی کی وجہ سے تاریخ میں مشہور ہوئی۔

ہوشنگ کے بعد طہمورث حاکم بنا۔ ان کے دور میں زراعت نے خوب ترقی کی اور سواری کے لیے گھوڑوں کو سدھایا گیا۔ کھیتی باڑی کے لیے بھی جانوروں کی تربیت کی جانے لگی۔ اس نے دیووں کو قید کی اور اس شرط پر انہیں رہا کیا کہ وہ انسانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں گے۔

طہمورث کے بعد اس خاندان کا اہم ترین حکمران جمشید برسرِ اقتدار آیا۔ ایران کی قبل از مید دور حکومت کی تمام تر عظمت پیشدادی حکمران جمشید سے وابستہ ہے۔ جمشید وہ حکمران گذرے ہیں کہ جن کا نام آج بھی فارسی اور اردو زبان و ادب میں زندہ ہے اور ان زبانوں کے جاننے والے جمشید، جامِ جمشید اور تخت جمشید سے بخوبی واقف ہیں (بدخشانی1967: 35)۔ شاہنامہ ثعالبی کے مطابق یہ وہ حکمران تھا جنہوں نے پہاڑوں کو کاٹ کر چونا بنوایا اور ان سے

محلات اور مکانات تعمیر کروائے۔ ایران کے بعض مقامات پر دریافت ہونے والی قدیم عظیم الشان تعمیرات کے بارے میں یہی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دراصل جمشید کی یادگاریں ہیں جنہوں نے دیووں کو مطیع و فرمانبردار بنا کر یہ محلات تعمیر کروائے۔ جس طرح سامی اقوام حضرت سلیمانؑ کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے دیوں اور جنات پر حاکمیت کی اور انہیں مطیع و فرمانبردار بنا کر ان سے بڑے بڑے تعمیراتی و دیگر کام کروائے اس کے بالعکس ایرانی آرین اس بات کے دعویدار ہیں کہ جمشید نے بھی اسی طرح ان مخلوقات کو مسخر کیا اور ان سے تعمیراتی اور دیگر کام کروائے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اہلِ قلم ان دونوں شخصیات کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ ثعالبی اور فردوسی دونوں اس بات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ جمشید نے بڑے بڑے کام کیے اور ملک کی دفاع، ترقی اور توسیع کے لیے ایسے کارنامے سرانجام دیے جو آج تک کسی حکمران نے سرانجام نہیں دیے تھے۔ انہوں نے انسانوں ہی نہیں بلکہ جنات، دیو، پری، چرند اور پرند حتیٰ کہ تمام مخلوقات پر حکومت کی۔ انہوں نے البرز سے بابل تک کا سفر دیووں کی مدد سے ایک دن میں طے کیا۔ تاریخ طبری کے مطابق ان کے دور میں ریشم کی دریافت ہوئی، لوگوں کی درجات اور طبقات بنے اور پہلا درجہ علماء اور دانشوروں کا تھا، حتیٰ کہ ان کا دور ایران ہی کا نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ کا زرین دور تھا۔ طبری کے مطابق انہوں نے سات سو سال کے طویل عرصے تک حکومت کی (بدخشانی 1967:37)۔ لہٰذا طویل عمری اور دنیا میں اعلیٰ نام پانے کی وجہ سے ان کا غرور حد درجہ بڑھ گیا اور انہوں نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ جس کی وجہ سے اس کی سلطنت پر حملہ ہوا اور پیوارسپ (ضحاک) نامی ایک اور ظالم بادشاہ نے اسے پکڑ کر آرے سے چیر لیا اور اس کی حکومت کا خاتمہ کیا۔

پیوراسپ بھی دراصل اسی خاندان سے تھا اور کیومرث کے بیٹے سیامک کی اولاد سے تھا۔ جبکہ ان کے مظالم اور جمشید کو قتل کرنے کی وجہ سے ایرانی اس سے نفرت کرتے تھے۔ لہٰذا اس نفرت کی بناء پر اس کو کیومرث کی اولاد تسلیم نہیں کرتے بلکہ نفرت کی بناء پر اسے یمن کے عربوں سے متعلق تحریر کرتے ہیں۔ فردوسی اور ثعالبی دونوں علماء ادب و تاریخ اسے عرب تحریر کرتے ہیں جبکہ بعض مورخین اسے حامی النسل افریقی خیال کرتے ہیں (بدخشانی 1967:39)۔ اس ظالم بادشاہ کے بارے میں لاتعداد کہانیاں اور افسانے مشہور ہیں جیسا کہ دورِ قدیم کے حکمرانوں کے بارے میں مافوق الفطرت اور محیر العقول کہانیاں مشہور ہوتی ہیں اسی طرح اس ظالم بادشاہ کے بارے میں کئی اساطیری اور دیومالائی داستانیں مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس بادشاہ کے دونوں کندھوں پر شیطان نے بوسہ دیا تھا جس کی وجہ سے وہاں دو سانپ ابھر آئے تھے۔ اس سے ضحاک کو کندھوں میں سخت تکلیف ہوتی تھی اور وہ قریب المرگ ہو جاتا تھا۔ طبری سمیت تمام علماء تاریخ لکھتے ہیں حکمأ کے کہنے پر یا تجربہ کرنے پر اس تکلیف کا علاج لہو یا مغز انسانی میں تلاش کیا گیا لہٰذا ضحاک نے حکم دیا کہ اسے روزانہ دو جوان انسانوں کا خون یا مغز پیش کیا جائے تاکہ وہ اس تکلیف سے بچ سکے۔ ایرانی روایات کے مطابق ضحاک نے ایک ہزار سال سے بھی زیادہ طویل عمر پائی لہٰذا اُس نے لاکھوں لوگوں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا اور لوگوں پر مظالم کی انتہا کر دی۔ جب اس نے اصفہان کے ایک آہن گر "کاوہ" کے دو بیٹوں کو بھی اپنے ظلم کا نشانہ بنایا تو "کاوہ" نے اُس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور بکھرے ہوئے عوام کو یکجا کر کے اُن کی مدد سے شہر شہر صوبہ صوبہ فتح کرتا ہوا بالآخر میدان جنگ میں ضحاک کو اپنی درانتی سے قتل کیا اور ملکی عوام کو اس کے ظلم و جبر سے نجات دلا دی۔

”کاوہ“ دراصل لوری قبائل سے تعلق رکھتا تھا اور وہ بنیادی طور پر لورستان کا باشندہ تھا اور پیشے کے لحاظ سے آہن گر یعنی (Blacksmith) تھا۔ اُس نے اپنی دھونکنی کو جنگی علم بنایا اور نچلے طبقے کو اپنی جوشیلی تقریروں سے اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب ہوا۔ اس نے زراعت پیشہ لوگوں کے اوزار یعنی درانتی کو اپنا ہتھیار بنا کر زراعت پیشہ نچلے اور متوسط طبقے کو اپنے ساتھ ملایا۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ دنیا کی پہلی طبقاتی بغاوت تھی کہ جب عوام نے اپنے حقوق کی خاطر حکمرانوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ اکثر کہا جاتا ہے بلکہ مغربی مورخین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ روم میں سپارٹیکس کی قیادت میں ہونے والی غلاموں کی بغاوت دنیا کی پہلی طبقاتی بغاوت تھی جبکہ ”کاوہ“ کی بغاوت غلاموں کی بغاوت سے سینکڑوں سال پہلے وقوع پذیر ہوئی تھی۔ لہٰذا بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ کاوہ کی بغاوت دنیا کی پہلی عوامی اور نچلے طبقات کے ظالم حکمرانوں اور اُن کے ناجائز اقدامات کے خلاف پہلی منظم اور کامیاب بغاوت تھی جس نے انقلاب کی شکل اختیار کی۔ اس انقلاب کے نتیجے میں ظالم بادشاہ ضحاک قتل ہوا، بغاوت کامیاب ہوئی اور ضحاک کے مظالم کا خاتمہ ہوا۔ بعد ازاں کاوہ نے کیومرث کی نسل سے ایک گمنام شخص فریدوں کا کھوج لگایا اور اسے تلاش کر کے بادشاہ بنایا اور خود سپہ سالار کے عہدے پر فائز رہا۔ ایرانی روایات کے مطابق کاوہ آہن گر دس سال تک ایران کا سپہ سالار رہا اور اس دوران کئی ممالک فتح کر کے انہیں پیشدادی سلطنت کے تابع فرمان بنایا۔

فریدوں بھی جمشید کی طرح ایک کامیاب حکمران بن کر ابھرا اور ہفت اقلیم کا حکمران بن گیا۔ فریدوں کے تین بیٹے تور، سلم اور ایرج تھے۔ جب وہ جوان ہوئے اور فریدوں بڑھاپے میں داخل ہوا تو اس خیال سے مبادا اس کے بیٹے اس کے مرنے کے بعد تاج و تخت کی خاطر کسی خانہ جنگی میں نہ پڑ جائیں، اُس نے اپنی تمام سلطنت کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔ فریدوں کو

ایرج سے بہت محبت تھی۔ تور اور سلم کو مشرق اور مغرب کی حکومتیں دے کر انہیں اُن کی سلطنتوں کی جانب روانہ کیا جبکہ ایرج کو اپنے پاس رکھا اور ملکی خزائن کی کنجیاں اُس کے حوالے کیے۔ تور اور سلم اپنے والد کی جانب سے کی گئی اس تقسیم سے مطمئن نہ تھے لہٰذا انہوں نے اپنے والد اور بھائی کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس سے فریدوں سخت برافروختہ ہوا اور ایرج کو ان کے مقابلے پر جانے کا حکم دیا۔ ایرج نے والد کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم بھائیوں کے آپس میں لڑنے سے ملک میں انتشار پھیلے گا اور ہماری حاکمیت کا خاتمہ ہو جائے گا لہٰذا اجازت دے کہ میں اپنے بھائیوں کو سمجھا سکوں اور انہیں لڑنے سے باز رکھ سکوں۔ باپ کے منع کرنے کے باوجود ایرج اپنے بھائیوں تور اور سلم کے کیمپ میں پہنچا جہاں ان دونوں بھائیوں نے اس کا سر کاٹ کر فریدوں کو بھیجا۔ اس واقعہ سے پورے ملک میں کہرام مچ گیا اور صفِ ماتم بچھ گئی۔ فریدوں اپنے بیٹوں سے انتقام لینے کی دعائیں کرنے لگا۔ اس دوران ایرج کی ملکہ ماہ آفرید نے ایرج کے بیٹے منوچہر کو جنم دیا جس پر پورے ملک میں خوشیاں منائی گئیں اور جشن منایا گیا۔ فریدوں نے انتہائی قابل ترین اتالیق مقرر کیے جو ننھے شہزادے کی تربیت کرتے تھے۔ فریدوں نے بھی اپنے پوتے کو چچاؤں سے انتقام لینے کے لیے تیار کیا۔ فریدوں نے منوچہر کو اپنا ولی عہد اور جانشین مقرر کیا۔ اس نے منوچہر کے لیے ایک بڑی فوج تیار کی اور کاوہ آہن گر لوری کے بیٹے قارن کو اس فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ آذربائیجان کے قریب تور اور سلم کی افواج کا قارن اور منوچہر کی افواج سے آمنا سامنا ہوا۔ ایک طویل اور خونریز جنگ کے بعد منوچہر نے تور اور سلم کو گرفتار کر کے اُن کے سر قلم کر دیے اور انہیں اپنے دادا فریدوں کے پاس بھیجا اور اس طرح اپنے دادا کی ہفت اقلیم سلطنت کو دوبارہ حاصل کیا۔ مگر یہ خانہ جنگی رُک نہیں سکی۔ چنانچہ تور کے خاندان کے ایک شخص افراسیاب نے اُٹھ کر منوچہر کی سلطنت پر حملہ کیا۔ اُس وقت تک منوچہر انتقال کر چکا تھا اور

اس کا بیٹا نوذر حاکم تھا۔ افراسیاب کی سلطنت ترکستان کہلاتی تھی تاریخ میں اُسے توران کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس کی فوج ترک جنگجوؤں پر مشتمل تھی جنہوں نے پیشدادی سورماؤں کو شکست فاش دی اور نوذر کو اپنے شرائط ماننے پر مجبور کیا۔ لہٰذا دریائے جیحوں کو توران اور ایران کے مابین سرحد تسلیم کیا گیا۔ مگر نوذر کی وفات کے بعد افراسیاب نے ایران پر قبضہ کر کے اس کی ساری دولت ترکستان منتقل کی اور ایرانیوں پر ظلم و جبر کے پہاڑ گرائے۔ افراسیاب کے ان مظالم سے اہل ایران کو نجات دلانے کے لیے اہل سیستان نے قدم آگے بڑھائے اور زال پہلوان پسر رُستمِ پہلوان کی سربراہی میں لشکروں نے تورانیوں سے جنگ کی مگر اس جنگ کا کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ ان حالات میں زال سیستانی نے یہ تجویز پیش کی کہ اہل ایران شاہی خاندان کے کسی فرد کو اپنا بادشاہ بنائیں تاکہ ایک بادشاہ کی سرپرستی میں سلطنت اور ملک کے حصول کے لیے جنگ لڑی جائے۔ اس سے عوام کی بددلی ختم ہو جائے گی اور وہ اپنے دشمن سے لڑنے کے لیے زیادہ بہادری اور گرم جوشی کا مظاہرہ کریں گے۔ لہٰذا اہل ایران نے زال کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے شاہی خاندان کے ایک نوجوان زُو بن طہماسپ کو بادشاہ بنا کر اس کی تاج پوشی کی اور اس کے ہاتھوں وفاداری کا حلف اُٹھایا تو اہل ایران میں ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا ہوا۔ انہوں نے پوری قوت کے ساتھ زُو بن طہماسپ کا ساتھ دیا اور افراسیاب سے ایک خونریز جنگ لڑی۔ اس جنگ کے نتیجے میں افراسیاب اور اُس کے تورانی لشکر کو شکست ہوئی۔ اور یوں ایران کو اس کے تسلط سے آزادی ملی۔ زُو بن طہماسپ پیشدادی خاندان کا آخری حکمران تھا کیونکہ اُس کے جانشینوں کو نااہل دیکھ کر اہل ایران نے اس ڈر سے اُن میں سے کسی کو بھی حاکم نہیں بنایا کہ مبادا ان کی نااہلیت سے تورانی دوبارہ اہل ایران پر قابض نہ ہو جائیں۔ لہٰذا اہل ایران نے متفقہ طور پر قوم ماد (مید) کے سردار اور ایران کے قابل ترین سیاستدان قباد کو اپنا نیا بادشاہ بنایا اور اس کے ہاتھوں حلفِ

وفاداری لیا۔ اس طرح قدیم پیشدادی خاندان طویل عرصے تک ایران پر حاکمیت کرنے کے بعد بالآخر زوال پذیر ہوا۔ یونانی ذرائع ضحاک کو ہی آخری پیش دادی حکمران لکھتے ہیں جس کے بعد قباد نے مید خاندان کی حاکمیت کی بنیاد رکھی۔

ایران کا یہ قدیم خاندان پیشدادی کون تھا؟ اس خاندان کی اصلیت کیا تھی؟ یہ مقامی قبیلہ تھا یا باہر سے آکر ایرانی خطے میں وارد ہونے والے لوگ تھے؟ ان کی حکومت کا آغاز کب ہوا؟ اور ان کے اقتدار کا خاتمہ کب ہوا؟ یہ وہ سوالات ہیں کہ جن کے بارے میں تاریخی کتب خاموش ہیں اور اگر ان میں سے کسی سوال کا جواب اگر کسی نے دیا بھی ہے تو وہ محض قیاسات اور مفروضات پر مبنی ہے۔

ایرانی مورخین اور دانشور اس خاندان کو آریا قرار دیتے ہیں اور کیومرث کو ایرانیوں کا جد اعلیٰ تحریر کرتے ہیں۔ اس حوالے سے کسی ایک مورخ کا حوالہ نہیں دیا جاسکتا کیونکہ تقریباً تمام قوم پرست ایرانی مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ کیومرث اہل ایران ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کے جدِ اعلی تھے کہ جن کی اولادوں نے زمین پر پھیل کر مختلف اقوام اور خطوں کی بنیاد رکھی۔ بیہقی، ثعالبی، فردوسی، طبری، بہار حتیٰ کہ اس نظریے کے حامی ایرانی مورخین کی ایک لمبی اور طویل فہرست ہے۔ اسی طرح اس خاندان کے کئی حکمرانوں کو سامی پیغمبروں سے مماثلت دی گئی ہے یعنی کیومرث کو حضرت آدمؑ کہا گیا ہے، جمشید، ہوشنگ اور فریدوں کو بھی مختلف پیغمبروں سے تشبیہہ دیا گیا ہے۔ جبکہ ضحاک کو اس کے ظلم، جبر، عوام پر ناجائز مظالم ڈھانے اور مکروہ کردار کی وجہ سے ایرانی مورخین نے سامی عرب قرار دیا ہے۔ اسی طرح ان بادشاؤں سے ایسی ایسی مافوق الفطرت اور محیر العقول واقعات اور داستانیں منسوب کی گئی ہیں جنہیں عقلِ انسانی تسلیم کرنے سے قاصر نظر آتا ہے۔ جیسا کہ دیووں اور جنات سے لڑائیاں،

رستم سے منسوب انتہائی مبالغہ آمیز واقعات، ضحاک کے کندھوں پر لہرانے والے مارِ سیاہ، حکمرانوں کی طویل العمری اور سینکڑوں سالوں تک حاکمیت کرنا وغیرہ۔

اسی طرح ہوشنگ سے یہ کارنامہ منسوب کیا گیا کہ انہوں نے انسانوں کو غاروں سے نکال کر زمین پر رہنا، مکان بنانا، آگ کا استعمال اور مہذب زندگی گزارنے کا ہنر سکھایا۔ حالانکہ بلوچستان کے کئی علاقوں بالخصوص ضلع کچھی کے مقام مہر گڑھ سے پیشدادی خاندان سے بھی کئی ہزار سال پہلے کے آثار برآمد ہوئے ہیں کہ جن کے مطالعہ سے یہ بات شنید میں آتی ہے کہ انسانوں نے ہوشنگ اور اس کے خاندان کے برسرِ اقتدار آنے سے بھی ہزاروں سال قبل زمین پر آباد ہونا، مکان بنانا، برتن سازی اور آگ کے استعمال کے ساتھ ساتھ ثقافتی اور تہذیبی زندگی کی بنیاد ڈالی تھی (ماخوذ از شاہنامہ فردوسی۔ مسکو نسخہ)۔

قارئین کرام یہ بات ذہن نشین رہے کہ ایرانی مورخ نے ایران کے ہر حکمران خاندان کو آرین قرار دیا ہے چاہے وہ ایران میں دوسری ہزارویں قبل مسیح کے دوران داخل ہونے والے شمالی حملہ آور ہوں یا مقامی حکمران قبائل۔ یہ سب ایرانی مورخین کی نظر میں آریائی یعنی مہذب اور اعلیٰ درجہ کے لوگ تھے جبکہ باقی ماندہ لوگوں اور اقوام کا درجہ ان خاندانوں سے کم تھا۔ ممکن ہے ایرانی مورخ لفظ آریا کو طبقاتی درجہ بندی کے لیے استعمال کرتا ہو اور قدیم آرین حملہ آوروں نے بھی یہ لفظ اسی مقصد کے لیے استعمال کیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایرانی مورخ نے نسلی تعصب کی بناء پر نہ صرف لفظ آریا کو برتر اور اعلیٰ کے معنوں میں استعمال کیا بلکہ انہوں نے ایران کے ہر حکمران خاندان کو آرین قرار دیا۔ ایرانی مورخین کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ تحقیق سے زیادہ قیاسات بیان کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ مورخین نیکی و پاسداری، عدل و انصاف، بہادری و شہہ زوری، حاکمیت و سیاست، عقل و دانش، علم و ہنر اور شعور و آگہی کو ایرانی

اقوام اور حکمرانوں کے کھاتے میں ڈالتے ہیں جبکہ اس کے برعکس اقدامات کو وہ دوسری اقوام کے لیے مخصوص کرتے ہیں اور اگر کسی ایرانی حکمران میں کوئی نقص اور کمی نظر آتی ہے تو وہ اُسے ایرانی تسلیم ہی نہیں کرتے۔ یہی معاملہ ضحاک کے ساتھ ہوا۔ جب اُس نے جمشید کے مظالم کا خاتمہ کیا اور اہل ایران کو خدائی کے اس دعویدار سے نجات دلایا تو اہل ایران نہال ہو گئے۔ مگر جب ضحاک قہرِالٰہی بن کر اپنی قوم پر ٹوٹ پڑا اور ناجائز ٹیکسوں اور سیاسی پابندیوں کی وجہ سے عوام کا جینا دوبھر ہوا تو اُس کے یہ اقدامات ایرانی مورخ کے لیے ناقابلِ قبول تھے لہٰذا اُسے آریا کی بجائے سامی قرار دیا گیا۔ جبکہ ضحاک کی اصل حقیقت یہ تھی کہ وہ ایرانی تھا اور سیامک کی نسل سے تھا۔ مگر جب اُس نے ایرانیوں کے خلاف محاذ آرائی کی اور اس نے ایرانیوں پر ظلم و جبر کے پہاڑ توڑے اور ٹیکسوں کی بھرمار کر دی تو وہ ایرانی مورخین کی نظروں میں سامی النسل ٹھہرا۔

اسی طرح ایک اعتراض یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ آریائی قبائل تو سولہویں صدی عیسوی کے بعد ایرانی خطے میں داخل ہوئے جبکہ پیشدادی خاندان کی حاکمیت اُن کی آمد سے صدیوں پیشتر قائم ہوئی تھی تو پھر آریاؤں کی آمد سے قبل کے باشندے کیسے آرین ہو گئے۔ علاوہ ازیں کیومرث تو کوہِ البرز کا باشندہ تھا جسے آرین اپنا جدِ اعلیٰ کہتے تھے جبکہ آرین خود ایران میں نوارد تھے اور روس کی جانب سے اس طرف آئے تھے۔ پھر وہ کیسے کیومرث کی اولاد ہو سکتے تھے؟

اس طرح کے لاتعداد تضادات ایرانی مورخین کی تحریروں میں ملتے ہیں جن کے مطالعہ سے ان متعلقہ مورخین کی جانبداری اور تعصب واضح ہوتی ہے۔

لہٰذا اس سلسلے میں غیر جانبداری اور وسیع النظری کے ساتھ نئے سرے سے تحقیق کی ضرورت ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ پیشدادی کون لوگ تھے اور ان کی حاکمیت کب اس خطے پر قائم ہوئی تھی؟

فارسی مورخین کے برعکس یونانی مورخین اندازاً ان قبائل کی تاریخ طے کرتے ہیں مگر وہ بھی انہیں آرین قرار دیتے ہیں۔ یونانی مورخین کے بیانات کے مطابق چار ہزار سال قبل مسیح کے دوران شمالی خطوں سے انسانوں کی بڑی مہاجرت ہوئی۔ یہ مہاجر لوگ تاریخ میں آرین کے نام سے موسوم ہوئے۔ یہ لاتعداد قبائل پہلے پہل پامیر سے چل کر بلخ و بخارا اور سمرقند کے علاقوں میں اقامت پذیر ہوئے۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے وہاں سے بھی مہاجرت کی اور ایران کے مختلف علاقوں میں آباد ہوتے گئے۔ وہ مید قبائل کے خطے مادستان یعنی شمالی اور شمال مغربی ایران سمیت جنوب میں فارس اور سمندر تک پہنچ گئے۔ وہ کرُدستان کے پہاڑوں کو عبور کر کے مادستان میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے مشرقی ایران کی جانب بھی اپنی مہاجرت جاری رکھی مگر ایرانی ریگستانوں تک اُن کے پہنچنے کے شواہد نہیں ملتے البتہ سائرس اعظم وہ پہلا آرین حکمران تھا کہ جس نے 545-540 قبل مسیح کے دوران مکران کے راستے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی مگران کا یہ حملہ ناکام رہا (آزاد 2012:52)۔ یونانی مورخین کے مطابق مادستان کے باشندوں نے دیوکسس نامی ایک طاقتور قبائلی سردار کو اپنا بادشاہ بنا کر عراقی آسوریوں کے آئے روز کے حملوں اور خراج کی ادائیگی سے نجات حاصل کی۔ یونانی مورخین اس زمانے کو ساتویں صدی قبل مسیح کا دور تحریر کرتے ہیں اور دیوکسس کی وفات کا سال 655 قبل مسیح بیان کرتے ہیں۔ یہی تاریخ ایرانی فارسی مورخین بھی تحریر کرتے ہیں۔ جبکہ پیشدادی خاندان کے بارے میں یونانی تحریریں بھی خاموش ہیں۔

یونانی تحریریں ایران کی تاریخ کا آغاز دراصل میدوں کی حاکمیت سے کرتے ہیں اور دیوکسس یعنی قیقباد (کیقباد) کو ایرانی سرزمین کا پہلا حکمران تحریر کرتے ہیں۔ جبکہ ایرانی فارسی تحریریں ایران کی قدیم تاریخ کو پیشدادی خاندان کی بادشاہت سے شروع کرتے ہیں۔ ان کے

عقیدے کے مطابق دراصل اسی خاندان نے انسانوں کو غاروں سے نکال کر زمین پر آباد ہونا سکھایا اور تہذیب و تمدن سے روشناس کروایا۔ المختصر یہ کہ ایرانی مورخین انسانوں کو تہذیب سے آشنا کرنے کا اعزاز پیشدادی خاندان کو عطا کرتے ہیں۔ ایرانیوں نے پیشدادی خاندان کی حاکمیت کے لیے جو زمانہ اندازاً بیان کیا ہے اور جو واقعات رقم کی ہیں ان کی تحریروں کی روشنی میں یہ زمانہ لگ بھگ 2000 قبل مسیح سے لے کر 2300 قبل مسیح تک کا ہوگا۔ قیاس کہتا ہے کہ اس خاندان نے کسی اور طاقتور خاندان کی حاکمیت ختم کرکے اقتدار پر قبضہ کیا ہوگا اور یقیناً یہ وہ زمانہ تھا جب میسوپوٹیمیا یعنی دجلہ و فرات اور مشرق وسطیٰ کی سرزمین پر اکادیوں اور آسوریوں کو عروج حاصل ہو رہا تھا۔ آسوری اور اکادی اقوام آئے روز زاگروس کے دروں کے راستے کردستان، مادستان اور البرز پر حملہ آور ہوتے اور خوب لوٹ مار کرتے۔ اُن کے ان حملوں سے بچنے اور اپنے دفاع کی خاطر ان مقامی پہاڑی باشندوں نے اپنے آپ کو منظم کیا۔ یہ چونکہ پہاڑی لوگ تھے اور جسمانی طور پر بڑے مضبوط تھے لہٰذا گرم اور میدانی علاقے کے سست اور کاہل الوجود لوگ انہیں دیووں سے تشبیہہ دیتے تھے۔ یقیناً ان قبائل کو منظم ہونے کے لیے بھی کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ آپس کی خانہ جنگیوں اور اختلافات کے بعد کہیں جا کر پیشدادی خاندان کی حاکمیت کو ان منہ زور اور سرکش پہاڑی قبائل کے سرداروں نے تسلیم کیا ہوگا۔ مورخین کے بیان کردہ حالات و واقعات کی منظر کشی بھی یہی کہتی ہے کہ کیومرث کو اس جدوجہد میں اپنے بیٹے سیامک کی بھی قربانی دینی پڑی جسے کیومرث کے مخالفین نے قتل کیا۔ ان قاتلوں کو ایرانی مورخین نے دیو تحریر کیا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں ہو کہ دیو کو شکست دینے کے لیے بھی کسی دیو کی ضرورت ہوتی ہے اور ان دیووں کو کیومرث نے شکست دی تھی۔ یقیناً اُن طاقتور لوگوں کے مقابلے میں کیومرث اور اس کا خاندان زیادہ طاقتور تھا۔ ایسا ممکن نہیں کہ یہ لوگ صرف جسمانی لحاظ سے شہہ

زور اور طاقتور تھے بلکہ ان کی قبائلی افرادی قوت اور اسلحہ جنگ بھی مخالفین سے زیادہ ہو گی جن کی وجہ سے وہ اپنے طاقتور مخالفین پر غالب آگئے ہوں گے۔ پیشدادیوں سے قبل اس خطہ پر کن لوگوں کی حکومت تھی یہ تو واضح نہیں ہے البتہ تاریخی ذرائع یہ معلومات ضرور فراہم کرتے ہیں کہ پیشدادیوں نے کوہِ دماوند یعنی البرز کے پہاڑی سلسلوں میں خود کو منظم کیا اور یہاں کے دیووں یعنی طاقتور لوگوں کو شکست دے کر اپنے اقتدار کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ بیان اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ پیشدادی خاندان کا تعلق البُرز کے پہاڑی علاقوں سے تھا اور اُن سے قبل بھی اسی پہاڑی سلسلے میں آباد کسی قبیلے کی حکومت اس خطے پر قائم تھی۔ چونکہ یہ دور تاریخ سے قبل کا دور ہے لہٰذا اس دور کے بارے میں مستند تحریری مواد کہیں پر بھی دستیاب نہیں ہے۔ اس کے متعلق جتنے بھی بیانات ہوں گے وہ قیاسات اور مفروضات پر مبنی ہوں گے۔ یہ چونکہ پہلے پہل فارسی ادب کے ذریعے مشتہر ہونے والے بیانات ہیں لہٰذا ان میں ایرانی مورخ کی افسانوی اور دیومالائی طرز تحریر پورے مبالغہ کے ساتھ شامل ہو گی۔ پیشدادیوں کے بارے میں بھی ایرانی مورخ نہایت مبالغہ آمیزی کے ساتھ بیانات تحریر کرتا ہے اور مکمل افسانوی انداز میں تاریخی واقعات کو بیان کرتا ہے۔ ایرانی عام طور پر کوہِ البُرز (دماوند)، کوہِ قفقاز (کوہِ قاف) اور کوہ زاگروس (کردستان) کے بارے میں یہ نظریہ رکھتے تھے کہ وہاں دیو اور پریاں رہتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پیشدادی اور اُن سے قبل کے دیو نما لوگ کون تھے کہ جو البُرز کے پہاڑوں میں رہتے تھے؟

ایرانی تحریری ذرائع کے علاوہ یونانی اور اردو ادب کی پرانی تحقیقی کتب میں اس بات کے تذکرے عام ملتے ہیں کہ مذکورہ بالا پہاڑی سلسلوں کے قبائل تاریخ میں کُرد کے نام سے جانے جاتے تھے۔ شاہنامہ فردوسی میں بھی کوہِ البرز کے باشندوں کو کوچ و بلوچ تحریر کیا گیا ہے۔ فارسی

اور عربی کتب میں کوچ اور کُرد کے الفاظ عام طور پر ایک ہی طائفے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ جیسا کہ شاہنامہ میں البرُز کے ایک واقعہ کے بارے میں ابوالقاسم فردوسی لکھتا ہے:

براہ اندر آگاہی آمد بشاہ
کہ گشت ازبلوچی جھانی تباہ
زبس کشتن وغارت وتاختن
زمین راآب اندراناختن
زگیلان تباہی فزونست ازین
زنفرین پراگندہ شد آفرین
دل شاہ نوشین روان شدغمی
برآمیحنت اندوہ باخرمی
بایرانیان گفت الانان وہند
شدازبیم شمشیرماچون پرند
بسندہ نباشیم باشہرخویش
ہمی شیرجوییم پیچان زمیش
بدوگفت گویندہ کای شہریار
بپالیزگل نیست بی زخم خار
ھمان مرزتابودبارنج بود
زبھرپراگندن گنج بود
زکار بلوچ ارجمنداردشیر
بکوشید باکار دانان پیر
نبدسودمندی بافسون ورنگ
نہ ازبندوزرنج و پیکار و جنگ

اگر چندبداین سخن ناگزیر
بپوشید بر خویشتن اردشیر
زگفتاردہقان برآشفت شاہ
بسوی بلوچ اندر آمدزراہ
چوآمدبندیک آن مرزوکوہ
ایک نسخہ میں لکھا ہے کہ
چوآمدبندیک آن برزکوہ
بگردیدگرد اندرش باگروہ
برآنگوہ نگرداندر آمدسپاہ
کہ بستندزانبوہ بربادراہ
ہمہ دامن کوہ تاروی شخ
سپہ بودبرسان موروملخ
منادیگری گرد لشکر بگشت
خروش آمدازغاروزکوہ ودشت
کہ ازکوچکہ ہرک یابیدخرد
وگرتیغ دارندمردان گرد
وگر انجمن باشدازاندکی
نبایدکہ یابدرہایی یکی
چو آگاہ شد لشکرازخشم شاہ
سوار و پیادہ ببستندراہ
ازایشان فراوان واندک نماند
زن و مردجنگی وکودک نماند

سراسر بشمشیر بگذاشتند
ستم کردن ورنج برداشتند
ببودایمن ازرنج شاه جهان
بلوچی نماند آشکارونهان
چنان بدکه برکوه ایشان گله
بدی بی نگهبان وکرده یله
شبان هم نبودی پس گوسفند
بهامون وبرتیغ کوه بلند
همه رختها خوار بگذاشتند
دروکوه راخانه پنداشتند
وزآن جایگه سوی گیلان کشید
چورنج آمدازگیل وديلم پدید
زدریاسپاه بودتاتیغ کوه
هواپردرفش و زمین پرگروه
پراگنده برگردگیلان سپاه
بشد روشنايي زخورشیدوماه
چنین گفت کایدرزخردوبزرگ
نبایدکه ماندیکی میش وگرگ
چنان شدزکشته همه کوه ودشت
که خون درهمه روی کشوربگشت
زبس کشتن وغارت وسوختن
خروش آمدونالهٔ مردوزن

زکشتہ بھر سویکی تودہ بود
گیاھا بمغز سرآلودہ بود
زگیلان ہرآنکس کہ جنگی بدند
ہشیوار وبارای وسنگی بدند
ببستند یکسرہمہ دست خویش
زنان ازپس وکودک خرد پیش
خروشان بر شہر یار آمدند
دریدہ برو خاکسار آمدند
شدند اندران بارگاہ انجمن
ہمہ دستھابستہ وخستہ تن
کہ ماباز گشتیم زین بدکنش
مگرشاہ گردد زما خوش منش
اگرشاہ رادل زگیلان بخست
ببریم سرھاز تنھا بدست
دل شاہ خوشنود گردد مگر
چوبیند بریدہ یکی تودہ سر
چوچندان خروش آمد ازبارگاہ
وزان گونہ آواز بشنید شاہ
برایشان ببخشود شاہ جھان
گذشتہ شداندردل اونھان

(فردوسی،شاہنامہ۔مسکوروس:435-36)

ان اشعار میں فردوسی اعلانیہ طور پر کوہِ البُرز کے باشندوں کو بلوچ اور کوچ تحریر کر رہا ہے اور انہیں چھٹی صدی عیسوی میں ایران کے عظیم ساسانی حکمران نوشیروان کے خلاف نبرد آزما دکھا رہا ہے۔ اس بیان سے ہی ثابت ہوتا ہے کہ البُرز کے قدیم باشندے بلوچ تھے۔ جنہیں مورخین کُرد بھی تحریر کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ابنِ خلدون نے بھی اپنی تاریخ میں البُرز کے کئی قبائل کا تذکرہ کیا ہے جنہیں وہ کُرد تحریر کرتا ہے۔ وہ ان قبائل کی طویل حکومتوں اور سیاسی کردار کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب کے مختلف ابواب میں دھبانی کُرد، البرزیکانی کرد، میروانی کُرد، الباریزی کُرد اور حسنوی کُرد قبائل کے تفصیلی تذکرے کیے ہیں اور ان کے سیاسی کردار کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق یہ قبائل البُرز کے دامنوں میں اور اس کے پہلو کے شہروں میں آباد تھے اور مضبوط مالی افرادی قوت رکھتے تھے۔ ابنِ خلدون کے علاوہ دیگر عرب اور فارسی مورخین بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ البُرز اور زاگروس کے باشندے کُرد تھے جبکہ پروفیسر مرزا مقبول بیگ بدخشانی پہاڑی باشندوں اور بیابانوں میں رہنے والے لوگوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ کُرد تھے (بدخشانی 1967: 40) دھبانی (دابانی) قبیلہ کا تذکرہ ہیروڈوٹس نے بھی کیا ہے۔ اُن کے مطابق یہ پہاڑی قبیلہ تھا۔ اسی قبیلہ کا تذکرہ عرب عہد میں ابنِ خلدون نے بھی کیا ہے (خلدون 2009: 489)۔

ان کے علاوہ بھی کئی تاریخی کتب میں ایران کے شمالی اور مغربی پہاڑوں اور مشرقی ریگستانوں کے باشندوں کے بارے میں یہی تحریریں ملتی ہیں کہ وہ کوچ، بلوچ اور کُرد تھے بعض اوقات ان قبائل کے لیے صرف لفظ بلوچ بھی تحریر کیا گیا ہے جبکہ انہیں کوچ و بلوچ بھی لکھا گیا ہے اور بعض مورخین انہیں کُرد بھی تحریر کرتے ہیں۔ جیسا کہ المقدسی کرمان کے قریبی پہاڑ کوہِ قفص کے باشندوں کو قفصی (کوچ) اور کُرد دونوں ناموں سے تحریر کرتا ہے جن کا بیان گذشتہ

اوراق میں آ چکا ہے۔ ان مستند حوالوں کے بعد اس بات کا دعویٰ کرنا یقیناً غلط نہ ہو گا کہ ایرانی فارسی باشندے پہاڑی باشندوں کو کوچ اور کُرد کا نام دیتے تھے۔ چونکہ پہاڑی باشندے میدانی باشندوں کی نسبت زیادہ مضبوط اور طاقتور ہونے کے ساتھ ساتھ نڈر اور بہادر بھی ہوتے ہیں لہٰذا جب کبھی ان پہاڑی باشندوں کو موقع ملتا وہ ایرانیوں پر حملہ کرتے اور انہیں سخت نقصان پہنچاتے تھے۔ ان کے قلعے پہاڑی علاقوں میں انتہائی دشوار گزار مقامات پر واقع تھے جہاں کسی کا پہنچنا بہت ہی مشکل بلکہ ناممکن ہوتا تھا۔ یہ قبائل سینکڑوں کی تعداد میں ان پُرپیچ اور دشوار گزار پہاڑی گھاٹیوں میں رہتے تھے۔ کُرد قبائل جسمانی لحاظ سے بھی مضبوط اور طاقتور لوگ خیال کیے جاتے تھے۔ لہٰذا ایرانی اقوام ان کی یورشوں اور خوفناک وحشیانہ طریقۂ جنگ سے ہمیشہ خوفزدہ رہتے تھے۔ لہٰذا ایرانی ادیب اور مورخ نے اپنی روایتی افسانوی اندازِ تحریر کے مطابق ان باشندوں کو دیووں اور جنات سے تشبیہہ دی۔

علاوہ ازیں کوہِ البُرز کے دامنوں میں آباد کئی شہر ایسے ہیں کہ جن کے نہ صرف نام بلوچی کے ہیں بلکہ ان ناموں کے قبائل بھی بلوچوں میں پائے جاتے ہیں۔ لفظ مازین مکمل بلوچی نام ہے جس سے علاقہ مازیندران منسوب ہے۔ قبیلہ گیل بھی ایک بلوچ قبیلہ ہے جس کے نام سے علاقہ گیلان منسوب ہیں۔ یاد رہے کہ مازندران، گیلان اور ایلان کے علاقے کوہِ البُرز کے جنوبی دامنوں میں واقع ہیں۔ اس کے علاوہ دورِ حاضرہ میں بھی ان پہاڑی سلسلوں میں کُرد قبائل آباد ہیں جبکہ زاگروس کے پہاڑی سلسلے کو کردستان کا پہاڑی سلسلہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں اب کردوں نے اپنی الگ ریاست کا اعلان بھی کر دیا ہے۔

ان بیانات اور شواہد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایران کے شمالی اور مغربی پہاڑی سلسلوں کے علاوہ کوہِ قفص اور کوہِ الباریزی کے باشندے کُرد کہلاتے تھے جو یہاں کے قدیم ترین باشندے تھے اور آرین حملوں سے بھی قبل یہاں آباد تھے۔ وہ ان پہاڑی علاقوں کے علاوہ تمام

ایران اور اس سے متصل علاقوں پر حاکمیت کرتے تھے۔ اگر یہ مفروضہ درست ہے تو پھر بلاشبہ پیشدادی اور ان سے قبل کے لوگ بھی کُرد تھے جو کوہِ البرُز کے دامنوں کے طاقتور لوگ تھے۔ انہوں نے ایرانی خطے میں پہلی بار ایک منظم اور مستحکم حکومت کی بنیاد رکھی اور میسوپوٹیمیا سمیت شمالی سمت کے حملہ آوروں کے حملوں کا سدِ باب کیا جو آئے روز کردستان کے پہاڑوں کو عبور کرکے ان پر حملہ آور ہوتے تھے۔ میسوپوٹیمیا کے آسوری اور اکادی اقوام زیادہ منظم اور جنگی تجربہ رکھنے کی وجہ سے ان پہاڑی باشندوں کو شدید نقصان پہنچاتے تھے۔ لہٰذا ان حملوں کا سدِباب کرنے اور ان سے نمٹنے کی خاطر یہ پہاڑی کُرد متحد ہوئے اور انہوں نے ایران میں پہلی منظم اور آئینی حکومت کی بنیاد رکھی۔ جسے تاریخ میں پیش دادی کا نام دیا گیا۔

یہ بات ذہن نشین ہو کہ البرُز کے ان حکمرانوں کی حاکمیت کو سیستان کے قبائل نے بہت بڑا سہارا دیا تھا۔ سیستان کی سرزمین کے کئی نامور ہستیاں پیشدادی اور اس کے بعد ایران میں قائم ہونے والی حکومتوں کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ اس کے دست و بازو بھی مانے جاتے تھے۔ شاہنامہ فردوسی سمیت تاریخ کی ان تمام کتب میں، جو اس ملک جسے اب ایران کہا جاتا ہے، کی قدیم تاریخ سے متعلق ہیں، اس بات کے تذکرے ملتے ہیں کہ سیستان نے دراصل ایرانی تہذیب کو سامراج بننے میں بڑی مدد دی تھی اور کئی نامور سیستانیوں نے ایرانی افواج کی قیادت کی پیشدادی، میدی، ہخامنشی اور ساسانی حاکموں کو بامِ عروج پر پہنچایا۔ ان مشاہیر کے تذکروں سے فارسی ادب و تاریخ کے صفحات مزین ہیں۔ ان نامور ہستیوں، جنہوں نے قدیم ایرانی تہذیب کی ترقی و عروج کے لیے بنیادی کردار ادا کیا، میں مشہور زمانہ پہلوان اور افسانوی کردار کے حامل جنگجو رستم بن زال، اُن کے والد زال پہلوان، گودرز، گیو، نیو، اشکش، شیدوش رہام وغیرہ شامل تھے۔ شاہنامہ فردوسی بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ بلوچ لشکر کی کمان امیر اشکش کے ہاتھ میں تھی جیسا کہ وہ لکھتا ہے کہ:

ھمی از پہلی پارس کوچ و بلوچ
یہ پارس کے کوچ و بلوچ سپاہی ہیں

زگیلانِ جنگی و دشتِ سروچ
جو گیلان کے جنگجو اور دشتِ سروچ کے لڑاکے ہیں

پس از گستہم اشکش تیزہوش
گستہم کے بعد ہوشمند اشکش آیا

کہ باراى دل بودو با مغز و ہوش
جو بہت ہی صاحبِ دل و دماغ تھا

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ سیستان کی سرزمین زمانہ قدیم سے ہی بلوچ قبائل کی آماجگاہ رہی ہے اور آج بھی سیستان بلوچوں کا مسکن ہے۔ سیستان کا وہ حصہ جو ایران میں شامل ہے سیستان بلوچستان کے نام سے الگ صوبائی درجہ رکھتا ہے جبکہ جنوبی افغانستان میں سیستان کا جو حصہ ہے وہ بھی بلوچ آبادی والا علاقہ ہے جو دو صوبوں پر مشتمل ہے یعنی صوبہ نیمروز اور صوبہ ہیلمند۔ لہٰذا پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ سیستان کے مذکورہ بالا تمام پہلوان بلوچ تھے جو پیشدادی کُرد، مید بلوچوں، ہخامنشی آریاؤں، آشکانیوں اور کشانیوں کے مددگار تھے۔ اس علاقے کے باشندوں کو ہمیشہ قدیم ایرانی فوج کی سربراہی ملی۔ یہ بھی ذہن نشین ہو کہ ایرانی روایات کے مطابق رُستم کے والد زال پہلوان کی پرورش اور تربیت بھی کوہِ البرُز کے قبائل نے کی تھی (فردوسی: نسخہ مسکو)۔

پیشدادی خاندان کے زوال کا آغاز ضحاک سے شروع ہوا اور بالآخر زُو بن طہماسپ پر جاکر انجام پذیر ہوا۔ ضحاک ایک ظالم اور ناروا حکمران تھا جس نے اپنے عوام پر اتنے ٹیکس لگائے کہ جن کی وجہ سے عام آدمی کا جینا دوبھر ہوا اور لوگ سراپا احتجاج بن گئے۔ ضحاک نے عوام کے حقوق کا خیال کرنے کی بجائے جیلوں کو لوگوں سے بھرنا شروع کیا اور مخالفین کو ختم کرنے لگا۔ اس نے قتل وغارت گری کی انتہا کردی جس کی وجہ سے وہ توہم پرست ایرانی معاشرے میں آدم خور اور جادوگر کے نام سے مشہور ہوا۔ لوگوں نے یہ مشہور کیا کہ اس کے کندھوں پر سانپ ہیں جو روزانہ اُس سے انسانی خون کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لہٰذا ضحاک ان اژدھوں کا پیٹ بھرنے کی

خاطر اپنے مخالفین کو قتل کر رہا ہے اور عوام پر ظلم و جبر کی انتہا کر دی ہے۔ ان حالات میں ضحاک کے مظالم کے خلاف پہلے پہل ہتھیار اٹھانے والا شخص ایک لوری (لوڑی) تھا جس کا پیشہ آہن گری تھا۔ وہ بنیادی طور پر لورستان کا باشندہ تھا جو اصفہان میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ کاوہ آہن گر نے ضحاک کے مظالم کا خاتمہ کیا۔ بعد ازاں جب کاوہ کا انتقال ہوا تو بھی اُس کا خاندان اس عہدے پر فائز رہا اور اس کی دھونکنی سے بنا ہوا جھنڈا ایرانیوں کے لیے اتنا ہی مقدس بن گیا تھا جتنا کہ عیسائیوں کے لیے وہ صلیب جس پر اُن کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کیا گیا تھا۔ لہٰذا ساسانی عہد تک یہ جھنڈا (درفشِ کاویانی) ایرانی حکمرانوں کے پاس رہا۔ کاوہ لوری کے بیٹے قارن نے بھی طویل عرصہ تک پیشدادی کُردوں کے افواج کی قیادت کی۔

اس طویل بیان سے یہ بات شنید میں آئی کہ لوری، کُرد اور سیستانی دراصل قدیم بلوچ قبائل تھے کہ جنھوں نے سیاسی بنیادوں پر سب سے پہلے خود کو منظم کیا اور ایران سمیت ایک وسیع و عریض خطہ زمین پر حاکمیت کی۔ پیشدادی کُردوں کی حاکمیت کا خاتمہ ساتویں صدی قبل مسیح میں ہوا اور خطہ ایران ایک اور بلوچ قبیلہ مید کی زیرِ اثر آیا۔

یہ بات بھی ذہن نشین ہو کہ اُس زمانے میں یہ خطہ ایران نہیں کہلاتا تھا بلکہ کئی ولایتوں میں منقسم تھا جو میڈیا یا مادستان، پساگردیا پارس گرد (آریائی قبیلہ بازارگد کے یہاں آنے بعد یہ علاقہ بازارگد اور ازاں بعد پساگرد کہلایا) کرمانیہ، مکران یا ماکا (اس علاقے کو یونانی گیدروشیا اور یوتیئن بھی کہتے تھے کیونکہ یہاں ہوت قبائل کی حاکمیت قائم تھی جن کی وجہ سے اُن کا علاقہ Utian کہلاتا تھا) درنگیانا یا سجستان، پارتھیا یا اراخوزیا یا خراسان، ہیرکانیہ یا کوہِ البُرز اور بحیرہ کیسپیئن، لورستان، عیلام اور توران وغیرہ کے ناموں سے موسوم تھے۔ ان خطوں میں یہ قدیم قبائل آباد تھے جن میں بلوچوں کے اجداد بھی شامل تھے۔ یہ بھی ذہن نشین ہو کہ بلوچ، کوچ اور کرد وغیرہ کے نام اُس زمانے میں بھی مستعمل تھے جب یہ علاقے ولایتوں میں منقسم ہوئے اور

مختلف ممالک کے جغرافیائی حدود کسی حد تک قائم ہو چکے تھے۔ علاوہ ازیں اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ علاقائی تقسیم آرین حملہ آوروں سے قبل ہی وجود میں آچکی تھی اور یہ قبائل کافی حد تک مستحکم ہو چکے تھے۔ لہٰذا آرین قبائل کے ان خطوں پر حملے صدیوں تک جاری رہے اور ان حملوں میں مکمل تسلسل رہا۔ آرین قبائل کے لاتعداد دھڑے مادستان اور پارس پر حملہ آور ہونے کے لیے دو حصوں میں متحد ہو گئے اور انھوں نے میدوں اور پارسیوں کی سرزمین پر یورشیں کیں۔ صدیوں تک مید اور آرین آپس میں ٹکراتے رہے جبکہ پارس کی سرزمین پر اِن حملہ آوروں نے قبضہ کر لیا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب پارس کے آرین قبائل میدوں کو خراج ادا کرتے تھے۔ لہٰذا ہیر لڈلیم کے بیان کے مطابق "پارس کے ہخامنشی سردار سالانہ ایک ہزار نسیائی نسل کے گھوڑے میدوں کو بطور خراج ادا کرتے تھے" (ہیر لڈلیم 2012: 47)۔ آرین حملے صدیوں تک جاری رہے۔ اُس وقت تک ان ولایتوں میں مقامی قبائل کی کئی حکومتیں قائم اور زوال پذیر ہو چکی تھیں۔ جب ساتویں صدی عیسوی تک آرین طوفان کسی حد تک تھم چکا تو پیشدادیوں کی حاکمیت بھی انجام پذیر ہوئی اور ان تمام علاقوں پر مادستان کے مید قبائل کی حاکمیت قائم ہوئی۔

کردوں کے ایک اور قبیلے کاسیو یا کاسی (Gothians) کا یہاں تذکرہ کرنا ضروری ہے کہ جنھوں نے 18 ویں صدی قبل مسیح میں زاگروس کے پہاڑی سلسلوں سے نکل کر آسوریا پر حملہ کیا اور آسوری سامیوں کو ان کی حکومت سے محروم کر کے میسوپوٹیمیا پر قبضہ کر لیا۔ بارہویں صدی عیسوی تک یہ قبائل آسوریا اور میسوپوٹیمیا پر قابض رہے۔ بدخشانی کے بیان کے مطابق:

> "کاسی یا کاسو وہ لوگ تھے جو کرمان شاہان کے نزدیک کردستان کے پہاڑوں میں رہتے تھے۔ انھوں نے بابل فتح کر کے کاسیہ سلسلے کی بنیاد رکھی جو 1747 قبل مسیح سے 1173 قبل مسیح تک قائم رہا" (بدخشانی 1967: 5)۔

مید :

مید نہ صرف ایک قدیم بلوچ قبیلہ ہے بلکہ یہ قبیلہ موجودہ خطہ ایران کے اولین حکمران خاندان سے تعلق رکھتا ہے کہ جنہوں نے ہخامنشیوں سے قبل ایران سمیت ایک وسیع وعریض خطہ پر اپنی حکومت قائم کی تھی۔ انہی کی حکومت اور بالادستی کی وجہ سے قدیم دور کا یہ تمام خطہ جو اب ایران کہلاتا ہے مادستان (Media) کے نام سے موسوم ہوا۔ مادستان میں وسط ایشیاء سمیت کئی دیگر ممالک اور خطے بھی شامل تھا۔

یہ قبیلہ موجودہ خطہ ایران کے قدیم اور اصل قبائل میں شمار ہوتا ہے جن کا سراغ آریائی حملوں سے بھی قبل ملتا ہے۔ یہ وہ قبائل تھے جنہوں نے مشرق میں پہلی منظم اور آئینی حکومت قائم کی اور اپنی حکومت کی حدود کو نہ صرف وسعت دی بلکہ بیرونی ممالک سے بھی مراسم قائم کیے۔ ان قبائل کی مشرقِ وسطیٰ یعنی سرزمین عراق و شام کے حکمرانوں کے ساتھ طویل اور انتہائی خونریز جنگیں ہوئیں۔

مید بلوچوں کے اولین قبائل میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے ایران کے افسانوی دور میں اپنی حاکمیت قائم کی۔ ان کے بارے میں چونکہ مستند تاریخی بیانات کی قلت ہے لہٰذا محققین زیادہ تر ایرانی فارسی مواد (حماسہ ملی) سے استفادہ کرنے پر مجبور ہیں۔ ایرانی مورخ اس قبیلہ کو بھی جمشید اور کیومرث کی اولادوں سے ملاتے ہیں اور اُسی خاندان کا تسلسل سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان کے یہ مفروضات مبالغہ آرائی کے سوا کچھ نہیں اور ایسے بیانات سے ایرانی مورخ کی متعصب رویے کی مکمل عکاسی ہوتی ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ کیومرث پہاڑی سلسلہ البرُز کا باشندہ تھا جبکہ مید ہمدان کے میدانی علاقوں کے کسان باشندے تھے۔ لہٰذا یہ کیونکر ممکن ہے کہ پہاڑی کردوں کو مید یا میدانی میدوں کو کُرد لکھا اور سمجھا جائے۔ مگر ایرانی مورخ حسبِ عادت ایران

کے تمام حکمران خاندانوں کو کیومرث کی ہی اولاد سمجھتے ہیں اور نسلاً انہیں آریائی تحریر کرتے ہیں۔ چاہے وہ آریاؤں سے قبل کے کُرد، مید، ہوت اور لوری ہوں یا مابعد کے آشکانی اور کشانی ہوں۔ آریاؤں کی اسی نفرت، بغض اور تعصب نے گذشتہ صدی میں پوری دنیا کو جنگ کی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جب ہٹلر نے حسب عادت آریائی شریفوں اور حاکموں کی حقِ حاکمیت کی بات کی تھی اور باقی ماندہ دنیا کو دوسرے درجے کا شہری قرار دیا تھا۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ مید اولین بلوچ قبائل میں شمار ہوتے ہیں کہ جنہوں نے کُردوں کی طرح شمالی اور شمال مغربی ایران میں اپنی حاکمیت قائم کی اور طویل عرصہ تک حکمرانی کرنے کے بعد بالآخر ایک آرین قبیلہ ہخامنشی کے ہاتھوں اقتدار سے محروم ہوئے۔ اس خاندان یعنی قبیلہ مید کا کردار مابعد مکران میں بھرپور انداز میں نظر آتا ہے۔

دراصل یہی وہ قبیلہ ہے جن کو سائرس نے شکست دے کر ان کے آخری حکمران اژدھاک (آستیاگس) کو گرفتار کر کے زندان میں ڈال دیا تھا اور مادستان کے دارالخلافہ اگباتانہ پر قبضہ کر لیا تھا(ہیروڈوٹس 2001 :83-84)۔ اس طرح اس بلوچ قبیلہ کی حکمرانی کے خاتمہ کے ساتھ ہی آریاؤں نے اس خطہ پر قبضہ کر لیا اور محکوم مید دارااول کے دور تک اپنی حاکمیت کی واپسی کے لیے لڑتے رہے مگر دارا نے انہیں آخری شکست دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کی قوت توڑ دی۔ تب مید بلوچستان کے ساحلی علاقوں کی جانب متوجہ ہوئے اور یہاں قبضہ کر کے ان ساحلوں سے گذرنے والے جہازوں سے ٹیکس وصول کرنے لگے بسا اوقات ان کے کچھ دھڑے قذاقی بھی کرتے تھے اور سندھی فوج میں خدمات بھی سرانجام دیتے تھے۔ لہٰذا ایک مورخ لکھتا ہے کہ:

> ”عربوں اور ہندوؤں کے درمیان تعلقات کا ایک اور ذریعہ بھی تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ شہنشاہ ایران کا قبضہ بلوچستان اور سندھ پر اکثر رہا۔ اس قبضہ کے تعلق سے سندھ کے بعض جنگجو قبیلوں کے فوجی دستے ایرانی فوج میں داخل تھے۔ ان جنگجو قبیلوں میں

میدوں کا ذکر عربوں نے کیا ہے اور وہ زط (دراصل ہوت) اور مید ہیں۔ یہ دونوں سندھ (دراصل مکران و بیلہ) کی مشہور قومیں تھیں۔ اہل عرب چھٹی صدی عیسوی میں بھی جاٹوں سے واقف تھے۔ ایرانیوں کو جب شکست ہوئی تو یہ بہادر جاٹ ہوا کا رخ دیکھ کر چند شرطوں کے ساتھ مسلمانوں کے لشکر سے آکر مل گئے۔ سپہ سالار اسلام نے ان کی بڑی عزت کی اور ان کو اپنے قبیلوں میں داخل کر لیا۔ حضرت علیؓ نے جنگ جمل کے موقع پر بصرہ کا خزانہ ان ہی جاٹوں کی نگرانی میں چھوڑا تھا" (ندوی سال اشاعت ندارد: 26)۔

موصوف جن قبائل کو زط کا نام دے کر انھیں جاٹ تحریر کرتا ہے وہ دراصل مکران کے قدیم مید اور ہوت قبائل ہی تھے۔ ہوت قبائل کو یونانی مورخین نے یوت یا یوئتی یا یوتی اور اوریتائی بھی تحریر کیا ہے۔ عرب مورخین انھیں زط تحریر کرتے ہیں کہ جو مکران اور بیلہ کے ماقبل تاریخ دور کے باشندے تھے جن کے ساتھ مختلف اقوام کی مڈبھیڑ ہوتی رہی جنہوں نے انہیں اپنے اپنے لہجوں اور زبانوں میں نام دیے۔

بہرحال مید قدیم ترین بلوچ قبائل میں شمار ہوتا ہے کہ جنہوں نے پہلی بلوچ حکومت قائم کر کے ایک وسیع و عریض سلطنت کی بنیاد رکھی کہ جس پر بعد ازاں آریائی خاندانوں نے تسلط جما لیا اور اسی طرز حکمرانی کی پیروی کرتے رہے۔ بعض مورخین انہیں دنیا کے بہترین ملاح تسلیم کرتے ہیں (مولائی شیدائی 1983 :131)۔ مولائی شیدائی ان کے موجودہ عہد میں چار بڑے طائفوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ یعنی،

۱۔ جالارزئی۔ ۲۔ گزبرُ۔ ۳۔ چلمبر زئی۔ ۴۔ اُرماڑی۔ اور یہ بھی لکھتا ہے کہ یہ قبیلہ ماضی میں مصری، یونانی، بابلی اور فنیقی اقوام کے سمندری مہم جوؤں سے متواتر نبرد آزما رہا ہے (مولائی شیدائی 1983: 132)۔

اس قدیم بلوچ قبیلہ کا سیاسی کردار غزنوی عہد یعنی دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی میں ایک بار پھر سامنے آیا ہے جب مکران کے خطے سمیت آس پاس کی زمینوں پر دوبارہ اس

خاندان کا اقتدار قائم ہوا۔ ابنِ خلدون سمیت اکثر مورخین غزنوی عہد کے دوران مکران میں بنو مادان کی حاکمیت کا تذکرہ کرتے ہیں اور دو بھائیوں عیسیٰ اور عسکر کے مابین جنگ تخت نشینی اور محمود اور بعد ازاں مسعود غزنوی کے عہد اقتدار میں مکران میں ترکوں کی مداخلت کے متعلق جامع معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر مورخین اس خاندان کو عرب تحریر کرتے ہیں جبکہ ان کے حاکم کا لقب مہاراج لکھتے ہیں۔ یقینا جس طرح عرب عہد سے قبل کے فارسی مورخ ایران کے تمام حکمران خاندانوں کو آرین تحریر کرتے ہیں بالکل اسی طرح عرب دور اور مابعد کے مورخ اسلامی دنیا کے اکثر حکمران خاندانوں کو عرب تحریر کرتے ہیں۔ بنو مادان بلاشبہ مکران کے قدیم مید تھے جو اس خطے میں بھرپور طاقت کے مالک تھے۔ لفظ مادان دراصل مید یا ماد کی جمع ہے۔ عرب مورخین نے اس خاندان کا نام جمع کے طور پر تحریر کیا ہے جس کا واحد ''ماد یا مید'' بنتا ہے۔ اسی طرح کسی بھی عرب حاکم کے لیے لفظ مہاراج کی مثال اسلامی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ بنو مادان کی حاکمیت کا تفصیلی تذکرہ اگلے اوراق میں کیا گیا ہے۔

مید خاندان آج بھی بلوچستان کے ساحلوں پر براجمان ہیں اور مضبوط جمعیت کے مالک ہیں۔ گو کہ آج اس قبیلہ کی معاشی اور سماجی حالات ماضی سے بالکل مختلف ہیں مگر یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ بلوچ قوم کے اولین حکمران خاندانوں میں سے ایک ہے کہ جس نے بارہا بلوچستان سمیت ایشیاء کے ایک وسیع و عریض خطے پر حاکمیت کی۔ میدوں کا دورِ حاضرہ میں عام طور پر ذریعہ معاش ماہی گیری ہے اور ان کی بڑی اکثریت اسی پیشے سے وابستہ ہے۔ اس خاندان کو آج مکران میں ان کے پیشے ماہی گیری کی وجہ سے مید سمجھا جاتا ہے جو کہ لفظ مید کی سراسر غلط تشریح ہے۔ ان کی بڑی اکثریت آج بھی مقامی بلوچوں میں مدغم ہو چکی ہے۔

تاریخی عمل کو چونکہ ہمیشہ بادشاہوں اور حاکموں کے اردگرد رکھا گیا اور ہمیشہ انہی کے حالات کو قلمبند کر کے تاریخ کا نام دیا گیا۔ لہٰذا بادشاہوں کے چپقلش اور تصادم کے نتیجے میں جو تباہی اور بربادی عام لوگوں پر آتی ہے مؤرخین اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کے حالات تاریخ میں نظر نہیں آتے وگرنہ سب سے زیادہ تاریخ سے متاثر یہی لوگ ہوتے ہیں۔ مید بھی انہی حوادث زمانہ کا شکار ہوئے اور بلوچستان کے ساحلوں کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چمٹ گئے۔ آج اگر انھیں میدیا ماہی گیر کہا جاتا تو عرب دور میں انھیں میدیا بحری قزاقPirates کہا جاتا تھا۔ اکثر کتابوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سراندیپ سے آنے والے مسلم (عرب) جہازوں کو ساحل مکران کے قریب، آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں میدقزاقوں نے لوٹا تھا۔ جس کے نتیجے میں عربوں نے سندھ پر حملہ کرکے راجہ داہر برہمن سندھی کی حکومت ختم کرکے ملتان تک اموی خلافت کی سرحدیں پہنچادی تھیں۔ راجہ داہر کے اس بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب دور میں مکران کی حاکمیت میدوں کے پاس تھی اور وہ ایران اور سندھ کے مابین طاقت ور اور بااختیار حکمران کی حیثیت رکھتے تھے جنہوں نے عرب حملہ آوروں کے مقابلے میں مضبوط اور منظم فوج کا بندوبست کیا تھا اور اس لشکر عظیم کے ساتھ ان حملہ آوروں کا مقابلہ کیا تھا۔

ہوت :

قبیلہ ہوت بلوچ قوم کے انتہائی مشہور و معروف قبیلہ ہے جو اس قوم کے بنیادی اور قدیم قبائل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس قبیلے کی اصلیت اور ماٗخذ کے بارے میں کئی روایات ملتی ہیں۔ بلوچ قوم کی تاریخ پر لکھنے والے بعض مصنفین اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ہوت دراصل میر جلال ہان (جلال خان) کا بیٹا تھا جس کے مزید تین بھائی رند، لاشار، کُرّا اور ایک بہن مائی جتو تھی

(بلوچ 1977:463-68)۔ یہ روایت دراصل رند و لاشار عہد کی بلوچی شاعری سے لی گئی ہے۔ قدیم بلوچی شاعری، جو رند عہد کی تخلیق ہے، میں ہوت کو میر جلال خان کا بیٹا کہا گیا ہے۔ جبکہ مشرقی بلوچستان سے تعلق رکھنے والے بعض اہل دانش اس سلسلہ میں زیادہ گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ بلوچوں کے اجداد دراصل یہی لوگ یا یہی چار بھائی تھے جو پندرہویں صدی عیسوی میں وسطی بلوچستان کو روندتے ہوئے سبی اور کچھی کے میدانوں کی جانب بڑھتے گئے۔ اُن کا یہ طوفان مزید مشرق کی جانب جاری رہا حتیٰ کہ سو سالہ اس یورش میں یہ قبائل پنجاب کو عبور کرتے ہوئے ہندوستان کی سرحدات کے ساتھ منسلک ہوگئے۔ اس پوری شاعری میں بلوچوں کو میر حمزہ نامی کسی شخص کی اولاد کہا گیا ہے جس کی نسل میں میر جلال خان نامی ایک معروف شخص بھی گزرا ہے۔ اس کے چار بیٹوں کے اسماء رند، لاشار، ہوت اور کُرّا تھے۔

اس شاعری میں بعض باتوں میں انتہائی ابہام پایا جاتا ہے جو بحث طلب ہیں۔ یعنی اس میں مذکور بابا حمزہ نامی کسی مشہور و معروف بلوچ سردار کو حضرت محمد ﷺ کے محترم چچا اور غزوہ احد کے شہید حضرت امیر حمزہؓ سے تشبیہہ دی گئی ہے جو یقیناً ایک مبالغہ اور خوش فہمی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اسی طرح یزید نامی کسی عرب حاکم کو یزید بن معاویہ سمجھا گیا اور کلبلا نامی ایک قصبہ کو کربلا کہا گیا۔ اس طرح اس شاعری میں بعض ایسی باتیں ہیں کہ جن کی تفصیلات شاعر نے بیان نہیں کیں مگر محققین اپنے اپنے اندازوں کے مطابق ان غیر واضح باتوں اور بیانات کو مختلف شخصیات، علاقہ جات اور واقعات سے تشبیہہ دے کر بلوچ تاریخ میں اغلاط پیدا کرنے کا سبب بنے۔

بابا حمزہ کی اصلیت اور بلوچوں کی بقا کی خاطر اس کے تاریخی کردار پر راقم الحروف اس سے قبل ایک تحقیقی کتاب تحریر کرچکا ہے جو فکشن ہاؤس لاہور کی جانب سے 2013ء میں چھپ کر شائع ہوچکی ہے۔ اس کتاب میں اس موضوع سے متعلق بعض سوالات کے تفصیلی جواب دیے

گئے ہیں اور اس ابہام کو کافی حد تک دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ بلوچ قوم کا جدِ اعلیٰ میر حمزہ تھے۔ اور اس غلط فہمی کو بھی دور کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ میر حمزہ کا تعلق عربوں کے قبیلہ قریش سے تھا اور وہ عمِ رسول ﷺ تھے۔ علاوہ ازیں اس موضوع میں جو ابہام پائے جاتے ہیں ان کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے اور ان کی اصلیت ثابت کرنے کے لیے تحریری شواہد بیان کیے گئے ہیں۔

یہ بلوچی شاعری دراصل صدیوں سے سینہ در سینہ منتقل ہوتی چلی آ رہی تھی جبکہ 1907ء میں ایک انگریز جناب لانگ ورتھ ڈیمز نے اس کے بعض حصے انگریزی ترجمے کے ساتھ کتابی شکل میں The Popular Poetry of Baloches کے عنوان سے شائع کروایا۔ بعد ازاں کئی بلوچ دانشوروں اور ادیبوں نے اس موضوع پر کام کیا۔ جن میں محمد سردار خان بلوچ، جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری، میر شیر محمد مری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ موضوع کی مناسبت اور اعتبار سے اس نظم کو یہاں نقل کرنا ضروری ہے تاکہ ہوت قبیلہ کے بارے میں پیش کردہ اُس مآخذ کو دیکھا جاسکے جس کی بنیاد پر اکثر مصنفین اور ادیب نہ صرف اس قبیلہ کی تاریخ پندرہویں صدی عیسوی کے قریبی زمانے تک بیان کرتے ہیں بلکہ اس غیر واضح نظم کی بنیاد پر بلوچوں کو بھی نسبی طور پر عربوں سے تشبیہ دے کر اُن کی قدیم تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاعر اس پوری نظم میں بلوچوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے:

''شکر اللہءِ حمد گذاراں	اللہ تعالیٰ کے شکر گذار اور اس کے ثناء خواں ہیں
بادشاہ ملکے ہماوثءِ نت	کہ تمام ممالک (زمین) کا وہ بادشاہ ہے
وث کوشی یک وتھنہا	ایک ہے اور ہمیشہ قائم رہیگا
کل جہاں ہاخ گل بئث	جب کہ تمام جہاں خاک وگل ہو جائیگا
ما مریدوں یا علیءِ	ہم حضرت علی کے پیروکار ہیں
دین وایمان ثبتءِ نت	اپنے دین وایمان پہ ثابت قدم ہیں

امتوں پاکیں نبی ءِ	ہم پاک نبی ﷺ کے امتی ہیں
کہ جہانءِ واژہ ئنت	کہ جو جہاں کا وارث (مالک) ہے
اولادوں ما میریں حمزہءِ	ہم میر حمزہ کی اولاد ہیں
اژ حلبا پھاژ کایوں	اور حلبا (البانے یا البا) سے آئے ہیں
گوں یزیدءِ جھیڑوئیت	یزید کے ساتھ جنگوں کی پاداش میں
صوب درگاھا گورئیت	اور حرم کی وجہ سے ہم صوب مند (کامیاب) ہیں
کلبلا بمپورِ نیاما	کلبلا اور بمپور کے درمیان (قریب)
ملک سیستان میزل ئنت	سیستان کا علاقہ ہماری منزل ہے
بادشاہ کے شمس الدین	اب جو بادشاہ ہے شمس الدین ہے
گوں بلوچاں حاطر ئنت	وہ بلوچوں کے ساتھ بہت اچھا ہے
نی کہ بدر الدین در آتکہ	اب جو بدرالدین آیا ہے
ناغمانیں شدت ئنت	اس کا رویہ ہم سے درست نہیں ہے
مئے سرمیریں جلال ہاں	ہمارا سردار میر جلال خان ہے
گوں چھل وچھار بولک ئنت	جس کی کمان میں چوالیس قبائل ہیں
کاتکریں ھاریں بندرا	ہارین بندر (گاہ) سے ہوتے ہوئے
کیچءِ راستین پلوا	ہمارے دائیں جانب کیچ ہے
ہوت نندیں مکران	ہوت قبائل مکران کے باسی ہیں
کھوسغ ما کیچءِ دھا	کھوسہ کیچ میں رہتے ہیں
ہوت و کورائی اواراں	ہوت اور کورائی یکجا ہیں
اے ماں لاشار گھڑ ئنت	یہ لاشار کے گھرانے سے ہیں
دریشک و ہوت و مزاری	دریشک، ہوت اور مزاری
اے گوں رندءِ یک سرئنت	یہ رندوں میں سے ہیں

رندو لاشار ماں ملک ءَ	رند و لاشار کے جو ممالک ہیں
سیم گون نیا منع ءَ ئنت	وہ آپس میں متصل ہیں
مستیریں لوغ ڈومبکی ئیگ	سب سے بڑا گھرانہ ڈومبکی ہے
گاج سیاہ آف سر ئنت	جو گاج اور سیاہ آب کے قریب رہتے ہیں
اڑ حلبا چانڈیہ گون ئنت	چانڈیہ قبیلہ حلبا (البانے یا البا) سے ساتھ ہے
کلمتیں ءِ لوغ پہ گور ئنت	ایک طرف کلمت کے گھرانے ہیں
نوح نندی ماں نلی ءَ	جبکہ نوح (نوحانی) نلی میں رہائش رکھتے ہیں
جستکانی پہ گور ئنت	جستکانی بھی ان کے ساتھ ہیں
پھڑ میر عالی جتوئی	پھڑ میر عالی اور جتوئی
درست سیوی ڈھاڈر ئنت	یہ سب سبی اور ڈھاڈر میں رہتے ہیں
اڑ بنیادا پھڑ رندئیت	پھڑ بنیادی طور پر رند ہے
سرگوں میریں چاکر ئنت	جن کا سربراہ میر چاکر ہے
گولہ و گوپانک و دشتی	گولہ و گوپانک اور دشتی
اڑ رند تھالی ءِ در ئنت	یہ رند کے گھرانے سے نکلے ہیں
دور نشک پہ گورگیژ ئنت	گورگیج اپنی دولتمندی میں مشہور ہیں
آں ماں تلی ءِ در ئنت	جو تلی میں رہتے ہیں
تھی بلوچ بارو بشاریں	کئی اور بلوچ قبائل بھی ہیں
درست ماں رند ءِ مناہ ئنت	یہ تمام رندوں کی پناہ میں آباد ہیں
رند ماں شوران ءَ نندی	رند جو شوران میں رہتے ہیں
لاشار ماں گنداوغ ئنت	جبکہ لاشار گنداوہ میں
جو میاف بہر کھناناں	انہوں نے زمینیں اور پانی آپس میں بانٹ لیے
کل سردار شہک ئنت	تمام قبائل کا سردار میر شہک ہے

شہک و سحاق رندا	شہک اور اسحاق کے بعد
لس سردار چاکر ئنت	قوم کا سردار چاکر ہے
چھل ہزار کیت میرءِ گوانکا	جس کے ساتھ چالیس ہزار کا لشکر ہے
تھیو غار ند پڑئنت	تمام رند اعلیٰ نسل ہیں
ہول پوش دست کرائی	جو زرہ بکتر سے لیس ہیں
دراہ کمان و جائنت	تیر کمان ان کے کندھوں پر ہیں
کاڑچ و کاٹار نغر ہیں	چھری، خنجر ہر طرح سے مسلح ہیں
دست مندری تھنگوئنت	ان کے ہاتھوں میں سونے کے کڑے ہیں
بکر و گواہرام و رامین	بکر و گواہرام و رامین
زرزوال نوذبندغ ئنت	زرزوال نوذبندغ سے ہیں
پھڑ جاڑو جور جواویں	جاڑو پھڑ بہادر و دلیر ہے
حدہ دینءِ برادرئنت	جبکہ حدے اس کے دین کا بھائی ہے
پیروزشاہ بجار ریحان	پیروزشاہ بجار ریحان
باہر گوں شاہی بیورغءِ	بیورغ پھڑ (قبیلہ) کا سربراہ ہے
رنداں حسن مولانغ ئنت	رندوں میں حسن مولانگ بھی ہے
درستاں میرحان تیغ زن ئنت	اور سب سے بڑا شمشیر زن میرحان ہے
صوبھا میہاں و عالی	صوبھا، میہان اور عالی
جام سحاق والن ئنت	جام، اسحاق اور الن بھی ہیں
ھیوتاں بیورغ مارنداں	ھیبت خان اور بیورغ رندوں سے ہیں
میر حسن گوں براھم ئنت	میر حسن میر ابراہیم کے ساتھ ہے
پھیلویں سی سال جنگ ئنت	یہ تیس سالوں کی جنگوں کی کہانی ہے
اے بلوچانی شدت ئنت	جو بلوچوں کی (بیجا) ضد کا نتیجہ ہے

اے منی پیر اور ندئنت — یہ میری معلومات اور میرا بیان ہے
اے بلوچءِ دپترئنت — یہ بلوچی تاریخ ہے
شاھر کہ شیر اں گوشی — شاعر جو شعر کہتا ہے
میر جلال ہاں سر پدئنت — صرف میر جلال خان جانتا ہے۔"

(بلوچ 1977: 463-68)

بعض مصنفین ہوت قبیلہ کو قدیم قبیلہ سمجھتے ہیں۔ بلوچی زبان کے ادیب و مصنفین لفظ ہوت کے معنی نڈر اور جنگجو بیان کرتے ہیں (ڈسٹرکٹ گزیٹیئر۔ مکران 1996 :740)۔ مگر کرنل موکلر اور سر ٹی ہولڈچ انہیں رند نہیں سمجھتے بلکہ ان کو قدیم اور ریتائی قبیلہ تحریر کرتے ہیں کہ جنہوں نے لسبیلہ اور مکران کے سفر کے دوران سکندر کے سامنے شدید مزاحمت پیش کی تھی یا پھر انہیں قدیم یوتی قبیلہ خیال کرتے ہیں کہ جوزرکسیز ہخامنشی کی فوج میں شامل تھے (ڈسٹرکٹ گزیٹیئر۔ مکران 1996: 734-35)۔ گزیٹیئر کے مطابق ہوت قبیلہ بھی رندوں کی طرح جمہوریت پسند ہیں اور کسی مخصوص سردار کے زیرِ اثر نہیں ہیں (ڈسٹرکٹ گزیٹیئر، مکران 1996: 735)۔

اگر تاریخ کے قدیم اوراق پر ایک گہری نظر ڈالی جائے تو اس اہم اور مضبوط بلوچ قبیلہ کے بارے میں لاتعداد حوالے ملیں گے۔ تاریخ کے قدیم کتب کے مطالعہ سے یہ بات شنید میں آتی ہے کہ اس قبیلہ نے موجودہ خطہ بلوچستان و ایران کی تاریخ میں بھرپور کردار ادا کیا ہے اور ہمیشہ سیاسی و سماجی حوالے سے سرگرم رہی ہے۔ یہ مکران کے قدیم اور اولین قبائل میں شامل تھے جنہوں نے مید دور یا اس سے کچھ عرصہ پیشتر ساحل مکران (ایران اور پاکستان کے درمیان منقسم مکران) اور اس کے مضافات میں اپنی حاکمیت قائم کی تھی۔ بعد ازاں فارسی آریائی دور میں بھی یہ خطہ اور اس کے ہوت باشندے سیاسی طور پر خوب سرگرمِ عمل رہے۔ حتیٰ کہ عرب دور

میں ان کی عسکری سرگرمیاں عرب دور کے مورخین اور جغرافیہ دانوں کا خاص موضوع رہے ہیں اور انہوں نے اپنی تحریروں میں مکران اور اس کے ہوت اور مید باشندوں کے بارے میں گراں قدر بیانات رقم کیے ہیں۔ وسطی اسلامی عہد میں بھی تاریخ کے صفحات اس بلوچ قبیلہ کے کارناموں سے مزین ہیں۔

جدید تحقیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قبیلہ ہوت کسی ایک مخصوص فرد کی اولاد نہیں ہیں بلکہ مکران کے تمام قدیم قبائل بالخصوص وسطی مکران، ساحلی مکران اور بیلہ کے قدیم قبائل ایک ہی یونین کے زیرِ علم تھے کہ جنہیں یونانیوں نے یوتی اور اوریتائی تحریر کیا جبکہ قدیم فارسی علماء انہیں مردمانِ مکران یا کوچ و بلوچ تحریر کرتے ہیں۔ ان ہی لوگوں کو عربوں نے "زط" جبکہ مابعد کے ایرانی فارسی موٴرخین نے جت اور مغربی موٴرخین نے جٹ تحریر کیا۔ مقامی طور پر انہیں جدگال یا جاموٹ کہا جاتا ہے۔ لفظ جدگال کو مقامی براہوئی زبان میں جغدال بھی ادا کیا جاتا ہے جس کے معنی جنگلی زبان بولنے والے لوگ، اور لفظ جاموٹ بلاشبہ جام ہوت کی بگڑی ہوئی شکل ہے کہ جس کے معنی ہیں ہوتوں کا حکمران یا سردار، کیونکہ لفظ جام اب بھی لسبیلہ کے مقامی حکمران (نواب) کا لقب ہے اور تاریخ یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ مشہور تاریخی رومانوی کردار سسی پنوں میں شہزادہ پنوں مکران کے حکمران میر عالی ہوت کا بیٹا تھا کہ جن کا نام و لقب بسا اوقات جام آری ہوت (میر عالی ہوت) بھی تحریر کیا جاتا ہے۔ اور سسی پنوں کا عہد مورخین کے مطابق بارہویں صدی عیسوی تھا کہ جب عالم اسلام پر عباسی عربوں کی خلافت قائم تھی جبکہ ترک خانوادے عالم اسلام کے اکثر علاقوں پر قابض ہو کر دربارِ خلافت سے اپنے لیے سلطانی کے پروانے حاصل کر کے مختلف سلطنتوں کی بنیاد رکھ چکے تھے۔

دراصل یہ وہ قبیلہ ہے جس کا تذکرہ سب سے پہلے بابائے تاریخ ہیروڈوٹس نے کیا ہے اور اسے مکران کا قبیلہ اور میدی وہخامنشی حکمرانوں کا اتحادی یا باج گذار تحریر کیا ہے۔ قدیم کتب میں علاقہ مکران اپنے اصل نام سمیت کئی دیگر ناموں کے ساتھ مذکور ہوا ہے۔ اس علاقے کو ایرانی اقوام ماکا جبکہ قدیم عکادی اسے ماگان کہتے تھے۔ قدیم وادی سندھ کے باشندے بھی اس سے اچھی طرح واقف تھے کیونکہ اُن کی تمام تر تجارت جو مشرقِ وسطیٰ کے ساتھ ہوتی تھی مکران کے بری وبحری راستوں کے ذریعے ہی ہوتی تھی جو مختصر ترین راستہ تھا۔ یونانی اس خطے کے مختلف نام تحریر کرتے ہیں جبکہ ساحل بحر کو بھی علاقے کی مناسبت سے نام دیتے ہیں۔ ہیروڈوٹس اس علاقے کو یوتین (Utian) تحریر کرتا ہے جبکہ باشندوں کو یوت لکھتا ہے جو بلاشبہ لفظ ہوت کا یونانی تلفظ ہوگا۔ اسی طرح وسطی مکران کے لیے وہ ماکا جبکہ سمندر کے لیے جنوبی سمندر اور اریتھیرین سمندر کے الفاظ استعمال کرتا ہے (ہیروڈوٹس 2001:303-04)۔ لفظ اریتھیرین یقینا لفظ اوریتائی سے ماخوذ ہے۔ اوریتائی کا لفظ ایرین نے اپنی کتاب میں دوسری صدی عیسوی میں اُن قبائل کے لیے استعمال کیا تھا جو مکران اور لسبیلہ میں آباد تھے۔ ایرین نے سکندر کے واپسی کے سفر کی روداد تحریر کرتے وقت لسبیلہ اور مکران کے حدود میں آباد کئی قبائل کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے علاقوں کے نام بھی تحریر کیے ہیں۔ جو قبیلہ جہاں آباد تھا اسے یا تو اسی علاقے کی مناسبت سے نام دیا یا پھر اُس علاقے کو اُن کی مناسبت سے نام دیا۔ جیسا کہ وہ ایک قبیلہ اربوئی یا اریبائی یا اربوئی کا تذکرہ جھلاوان (وسطی بلوچستان) کے پہاڑوں کے باشندوں کے طور پر کرتا ہے جو یقینا براہوئی لفظ کی ابتدائی شکل ہوگی۔ اسی طرح لسبیلہ کو اوریتائی کے نام سے تحریر کیا اور یہاں کے باشندوں کو بھی یہی نام دیا۔ وسطی مکران کو گیدروشیا لکھا اور وہاں کے باشندوں کو گیدروشیائی تحریر کیا۔ ساحلی مکران کے باشندوں کو اچھیتافیگوئی یعنی مچھلی خور کے نام سے موسوم کیا۔ جارج میک

کرنڈل، ونسنٹ اے سمتھ اور ہیر لڈ لیم جیسے بڑے مورخین بھی ان بیانات کی تصدیق کرتے ہیں اور ان قبائل کا تذکرہ اپنی کتب میں کرتے ہیں جن کا تذکرہ ایرین اور سٹر یبو نے اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ یہ مورخین مکران اور لسبیلہ کے باشندوں کو اوریتائی اور گدروشیائی تحریر کرتے ہیں۔ یقینا لفظ اوریتائی ہوت کے لفظ سے ہی ماخوذ ہے۔ ہیروڈوٹس اس قبیلہ کو یوت اور اُن کے سمندر کو اریتھیرین لکھتا ہے جبکہ ایرین اس قبیلہ کو اوریتائی اور ان کے سمندر کو اریتھیرین لکھتا ہے اور علاقہ کو بھی اسی نام سے موسوم کرتا ہے۔ ہیروڈوٹس نے مکران کے کئی دیگر قبائل کا بھی تذکرہ کیا ہے جنہیں وہ میکوئی، مائشی اور میکرونی کا نام دیتا ہے (ہیروڈوٹس 259:2001)۔ جبکہ گدرو قبیلہ اب بھی ایک چھوٹے سے قبیلہ کی صورت میں لسبیلہ اور مکران کے حدود میں آباد ہے۔ مگر یہ قبیلہ اب یا تو ناپید ہو رہا ہے یا ہو چکا ہے اور اس کے زیادہ تر افراد دیگر قبائل کے اندر ضم ہو چکے ہیں۔ اس قبیلہ کا تذکرہ مولائی شیدائی نے بھی کیا۔ یقینا علاقہ گیدروشیا اور علاقہ گوادر و گوتر اسی قبیلہ کی وجہ سے معروف ہوئے۔ اس قبیلہ کو قدیم قبیلہ ہوت کی ہی ایک شاخ سمجھا جاتا ہے۔

قبیلہ ہوت کو مابعد کے فارسی اور عرب دور کے مورخین کئی ناموں سے تحریر کرتے ہیں۔ جب عربوں نے مکران پر حملہ کیا تو پھر سندھ کی فتح تک اُن کے حملوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ایران و عراق سے سندھ تک پہنچنے کے لیے چونکہ سب سے مختصر ترین راستہ مکران کا تھا لہٰذا عرب ہر حال میں اس خطہ پر قابض ہونا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی اسلامی حملوں میں ہی اس علاقہ کو عربوں نے اپنی ترکتازیوں کا نشانہ بنایا۔ حضرت عمرِ فاروقؓ کے عہد میں ہی عرب حملہ آور مکران تک پہنچ گئے اور اس کے سرحدی علاقے فتح کر لیے تاکہ مستقبل میں سندھ و ہند تک پہنچنے کے راستے اُن کے قبضے میں رہیں۔ یہ حملے تمام عرب ادوار میں جاری رہے۔ ان حملوں کا آغاز 644ء میں خلافت راشدہ کے دوسرے خلیفہ حضرت عمرِ فاروقؓ کے دور میں ہوا۔ اموی اور

عباسی عہد میں بھی علاقہ مکران میں عرب اور مقامی قبائل کے مابین مسلح تصادم اور چپقلش ہمیشہ جاری رہی۔ تاریخی کتب کے مطالعہ سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ عربوں نے اس خطے میں ایک دن بھی چین و سکون کے ساتھ نہیں گزارا بلکہ ہمیشہ اپنی فوجی چھاؤنیوں، بیرکوں اور قلعوں کے اندر محصور رہے۔ ان کا مقصد یہاں کے لوگوں کو سہولتیں فراہم کرنا ہرگز نہیں تھا بلکہ ان کا یہ قبضہ فوجی نوعیت کا تھا تاکہ وہ بلوچستان کی اہم گزر گاہوں پر قابض ہو کر سندھ و ہند کے ساتھ عربوں کے تجارتی اور فوجی تعلقات کو منسلک کر سکیں۔ عرب فوجیں پنجاب و ہند تو فتح نہ کر سکے مگر سندھ پر انہوں نے اپنی فتوحات کا پرچم ضرور لہرایا اور آخری عرب حکمران تک سندھ کے حاکم مرکزِ خلافت کے ماتحت رہے۔

جب عربوں کی مرکزیت کمزور ہوگئی تو وسط ایشیائی ترکوں کو غلبہ حاصل ہوا۔ لہٰذا عرب خلافت کے آخری ادوار میں ایرانی، ترک اور منگول اقوام نے اسلامی ممالک ہی نہیں یورپ اور ہندوستان کو بھی روند ڈالا۔ ترک، منگول اور ایرانی اقوام کی یلغاروں کے دوران بھی مکران میں ہوت قبیلہ کی سیاسی اجارہ داری اور برتری قائم رہی۔ انارکیت کے اس دور کی تاریخ کے اوراق پر اس قبیلہ کی سرگرمیوں کی داستانیں مرقوم ہیں۔ منگول طوفان کے دوران مکران پر اس قبیلہ کی حاکمیت کے ٹھوس شواہد ملتے ہیں۔ اس عہد میں یعنی بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں جب منگولوں نے چین اور تمام اسلامی بلاک کو اپنے تند و تیز اور برق رفتار گھوڑوں کے سُموں تلے روند ڈالا تو اس زمانے میں ہوت خاندان ہی مکران میں برسرِ اقتدار تھا جو بنو مادان کے بعد اقتدار میں آیا تھا۔ اس کی گواہی تیرہویں صدی عیسوی میں وقوع پذیر ہونے والی عشق و محبت کی وہ عظیم داستان ہے جسے لوگ ''داستانِ سسی پنوں'' کے نام سے جانتے ہیں۔ قبیلہ ہوت

کی گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی کے دوران مکران میں حاکمیت کے بارے میں بعض محققین لکھتے ہیں کہ،

"گیارہویں اور بارہویں صدی کے دوران مکران کے وسطی علاقوں یعنی کیچ مکران میں ہوت قبیلہ کی حکمرانی کی ٹھوس اور ناقابلِ تردید شہادت اور گواہی عشق و محبت اور اخلاص و وفا کی وہ عظیم داستان ہے کہ جسے ہر خاص و عام داستانِ "سسی و پنوں" کے نام سے جانتا ہے۔ اس داستان کے بارے میں سب سے پہلے منظوم انداز میں معلومات مشہور صوفی شاعر ہاشم شاہ نے پنجابی زبان میں فراہم کیں۔ ہاشم شاہ اس طویل منظوم داستان میں سسی کو بھنبور یعنی سندھ جبکہ پنوں کو کیچ مکران کا شہزادہ کہتا ہے اور اسے کیچ کے حکمران میر عالی ہوت (ہاشم شاہ انہیں جام عالی ہوت لکھتا ہے) کا بیٹا لکھتا ہے۔ ہاشم شاہ کی یہ منظوم داستان بہت جلد شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگی اور زبانِ زدِ عام ہو گئی۔ ہاشم شاہ نے اس اہم واقعہ کا عرصہ یا سال و سنہ بیان نہیں کیا۔ بعد ازاں سندھ بلکہ برصغیر کے مشہور صوفی بزرگ اور قافیہ گو شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی نے بھی اپنی شاعری میں اس داستان کو جگہ دی کہ جس کی وجہ سے ہر خاص و عام اس واقعہ سے آشنا ہو گئی۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی بھی سسی کو بھمبور جبکہ پنوں کو کیچ مکران کا باسی تحریر کرتا ہے۔ اسی طرح میر عالی ہوت کو جام کا لقب دیتا ہے۔ اس میں کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہے کیونکہ سندھ اور سندھی زبان میں حاکم یا سردار کے لیے عام طور پر لفظ "جام" استعمال ہوتا ہے۔ اسلامی عہد میں سندھ کے حکمرانوں کا لقب بھی جام ہوتا تھا جیسا کہ بلوچستان کے حکمران یا سربراہ میر کہلاتے تھے۔ لہٰذا شاہ عبداللطیف بھٹائی اور ہاشم شاہ نے اگر میر عالی ہوت کو جام کا لقب دیا ہے تو اس کا مطلب حکمران ہے۔ پنوں بلاشبہ کیچ کے حکمران میر عالی ہوت کا بیٹا تھا مگر شاہ عبداللطیف بھٹائی نے بھی اس واقعہ کا سال و سنہ نہیں دیا۔ ہاشم شاہ کے کلام کی تشریح اور اس تمام داستان پر تحقیق عقیل ہاشمی نے کی ہے اور وہ بھی بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اس داستان کے ہیرو کا تعلق مکران کے حاکم خاندان ہوت

> سے تھا اور وہ یعنی پنوں (مصنف شفیع عقیل نے سلطان علی خان تحریر کیا ہے۔ یقیناً لفظ سلطان کو میر یا حاکم کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور عالی کی بجائے عربی لہجے میں عالی کو علی لکھا گیا ہے۔) میر عالی ہوت کا سب سے کمسن اور لاڈلا بیٹا تھا۔ اسی طرح اس داستان پر سندھ کے مشہور محقق، تاریخ دان پروفیسر ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے بھی کافی تفصیلی کام کیا ہے جو اس لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ انہوں نے اس واقعہ کا سال وسنہ بھی تحریر کیا ہے۔ اُن کے مطابق یہ واقعہ بارہویں صدی عیسوی کے زمانہ کا ہے اور یہ مشہور واقعہ جس میں سسی اور پنوں کی جان چلی گئی تھی 1167ء میں پیش آیا تھا" (عقیل 2002:23)۔

منگولوں کے طوفانی عہد میں اس قبیلہ کی بلوچستان پر حاکمیت کی کئی دیگر شہادتیں بھی ملتی ہیں۔ بلوچستان کے علاقہ نوشکی میں ریت کا ایک پہاڑ نما ٹیلہ ہے جو "ہوتان" کہلاتا ہے۔ اس ٹیلہ کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کے نیچے ایک شہر دفن ہے جو ہوتان کہلاتا تھا۔ اس شہر یا اس کے قلعہ کا ایک بُرج یا دیوار کا کچھ حصہ اس ٹیلے کی اوپر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں پیر بلانوش ضلع چاغی کے مشہور بزرگوں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کا مزار ضلع چاغی میں چاغی نامی قصبہ میں ایک پہاڑی سلسلے کے اندر واقع ہے۔ یہاں سے جنوبی افغانستان کی سرحد صرف دس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ بلانوش بابا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں سے منگولوں کے خلاف زبردست معرکہ آرئیاں کیں اور مقامی قبیلہ ماسنی کی ایک شاخ شیخ حسینی قبیلہ کے جنگجوؤں اور بزرگوں کی مدد سے طویل عرصہ تک منگولوں کے خلاف لڑائیاں لڑیں اور دادِ شجاعت دیتے رہے۔ بلانوش بابا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُن کا تعلق مکران کے علاقہ بلیدہ سے تھا جو یہاں کا گورنر تھا۔ ان کے مقبرہ کے کتبہ پر بھی ان کے نام کے ساتھ مکرانی پیر لکھا ہوا ہے۔ وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ بزرگ ہوت عہد میں جب بلوچستان پر منگولوں کی یلغار ہورہی تھی تو ہوت ریاست کے شمالی

علاقوں، جو سیستان سے متصل تھیں، کا گورنر تھا اور منگولوں کے خلاف لڑنے اور انہیں اپنی سرزمین سے دور رکھنے کی وجہ سے علاقہ چاغی میں کافی مقبول ہوا اور لوگوں میں ان کا مقام و مرتبہ بلند ہوتا گیا۔ ان کی وفات کے بعد بھی اُن کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ انہوں نے اور شیخ حسینی قبیلہ کے بزرگوں شہ حسین اور اس کے جوانسال اور بہادر بیٹے شہ رمضان غائب نے بھی پیر کامل کا درجہ حاصل کیا اور ان کے مقبرے مرجع خلائق بن گئے۔

ہوتوں کی کہانی یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس قبیلہ کا سیاسی کردار وقت کے ساتھ ساتھ مزید پھیلتا چلا گیا اور اس قبیلہ کی کئی شاخوں نے سندھ اور پنجاب میں اپنی جڑیں مضبوط کیں اور بالآخر سندھ اور پنجاب میں بھی انہیں سیاسی بالادستی اور حاکمیت حاصل ہوگئی۔ اخلاق احمد قادری لکھتا ہے کہ جس زمانے میں میر چاکر رند بلوچستان میں تیس سالہ خانہ جنگی کے خاتمے پر پنجاب کی جانب مہاجرت کر گئے اور ہمایوں کی مہمات سے فراغت پانے کے بعد وہ ملتان کے حکمران شاہ حسین لنگاہ کے پاس پہنچے اور ہندوستان پر حملے کے لیے اُن سے مدد طلب کی تو شاہ حسین لنگاہ کے وزیر اعظم میر سہراب خان دودائی تھے۔ جنہوں نے شاہ حسین لنگاہ کو میر چاکر خان رند کی مدد کرنے سے منع کیا تھا (قادری، سال ندارد: 163)۔ یہ بات ذہن نشین ہو کہ میر سہراب خان دودائی میر دوداخان ہوت کا بیٹا تھا۔ میر سہراب خان نے بعد ازاں جنوبی پنجاب میں اپنی حکومت قائم کی جس کا دائرہ بنوں اور وزیرستان تک وسیع تھا۔ میر سہراب کے بیٹے میر غازی خان، میر اسماعیل خان اور میر فتح خان تھے جبکہ اُن کی ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام بنوں تھا۔ بعض ذرائع کے مطابق غازی خان اس کا بیٹا نہیں تھا بلکہ بابر نام کا اُن کا ایک بیٹا تھا جس کے نام سے بابر کوٹ کا علاقہ موسوم ہوا اور یہ تمام جاگیر وہی سنبھالتا تھا۔ میر سہراب خان نے اپنی وسیع جاگیر اور ریاست اپنی وفات سے پہلے اپنی اولاد میں تقسیم کر دیا تھا۔ آج بھی اُن کی اولاد کے نام سے یہ علاقے موجود

ہیں۔ میر غازی خان کے نام سے ڈیرہ غازی خان، میر اسماعیل خان کے نام سے ڈیرہ اسماعیل خان، میر فتح خان کے نام سے فتح جنگ (ڈیرہ فتح خان)، بابر خان کے نام سے بابر کوٹ جبکہ بیٹی بنوں کے نام سے علاقہ بنوں آج بھی قائم و دائم ہیں اور اس مشہور و معروف ہوت سردار میر سہراب خان ہوت کی اولاد ان متذکرہ بالا علاقوں میں آباد ہے۔ علاوہ ازیں علاقہ رحیم یار خان کو بھی ان کے ایک بیٹے یا پوتے کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ دریا خان کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ میر سہراب خان کا پوتا تھا جبکہ علاقہ ٹانک ڈیرہ اسماعیل خان میں میر اسماعیل خان دودائی کا قلعہ اب بھی موجود ہے۔

سندھ میں ہوت قبیلہ کی مشہور و معروف شاخ تالپور نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں اپنی حاکمیت قائم کی اور کلہوڑوں کی حکومت کا خاتمہ کر کے تالپور عہد کا آغاز کیا۔ انگریزوں نے انہی کے خلاف 1841ء میں میانی کی مشہور جنگ لڑ کر سندھ پر قبضہ کر لیا۔ جس کے نتیجے میں تالپور عہد کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

یہ طویل تاریخ اور مستند حوالہ جات اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ ہوت قبیلہ یقیناً میر جلال خان کے بیٹے کے نام سے منسوب قبیلہ نہیں ہے بلکہ اس قبیلہ کی تاریخ انتہائی قدیم ہے اور وہ اس خطے کے قدیم قبائل میں شمار ہوتا ہے۔ دورِ حاضرہ میں اس قبیلے کی تعداد اتنی زیادہ پھیل گئی ہے کہ جس نے کئی الگ قبائل کی شکل اختیار کی ہے۔ جنوبی پنجاب اور صوبہ کے پی کے علاوہ ان کی آبادی ہندوستان تک پھیلی ہوئی ہے۔

پرکانی:

قبیلہ پرکانی بلوچوں کے براہوئی بولنے والے قبائل میں شمار ہوتا ہے۔ ان کی کثیر آبادی شمال مغربی بلوچستان یعنی اضلاع مستونگ، کوئٹہ، چاغی اور نوشکی میں آباد ہے جبکہ ان کا مخصوص

علاقہ ضلع کوئٹہ میں واقع ہے جو آشخان کے نام سے موسوم ہے۔ یہ علاقہ آگے جا کر شمالی جانب افغانستان کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ قبیلہ اب بھی دونوں ممالک میں منقسم ہے اور سرحد کے دونوں پار آبائی اور وراثتی زمینوں کا مالک ہے۔ علاوہ ازیں مشرقی بلوچستان اور سندھ میں بھی پرکانی قبیلہ کی ایک قابلِ ذکر تعداد آباد ہے۔ اس قبیلہ کا بنیادی پیشہ گلہ بانی ہے مگر دورِ حاضرہ میں ان کے پیشے بھی تبدیل ہو چکے ہیں۔ اس قبیلہ کے بہت سے مشاہیر اعلیٰ سرکاری عہدوں پر تعینات ہیں۔ علاوہ ازیں ٹرانسپورٹ، زراعت اور کئی دیگر کاروباری شعبوں میں بھی اس قبیلہ کے لوگ سرگرم نظر آتے ہیں۔

عام طور پر بھی براہوئی بولنے والے قبائل میں پرکانی کو قدیم اور بنیادی قبائل میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ قبیلہ نیم خانہ بدوشانہ طرزِ زندگی گزارنے والے لوگ تصور کیے جاتے ہیں مگر یہ درست نہیں ہے کیونکہ ان کی مستقل آبادیاں صدیوں پرانی ہیں البتہ ان کے بعض دھڑے دیگر براہوئی قبائل کی طرح سردیوں اور گرمیوں میں اپنی رہائش گاہیں عارضی طور پر تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ سردیوں میں یہ قبائل کچھی اور سندھ کی جانب جبکہ گرمیوں میں اپنے آبائی علاقوں کی جانب مائیگریشن کرتے رہتے ہیں۔ ان کی اس مہاجرت کو موسمی مہاجرت کہا جاسکتا ہے۔ دور حاضرہ میں اس قدیم مہاجرت میں کمی آتی جا رہی ہے۔ جوں جوں لوگوں کو اُن کے شہروں، گھروں اور قصبوں میں سہولتیں مل رہی ہیں اُن کی اس موسمی مہاجرت اور تبدیلی رہائش میں بھی کمی آتی جا رہی ہے۔ سرکاری ملازمتوں، تعلیم کے عام ہونے اور آبائی علاقوں میں کاروبار ہونے کی وجہ سے بھی اس قدیم طریقِ زندگی میں کمی آتی جا رہی ہے۔ مختصراً یہ کہ موسمی مہاجرت ان قبائل کی مجبوری تھی جس کی وجہ سے ان قبائل کی سندھ و بلوچستان کے مابین مہاجرت جاری رہتی تھی۔

بہر حال پرکانی قبیلہ بلوچستان کے اُن قبائل میں شمار ہوتا ہے جن کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ دراصل بلوچستان کے ابتدائی اور قدیم قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان قبائل کے بارے میں جدید کتب میں زیادہ حوالے اس لیے نہیں ملتے کیونکہ بلوچستان کے وسطی اور جدید عہد میں ان کا سیاسی و سماجی کردار قابل ذکر نہیں رہا۔ مگر ماضی قدیم میں یہ قبائل زبردست سیاسی و عسکری قوت کے حامل تھے اور موجودہ خطہ ایران میں قائم ہونے والی مید اور ہخامنشی حکومتوں میں ان کا عسکری کردار تاریخی کتب کی زینت بنا۔ گو کہ ان کا نام اور سیاسی و عسکری کردار کی زیادہ تفصیلات دستیاب نہیں ہیں مگر قدیم نقشوں میں ان کے نام سے ایک وسیع و عریض خطہ منسوب ہونے کی شہادت ملتی ہے۔

ان کی تحریری طور پر شہادت بابائے تاریخ ہیروڈوٹس کی کتاب تاریخ ہیروڈوٹس سے ملتی ہے۔ ہیروڈوٹس کے مطابق پیرکانی نام کے ایک قبیلہ نے بھی تھرماپائلے کی مشہور جنگ میں ایران کے ہخامنشی حکمران زرکسیز کی مدد کی تھی اور فنونِ حرب وضرب کے ماہر جنگجوؤں پر مشتمل پیریکانی فوجی دستہ نے اپنے علاقے اور قبیلہ کی نمائندگی کی تھی۔ یہ جنگ 481 قبل مسیح میں ایران اور یونان کے مابین لڑی گئی تھی۔ اس قبیلہ کا جو علاقہ نقشوں اور ہیروڈوٹس کے بیانات کی روشنی میں دکھایا گیا ہے آج بھی وہی علاقہ اس قبیلہ کا مرکز کہلاتا ہے اور ان کا قبائلی سربراہ اپنے قدیم علاقے میں سکونت رکھتا ہے۔ ہیروڈوٹس تھرماپائلے کی جنگ میں شامل ایرانی فوج میں پرکانی قبیلہ کے دستے کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

> یوتی (مکران کا ہوت بلوچ قبیلہ) مائیشی (مامشئ) اور پیریکانی (پرکانی) سب پاکتیوں کی طرح مسلح تھے۔ پہلے دو کا قائد ارسامینیس ابنِ داریوش تھا، جبکہ آخری کا سیرومیتریس ابنِ اوبازس تھا۔" (ہیروڈوٹس 2001:508-09)

یہ مستند بیان تاریخی طور پر بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ یہ دنیا کی پہلی تاریخی کتاب میں لکھی گئی ہے۔ جس سے اس قبیلہ کی میدی وہخامنشی ادوار میں موجودگی ثابت ہوتی ہے۔ ان کے خطے کو دارا اول نے جس صوبے میں شامل کیا تھا اس میں کئی دیگر بلوچ علاقے اور قبائل بھی شامل تھے جن کا تذکرہ یونانی مورخ نے اپنے لہجے میں کیا ہے۔ جس طرح ہیروڈوٹس پرکانی قبیلہ کو اپنے لسانی لہجے میں پیریکانی لکھتا ہے اسی طرح وہ دیگر قبائل کے تذکرے بھی اپنے انداز میں کرتا ہے۔ جیسا کہ وہ دیگر قبائل کے ساتھ ساتھ پرکانی قبیلہ کا بھی تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"دسواں صوبہ۔۔ اگبتانہ اور میدیا کے دیگر حصوں، بشمول پیریکانی اور تھوکوری بانیتس، سب مل کر چار سو پچاس ٹیلنٹ دیتے تھے۔" (ہیروڈوٹس 2001:258-59)

یہ بیان دارا اول کے عہد میں ایران کے بیس صوبوں سے متعلق ہے جس میں بطور دسواں صوبہ کے ایک قبیلہ پیریکانی کا علاقہ بھی شامل تھا۔ اس بیان سے بھی اس قبیلہ کی قدامت اور بنیادی بلوچ قبیلہ ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ نقشہ بھی اس کتاب میں شامل ہے جس میں پیریکانی کے علاقہ کو واضح کیا گیا ہے۔ اس قبیلہ کے بارے میں کئی دیگر مورخین نے بھی لکھا ہے مگر وہ سب ہیروڈوٹس ہی کا حوالہ دیتے ہیں۔ مشہور جرمن مورخ ایڈولف ہولم نے اپنی کتاب قدیم تاریخ یونان (ایڈولف ہولم 1987 :614-16) میں بھی ایرانی فوج میں شامل پیریکانی قبیلہ کا تذکرہ ہیروڈوٹس کی کتاب کے حوالے سے کیا ہے اسی طرح مشہور پاکستانی ترقی پسند مصنف سید سبطِ حسن بھی "پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء" نامی اپنی کتاب میں مذکورہ بالا حوالہ نقل کرتا ہے۔ اس قبیلہ کے بارے میں راقم الحروف نے اس سے قبل اپنی کتاب بلوچ اور ان کا وطن میں بھی اس کے بنیادی اور قدیم بلوچ قبیلہ ہونے کے بارے میں تحریر کیا تھا۔ اس قبیلہ کی قدیم سیاسی تاریخ اور عسکری وسیاسی کردار کے بارے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

ڈایا:

ایک مشہور و معروف لیکن عدی لحاظ سے چھوٹا سا قبیلہ ہے۔ اس کی زیادہ تر آبادی علاقہ جھلاوان میں زہری اور درہ مولہ میں آباد ہے اور یہ زہری قبائل کا حصہ کہلاتا ہے۔ اس قبیلہ کے بارے میں بھی ابتدائی بیانات اور معلومات ہیروڈوٹس کی کتاب میں ملتے ہیں جو انہیں قدیم اور قبل از آرین قبائل میں شمار کرتا ہے۔ اُن کے بیان کے مطابق یہ قبائل خانہ بدوش تھے مگر بہت جنگجو اور بہادر تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ ان قبائل نے ہخامنشی سلطنت کے قیام میں پہلے ہخامنشی فرمانروا سائرس کی میدیوں کے خلاف مدد کی تھی (ہیروڈوٹس 512:2001)۔ افسوس اس قبیلہ کے بارے میں مزید معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ تورا کینہ قاضی اور ایڈولف ہولم نے بھی اس کا تذکرہ ضمناً ہیروڈوٹس کے حوالے سے کیا ہے۔ یقیناً اس قبیلہ نے حوادث زمانہ سے مجبور ہو کر قدیم ایرانی خطہ کو چھوڑ کر موجودہ وسطی بلوچستان میں سکونت اختیار کی ہو گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ موجودہ ایرانی خطہ کے شمالی پہاڑوں اور مشرقی ریگزاروں میں یہ قبیلہ اب بھی موجود ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کسی دوسرے قبیلہ میں ضم ہو گیا ہو۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ اس قبیلہ نے ہخامنشی انقلاب میں مرکزی کردار ادا کیا تھا اور ہخامنشیوں کی کامیابی اور میدوں کی شکست کی وجہ بنے تھے۔ اس قبیلہ کے بارے میں بھی تحقیق کی ضرورت ہے۔

کولاچی:

یہ بھی قدیم بلوچ قبائل میں شمار ہوتا ہے جس کا تذکرہ ہیروڈوٹس کی کتاب میں ملتا ہے۔ مورخ ہیروڈوٹس اس کو اپنے لسانی لہجے میں کوپچی تحریر کرتا ہے۔ اردو زبان کے مترجم اس لفظ کو لکی ترجمہ کرتے ہیں جو درست نہیں ہے۔ اصل میں یہ قدیم بلوچ قبیلہ تھا جو شمالی اور مشرقی ایران میں آباد تھا اور میدی و ہخامنشی حکمرانوں کے ماتحت تھا۔ اس قبیلہ نے بھی ایران کی قدیم

تاریخ میں اہم عسکری کردار ادا کیا تھا اور یونانیوں کے خلاف ہخامنشی حکمران زرکسیز کی فوج میں کثیر تعداد میں شامل ہوگئے تھے۔ لہٰذا ہیروڈوٹس کے بیان کے مطابق:

"اہل فارس جنوبی یا ایریتھرینئن سمندر کے اوپر والے ملک میں آباد ہیں اُن سے اوپر شمال میں میدی ہیں، میدیوں سے آگے ساسپیری، پھر شمالی سمندر (جس میں فاسس گرتا ہے) تک کولیچی۔ ایک ساحل سے لیکر دوسرے ساحل تک کا سارا علاقہ ان چار اقوام سے آباد ہے" (ہیروڈوٹس 303:2001)۔

وہ تھرماپائیلے کی جنگ میں اس قبیلہ کی شرکت کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتا ہے،

"کولچیوں (مشہور بلوچ قبیلہ کولاچی) کے سر پر لکڑی کے خود اور ہاتھوں میں خام کھال کی چھوٹی ڈھالیں اور مخصوص نیزے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے پاس تلواریں بھی تھیں۔ ماریس) قبیلہ مری جمع کے صیغہ میں اسے Mares تحریر کیا گیا ہے (اور کولچیوں دونوں کی قیادت فیرانداتس ابنِ تیاسپس کر رہا تھا" (ہیروڈوٹس 11-508:2001)۔

قدیم نقشوں میں بھی اس قبیلہ کی موجودگی قدیم میدی اور ہخامنشی خطے میں نظر آتی ہے۔ اس نام سے اب بھی بلوچوں میں ایک بہت بڑا قبیلہ پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقے میں اس نام کا ایک قصبہ بھی ہے جہاں اسی نام کا یک بلوچ قبیلہ آباد ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے ٹانک جاتے ہوئے ڈیرہ اسماعیل سے تھوڑے ہی فاصلے پر کولاچی نام کا قصبہ واقع ہے جہاں کولاچی بلوچ قبیلہ سکونت پذیر ہے۔ اسی طرح کلانچ نامی علاقہ مکران ڈویژن کے ضلع گوادر میں واقع ہے۔ کراچی شہر کے نام کے بارے میں ہر خاص وعام یہ جانتا ہے کہ اس کا پُرانا نام کلاچی تھا۔ کراچی میں واقع ماہی کلاچی کا علاقہ اب بھی اس کے قدیم نام کی یاد دلاتا ہے۔ اس قبیلہ کی قدیم تاریخ بھی تحقیق طلب ہے۔

اربوئی یا اریبوئی (قبائلِ براہوئی):

اربوئی بلوچستان کے سابقہ دارالحکومت قلات میں ایک مشہور و معروف صحت افزا سیاحتی مقام کا نام ہے۔ یہ مقام جس پہاڑی سلسلے میں واقع ہے وہ پورا سلسلہ کوہِ وسطی اربوئی کہلاتا ہے جسے برطانوی عہد میں سلسلہ وسطی براہوئی بھی کہا جانے لگا۔ اس لفظ کو عام طور پر مقامی مورخین کی کتب میں ہربوئی لکھا جاتا ہے۔

کچھ عرصہ پیشتر تک اس لفظ یعنی اربوئی کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ یہ فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "ہر قسم کی خوشبو" ہے۔ کچھ حلقوں کا یہ بھی اصرار تھا کہ یہ لفظ انگریزوں کی اختراع کردہ ہے۔ جبکہ اس لفظ کے تحریری طور پر پہلی بار استعمال ہونے کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

قدیم یونانی تحریروں کے مطالعہ سے اس بات کے بارے میں اہم ترین انکشاف سامنے آتا ہے کہ اربوئی نام کے ایک قبیلہ نے بلوچستان کے حدود میں سکندر کی پنجاب کی مہمات سے واپسی کے دوران پہلی مزاحمت پیش کی تھی۔ اس لفظ کا تحریری استعمال اور اس کو ایک وسیع پہاڑی علاقے، ایک بڑے قبائلی گروہ اور اُن کے پانی کے ذخائر کے بارے میں سب سے پہلے ایرین نے کی۔ سکندر کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اُن کی سوانح حیات اور مہمات کے بارے میں ایرین نامی ایک مورخ نے ایک اہم اور جامع کتاب تحریر کی۔ ایرین 86ء عیسوی میں پیدا ہوئے اور دوسری صدی عیسوی میں اپنی کتاب مکمل کی۔ گو کہ انہوں نے خود کبھی بھی ہندوستان کی سیاحت نہیں کی مگر انہوں نے اپنے زمانے کی مشہور و معروف تحریروں سے استفادہ کیا۔ جن میں ارا تستھنیز اور میگا ستھنیز جیسے اعلیٰ پائے کے مورخین اور سیاح شامل تھے۔ جن کی تحریریں تاریخی اسناد مانی جاتی ہیں۔ ایرین کی تحریر "انڈیکا" بین الاقوامی معیار کی کتاب ہے کہ جس سے مورخین اکثر استفادہ

کرتے ہیں۔ یہ کتاب سکندر کے اُن مہمات و واقعات کا احاطہ کرتی ہے جو سکندر کو ایشیاء میں پیش آئے۔ اس کتاب میں بلوچستان اور ساحلِ بیلہ و مکران سے گزرنے والی سکندر کی بحری فوج کی مہم جوئی کے تفصیلی تذکرے ملتے ہیں۔ ان مہمات کے دوران ایرین ایک ایسے قبیلہ کا تذکرہ بھی کرتا ہے جس کی مڈبھیڑ سکندر کے ساتھ ہوئی تھی۔ سکندر جب سندھ سے ایران کی جانب عازم سفر ہوا تو اس نے اس سفر کے لیے بیلہ اور مکران کا راستہ اختیار کیا۔ اس کے رہنماؤں اور ان لوگوں نے جو اس علاقے سے آگاہ تھے اس کے خطرات کے بارے میں جانتے تھے سکندر کو بہت منع کیا کہ وہ اس سفر سے باز آئے مگر سکندر اپنے ارادوں پر قائم رہا۔ بلوچستان کے حدود میں داخل ہوتے وقت جس پہلے قبیلے کی مزاحمت کا یونانیوں کو سامنا کرنا پڑا اُن کو ایرین نے ''اربوئی Arboi'' تحریر کیا ہے۔ جنوبی بلوچستان کے سفر کے دوران سکندر اور اس کے امیر البحر نیر وخس کو کئی دیگر قبائل کا بھی سامنا کرنا پڑا جنہیں وہ اوریتائی، گیدروشیائی اور اچھیتافیگوئی تحریر کرتا ہے جو بلاشبہ بلوچوں کے قدیم قبائل ہوت، گدرو اور ساحلی مید تھے۔ اس پورے خطے میں سکندر کو شدید مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا اور یہ سفر اس کی تمام مہمات میں مشکل ترین سفر ثابت ہوا۔ ایرین نے اربوئی قبیلہ کا تذکرہ بلوچستان کے جن حدود میں کیا ہے اُن حدود کو بھی اسی نام سے منسوب کیا ہے جبکہ اُن کے پانی کے ذخیرے کو موصوف نے اربیئیں تحریر کیا ہے جس کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ دریائے پورالی کا قدیم نام تھا (میک کرنڈل 1986 :21-27)۔ جارج میک کرنڈل اپنی کتاب ''دی انویژن آف انڈیا بائے الیکزنڈر دی گریٹ'' میں بھی اس قبیلہ کا تذکرہ کرتا ہے۔ میک کرنڈل کی یہ مشہور کتاب بھی انڈیکا کے حوالوں پر مشتمل ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ ایرین کی کتاب کا انگریزی ترجمہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔ وہ بھی موجودہ جھلاوان کے علاقے سے سکندر کے گزرنے کے دوران اربوئی قبیلہ کا تذکرہ کرتا ہے (میک کرنڈل 1986 :21-27)۔ مشہور و

معروف مورخ ونسنٹ اے سمتھ بھی اپنی مشہور زمانہ کتاب ”اینشنٹ ہسٹری آف انڈیا“یعنی قدیم تاریخ ہند میں اس قبیلہ کا تذکرہ اربوی کے نام سے کرتا ہے۔ سمتھ بھی ایرین سے استفادہ کرتے ہوئے اس قبیلہ اور ان کے علاقے کو اربوئی کا نام دیتا ہے جبکہ دریائے پورالی کو ہی قدیم اربیئس لکھتا ہے (سمتھ 2001 :126)۔ مشہور مورخ ہیرلڈلیم بھی اپنی مشہور زمانہ کتاب ”الیگزنڈر دی گریٹ“ میں اس قبیلہ کا تذکرہ اسی نام سے کرتا ہے (ہیرلڈلیم 2006 سیکنڈ ایڈیشن:300)۔ الغرض وہ تمام مورخین جو سکندر کی ہندوستانی مہمات اور سفر مکران ولسبیلہ کے بارے میں لکھتے ہیں وہ اس قبیلہ کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں۔

ہیروڈوٹس کا زمانہ ایرین سے صدیوں پہلے کا تھا۔ دونوں میں تقریباً چھ سو سال کا فرق ہے۔ ہیروڈوٹس نے اپنی کتاب میں ایک قبیلہ کا تذکرہ ایشیائی حبشی کے نام سے کیا ہے اور انہیں اس لیے افریقی حبشیوں سے مختلف لکھا ہے کیونکہ ان کے بال سیدھے تھے جبکہ افریقیوں کے بال گنگریالے تھے۔ جرمن مورخ ایڈولف ہولم کے بیان کے مطابق وہ قبائل جنہیں ہیروڈوٹس نے ایشیائی حبشی کہا ہے دراصل جھلاوان کے براہوئی تھے (ایڈولف ہولم 1987 :615)۔

گمان کہتا ہے کہ اصل لفظ اربوئی ہے جسے بعد ازاں بگاڑ کر براہوئی بنا دیا گیا۔ اور جن قبائل کا تذکرہ اربوئی کے نام سے آیا ہے وہ دراصل جھلاوان کے براہوئی قبائل تھے جو اپنے قدیمی مسکن کوہِ اربوئی کے باشندے تھے اور ان پہاڑوں اور پہاڑی وادیوں میں رہتے تھے۔ یونانی مورخ جارج میک کرنڈل انہی قبائل کو اربوئی کا نام دیتا ہے اور اُن کے پہاڑی سلسلے کو بھی اسی نام سے موسوم کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سکندر کا پہلا حملہ خضدار کے قریب ہوا تھا جہاں سے آگے سلسلہ اربوئی ختم ہو جاتا ہے اور پب اور کیرتھر کی پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ بات ذہن میں ہو کہ شہداد کوٹ کی جانب سے ضلع خضدار میں داخلے کا ایک اور خفیہ راستہ بھی ہے جہاں زمانہ قدیم

کے لاتعداد آثار اور قدیم قبرستان پائے جاتے ہیں۔ راقم الحروف نے اپنی ایک کتاب ''بلوچستان کے تہذیبی نقوش'' میں اس مقام کا تذکرہ کیا جہاں ایک قدیم اور اونچے قلعے کے شکستہ آثار پائے جاتے ہیں۔ اس مقام کو شاری دمب کہا جاتا ہے (بلوچ2012: بلوچستان کے تہذیبی نقوش:85-87)۔ یہاں سے خضدار کا فاصلہ لگ بھگ ایک سو دس کلومیٹر بنتا ہے جو مکمل پتھریلا راستہ ہے۔ یہ راستہ موجودہ تعمیر شدہ راستہ نہیں ہے جو ونگو روڈ کہلاتا ہے اور جھل مگسی کو خضدار سے منسلک کرتا ہے بلکہ شاری دمب کا راستہ مختلف ہے اور ونگو روڈ سے کافی دور اور پیچیدہ پہاڑی سلسلے کے اندر واقع ہے۔ شاری دمب کا قدیم مسمار شدہ قلعہ ایک معمہ ہے جسے حل کرنے کی جانب توجہ دینا چاہیے۔ ممکن ہے یہی قدیم قلعہ اربوئی قبائل کا مرکز ہو یا ممکن ہے کہ یہ قلعہ بعد ازاں زیرِ استعمال لایا گیا ہو بہرحال اس قلعہ پر تحقیق سے امکان یہی ہے کہ یہاں کی قدیم تاریخ اور باشندوں کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

درج بالا بیانات اور مورخین کی تحریروں کے اقتباسات سے یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ جھلاوان اور سراوان کے مابین شمالاً جنوباً پھیلا ہوا یہ پہاڑی سلسلہ جو کوہِ ہربوئی کہلاتا ہے دراصل ابھی تک اپنے قدیم ترین نام سے منسوب ہے۔ اس پہاڑی سلسلے میں رہنے والے باشندوں کو یونانی اربوئی قبائل کا نام دیتے تھے۔ امکان ہے کہ یہی قبائل بعد ازاں براہوئی کے نام سے موسوم ہوتے گئے جبکہ ان کا پہاڑی سلسلہ اپنے قدیمی نام کے ساتھ ساتھ کوہِ وسطی براہوئی بھی کہلانے لگا۔

میکرونی، موسینوکوئی یا موسینوشی، مری، میکوئی قبائل:

بابائے تاریخ ہیروڈوٹس کی کتاب میں کئی ایسے قبائل کے تذکرے ملتے ہیں جو اپنے علاقائی ناموں سے منسوب تھے یا پھر یونانی مورخ نے اپنے طریقہ تاریخ نویسی کے مطابق ان قبائل کو اُن کے علاقائی ناموں سے منسوب کیا۔ جیسا کہ ہیروڈوٹس کے بعد آنے والے یونانی

مورخین نے اپنی تحریروں میں کیا۔ جس طرح ہیروڈوٹس نے پیریکان (پیریکانیہ) کے باشندوں کو پیریکانی، کرمان کے باشندوں کو کرمانی وغیرہ لکھاہے اسی طرح خطہ مکران کے باشندوں کو بھی ان کے علاقائی نام سے منسوب کیاہے۔ وہ اپنی کتاب میں کئی جگہوں پر مکران کے باشندوں کو یونانی لہجے میں میکرونی (Macronian) لکھتاہے۔ ہیروڈوٹس کی کتاب کے انگریزی زبان کے ایک ترجمے میں جسے(G. C. Macaulay:147 ،235،491) نے تحریر کیاہے، میکرونی قبائل کا تذکرہ کئی صفحات پر کیا گیاہے۔ اس کتاب کے صفحات،147 ،235اور491پر ان قبائل کا تذکرہ ملتاہے۔ یہ قبائل مید اور ہخامنشی ادوار میں خطے کی افواج میں شامل ہونے کے ساتھ مرکزی حکومت کو رائلٹی بھی ادا کرتے تھے۔ ہیروڈوٹس نے ان قبائل کے ساتھ ساتھ مکران میں یا اس سے منسلک علاقوں میں کئی دیگر قبائل کا بھی تذکرہ کیاہے جو مرکزی حکومت مادستان اور پارس گرد کے ماتحت تھے اور اُسے فوجی و مالی معاونت فراہم کرتے تھے۔ ان قبائل کے نام بھی موجودہ بلوچ قبائل میں تھوڑی سی ردوبدل کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان میں ایک قبیلہ کو موسینوئی یا (Mossynoicoi) تحریر کیا گیاہے ممکن ہے کہ یہ ممتاز بلوچ قبیلہ ماسنی یا پھر قبائل زہری کی مشہور شاخ موسیانی کا یونانی تلفظ ہو۔(G. C. Macaulay:235 ،491)سی طرح ان دو قبائل کے ساتھ ایک اور قبیلہ کا بھی تذکرہ ملتاہے جو انگریزی میں (Mares) تحریر ہے۔ یہ لفظ اور نام بھی باقی الفاظ اور ناموں کی طرح جمع کے صیغہ میں استعمال ہواہے۔ یہ کسی شبہ کے بغیر مشہور و معروف اور کثیر التعداد مری قبیلہ کا نام ہے کہ جسے یونانی مورخ نے اپنے طرز تاریخ نویسی کے مطابق واحد کی بجائے جمع کے صیغے میں تحریر کیاہے۔ کتاب میں اس قبیلہ کا تذکرہ بھی درج بالا قبائل کے ساتھ آیاہے جو یکجا طور پر مرکزی حکومت کو مالی و عسکری معاونت فراہم کرتے تھے۔ ان کے ساتھ کئی دیگر قبائل کے تذکرے بھی اس کتاب میں ملتے ہیں جو خطہ مکران

اور اس سے متصل علاقوں میں آباد تھے۔ ان میں میکوئی (لفظ ماکا سے ماخوذ ہے جو مکران کا فارسی زبان میں تلفظ تھا)، مائشی (ممکن ہے قبیلہ ماشی) قبائل کے تذکرے بھی شامل ہیں۔

ہیروڈوٹس کے یہ بیانات غور طلب ہیں کیونکہ ان قبائل کے ناموں کو یونانی کی بجائے مقامی بلوچی تلفظ میں ادا کیا جائے تو ممکن ہے کہ یہ موجودہ بلوچ قبائل کے ناموں سے ہی مماثلت رکھتے ہوں۔ ظاہر ہے ہیروڈوٹس مغربی باشندہ تھا۔ اس کی اپنی زبان اور اس کا اپنا تلفظ اور ادائیگی لسان تھا۔ آج بھی کوئی مغربی باشندہ مشرقی ناموں کی ادائیگی جس لہجہ اور تلفظ میں کرتا ہے وہ مقامی لہجے سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ اگر اُن کے ادا کردہ تلفظ کی روشنی میں موجودہ ناموں کو انگریزی الفاظ میں لکھا جائے تو یقیناً اُن کے الفاظ مقامی لہجے اور لسانی ادائیگی سے مختلف ہوں گے۔ جیسا کہ ایک مغربی باشندہ لفظ ''بلوچ'' کو مقامی باشندوں کی طرح ادا نہیں کر سکتا۔ اب اگر اس کے ادا کردہ لفظ بلوچ کے انگریزی الفاظ لکھے جائیں تو وہ کبھی بھی Baloch نہیں ہوں گے۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت ہی نہیں پاکستان کے دیگر اقوام بھی لفظ بلوچ کو اُس طرح ادا نہیں کر سکتے جس طرح خود بلوچ باشندے ادا کرتے ہیں۔ پنجابی زبان میں لفظ بلوچ کو بِلوچ یعنی (Biloch) یا بُلوچ (Buluch) بولا جاتا ہے۔ سندھی جو بلوچوں کے قدیمی ہمسایے ہیں وہ بھی لفظ بلوچ کو اپنی زبان میں بھروچ یا بروچ جبکہ ہمسایہ پشتون قبائل بلوس اور عرب اس لفظ کو بلوش، بلوص یا بلوس لکھتے اور ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر یہ اقوام بلوچوں کے قبائلی ناموں کو اپنے لسان میں ادا کریں تو وہ یقیناً مقامی ادائیگی اور اصل نام سے مختلف ہوں گے۔ اسی طرح یونانی زبان کی ادائیگی بھی مختلف تھی۔ یونانی مورخین مقامی قبائل کو اُن کے شہریتی و علاقائی ناموں سے منسوب کرتے ہوئے اُن کے ناموں کو اکثر و بیشتر جمع کے صیغہ میں استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا یوت کو یوتین، میکرونی کو میکرونین اور مری کو مریس تحریر کیا گیا ہے۔

معروف مسلمان مورخ اور بابائے عمرانیات و مسلم تاریخ نویسی علامہ عبدالرحمن ابنِ خلدون اپنی مشہور زمانہ کتاب تاریخ ابنِ خلدون میں بھی مری قبیلہ کا تذکرہ کرتا ہے جو مکران سمیت مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک میں سرگرم تھا اور بھرپور سیاسی کردار ادا کر رہا تھا۔ ان کے کئی زعمأ کے تذکرے انہوں نے اپنی کتاب میں کیے ہیں جو بڑے مالدار اور صاحب املاک تھے۔ وہ ایک مری امیر کے بارے میں لکھتا ہے:

> "عضد الدولہ نے اپنی فوجیں بلادِ ہکاریہ پر (صوبجات موصل) کے سر کرنے کیلئے روانہ کی تھیں۔ اس نے ان قلعوں کا محاصرہ کر لیا۔ رسد و غلہ کی کمی سے اہلِ قلعہ پریشان ہوگئے تھے، چونکہ سردی کا موسم تھا برف پڑنے کا انتظار کر رہے تھے۔ خواہ مخواہ برفباری کی وجہ سے مخالف فوج محاصرہ اُٹھا کر چلی جائے گی۔ اتفاق یہ کہ برفباری میں تاخیر ہوئی، مجبور ہو کر اہلِ قلعہ نے امان طلب کی اور قلعہ سے موصل کی طرف اُتر آئے۔ عضد الدولہ کے لشکر نے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور سالارِ لشکر نے اہلِ قلعہ کے ساتھ بدعہدی کی اور سب کو قتل کر ڈالا۔ اسی اطراف میں ابو عبداللہ مری کے قبضہ میں چند قلعے تھے ان میں سے ایک قلعہ میں وہ خود رہتا تھا۔ یہ قلعہ نہایت مستحکم بنا ہوا تھا۔ اس میں عمدہ عمدہ مکانات تھے۔ عضد الدولہ نے ابو عبداللہ مری کو مع اس کی اولاد کے گرفتار کر کے قید کر دیا اور تمام قلعوں کا مالک بن بیٹھا۔ پھر انھیں صاحب بن عباد نے بعد میں قید سے رہا کیا۔ ابو عبداللہ کے لڑکوں میں سے ابو طاہر کو اپنی کتابت کی خدمت عطا کی، یہ نہایت خوشخط اور اعلیٰ درجہ کا منشی تھا" (ابنِ خلدون 2009 :669)۔

مری کی قدیم ریاست اور شہر کا تذکرہ بھی قدیم کتب میں ملتا ہے جو عراق کی قدیم تہذیب کے دوران مشرقِ وسطیٰ میں واقع تھا (مری1989 :29-30)۔ اس قبیلہ نے تاریخ میں ہمیشہ متحرک کردار ادا کیا ہے اور اپنے وجود کو زندہ رکھا ہے۔ دورِ حاضرہ میں بلوچ قبائل میں اس نام سے ایک بہت بڑا اور مشہور و معروف قبیلہ ہے جس نے بلوچستان کی تاریخ میں سب سے

زیادہ متحرک سیاسی و عسکری کردار ادا کیا ہے۔ احمد زئی عہد، انگریزی نو آبادیاتی دور اور موجودہ عہد میں یہ قبیلہ سیاسی و عسکری لحاظ سے ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔ بلوچ قبائل میں مری کے بے مثال مزاحمتی کردار کو ضرب المثل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

بلوچوں کے براہوائی سٹاک سے تعلق رکھنے والا قبیلہ مامشئی بھی قدیم اور اولین بلوچ قبائل میں شمار ہوتا ہے۔ اس قبیلہ کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ یہ براہوئی سٹاک کا ایک خانہ بدوش قبیلہ ہے مگر یہ رائے درست نہیں ہے۔ خطے کے دیگر بلوچ براہوئی قبائل کی طرح اس قبیلہ کے بھی کچھ خاندان موسموں کی مناسبت سے اندرونِ ملک یا زیادہ سے زیادہ سندھ تک نقل مکانی کرتے ہیں اور موسم کے بہتر ہوتے ہی واپس اپنے اپنے قصبوں اور دیہاتوں میں لوٹ آتے ہیں۔ دورِ حاضرہ میں یہ قبیلہ بلوچستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہے اور اس کی آبادی پھیلی ہوئی مگر منتشر حالت میں ہے۔ ان کا مرکزی علاقہ مستونگ ہے جہاں ان کا قبائلی سردار سکونت رکھتا ہے۔ گمان یہی ہے کہ ہیروڈوٹس نے اپنی کتاب میں جس قبیلہ کو ماشئی یا موئشی (Moschoi) تحریر کیا ہے اصل میں موجودہ مامشئی قبیلہ ہی تھا جسے ہیروڈوٹس نے اپنے لہجے میں بیان کیا ہے اور ساتھ ہی اس کو میکرونی، کولچی یا کولیچی، الرودین، ساسپیری، موسینوئی قبائل کے ہمسائے میں رہنے والا قبیلہ بیان کیا ہے اور یہ بھی کہ یہ قبیلہ انہی قبائل کی طرح سیاسی و سماجی کردار ادا کرتا تھا۔ جنگوں میں وہ کولیچیوں کی طرح جنگی لباس اور ہتھیار استعمال کرتا تھا (ہیروڈوٹس ترجمہ: میکالے:235، 491)۔

موجودہ عہد میں بھی مامشئی قبیلہ رودینی اور سرپرہ قبائل کی قربت میں ہی رہتا ہے۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ یونانی مورخ نے جن قبائل کو الرودین یا الارودیئن (Alarodians) اور ساسپیریئن (Saspeirian) تحریر کیا ہے (ہیروڈوٹس ترجمہ: بائے میکالے:492، 282، 281، 235، 50، 48)۔

وہ بلوچوں کے براہوئی سٹاک کے مشہور و معروف قبائل رودینی اور سرپرہ ہوں۔ ان قبائل کے بارے میں بھی عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ براہوئی سٹاک کے قدیم قبائل ہیں۔

یہ تمام قبائل میدوں کے دست و بازو ہوتے تھے مگر جب میدوں کی حکومت میں زوال کے آثار نمایاں ہونے لگے تو ان قبائل کی اکثریت نے ہخامنشی آریاؤں کا ساتھ دیا اور میدوں کی سلطنت کے خاتمے کا سبب بنے۔ ان کے جغرافیائی حدود کے بارے میں ہیروڈوٹس جو بیانات دیتا ہے وہ موجودہ ایرانی، افغانستانی اور پاکستانی بلوچستان کے ان علاقوں سے مماثلت رکھتے ہیں جہاں ان قبائل کے مرکزی سربراہ سکونت رکھتے ہیں۔ وہ ان قبائل کو مکران، سیستان، رخشان، وسطی بلوچستان (سراوان و جھلاوان)، جنوبی خراسان، کرمان، صحرائے لوط، کوہِ البرز وغیرہ کے حدود میں آباد تحریر کرتا ہے۔ اور انہیں ایران میں قائم ہونے والی مختلف حکومتوں میں اہم کردار ادا کرنے والی آبادیوں میں شمار کرتا ہے۔ جو نہ صرف عسکری بلکہ سیاسی حوالے سے بھی بھرپور کردار ادا کر رہے تھے۔ ان قبائل کے بلوچ ہونے کا گمان اس لیے بھی ہوتا ہے کیونکہ جن قبائل کو ہیروڈوٹس نے اُن کے قبائلی اور علاقائی ناموں سے اپنی کتاب میں جگہ دی، ہیروڈوٹس کے پندرہ سو سال بعد آنے والے منظوم تاریخ نویس ابوالقاسم فردوسی نے انہی قبائل کو بالکل انہی واقعات اور حالات میں بیان کیا ہے جن میں ہیروڈوٹس نے انہیں بیان کیا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ ہیروڈوٹس ان کے قبائلی اور علاقائی نام تحریر کرتا ہے اس کے برعکس ابوالقاسم فردوسی ان کو کوچ و بلوچ لکھتا ہے۔

سپاہی بیا مد زہر کشوری
زگیلان و زدیلمان لشکری
زکوہ بلوچ و زدشت سروچ
گرازان برفتند گردان کوچ

مزید لکھتا ہے کہ:

دو منزل بیا مدیکی بادخاست
وزوبرف باکوہ و درگشت راست
زسرماو برف اندرآن روزگار
تبہ شدبسی مردم پایکار
برآمدیکی ابرودودی سیاہ
برآتش ہمی رفت گفتی سپاہ
زرہ کتف آزادگان رابسوخت
زنعل سواران زمین برفروخت
بدین ہم نشان تابشہری رسید
کہ مردم بسان شب تیرہ دید
فروہشتہ لفچ و بر آوردہ کفچ
بکردار قیروشبہ کفچ و لفچ

دشت لوط کے بلوچوں کے ایک امدادی لشکر کے بارے میں لکھتا ہے کہ،

یکی لشکر آمدز پہلوبدشت
کہ ازگرد ایشان ہواتیرہ گشت
سرا پردہ و خیمہ زدہ بردومیل
بپوشیدگیتی بنعل و بپیل

(فردوسی، مسکوپرنٹ: سال اشاعت ندارد: 91)

اس طرح ابوالقاسم فردوسی ان پہاڑی اور ریگستانی قبائل کے لشکروں کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں جابجا کوچ و بلوچ تحریر کرتا ہے۔ بلاشبہ یہ وہی قبائل تھے جن کے علاقائی اور قبائلی

نام ہیر وڈوٹس نے اپنی کتاب میں تحریر کیے ہیں۔ ان میں کئی بلوچ قبائل شامل تھے جبکہ جغرافیائی حدود، سیاسی دور اور واقعات وہی ہیں جو ہیر وڈوٹس نے بیان کیے ہیں۔

الشاری:

بلوچوں کے دو بڑے قبائل رند اور لاشار کا تاریخی پس منظر بہت ہی دلچسپ اور تاریخی واقعات سے بھرپور ہے۔ یہ قبائل بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں اُس وقت منظر عام پر آئے جب سیستان کے علاقے سے ان کے چند بڑے گروہوں نے منگول حملوں اور چند دیگر وجوہات کی بناء پر وہاں سے ہجرت کی اور دشت لوط کے ایرانی حصے اور مکران کی جانب چلے آئے۔ بعد ازاں ان قبائل نے مکران میں ایک بڑے یونین کی شکل اختیار کی اور پندرہویں صدی کے وسط میں انہوں نے مکران میں اپنی حاکمیت کی بنیاد رکھی۔ ان کی حکومت نیم جمہوری نظام پر مشتمل تھا۔ اس عہد میں ہونے والی شاعری کے مطابق یہ چوالیس قبائل پر مشتمل ایک بڑا قبائلی یونین تھا جو عسکری اور معاشی طور پر خوب مستحکم تھا۔ اس یونین کا اقتدار 1450ء میں قائم ہوا اور پھر اس کی لہریں مشرق کی جانب بڑھنے لگیں حتیٰ کہ یہ قبائل یلغار کرتے ہوئے ہندوستان تک پہنچ گئے۔ ان قبائل کا دور بلوچی زبان و ادب کا کلاسیکی دور کہلاتا ہے کہ جب ایک بڑے ادب نے جنم لیا۔ آج بلوچی زبان کے قدیم دور کا تمام تر ادب انہی قبائل کے چھوڑے ہوئے اثاثوں پر مشتمل ہے۔ ان قبائل نے کئی مقامی حکومتوں کا خاتمہ کرتے ہوئے ایک وسیع و عریض ریاست قائم کی جو شرقاً غرباً دریائے سندھ کے مغربی کناروں سے کرمان کے صحراؤں تک پھیلی ہوئی تھی جبکہ شمالاً جنوباً جنوبی افغانستان سے ساحلِ مکران تک اس کی وسعت تھی۔ مگر ایک بڑی خانہ جنگی کی وجہ سے اس قبائلی یونین کی حاکمیت ختم ہوگئی اور مقبوضہ علاقے ان کے ہاتھوں سے نکل گئے۔

اس یونین میں چوالیس قبائل شامل تھے جو دو بڑے قبائلی گروہوں میں تقسیم تھے۔ ان میں ایک قبیلہ رند کہلاتا تھا جس کے ماتحت رند سمیت بیس قبائل تھے جبکہ دوسرا گروہ لاشاری کہلاتا تھا جو چوبیس قبائل پر مشتمل تھا۔ اس طرح ان تمام قبائل نے سیستان سے نکلنے کے بعد خود کو منظم کیا اور زبردست سیاسی و عسکری قوت کی شکل اختیار کی اور بلوچ تاریخ ہی نہیں بلکہ ایشیاء کی تاریخ میں بھی خود کو منوایا۔

اس قبائلی یونین کے بارے میں اکثر و بیشتر غلط آراٗ قائم کیے جاتے ہیں۔ مورخین اس قبائلی یونین کی شاعری کی غلط تشریحات کر کے انہیں نہ صرف عربستان سے آنے والا گروہ ثابت کرتے ہیں بلکہ انہیں نسلاً بھی سامی النسل اقوام کلدانی اور عرب سے ملاتے ہیں۔ ان کی طویل شاعری کو سب سے پہلے لانگ ورتھ ڈیمز نے کتابی شکل دی۔ بعد ازاں دیگر بلوچ اہلِ قلم حضرات نے بھی اس سلسلے میں اپنی تحریریں شائع کیں۔ اس شاعری میں بعض مقامات پر ایسے نام آئے ہیں کہ جن کی پوری وضاحت موجود نہیں ہے مگر جن لوگوں نے ان کی شاعری پر کام کیا ہے انہوں نے تشریحات میں بعض مقامات، شخصیات اور واقعات کو عربوں سے جوڑنے اور ان قبائل کو عرب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں بعض اہل قلم حضرات تو اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ ان قبائل کو نہ صرف حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے چچا حضرت امیر حمزہؓ کی اولاد لکھتے ہیں بلکہ تمام بلوچ قوم کو انہی کی باقیات اور نسل قرار دیتے ہیں۔

ان کے بارے میں گذشتہ اوراق میں کافی تفصیلات بیان ہو چکی ہیں۔ کہ بلوچ ان قبائل کے ایک عظیم ہیرو میر حمزہ کی اولاد نہیں ہیں البتہ میر حمزہ ان قبائل میں ایک عظیم ہیرو گزرے ہیں جنھوں نے سیستان، مکران، خراسان اور دشت لوط کے بلوچ قبائل کی قومی آزادی کی طویل جنگ لڑی اور 177 ھجری سے لے کر 213 ھجری یعنی اپنی وفات تک عباسی عربوں کے خلاف

رزم آرائیاں کرتے رہے۔ ان کے عظیم کردار کی وجہ سے ان کا قبیلہ اور دیگر بلوچ قبائل اُن سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ لہٰذا اس سبب سے وہ میر حمزہ کو عقیدتاً ایک باپ اور محافظ کا درجہ دیتے تھے۔ لہٰذا بعد میں آنے والے شاعر نے اپنی شاعری میں اسی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

اولادوں مامیریں حمزہء

وگرنہ شاعر کا مقصد اور کچھ نہ تھا۔ انہی قبائل میں جب چاکر اعظم نے اپنا نام تاریخ میں رقم کروایا تو شاعر نے بے ساختہ کہا:

ماچاکریں اولادیں گواہرامء دلء بندیں

یقیناً یہ الفاظ بھی عقیدت میں بولے گئے ہیں وگرنہ سب جانتے ہیں کہ تمام بلوچ چاکر کی اولاد نہیں ہیں بلکہ چاکر کے عظیم الشان کردار کی وجہ سے قبائل عقیدتاً انہیں یہ درجہ پدری دیتے ہیں۔

بات ہو رہی تھی لاشاری قبائل کی جو بلوچ قوم کے قدیم قبائل میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی تاریخ گو کہ بہت قدیم ہے اور پیشدادی اور میدی خاندانوں کی حکمرانی تک ان کی تاریخ کی قدامت کے شواہد دستیاب ہیں مگر لاشاری کے نام سے ان کی تاریخ عباسی عہد کی تحریروں سے ثابت ہوتی ہے اور اس نام سے ان کا تاریخ میں کردار علاقہ سیستان سے شروع ہوتا ہے۔ دراصل عرب مورخین سیستان کے دارالخلافہ ''زرنگ'' کے دو نام تحریر کرتے ہیں یعنی اسے ''زرنگ'' لکھتے ہیں جو اس کا اپنا نام ہے البتہ عربی زبان میں لفظ ''گ'' کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کی جگہ لفظ ''ج'' لکھتے ہیں اور اسے ''زرنج'' تحریر کرتے ہیں۔ بعض اوقات اس شہر کو سیستان کی مناسبت سے ''شہر سیستان'' اور اختصار کے ساتھ ''شہرستان'' بھی تحریر کرتے ہیں (سٹر یئج 1986 :505)۔ عرب تحریروں میں شہرستان کے باشندوں کو الشاری تحریر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ بھی ایک

علاقائی اور شہریتی نام ہے نہ کہ اجدادی نام۔ جس طرح بلوچی شاعری میں ان قبائل کو بھی رند اور ہوت قبائل کی طرح میر جلال خان کی اولاد سے منسوب کیا جاتا ہے اور انہیں ان کے کسی بیٹے لاشار سے جوڑا جاتا ہے۔ عرب تحریروں میں سیستان کے دارلخلافہ رزنج سے تعلق رکھنے والے کئی مشاہیر کے اسمأ کے آخر میں الشاری لکھا گیا ہے۔ بابا میر حمزہ کے نام کے آخر میں بھی الشاری لکھا گیا ہے یعنی حمزہ الشاری۔ اسی طرح عمر الشاری اور کئی دیگر زعمأ کے نام تاریخی کتب میں ملتے ہیں۔ یونانی مورخین سیستان کے دارلخلافہ زرنگ کے باشندوں کو بھی اُن کے شہریتی نام سے اپنی کتب میں جگہ دیتے ہیں اور انہیں زرنگی (زرنجی) لکھتے ہیں۔ بعض فارسی تحریروں میں بھی انہیں زرنگی اور زرنجی کے نام سے تحریر کیا گیا ہے۔ تاریخی شواہد اس بات کی بھی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ قبیلہ دراصل قدیم سیستانی ہیرو اور شاہنامہ فردوسی کے مرکزی کردار رستم اور اس کے اجداد سے تعلق رکھتا تھا۔ اس موضوع پر راقم الحروف اپنی کسی اور تصنیف میں دلائل و شواہد کے ساتھ بحث کریں گے جو زیرِ تحقیق ہے۔ ان سطور میں مقصد صرف لاشاری قبائل کا پس منظر بیان کرنا ہے۔ بلوچ تاریخ میں لاشاریوں کو پندرہویں صدی عیسوی کا قبیلہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بلوچ شاعری اسی دور سے یا اس سے کچھ قبل کے عہد سے دستیاب ہے۔ اس شاعری کی وجہ سے ہی بلوچ اور دیگر مورخین لاشاری قبیلہ کے نام سے متعارف ہوئے۔ بلوچ منظوم تاریخ کے علاوہ بھی اسی عہد اور اسی خطے سے متعلق دیگر زبانوں کی تواریخ بھی دستیاب تھیں کاش مورخین نے اپنے مطالعہ کا رُخ صرف بلوچی شاعری اور برطانوی بیانات تک محدود رکھنے کی بجائے اسی عہد کی اس خطے اور یہاں کے باشندوں کے متعلق فارسی اور عربی زبانوں میں تحریر شدہ مواد کا بھی مطالعہ کیا ہوتا تو یقیناً اب نہ تو بلوچوں کی قدیم تاریخ کو تلاش کرنے کی ضرورت ہوتی اور نہ ہی قدیم بلوچ قبائل کے بارے میں ورق گردانی کرنا پڑتا۔ بابا حمزہ کی وفات کے بعد بھی

یہ قبائل سیستان میں رہے۔ جب بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں منگولوں کی یلغار شروع ہوئی تو جہاں وسط ایشیاء کے باشندے اس یلغار سے بُری طرح متاثر ہوئے تو سیستان موجودہ افغانستان اور ایران کے خطے بھی اس سے محفوظ نہ رہے حتیٰ کہ پورا وسط ایشیاء اس طوفان کی لپیٹ میں آیا۔ جہاں دیگر خطوں سے ہجرتیں شروع ہوئیں اور پناہ کی تلاش میں لوگوں کے غول کے غول محفوظ مقامات کی جانب راہِ فرار اختیار کرنے لگے تو سیستان سے بھی لوگوں کی بڑی ہجرت ہوئی اور یہاں کے باشندوں کی اکثریت نے ایرانی صحرا اور مکران کے محفوظ مقامات پر پناہ لی۔ انہی قبائل میں الشاری یعنی شہرِ سیستان (زرنج) کے باشندے بھی بڑی تعداد میں شامل تھے۔ مکران میں ان قبائل نے الشاری کی مناسبت سے لاشاری کا نام پایا اور اسی نام سے ایک قصبہ قائم کیا جو اب بھی قائم اور آباد ہے۔ لہٰذا ان قدیم قبائل کو جو سیستان کے قدیم بلوچ خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں کو پندرہویں صدی کے انہی قبائل کے ایک معروف سردار میر جلال خان کے بیٹے لاشار سے منسوب کرنا یقیناً درست نہیں ہو گا۔

منوجانی، سیرجانی، باریزی، خاشکی، جاسکی، حروسیہ وغیرہ:

عرب مورخین ایران کے مشرقی صحراؤں میں ایک قصبہ کا بار بار تذکرہ کرتے ہیں جو اس خطے میں ہمیشہ اور بالخصوص کرمان کی سیاست اور اس صحرائی خطے میں کافی اہمیت کا حامل تھا۔ اس قصبہ کے تذکرے ابنِ خردادبہ، ابنِ حوقل، المقدسی، ابنِ خلدون، عبداللہ یاقوت، ناصر خسرو حتیٰ کہ وہ تمام سیاح جو اس خطے سے گزرے ہیں اور وہ مورخین جنہوں نے اس خطے کی تاریخ لکھی ہے انہوں نے اپنی تحریروں میں اس قصبے کا تذکرہ ”منوجان“ کے نام سے کیا ہے۔ اسے ”منوقان“ بھی لکھا جاتا ہے (سٹرینج: 1986: 480-502)۔ یہاں کے باشندے بلوچ تھے اور اب بھی اس صحرا کے طول و عرض میں جتنے بھی قصبے اور دیہات ہیں ان کے باشندے بلوچ

ہیں جن میں زیادہ تر اپنے اپنے علاقائی اور شہریتی ناموں سے موسوم ہیں بالکل اسی طرح ماضی میں بھی اس صحرائی علاقے کے باشندے اکثر اپنے علاقائی ناموں سے جانے جاتے تھے۔ لہٰذا قصبہ منوجان کے باشندے منوجانی کہلاتے تھے۔ اسی طرح کئی قصبات مزید بھی تھے جن کے باشندے اپنے اپنے قصبات کے ناموں سے موسوم تھے۔ سیر جانی، بامی، باریزی، قفصی، جاسکی، حروسیہ، خاشکی وغیرہ وہ لوگ تھے جو اپنے اپنے قصبات اور علاقوں کے ناموں سے موسوم تھے۔ ان ناموں میں سے اکثر نام والے قصبات اب بھی ایران کے مشرقی صحرا یعنی صحرالوت میں ملتے ہیں، جیسا علاقہ جاسک، علاقہ خواش، باریز (سیستان کا پہاڑی سلسلہ باریزی)، بم وغیرہ۔ ان ہی باشندوں کو یہی عرب اور فارسی مورخین بعض اوقات کوچ و بلوچ بھی تحریر کرتے ہیں جنھوں نے عرب اور ان سے قبل آرین ادوار میں کبھی بھی ان اقوام کو جم کر اپنے خطے پر حکومت نہیں کرنے دیا اور ان کے خلاف ہمیشہ شورشیں اور بغاوتیں برپا کرتے رہے۔ ایران کے مشرقی صحرا کے کئی قریوں اور قصبوں کا تذکرہ عرب سیاح کرتے ہیں اور ان قریوں کے باشندوں کو بلوچ یا کوچ و بلوچ (قفص و بلوص / قفس و بلوس) تحریر کرتے ہیں۔ بعض اوقات کوچ و بلوچ کے علاوہ ان کے علاقائی نام بھی تحریر کرتے ہیں یعنی جس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں انہیں انہی سے منسوب اور موسوم کرتے ہیں۔ آج بھی یہ طریقہ کار بلوچ قبائل میں موجود ہے کہ وہ اپنے علاقائی ناموں کو اپنے نام کے ساتھ لکھتے ہیں۔ جیسا کہ قصرقندی، چاہ بہاری، گوادری، پنجگوری، بمپوری، دشتیاری، خضداری۔ نوشکوی، مستونگی، گنجابوی وغیرہ۔ بعض حضرات ان ناموں کو ان کے قبائلی نام سمجھتے ہیں حالانکہ یہ درست نہیں ہے۔ مگر یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اول تو یہ طریقہ کار کافی قدیم ہے دوم یہ کہ قدیم قبائل زیادہ تر تاریخی کتب میں اپنے علاقائی ناموں کے ساتھ مذکور رہوئے ہیں۔

کلوئی:

یہ رند یونین میں شامل ایک قدیم اور معروف قبیلہ ہے جو کوئٹہ اور ڈھاڈر سمیت بلوچستان کے مختلف علاقوں میں سکونت رکھتا ہے اور رند قبیلہ کی ایک شاخ کہلاتا ہے۔ رند سردار ہی ان کا قبائلی سربراہ ہے۔ یہ بھی دراصل عرب دور میں منظر عام پر آنے والا قبیلہ ہے جو آل بویہ کے کرمان اور اس سے متصل علاقوں پر حملہ آور ہونے کے بعد اپنے مزاحمتی عسکری کردار کی وجہ سے مورخین کی کتب کی زینت بنا۔ ابنِ خلدون سمیت وہ تمام مورخین اس قبیلہ اور ترک حکمران خاندانوں کے مابین ہونے والی لڑائیوں کی تصدیق کرتے ہیں جن میں فریقین کو شدید نقصانات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ابنِ خلدون نے اس قبیلہ کے سردار کا نام علی الکلونہ (ابنِ خلدون 1971 :639) جبکہ ابنِ مسکویہ نے علی الکلاوی تحریر کیا ہے (جسٹس مری۔ ازمنہ بلوچ)۔ ابنِ مسکویہ اور ابنِ خلدون نے کلوہی سردار علی الکلوہی کے مابین لڑائیوں کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیا۔ ان تفصیلات کو آل بویہ کے عنوان میں چوتھے باب میں شامل کیا گیا ہے۔ ذیل میں صرف ایک جھڑپ کے بارے میں مختصراً ذکر کیا جارہا ہے جس میں کلوہی سردار اور آل بویہ کے مابین خونریز تصادم ہوا تھا۔ ابن مسکویہ لکھتا ہے کہ:

"یہ 324 ہجری بمطابق 936ء کا واقعہ ہے۔ جب علی بن بعاویہ اور ابوالحسن احمد بن بعاویہ بھائیوں، جو کسی زمانے میں ماکان بن کاکی کے ملازمین اور افواج کے سالار تھے، کسی طرح فارس اور اصفہان کے حکمران بننے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی ابوالحسن احمد بن بعاویہ کو ایک جرار لشکر دے کر صوبہ کرمان کی فتح کیلیئے روانہ کیا۔ جب وہ کرمان کے دارالخلافہ جیرفت پہنچا تو اس کی ملاقات قفص اور بلوچ قبیلوں کے امیر علی بن زنجی (زنگی) کے سفیر سے ہوئی۔ یہ علی بن زنجی، ابنِ کلاوی کے نام سے بھی مشہور تھا۔ اس کے آباؤاجداد نے ان تمام علاقوں کی حکمرانی حاصل کرلی

تھی جن پر بعد میں وہ اپنے دستِ بازو سے قابض رہا۔ ابنِ کلاوی اور اسکی قوم کے افراد وہ لوگ تھے جو ہر آئے دن کے مرکزی سلطانوں کے ساتھ جبکہ وہ ان کے علاقوں پر حملہ آور ہوتے تھے، نہایت ملائمت سے پیش آتے تھے اور ایک مقررہ خراج بھی ادا کرتے تھے مگر اس نے یا اس کی قوم نے کبھی بھی کسی سلطان کے دربار میں جاکر حاضری نہیں دی۔ احمد بن بعاویہ نے بلوچوں کے دارالخلافہ جیرفت میں داخل ہونے کی اجازت اور روپیہ بطور رسمی نذرانہ طلب کیا۔ معاملہ گفت و شنید کے ذریعے طے ہو گیا اور احمد کو ایک لاکھ درہم کی خطیر رقم بطور نذرانہ وصول ہوئی ساتھ ہی ابنِ کلاوی نے دس لاکھ درہم سالانہ خراج دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے علاوہ احمد بن بعاویہ کا نام اپنے نام کے ساتھ خطبوں میں شامل کیا اور احمد کے ساتھ نہایت ملائمت اور راستبازی سے پیش آیا لیکن احمد کو اس کے منشی جو بھینگا ہونے کی وجہ سے ''کوریا دبیر'' کے نام سے مشہور تھا، نے مشورہ دیا کہ وہ بلوچ امیر کے ساتھ اپنے کئے ہوئے وعدے سے منحرف ہو کر بلوچوں پر شب خون مار کر وہ کارنامہ کر دکھائے جو آج تک کوئی نہ کر سکا ہے یعنی بلوچوں کو شکست دے۔ احمد نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور ایران کے آئے دن کے سلطانوں کی طرح اپنے وعدے سے منحرف ہو کر بلوچوں پر شب خون مارا لیکن حملہ آوروں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ بلوچ اپنی حفاظت کیلئے پوری طرح چوکنا ہیں۔ طرفین میں لرزہ خیز جنگ ہوئی اور حملہ آوروں میں سے صرف چند اشخاص اپنی جان بچا سکے۔ جیرفت کے لوگ (یعنی بلوچ قبائل) حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑے اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ بچے کھچے فوجیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ احمد خود بھی شدید طور پر زخمی ہوا، اس کا دایاں ہاتھ کٹ گیا اور بائیں ہاتھ کی چار انگلیاں قلم ہو گئیں۔ سر اور جسم کے دوسرے حصوں پر کاری ضربیں آئیں۔ بُری طرح مجروح ہو کر وہ لاشوں کے ساتھ ڈھیر ہو گیا علی الصبح ابنِ کلاوی نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ لاشوں میں احمد کی لاش تلاش کریں اتفاق سے وہ لاشوں کے ڈھیر میں زندہ پایا گیا۔ ابن کلاوی نے خود اس کی تیمارداری کی اس کے

علاوہ اس نے دوسرے لوگوں کا بھی علاج معالجہ کرایا۔ صحتیاب ہو جانے کے بعد احمد اور اسکے بچے کھچے ساتھیوں کو قیمتی خلعتوں اور زادِ سفر کے تمام ضروری سامانِ آسائش سے سرفراز کیا اور انھیں علی بن بعاویہ کی جانب اصفہان روانہ کیا۔ بجائے اس کے کہ احمد بن بعاویہ، ابنِ کلاوی کا شکر گزار ہوتا، کہ اس کی جان اس نے بچائی تھی اور اس کو خلعتوں سے سرفراز کر کے عزت کے ساتھ واپس روانہ کردیا اور اپنی وعدہ خلافی پر شرمسار اور نادم ہونے کے بجائے احمد بن بعاویہ نے 937ء میں ابنِ کلاوی کے خلاف اپنی شکست فاش کا بدلہ لینے کیلئے دوسرا حملہ کیا۔ مگر اس مرتبہ پھر اس کی فوجوں کو بلوچوں نے شکست فاش دی۔ احمد کا جوشِ انتقام اور تیز ہو گیا اور اس نے تیسری بار ابنِ کلاوی پر حملہ کردیا اور اس مرتبہ بلوچوں کو شکست دی" (جسٹس مری۔ ازمنہ بلوچ، مزید ملاحظہ کریں: مری 1989: 141-143)۔

ابنِ خلدون کا بیان بھی اسی نوعیت کا ہے اور وہ بلوچوں کو پہاڑی جرگہ، بادیہ نشین، حروسکیہ اور جاسکیہ تحریر کرتا ہے اور یہ بھی لکھتا ہے کہ آلِ بویہ کے حکمران عضدالدولہ نے اس گروہ کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاتمہ کردیا (ابنِ خلدون 1971: 639-40)۔ حالانکہ تاریخ اس کے برعکس حقیقت بیان کرتی ہے۔ یعنی اس صحرا میں کہ جسے صحرا کویر اور صحرا لوت کہا جاتا ہے آج بھی بلوچ قبائل آباد ہیں جبکہ آلِ بویہ اور اس کے کرایے کے سپاہیوں کا نام ونشان تک مٹ چکا ہے۔

یہی واقعہ مورخ جی۔ لی۔ سٹرینج نے اپنی مرتب کردہ تالیف "جغرافیہ خلافت مشرقی" میں رقم کی ہے (سٹرینج: 1986: 480-502)۔ اور جسٹس میر خدا بخش بجارانی بھی اس واقعے کا ذکر اپنی مشہور انگریزی کتاب "سرچ لائیٹس آن بلوچ اینڈ بلوچستان" میں کرتا ہے (مری 1985: 102-03)۔ علاوہ ازیں کئی دیگر مورخین بھی اس واقع کی تصدیق کرتے ہیں اور اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ ان جنگوں میں بلوچوں اور آل بویہ دونوں فریقوں کا شدید نقصان ہوا اور احمد ان جنگوں میں معذور ہوا۔ بالآخر یہ جنگیں آل بویہ کے زوال پر منتج ہوئیں۔

جسٹس مری کے مطابق ابنِ کلاوی نے شکست کھانے کے بعد پسپا ہو کر اپنی فوجوں کو جمع کیا اور واپس جاتے ہوئے احمد بن بعاویہ کے لشکر پر صحرا میں شب خون مارا اور ان کا خوب قتلِ عام کر کے ان کا تمام تر مال و اسباب لوٹ کر واپس اپنے قلعوں کی طرف چلا گیا (مری 1985:102-03)۔

اس طرح کے کئی اقتباسات تاریخی کتب میں ملتے ہیں جن سے اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ بلوچ قبائل ہی تھے جنہیں عرب مورخین نے ان کے یک قومی نام کے علاوہ علاقائی ناموں سے کتب تواریخ میں مرقوم کیا اور وہ اب تک انہی ناموں سے موسوم ہیں۔ کلوہی قبیلہ بلاشبہ ایک حاکم قبیلہ تھا کہ جس کا مرکز مکران میں واقع علاقہ کولواہ تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے علاقائی نام کولواہی یا کلوہی کی مناسبت سے تاریخ میں مشہور ہوا اور آج تک اپنے اسی قدیم نام کے ساتھ جانا جاتا ہے۔ یہ قبیلہ بعد ازاں رند یونین میں شامل ہوا اور اب تک رند قبائل کی طاقتور شاخوں میں شمار ہوتا ہے۔

ابنِ خلدون ان کے ساتھ دیگر علاقوں کے بلوچ قبائل کو بھی ان کے علاقائی ناموں سے منسوب کرتے ہوئے انہیں حروسیہ اور جاسکیہ تحریر کرتا ہے جو حروس اور جاسک کے باشندوں کے علاقائی نام تھے۔

بلیدی (بریدی):

بلیدہ مکران ڈویژن کے ضلع گوادر کی ایک تحصیل کا نام ہے۔ یہ قصبہ پنجگور سے تربت جاتے ہوئے درمیان میں آتا ہے۔ انتہائی خوبصورت وادی اور دلکش مناظر پر مشتمل اس علاقے کے باشندے بلیدی کے نام سے موسوم ہیں۔ مکران اور اس سے ملحق علاقوں پر سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں اس قبیلے کی حکومت کے تحریری شواہد ملتے ہیں۔ یعنی گچکیوں کے برسرِ اقتدار آنے سے قبل مکران پر اس قبیلہ نے اقتدار و اختیار حاصل کیا اور اپنی حاکمیت قائم کی۔

تاریخی کتب کے مطالعہ سے اس اہم قبیلہ کے بارے میں کئی نئی باتیں منکشف ہوتی ہیں یعنی یہ کہ بلیدی ایک قدیم بلوچ قبیلہ ہے کہ جو موجودہ دور میں نہ صرف مکران بلکہ مشرقی بلوچستان میں بھی کثیر تعداد میں آباد ہے۔ مکران میں ان کی زیادہ تر آبادی ضلع کیچ میں یونین کونسل بلیدہ میں ہے کہ جو پنجگور اور کیچ کے مابین واقع ایک خوبصورت وادی ہے۔ ممکن ہے کہ اس وادی کی وجہ سے یہ قبیلہ بلیدی کہلاتا ہو یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اس علاقہ کو نام ہی اس قبیلہ کی وجہ سے ملا ہو۔ قدیم کتب تواریخ میں کئی بلیدی زعماء کا تذکرہ ملتا ہے اور عرب مؤرخین انہیں اکثر و بیشتر "بریدی" یا "البریدی" تحریر کرتے ہیں۔ مثلاً ابنِ خلدون سمیت کئی دیگر عرب مؤرخین عباسی دور خلافت کے دوران مشرقی عرب مقبوضات میں ابو عبداللہ البریدی (ابن خلدون: 357-402 مزید ملاحظہ کریں: ابی یعقوب، اصل نسخہ تاریخ یعقوبی 1992: 320، علاوہ ازیں علامہ یعقوبی سال اشاعت ندارد: 717، 676) اور کئی دیگر بریدی یا بلیدی امیروں اور زعماء کا تذکرہ کرتے ہیں اور ان کے سیاسی کردار پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں۔

بلاشبہ بلیدی قبیلے نے بلوچستان کی تاریخ میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے اور اس قبیلہ کی سیاسی سرگرمیاں زمانہ قدیم سے جاری ہیں۔ طویل عرصہ تک مکران اور اس کے گردونواح کے علاقوں پر اس کی حکومت قائم رہی۔ مکران کی تاریخ میں ہوت، ملک، مید، رئیس، گچکی اور بلیدی قبائل کی مختلف اوقات میں حکومتیں قائم رہی ہیں۔ سولہویں صدی میں پرتگیزی حملے بند ہوگئے اور انہیں زوال آگیا جبکہ صفوی ایرانی ایک بڑی قوت کے طور پر ابھر کر سامنے آنے لگے۔ ایرانیوں نے جب بھی ایران پر اپنا تسلط قائم کیا تو مکران کو اپنے زیرِ تسلط رکھنا بڑا ضروری خیال کیا۔ ایرانی فارسیوں نے اپنے ہر دورِ اقتدار میں اس عمل کو تسلسل کے ساتھ دھرایا۔ لہٰذا صفوی بھی اپنے پیشروؤں سے پیچھے نہ رہے اور ایرانی خطہ پر اقتدار مضبوط کرتے ہی مکران کی

جانب متوجہ ہوئے اور بمپور، دیزک اور سیستان کو اپنی قلمرو میں شامل کیا۔ مؤخر الذکر یعنی سیستان مکران میں نہیں تھا بلکہ ایک الگ بلوچ مملکت یا ریاست تھی۔ 1515ء کے دوران شاہ اسماعیل صفوی نے مکران پر قبضہ کرنے کی غرض وغایت سے پرتگیزیوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے شاہ اسماعیل نے ساحلی مکران پر پرتگیزی قبضہ کو تسلیم کیا جبکہ اندرونِ ملک صفویوں کے خلاف ہونے والی بغاوتوں کے فرو کرنے کی غرض سے پرتگیزی ایران کی مدد پر کمربستہ ہوگئے۔ مگر یہ معاہدہ دیرپا ثابت نہ ہوسکا۔ 1581ء میں پرتگیزیوں نے ساحلِ مکران پر آخری مگر تباہ کن حملہ کیا پسنی گوادر اور تیز کی بندرگاہوں اور شہروں کو لوٹ کر تباہ کردیا۔ مگر اس کے بعد پرتگیزیوں کو زوال آیا اور وہ اس علاقے سے نکل گئے۔ سترہویں صدی کے ابتدا میں ہی ایک نئے کھیل کا آغاز ہوا اور زیادہ طاقتور اور وحشی اقوام ساحلِ مکران کی جانب متوجہ ہوئے۔ یہ انگریز اور ولندیزی تھے۔ انگریز زیادہ چالاک اور شاطر تھے وہ اس ملک گیری کی دوڑ میں ولندیزی ڈچ اقوام سے آگے نکل گئے اور ایرانی صفویوں کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا جسے مکران کے بلوچوں نے قبول نہیں کیا اور انگریز نمائندے پر گوادر میں حملہ ہوا جس میں وہ بال بال بچ گیا۔ برطانوی نمائندہ سر رابرٹ شرلے ایرانی حکام سے ملنے اصفہان جارہا تھا۔ جب وہ گوادر بندرگاہ پر اترا تو ان پر مسلح حملہ کیا گیا مگر وہ جان بچانے اور اصفہان جانے میں کامیاب ہوا۔ انسائیکلوپیڈیا ایرانیکا لکھتا ہے کہ، اصفہان ہی سے انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو خط لکھا جس میں انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ انگریز سرکار گوادر میں ایک فیکٹری قائم کرے تاکہ وہ اس علاقے کو اپنے دسترس میں لاسکے۔ مذکورہ خط میں فیکٹری کھولنے کی جو وجوہات بیان کی گئی ہیں ان کے مطابق چونکہ یہ علاقہ (گوادر) اہم تجارتی گزرگاہوں کے سنگم پر واقع ہے لہٰذا اس اہم

بندرگاہ کو دسترس میں لانے کے بعد ساحلِ مکران پر انگریز سرکار کی بالادستی قائم ہو گی (حمید بلوچ2009:230-232)۔

یہی وہ دور تھا کہ جب مکران میں ہوت قبائل بھی پرتگیزیوں کے خلاف لڑتے لڑتے کافی حد تک اپنی افرادی طاقت زائل کر چکے تھے اور ساحلی قبائل میں سے مید بھی اب پہلے جیسے طاقتور نہیں رہے تھے۔ طاقتور رند بھی ایک صدی پہلے بڑی تعداد میں علاقہ چھوڑ کر سبی و کچھی اور مزید مشرق میں سندھ و پنجاب کے حدود تک پہنچ گئے تھے جبکہ طاقتور مَلِک خاندان بھی اب پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ لہٰذا اب بلیدیوں کا راستہ روکنے والا کوئی نہ تھا۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر بلیدیوں نے مکران پر اپنی حکومت قائم کی۔

بلیدی حکمرانوں کے بارے میں بھی تحریری مواد نہ ہونے کے برابر ہے اور جتنا مواد دستیاب ہے اس کے مطابق سترہویں صدی میں انہوں نے ملک خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر کے مکران پر اپنا تصرف جمالیا۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ جمہوری طرز کے حکمران تھے اور ان کے مزاج میں سختی ہرگز نہ تھی۔ انہوں نے مکران کو انتظامی سہولت کی خاطر دو حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصہ پر مقامی قبائل کو بااختیار بنایا البتہ انہیں ایک ہی وفاق کے زیرِ اثر رکھا کہ جو بذاتِ خود بلیدیوں کے پاس تھا۔ انگریز مورخ ای۔ سی۔ راس کے مطابق اس خاندان کے حکمرانوں نے بھی ملک کا لقب اختیار کیا (ای۔ سی راس:32-41)۔ مگر راس کے اس بیان سے اختلاف کیا جاسکتا ہے کیونکہ تحریری طور پر بلیدی حکمرانوں کے جو نام ملتے ہیں ان میں ملک کی بجائے لفظ شہہ لاحقہ کے طور پر لگایا جاتا تھا جیسا کہ قاضی عبدالرحیم صابر بلیدی حکمرانوں کے نام تحریر کرتا ہے۔ یعنی،

"۱۔ شکراللہ، ۲۔ شہہ قاسم، ۳۔ شہہ زہری، ۴۔ شہہ احمد، ۵۔ شہہ عبداللہ، ۶۔ شہہ قاسم دوم، ۷۔ شہہ بلار (بلال)" (قاضی عبدالرحیم صابر 1967:34)۔

ای۔ سی راس اپنے رائے کی خود تردید بھی اپنی کتاب کے اگلے صفحات پر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ، بلیدیوں کے قبرستان میں سب سے نمایاں قبر شہہ بلار (بلال) کی ہے کہ جو 1729ء میں مکران کا حاکم تھا (حمید بلوچ 2009:258)۔ اسی شہہ بلال کی دورِ حکومت میں قلات کے احمد زئی بلوچ (براہوئی) حکمران خان عبداللہ خان قہار نے مکران پر حملہ کیا تھا۔ بلیدیوں کا آخری حکمران شہہ قاسم تھا جسے گچکیوں نے قتل کر کے مکران پر قبضہ کر لیا۔

بلوچستان کے علاقہ چاغی میں ایک مشہور و معروف بزرگ کا مزار ہے جہاں ہر سال ان کا عرس منایا جاتا ہے۔ سالانہ ہزاروں کی تعداد میں ان کے مرید اور معتقدان کے مزار پر آتے ہیں اور منتیں مانتے ہیں۔ ان کا مزار چاغی کے قصبہ سے شمال اور قدرے شمال مغرب کی جانب ایک دشوار گزار پہاڑی درے کے اندر واقع ہے۔ اس بزرگ کو عرف عام میں شہہ بلانوش کہا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مکران کے علاقہ بلیدہ سے تعلق رکھتے تھے اور جس زمانے میں منگولوں کی یلغار شروع ہوئی جناب بلانوش اس علاقے میں مکران کے ہوت حاکموں کی جانب سے بطور عامل (گورنر) تعینات تھے۔ انہوں نے علاقے کے دیگر قبائل میں اپنی بزرگی اور سخاوت کی وجہ سے بہت جلد مقبولیت حاصل کی۔ وہ بہادر اور زیرک انسان تھے لہٰذا انہوں نے منگولوں کے ساتھ خونریز جنگیں لڑیں۔ ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے ان کی عقیدت میں انہیں یہاں دفن کیا اور ان کا مقبرہ قائم کیا جو آج تک مرجع خلائق ہے۔ واضح رہے کہ جناب بلانوش کے مقبرہ پر بھی مکرانی پیر کے الفاظ مرقوم ہیں جبکہ ان کے مزار پر موجود ان کے معتقدین بھی اس بارے میں جانتے ہیں کہ حضرت کا تعلق علاقہ بلیدہ مکران سے تھا اور انہوں نے منگولوں کے خلاف زبردست مزاحمت پیش کی تھی اور کئی خونریز معرکے لڑے تھے جن میں

منگولوں کو شکست ہوئی تھی۔ منگولوں کی اس شکست کو علاقہ کے ضعیف الاعتقاد لوگ اب بھی ان کی بزرگی اور کرامات کا نتیجہ خیال کرتے ہیں۔

اس قبیلہ کے بارے میں اس طرح کے کئی دیگر بیانات بھی کتب تواریخ میں مرقوم ہیں جو سینکڑوں سال پرانے ہیں جن کے مطالعہ سے اس بات کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے کہ کئی دیگر بلوچ قبائل کی طرح بلیدی بھی ایک قدیم قبیلہ ہے جو مکران کے قدیم باسی ہیں جبکہ دور حاضرہ میں مشرقی بلوچستان، سندھ اور پنجاب تک ان کی آبادی پھیلی ہوئی ہے۔

سیستانی:

یہ علاقائی اور شہریتی نام ہر اُس شخص کے نام کے ساتھ منسوب ہو سکتا ہے جس کا تعلق علاقہ سیستان سے ہو۔ سیستان کے بارے میں قدیم کتب کے مطالعہ سے یہ بات شنید میں آتی ہے کہ یہ علاقہ زمانہ اولیٰ سے ہی بلوچ قبائل کا مسکن رہا ہے اور ابتدائی ادوار کے قدیم بلوچ مشاہیر میں سے زیادہ تر کا تعلق اسی خطے سے رہا ہے۔ ان تاریخی کتب کے مطالعہ سے جو علاقہ سیستان کی تاریخ کے متعلق ہیں یہ بات علم میں آتی ہے کہ مورخین میں سے اکثر نے اس خطے کے باشندوں کے ساتھ قومیت یا علاقائیت کی پہچان کے طور پر سیستانی تحریر کیا ہے۔ مگر یہ بھی واضح ہو کہ بعض مورخین اس علاقائی اور شہریتی نام کے ساتھ ساتھ یہاں کے باشندوں کو بلوچ بھی لکھتے ہیں۔ دورِ حاضرہ میں بھی سیستان کی تقریباً تمام تر آبادی بلوچ قبائل پر مشتمل ہے۔ یہ علاقہ اس وقت تین مختلف ممالک ایران، افغانستان اور پاکستان میں منقسم ہے مگر اس کے ہر حصے کی آبادی بلوچ قبائل پر مشتمل ہے۔ جنوبی افغانستان، مشرقی اور قدرے شمال مشرقی ایران اور شمال مغربی بلوچستان کا علاقہ دراصل سیستان کہلاتا تھا جس کی تمام تر آبادی بلا کم و کاست مختلف بلوچ قبائل پر مشتمل ہے۔ جن کی ان علاقوں میں موروثی اور آبائی زمینیں ہیں اور وہ خود کو یہاں کے قدیم باشندے کہتے ہیں۔

بلوچی اور براہوئی شاعری اور ادب کے دیگر موضوعات میں بھی علاقہ سیستان کے تذکرے خصوصی طور پر ملتے ہیں جبکہ بلوچی اور براہوئی زبانوں کی ضرب الامثال اور کہاوتوں میں بھی سیستان اور اس کے مختلف علاقوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ بلوچ جہاں بھی رہتے ہوں وہ سیستان کو اپنا قدیمی علاقہ کہتے ہیں اور اس علاقے سے شدید جذباتی لگاؤ اور اُنسیت رکھتے ہیں۔ عام بلوچ بھی یہ جانتا ہے کہ سیستان ایک بلوچ خطہ رہے جہاں زمانہ اولیٰ سے ہی بلوچ قبائل آباد ہیں۔ یہ علاقہ قدیم پیشدادی، میدی اور ہخامنشی خاندانوں کی سلطنتوں کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس خطے کے شہہ سواروں اور شمشیر زنوں نے ہمیشہ درج بالا خاندانوں کی سلطنتوں کو دوام بخشا اور ان کی جغرافیائی حدود کو زبردست وسعت عطا کی۔ تاریخ کی کئی کتابیں اور قدیم تحریریں اس علاقے کے عظیم پہلوان شہہ سواروں اور شمشیر زنوں کے تذکروں سے مزین ہیں۔ تاریخ اور بالخصوص تاریخ ایران اور تاریخ بلوچستان کا ہر قاری زال، رستم، سہراب، گودرز، نیو، گیو، اشکش، شیدوش اور رہام وغیرہ کے کارناموں اور قدیم ایرانی تہذیب کے لیے کی جانے والی کوششوں سے آگاہ ہو گا۔ اسی طرح بلوچ تاریخ کا ایک مشہور قومی ہیرو بابا میر حمزہ بھی اسی خطے کا ایک مشہور و معروف دانشور اور جنگجو رہنما تھا جنہوں نے دوسری اور تیسری صدی ہجری کے دوران سیستان، مکران، خراسان وغیرہ کے باشندوں کی حقِ حاکمیت کی خاطر عباسی خلفأ کے ساتھ ٹکر لی اور تقریباً چھتیس سالوں تک خلفأ بغداد کو دعوت مبارزت دیتے رہے (فاروق بلوچ 2013:5-90)۔ بلوچی قدیم شاعری میں بھی بابا میر حمزہ کے تذکرے ملتے ہیں اور انہیں انتہائی عقیدت اور احترام کا مقام دیا جاتا ہے۔ لٰہذا یہ کہنا بیجا نہ ہو گا کہ تاریخ میں جن مشاہیر کو ان کے نام کے سابقے میں السیستانی سے مخاطب کیا گیا ہے وہ دراصل سیستان کے باشندے تھے جو اپنے قبائلی یا قومی نام کی بجائے اپنے علاقائی نام سیستانی

اور السیستانی سے معروف ہوئے اور اس میں بھی کوئی مبالغہ اور مغالطہ نہیں کہ ان مشاہیر کی اکثریت کا تعلق سیستان کے بلوچ باشندوں سے تھا۔

ہیر کانی:

ہیروڈوٹس سمیت کئی دیگر مورخین اپنی تحریروں میں ایران کے شمال میں واقع سمندر کو بحیرہ "ہیر کانیہ" تحریر کرتے ہیں جو دورِ حاضرہ میں بحیرہ کیسپیئن (Caspian Sea) کہلاتا ہے۔ ماضی قدیم میں اسے بحیرہ خزر بھی کہا جاتا تھا۔ یہ سمندر دراصل ایک وسیع و عریض جھیل ہے جو ترکمانستان، ایران، روس اور آذربائیجان کے مابین واقع ہے۔ اس سمندر کے جنوبی کناروں پر کوہ البرز کا بلند و بالا پہاڑی سلسلہ واقع ہے۔ قدیم مورخین نے اس سمندر کے جنوبی کناروں پر آباد باشندوں کو ہیر کانی تحریر کیا ہے جو بنیادی طور پر کوہِ البرُز کے شمالی ڈھلوانوں اور دامنوں کے باشندے تھے۔ شاہنامہ فردوسی میں نوشیروان عادل کے ساتھ 531 سنہ ء میں جن قبائل کو لڑتا ہوا دکھایا گیا ہے اور جنہیں ابوالقاسم فردوسی نے کوچ و بلوچ تحریر کیا ہے ان میں ہیر کانی قبائل بھی شامل تھے۔ شاہنامہ کے علاوہ دیگر کتب تواریخ انہیں ہیر کانی اور کُرد تحریر کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں اغلب خیال یہی ہے کہ یہ یا تو ایک جداگانہ قبائلی یونین تھا جو ہیر کانیہ سمندر کے کنارے آباد باشندوں نے قائم کیا تھا یا پھر یہ کُرد قبائل کی کوئی شاخ تھی۔ قیاس زیادہ تر یہی کہتا ہے کہ یہ ایک جداگانہ علاقائی یونین تھا جس میں بہت سے قبائل شامل تھے۔ ان قبائل کے ساتھ ہخامنشیوں کو بھی واسطہ پڑا۔ لہٰذا پہلے ہخامنشی حکمران سائرس اعظم نے ان کو مطیع و فرمانبردار بنایا اور انہیں ہخامنشی سلطنت میں اعلیٰ اور امتیازی مراتب عطا کیے۔ ہیروڈوٹس کے مطابق یہ قبیلہ ایرانی ہخامنشی فوج کے مضبوط ترین دستوں میں شمار ہوتا تھا حتیٰ کہ اس قبیلہ سے بری فوج کی خدمات کے ساتھ ساتھ بحری فوج کی خدمات بھی حاصل کیے جاتے تھے کیونکہ انہیں سمندروں کا

وسیع تجربہ حاصل تھا۔ ہیروڈوٹس، توراکینہ قاضی، مرزا مقبول بیگ بدخشانی سمیت ہر وہ مورخ جس نے ایرانِ قدیم کی تاریخ رقم کی ہے ہیرکانیوں کا تذکرہ ضرور کرتا ہے۔ ہخامنشی حاکمیت کے وقت ان قبائل کا حکمران گشتاسپ نامی ایک شخص تھا۔ وہ زرتشت پیغمبر کا پیروکار تھا جبکہ اس کی قوم کے بارے میں یہی تحریر کیا گیا ہے کہ وہ غیر آرین اور پہاڑی باشندے تھے۔

دہوار قبائل (قدیم تورانی اور سفید ہُن):

وسطی بلوچستان کے علاقوں مستونگ اور قلات میں بلوچستان کے ابتدائی اور اولین عہد کے باشندے آباد ہیں جنہیں عُرفِ عام میں دہوار کہا جاتا ہے اور اب بھی یہ قبائل اسی نام سے معروف ہیں۔ یہ لگ بھگ ستاون ذیلی قبائل میں منقسم ہیں جو قلات اور مستونگ کے اضلاع میں آباد ہیں۔ ان کے بعض دھڑے کوئٹہ اور خضدار سمیت بلوچستان کے کئی دیگر علاقوں میں بھی آباد ہیں جبکہ ایرانی بلوچستان کے علاقوں میں انہیں دہواری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ علاقہ خاران میں ایک مقام دھگوار کے نام سے معروف ہے۔ اغلب خیال یہی ہے کہ یہ لفظ دراصل دہوار ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ لفظ دہوار کے آغاز سے متعلق مستند شواہد دستیاب نہیں ہیں اور نہ ہی اس بات کا علم ہے کہ یہ لفظ سب سے پہلے کب اور کن لوگوں نے استعمال کیا۔ لغوی طور پر اس لفظ ''دہوار'' کے معنی ''زمین کے مالک'' لیے جاتے ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ براہوئی زبان کے لفظ ''ڈیہہ وارا'' سے موخوذ ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ چونکہ براہوئی قبائل کی زیادہ تر آبادی پہاڑی علاقوں اور تنگ وادیوں میں رہتی تھی اور گلہ بانی کے شعبہ سے وابستہ تھی جبکہ میدانی علاقوں اور کھلی وادیوں میں جو قبائل آباد تھے وہ زیادہ تر زراعت پیشے سے وابسطہ تھے۔ یہ قبائل زیادہ تر دیہاتوں میں گارے مٹی کے کچے یا نیم پختہ مکانات بنا کر رہتے تھے اور معاشی و سماجی لحاظ سے کافی مستحکم اور ترقی یافتہ تھے جبکہ ان کے مقابلے میں پہاڑی باشندے

موسمی تغیرات کی وجہ سے اکثر اپنے مرزبوم کو تبدیل کرتے رہتے تھے اور مکانات کی بجائے رہائش کی خاطر گدانوں (ایک طرح کی خاص طرز کی جھگی) میں رہتے تھے جنہیں بوقت ضرورت اکھیڑ کر کہیں اور باآسانی منتقل کیا جاسکتا تھا۔ لہذا کہا جاتا ہے کہ وسطی بلوچستان کی ان وادیوں میں رہنے والے باشندوں کو سب سے پہلے انھی پہاڑی قبائل نے دہوار کے نام سے مخاطب کیا۔ ان قبائل کی زبان فارسی سے ملتی جلتی ہے مگر اب وہ خطے کی غالب زبان براہوئی سے حد درجہ متاثر ہو چکی ہے۔ قلات کے دہوار تو اپنی زبان سے مکمل طور پر نابلد ہو چکے ہیں جبکہ مستونگ کے دہوار بھی اب اس قدیم زبان سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔ البتہ مستونگ کے قصبات پڑنگ آباد اور شیخان کے علاقوں میں رہنے والے دہوار اب بھی گھروں میں یا اپنے عزیز واقربأ کے ساتھ اپنی ہی زبان میں بات کرتے ہیں۔ ان قبائل میں بعض ایسے بھی ہیں کہ جو ابتدائی عہد کے دہواروں سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ بعد کے ادوار میں بلوچستان میں داخل ہونے والے باشندوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ برطانوی جاسوس نمامور خین ان قبائل کو علمی کم فہمی کی وجہ سے تاجک النسل قرار دیتے ہیں جبکہ حقائق اس مفروضے کے برعکس ہیں۔ ان قبائل کے بارے میں جی پی ٹیٹ کی کتاب "سیستان" Siestan میں جبکہ ہنری پوٹینگر کی کتاب "سفر نامہ سندھ و بلوچستان" Travel in Sindh and Balochistan میں معلومات دستیاب ہیں مگر ان کتب میں انہیں افغانستان کے تاجکوں سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ جبکہ جمیل دہوار نے دہوار قبائل کی تاریخ پر ایک کتاب لکھی ہے مگر وہ مستند بیانات سے بالکل خالی ہے کہ جن کی مدد سے ان قبائل کی تاریخ بیان کی جاسکے اور ان کی بلوچستان میں موجودگی یا آمد کے وقت کا تعین کیا جاسکے۔

دہوار قبائل میں بعض قبائل ایسے بھی ہیں جو ہزاروں سالوں سے مستونگ و قلات کے مختلف علاقہ جات میں آباد ہیں اور یہاں کے اولین باشندوں سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ بلوچستان

کے راستے مشرق کی جانب ہونے والی یلغاروں کے دوران بھی کئی اقوام کے بعض دھڑے وسطی بلوچستان کی وادیوں میں بس گئے اور مقامی دھوار قبائل کے اندر ضم ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ جب میروانی عہد یعنی پندرہویں صدی عیسوی میں رندوں نے قلات پر حملہ کر کے یہاں قبضہ کیا تو ان کے بعض دھڑے مستقل طور پر مستونگ اور قلات کے علاقوں میں بس گئے جو بعدازاں رندوں کی حاکمیت کے خاتمے اور میروانیوں کے دوبارہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد مقامی دھوار قبائل میں شامل ہوگئے یا پھر براہوئی قبائل کا حصہ بن گئے۔ ماہرین نے ایسے کئی قبائل کی نشاندہی کی ہے جو بنیادی طور پر رند و لاشار یونین کے حصے تھے جو رند حاکمیت کے بعد مقامی آبادی میں شامل ہوگئے۔ علاوہ ازیں دھوار قبائل کے بعض دھڑے خود کو قدیم تورانیوں کی باقیات قرار دیتے ہیں جو پیشدادی عہد کے اواخر میں اور میدی عہد میں علاقہ توران کے حکمران تھے۔ ان کی حاکمیت وسط ایشیاء افغانستان اور وسطی بلوچستان کے علاقوں پر قائم تھی جبکہ اُس دوران علاقہ خضدار بھی ”توران“ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ پڑنگ آباد مستونگ کے دھوراوں میں اب بھی ایک قبیلہ ”توران زئی“ کہلاتا ہے جن کے معتبرین کا دعویٰ ہے کہ وہ قدیم اساطیری شخصیت اور شاہنامہ فردوسی کے ایک اہم کردار افراسیاب بن تور کی اولاد ہیں اور تور بن فریدوں کی وجہ سے ان کا قبیلہ تورانی کہلایا جو اب توران زئی کے نام سے وجود رکھتا ہے۔ توران زئی قبیلہ کے افراد خود کو قدیم باشندے قرار دیتے ہیں جبکہ دیگر دھوار قبائل بھی ان کے اس دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔ جبکہ علاقہ پڑنگ آباد کے یوسف زئی قبائل کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بھی ابتدائی ترکمان قبائل سے تعلق رکھتے ہیں جو سلم بن فریدوں کی نسل سے ہیں۔ علاوہ ازیں کئی دیگر قبائل بھی ابتدائی دھوار قبائل سے ہونے کے دعویدار ہیں۔ البتہ توران زئی اور یوسف زئی قبائل کے دعوے میں کافی صداقت نظر آتی ہے۔ قلات کے عالی زئی اور مغلزئی دھوار جبکہ

مستونگ کے علی زئی دہوار کسی شک و شبہ کے بغیر پانچویں صدی عیسوی میں علاقہ ایران، بلوچستان اور افغانستان پر حملہ کرنے والی سفید ہنوں کی باقیات میں سے ہیں جن کے بعض دھڑے ہندوستان جاتے ہوئے علاقہ بلوچستان اور سیستان میں آباد ہو گئے اور مقامی آبادی میں ضم ہوتے گئے۔ سفید ہنوں (Apthelites) کے یہ خاندان بلوچستان میں دہوار قبائل میں شامل ہو گئے جبکہ افغانستان میں یہ لوگ ہپتالی، ہفتالی، ابدالی کے نام سے معروف ہوئے۔ اسی طرح دہواروں میں کئی دیگر اقوام اور قبائل کی شاخیں بھی شامل ہیں۔ ممکن ہے کہ سفید ہنوں اور بعد ازاں رند یلغار کے بعد بھی کسی گروہ نے ان قدیم تورانیوں کے ساتھ شمولیت اختیار کی ہو جو دہوار کہلانے لگے تھے مگر اس طرح کے شواہد ناپید ہیں۔ شمس آباد کے دادی زئی دہوار خود کو رند کہتے ہیں۔ اسی طرح خواجہ خیل قبیلہ کے بارے میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ وہ قدیم قبائل سے تعلق رکھتا ہے جبکہ بعض ذرائع اس قبیلہ کو تاجک قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ ابتدائی عرب حملوں کے دوران قلات اور خضدار کی آبادی کو بعض عرب مورخین ترک تحریر کرتے ہیں۔ (البلاذری 2010: 578) جو بلاشبہ علاقہ کے قدیم دہوار قبائل کے جنگجو تھے جنہوں نے خضدار، قلات اور مستونگ میں عرب حملہ آوروں کے خلاف زبردست جنگیں لڑی تھیں۔ فارسی تاریخ اور منظوم ادب میں ان ترکمان دہواروں کو لاچین بھی کہا گیا ہے جو ایران سے لے کر وسطی بلوچستان اور وسطی ایشیاء کے بعض خطوں میں آباد تھے۔ لہٰذا شاہنامہ فردوسی مستونگ کے قریب واقع کوہ چلتن کے دامن میں ان کی قدیم آبادی کی تصدیق ان اشعار میں کرتا ہے:

که نزدیک زابل به سی روزه راه
یکے کوه بوده سر کشیده به ماه
به یک سوئے او دشت خرگاه بود
دگر دشت زاه هند راه راه بود

نشستند درآن دشت بسیار کوچ
زاوگاں و لاچین و کرد و بلوچ

(میر گل خان نصیر 1999:24-25)

ان اشعار سے بھی دہوار قبائل اور ان کے علاقے کا بلوچستان کی قدیم آبادی سے تعلق ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ دہوار قبائل نے بلوچستان کی تاریخ اور بالخصوص عرب حملوں کے دوران اور کمبرانی عہد میں فقید المثال کردار ادا کیا اور برطانوی تسلط کے خلاف ان قبائل کے زعمائ نے ہمیشہ خوانین قلات کا ساتھ دیا۔

آشکانی:

آسکانی نام کا ایک بڑا قبیلہ بلوچ قوم میں موجود ہے جو قدیم قبائل کے زمرے میں آتا ہے۔ اس قبیلہ کی بڑی تعداد مکران ڈویژن اور بالخصوص ضلع کیچ میں آباد ہے البتہ بلوچستان کے کئی دیگر اضلاع میں بھی اس قبیلہ سے تعلق رکھنے والے افراد اور خاندان ملتے ہیں۔ اس قبیلہ کو آسکانی کے علاوہ آشکانی بھی کہا جاتا ہے۔ غالب گمان یہی ہے کہ یہ قبیلہ قدیم آشکانیوں کی باقیات ہیں جو 250 قبل مسیح کے دوران ایران اور وسط ایشیاء سمیت بلوچستان کے کچھ حصوں پر حاکم تھے۔ ان کا دور حکومت 226 عیسوی میں ساسانی خاندان کے بانی اردشیر پاپکان نے ختم کر کے ساسانی خاندان کی حاکمیت کی بنیاد رکھی۔ آشکانیوں کی حاکمیت مشہور و معروف خاندان کشانوں کے متوازی قائم ہوئی تھی مگر کشانوں کی بہ نسبت آشکانیوں کی حاکمیت مسلسل طوائف الملوکی کا شکار رہی۔ اس خاندان کی حاکمیت کے بارے میں کتب تواریخ میں کافی معلومات دستیاب ہیں اور معروف مورخین نے اس خاندان کی حاکمیت اور سیاست کے بارے میں بیش بہا معلومات فراہم کیے ہیں۔ مشہور و معروف سیاح، محقق اور مورخ البیرونی نے آشکانی حکمرانوں کے ناموں کی

تفصیلات اور دور حکمرانی کے بارے میں انتہائی اہم معلومات فراہم کی ہیں جن کے مطالعہ سے اس بات کا گمان زیادہ غالب آجاتا ہے کہ آشکانی بعد ازاں بلوچ سٹاک میں شامل نہیں ہوئے بلکہ ابتدا ہی سے بلوچ سٹاک کا حصہ تھے۔ البیرونی نے آشکانی حکمرانوں کے جو نام بیان کیے ہیں وہ نام اب بھی بلوچوں میں ترجیحی بنیادوں پر رکھے جاتے ہیں اور انہیں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ بالاچ (البیرونی نے عربی لہجے میں بالاش تحریر کیا ہے) پیروز (البیرونی نے عربی لہجے میں فیروز تحریر کیا ہے) بہرام، بیزن وغیرہ۔ ہر بلوچ جانتا ہے کہ یہ معروف نام بلوچ قبائل میں بہت پسند کیے جاتے ہیں اور یہ نام مکمل بلوچی ثقافتی نام ہیں۔ علاوہ ازیں یہ قبیلہ آج جہاں بھی موجود ہے خود کو بلوچ کہتا ہے جبکہ بلوچوں کے ہمسائے میں رہنے والے افغانوں اور ایرانیوں میں آسکانی یا آشکانی نام کا کوئی قبیلہ یا خاندان نہیں جس کی بنیاد پر انہیں قدیم ایرانی یا وسط ایشیائی قوم ثابت کیا جاسکے۔ یہ قبیلہ بلوچستان کی سیاست میں ہمیشہ سرگرم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ اس قبیلہ کی سابقہ سیاسی تاریخ اور دورِ حاکمیت کے لیے البیرونی کی کتاب ''آثار الباقیہ'' مرزا مقبول بیگ بدخشانی کی کتاب ''تاریخ ایران از قوم ماد تا آلِ ساسان'' کے علاوہ ایران قدیم کی ہر کتاب کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کے عہد حکومت اور حکمرانوں کا تذکرہ اگلے باب میں کیا جائے گا۔

کشانی:

کشانی بھی بلوچ سٹاک کا ایک بڑا قبیلہ ہے جس کا تاریخی پس منظر بھی بہت حد تک واضح ہے۔ اس قوم کی دورِ حاکمیت کا آغاز بھی لگ بھگ 250 قبل مسیح کے دوران ہوا تھا اور ان کی حکومت آشکانیوں کی حکومت کے متوازی چلتی رہی۔ یہ خاندان دراصل گندارا تہذیب کے بنیاد گزار تھا۔ ان کا پہلا حکمران کجولہ کدفیزا نامی ایک شخص تھا جس کے عہد کے سکے مملکتِ افغانستان اور بلوچستان کے اضلاع لورالائی اور بارکھان سے دریافت ہوچکے ہیں۔ جبکہ صوبہ خیبر پختونخواہ کے کئی

علاقوں سے اس تہذیب کی باقیات دریافت ہو چکی ہیں جن کے مطالعہ سے اس بات کا ادراک ہو جاتا ہے کہ یہ ایک انتہائی ترقی یافتہ تہذیب کے بنیاد گزار تھے۔ اس خاندان میں کنشکا جیسا عظیم حکمران بھی گزرا ہے جس کا دور کشانوں کا عہد زریں کہلاتا ہے۔ کنشکا نے شمالی ہندوستان تک اپنی سرحدوں کو وسعت دی، ملک کا انتظام و انصرام بہتر کرنے کے علاوہ اپنی عظیم الشان سلطنت کو خوب ترقی دی اور بڑے بڑے شہر بسائے۔ کنشکا نے سونے کے سکے ڈھالے جبکہ اس سے قبل تانبے اور چمڑے کے سکے استعمال ہوتے تھے۔ اس خاندان کی حاکمیت بھی ساسانیوں کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ختم ہوئی۔ کشانی قبیلہ آج بھی حاکمیت کے خاتمے کے باوجود مضبوط جمعیت کا مالک ہے اور بلوچستان کے طاقتور قبائل میں شمار ہوتا ہے۔ کشانی نام کا ایک طائفہ شاہوانی قبائل کے رمضان زئی شاخ میں بھی پایا جاتا ہے جن کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ شاہوانیوں میں بعد ازاں آکر شامل ہوئے ہیں۔ جبکہ اس قبیلہ کی کئی شاخیں اور خاندان سندھ اور پنجاب میں بھی آباد ہیں۔

زنگی:

یہ ایک مشہور و معروف قبیلہ ہے اور قبائل اکراد میں شمار ہوتا ہے۔ اس قبیلہ نے مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ میں تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے اس قبیلہ نے کئی اہم اور نامور شخصیات، جرنیلوں اور حکمرانوں کو جنم دیا ہے۔ یقیناً قارئین کرام حلب کے معروف حکمرانوں عماد الدین زنگی، نورالدین زنگی، سیف الدین غازی اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے نام سے واقف ہوں گے جنہوں نے پہلی، دوسری اور تیسری صلیبی جنگوں کے دوران عیسائی دنیا کی فوج ظفر موج کو عبرت ناک شکست دی تھیں اور مسلمانوں کے قبلہ اول بیت المقدس کو عیسائیوں کے قبضے سے آزادی دلائی تھی۔ اسی زنگی قبیلہ کا مشہور و معروف اور تاریخ ساز ہیرو صلاح الدین ایوبی ہی تو تھا کہ جس نے مصر سمیت تمام مشرق وسطیٰ پر اپنی حاکمیت قائم کی اور ایک ایسے وقت میں ملتِ اسلامیہ کی باگ ڈور سنبھالی

کہ جب پورا عالم اسلام خلیفہ عباسیہ سمیت خواب غفلت کے مزے لوٹ رہا تھا۔ اس قبیلہ کا تذکرہ بابائے تاریخ ہیر وڈوٹس نے بھی کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک قدیم قبیلہ ہے اور ایران کے قدیم خاندانوں کی حکومتوں میں اہم کردار ادا کرتا چلا آیا ہے کیونکہ ہیر وڈوٹس اس قبیلہ کا شمار خطے کے قدیم اور اولین قبائل میں کرتا ہے۔ عرب وقائع نگاروں، روزنامچہ نویسوں، سیاحوں اور مورخوں نے بھی اپنی تحریروں میں اس قبیلہ کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے سیاسی کردار کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے (سٹر یخ 1986 :480-502)۔ بلوچستان میں کئی مقامات زنگی نام سے منسوب ہیں۔ مشہور بلوچ مورخ آغا نصیر خان احمد زئی کمبرانی بھی اکراد قبائل کے زنگنہ شاخ کا تذکرہ کرتا ہے اور اسے اکراد کی بڑی خاندانوں میں شمار کرتا ہے۔ علاوہ ازیں بطور نام ''زنگی (زنگی خان)'' بلوچ قبائل کے مقبول ترین ناموں میں سے ایک ہے۔ علاقہ خضدار میں اب بھی ایک قبیلہ ''زنگی جُو'' کے نام سے موجود ہے جو بلاشبہ خضدار کے قدیم اور اصل باشندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ قبیلہ بھی خود کو اکراد میں سے کہتا ہے۔ یہ بات ذہن نشین ہو کہ عرب مورخین عربی زبان میں لفظ ''گ'' نہ ہونے کی وجہ سے اس کے متبادل لفظ ''ج'' کا استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا اپنی تحریروں میں وہ اس قبیلہ کو ''زنجی'' تحریر کرتے ہیں۔

ساجدی:

ساجدی ایک مشہور و معروف بلوچ قبیلہ ہے جو جھلاوان کے ممتاز اور طاقتور قبائل میں شمار ہوتا ہے۔ دورِ حاضرہ میں آوران ڈسٹرکٹ کا علاقہ جھاؤ ان کا مرکز ہے مگر یہ خضدار، لسبیلہ، کیچ، کوئٹہ سمیت بلوچستان کے کئی دیگر اضلاع میں بھی سکونت رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں عام طور پر بھی کہا جاتا ہے کہ یہ قدیم باشندے ہیں اور بلوچوں کے ابتدائی قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ممتاز مورخ ہیر ودوٹس نے اپنی کتاب میں ایک قبیلہ کا تذکرہ سجیدی (Saggedian) کے نام

سے کیا ہے اور جمع کے صیغہ میں اسے تحریر کیا ہے۔ اس قبیلہ کو اُن قبائل کے مابین دکھایا گیا ہے جو آج بھی بلوچ سٹاک میں موجود ہیں اور بھرپور جمعیت رکھتے ہیں۔ اس قبیلہ کا ابتدائی علاقہ شمالی بلوچستان کے علاوہ سیستان تھا۔ اسی وجہ سے اس قبیلہ کو ساکاؤں سے نسبت دی جاتی ہے۔ اس قبیلہ کا سردار خیل طائفہ بھی ساکازئی کہلاتا ہے۔ اس قبیلہ کی تاریخ تلاش کرنے اور خطے میں ان کے ابتدائی عہد کے سیاسی وسماجی کردار کے بارے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

گرمانی:

مشہور و معروف بلوچ قبیلہ ہے۔ بلوچستان کے علاوہ ڈیرہ جات اور جنوبی پنجاب میں بھی اس کی کثیر آبادی رہتی ہے۔ علاوہ ازیں اس کی کچھ شاخیں سندھ میں بھی آباد ہیں۔ یہ قدیم قبیلہ ہے جس کا تذکرہ ہیروڈوٹس نے کیا ہے۔ موصوف اسے مشرقی ایران کا کاشتکار قبیلہ تحریر کرتا ہے۔ لکھتا ہے کہ:

"جرمانی (گرمانی) کاشتکاری کرتے ہیں" (ہیروڈوٹس 82:2001)

ہیروڈوٹس انہیں قدیم ایرانی اقوام میں شمار کرتا ہے جنہوں نے سائرس کی تخت نشینی میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ اسی طرح معروف مورخ ہیرلڈلیم بھی قدیم ایرانی دور میں اس قبیلہ کا ذکر کرتا ہے اور اس کی تفصیلات ہیروڈوٹس کی نسبت زیادہ بیان تو نہیں کرتا مگر اس لحاظ سے یہ بیان خاصی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ہیرلڈلیم ان کے جغرافیائی حدود بھی بیان کرتا ہے۔ لکھتا ہے کہ:

"کوروش ایک عظیم ترین فوج کے ساتھ ایران کی، مشرقی قوم گرمانیوں کے پہاڑی علاقے میں داخل ہوا۔ اس کے آگے پیچھے ایک بڑی اور وسیع سلطنت پھیلی ہوئی تھی" (ہیرلڈلیم 225:2012)۔

علاوہ ازیں توراکینہ قاضی بھی سائرس کی فتوحات میں اس قبیلہ اور اس کے پہاڑی علاقے کا تذکرہ کرتی ہے۔ جبکہ دیگر وہ مصنفین جو ایران کی ہخامنشی عہد کی تاریخ لکھتے ہیں وہ سائرس کے عہد میں اس قبیلہ کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں ہیروڈوٹس کی کتاب میں کئی دیگر ایسے قبائل کے تذکرے ملتے ہیں جو موجودہ بلوچ خطہ میں آباد تھے۔ ان کے جو نام یونانی مورخ نے تحریر کیے ہیں وہ چونکہ یونانی لہجے میں ہیں لہٰذا تھوڑی سی ردوبدل اور ادائیگی کی تبدیلی سے یہ قبائلی نام آج بھی بلوچ قبائل میں ملتے ہیں۔ جیسا کہ ہیروڈوٹس ایک قبیلہ کو الرودین لکھتا ہے جو موجودہ بلوچستان کے ہی حدود میں آباد تھا اور خوب مضبوط جمعیت رکھتا تھا۔ یہ نام چونکہ یونانی زبان میں تحریر ہے، ممکن ہے کہ یہ مشہور و معروف براہوئی بلوچ قبیلہ رودینی ہو جسے یونانی مورخ نے اپنے لسانی لہجے اور جمع کے صیغہ میں ادا کیا اور اسے الرودین تحریر کیا۔ علاوہ ازیں مورخ ہیروڈوٹس ایک قبیلہ کو، جو الرودین کے ہمسائے میں آباد تھے اور انہی کی طرح مسلح ہوتے تھے یعنی ان کا عسکری سکواڈ ایک تھا اور وہ ایک ہی سماجی طرز کی زندگی گزارتے تھے، ساسپیرین یا سراسپیرین (سراسپرائے) تحریر کرتا ہے۔ یہ لفظ بھی جمع کے صیغہ اور یونانی لب و لہجہ میں تحریر ہے۔ امکان یہ ہے کہ یہ موجودہ براہوئی قبیلہ سرپرہ ہے جو اب بھی رودینی قبیلہ کے ساتھ یا اُس کے ہمسائے میں رہتا ہے۔ یہ قدیم جنگجو قبائل میں شمار ہوتا تھا جس نے میدی اور ہخامنشی ادوار میں زبردست عسکری و سیاسی کردار ادا کیا تھا۔ یہ لفظ یقیناً بمرور زمانہ سراسپرائے سے تبدیل ہو کر آج سرپرہ بنا ہے۔ اسی طرح قبیلہ مامشئی کو مائشی تحریر کیا گیا ہے جو رودینی اور سرپرہ قبائل کے ہمسائے میں یا اُن کے قریب آباد تھا جبکہ مکران میں بھی اس کی کثیر آبادی تھی۔

درج بالا بیان کردہ قبائل کے علاوہ بھی تاریخی کتب میں کئی دیگر ایسے قبائل کے تذکرے ملتے ہیں جنہیں ان کے قدیم ناموں یا ان ناموں میں تھوڑے سے معقول ردوبدل کے بعد بلوچ قبائل میں تلاش کیا جاسکتا ہے اور کئی قبائل ایسے ہیں جنہیں قدیم قبائل خیال کیا جاتا ہے جبکہ ان کے متعلق تحریری بیانات اب تک تلاش نہیں کیے جاسکے ہیں۔ مامسنی، ناہروئی، ماندائی، نیچاری، ساسولی، چنال، ناہروئی اور کئی دیگر قبائل اس زمرے میں آتے ہیں۔

کئی قبائل ایسے بھی ہیں جن کے نام مورخین اپنی کتب میں بیان کرتے ہیں مگر وہ قبائل اب اپنے پرانے ناموں سے نہیں ملتے۔ ممکن ہے کہ وہ قبائل کسی بڑے قبیلے کے اندر ضم ہوگئے ہوں اور اپنے قدیم نام کھو چکے ہوں۔ علاوہ ازیں ایسے قبائلی ناموں کی بھی کمی نہیں ہے جو ماضی میں زبردست طاقت کے مالک تھے مگر بمرورِ زمانہ اپنی طاقت کھو دینے اور کمزور ہوجانے کے بعد کسی بڑے اور طاقتور قبیلہ کی آڑ لی ہو اور ساتھ ہی اپنے قدیم نام کو بھی زندہ رکھا ہو۔ ایسے کئی قبائل کو باآسانی موجودہ بلوچ قبائل میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔

ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ بلوچستان اور اس کے باشندوں کی قدیم تاریخ پر لکھنے والے مختلف اللسان اور مختلف الاقوام لوگ ہیں۔ بلوچستان کی قدیم تاریخ اور یہاں کے باشندوں کے بارے میں لکھنے والوں میں یونانی، فارسی، عرب، ترک، روسی، فرانسیسی، اطالوی، انگریز، ہندوستانی، پنجابی، پشتون، سندھی وغیرہ اور مختلف لسان کے علماء و مورخین شامل ہیں۔ ان میں سے کسی نے تفصیلاً تو کسی نے ضمناً اس خطہ اور یہاں کے باشندوں کے بارے میں معلومات فراہم کیے ہیں۔ چونکہ یہ حضرات مختلف اللسان لوگ تھے لہٰذا ہر ایک نے یہاں کے باشندوں، قبائل اور علاقہ جات کے نام اپنے اپنے لسانی لہجوں میں تحریر کیے ہیں جنہیں عام قاری کے لیے سمجھنا اور انہیں مماثلتی انداز سے دیکھنا مشکل ہوتا ہے بالخصوص اُن حضرات کے لیے جو بلوچ قوم سے تعلق نہیں

رکھتے اور بلوچستان کی قدیم تاریخ اور یہاں کے قدیم باشندوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ اس طرح کی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ جب کسی غیر بلوچ مورخ نے یہاں کے قدیم باشندوں، علاقوں اور قبائل کے نام اپنے اپنے لہجے میں تحریر کیے۔ مثال کے طور پر ہیروڈوٹس بلوچ قبائل کے کئی نام اپنے یونانی لہجے میں تحریر کرتا ہے۔ وہ ہوت قبیلہ کو یوت، پرکانی قبیلہ کو پیریکانی، مکران کے باشندوں کو میکرونی، ساجدی قبیلہ کو سجیدین، رودینی کو الرودین وغیرہ تحریر کرتا ہے۔ جو بلاشبہ اصل الفاظ کی یونانی زبان میں ادائیگی ہے۔ اسی طرح بعض عرب مورخین نے ہوت قبائل کے لیے لفظ ''زط'' اور ''الزط'' کے الفاظ استعمال کیا ہے۔ ان الفاظ کو ایرانی فارسی اللسان مورخین نے ''زط'' کی بجائے ''جت'' میں بدل دیا۔ برصغیر پر چونکہ فارسی زبان کا اثر زیادہ رہا اور تمام قدیم ادب اور سرکاری احکامات فارسی زبان میں تحریر ہوتی تھیں لہذا عربی زبان کے الفاظ زیادہ مقبولیت حاصل نہ کرسکے۔ علاوہ ازیں چونکہ اردو ادب میں فارسی ادب کا ایک بڑا حصہ شامل ہے لہذا اردو میں بھی عربی لفظ ''زط'' کی بجائے ''جت'' زیادہ مقبول ہوا اور یار لوگوں نے اس قبیلہ کو جٹ بنادیا۔ کوئی اسے پنجابی تو کوئی سندھی اقوام میں ان کا شمار کرنے لگا۔ کسی نے انہیں ہن قبائل کی نچلی ذات سے متعلق بیان کیا تو کسی نے انہیں قدیم وسط ایشیائی قبیلہ ''مساگیت'' (مساجیت) قبائل کی ایک شاخ بھی بیان کیا، جبکہ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ پنجاب اور سندھ کے علاوہ مشرقی بلوچستان میں آباد مشہور و معروف جت قبائل دراصل قدیم ہوت قبائل سے تعلق رکھتے ہیں جو بارہا حکمرانی کے منصب پر فائز رہے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف بلوچستان بلکہ سندھ اور پنجاب پر بھی حاکمیت کی ہے اور بلوچستان کی اولین تہذیب و ثقافت کے بنیاد گزار ہیں۔ اسی طرح لفظ پیریکانی، میکرونی، الرودین، ڈابیہ، کوپچی وغیرہ جو ہیروڈوٹس نے اُس خطے کے باشندوں کو قرار دیا ہے جو بلاشبہ اب بھی خطہ منقسم بلوچستان کہلاتا ہے۔ یعنی ایران، افغانستان اور پاکستان کی مملکتوں میں منقسم بلوچ قوم کا

خطہ۔ آج بھی انہی ناموں سے مطابقت رکھنے والے قبائل بلوچستان میں دیکھے جاسکتے ہیں جو ابھی تک اپنے قدیم ناموں سے جانے جاتے ہیں۔

اسی طرح عرب، فارسی، سندھی، روسی، فرانسیسی، انگریز، پنجابی حتیٰ کہ ہر زبان اور قوم سے تعلق رکھنے والے مورخ، شاعر، وقائع نگار، روزنامچہ نویس، سیاح اور ادیبوں نے بلوچوں کے نام، اُن کے قبائل کے نام اور اُن کے علاقوں کے نام اپنے لسانی لہجوں میں ادا کیے جنہیں عام قاری، جو بلوچستان کی تاریخ اور یہاں کے باشندوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتا، کے لیے سمجھنا کافی مشکل ہوتا ہے۔ سندھی میں لفظ "ل" کے نعم البدل کے طور پر لفظ "ر" کا استعمال ہوتا ہے لہٰذا سندھی میں بلوچ کو "بروچ" یا "بھروچ" کہا جاتا ہے لہٰذا ایک قاری کے لیے انہیں سمجھنا اور مماثلتی اور موازناتی مطالعہ کرنا کافی مشکل امر ہوتا ہے۔ سندھی میں ہی سسی پنوں کے رومانوی داستان کے مرکزی کردار پنوں کے والد اور مکران کے حکمران میر عالی خان ہوت کو "جام آری ہوت" تحریر کیا گیا ہے۔ اسی طرح دیگر زبانوں میں تحریر شدہ تواریخ میں بھی بلوچوں کے قدیم قبائل کے تذکرے ملتے ہیں۔ جنہیں تلاش کرنے کے لیے بلوچ تاریخ سے آگاہی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ موازناتی اور مماثلتی طریقہ مطالعہ کا جاننا بھی از حد ضروری ہے۔

باب سوم:

بلوچ قوم اور بلوچستان کے جغرافیائی حدود

اس موضوع پر اس سے قبل راقم الحروف نے اپنی کتاب ”بلوچ اور ان کا وطن“ میں تاریخی کتب کے حوالوں کی روشنی میں کافی معلومات فراہم کی ہیں البتہ یہاں اس موضوع پر چند باتوں کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ بلوچ جغرافیہ کو دو طرح سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ایک وہ جغرافیائی حدود جہاں اس قوم کے باشندے ابتدائی ایام سے سکونت پذیر ہیں۔ دوم وہ حدود جہاں بلوچ قوم نے اپنی سیاسی مرکزیت قائم کی اور اپنے سیاسی جغرافیائی حدود کو متعین کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان دو طرح کے جغرافیائی حدود میں ہمیشہ ردوبدل ہوتی رہی ہے۔ جب کوئی حملہ آور بلوچ جغرافیائی حدود پر حملہ آور ہوتا تو اس کی نئ شکل اپنی پسند اور مفادات کے تناظر میں ترتیب دیتا۔ طویل یا قلیل عرصہ بعد جب حملہ آور خطہ چھوڑ کر آگے نکل جاتا تو منتشر شدہ مقامی آبادی دوبارہ اپنے اپنے علاقوں میں واپس آکر آباد ہو جاتیں۔ مگر ایسے بھی شواہد ہیں کہ جب کسی حملہ آور نے بلوچ خطے پر حملہ کیا اور مقامی آبادی کو اقلیت میں تبدیل کر کے اس کے خطے پر ہمیشہ کے لیے قابض ہو گیا۔ ایسی کئی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں جن کے مطالعہ سے اس بات کا ادراک ہو جاتا ہے کہ بلوچ خطے کے کئی حصے اغیار کے قبضے میں چلے گئے اور وہ علاقہ جہاں بلوچ قوم کے ابتدائی مساکن اور آبائی و موروثی زمینیں تھیں وہ آج دیگر اقوام کے قبضہ و اختیار میں ہیں۔ مثال کے طور پر شمالی ایران کا تمام تر علاقہ بمعہ کوہِ دماوند (کوہِ البرُز) صوبہ جات مازندران و گیلان، مشرقی ایران کا تمام تر صحرائی علاقہ، شمال مغربی ایران کا وہ علاقہ جو آرمینیا اور تُرک خطے

کے ساتھ منسلک ہے، کا تمام تر علاقہ کسی زمانے میں بلوچ قوم کی آماجگاہ اور سیاسی مراکز ہوتے تھے آج آریائی اقوام کے قبضہ میں ہیں جنہوں نے مقامی آبادی کو یا تو اُن کی زمینوں سے بے دخل کیا یا پھر انہیں اپنی ثقافت اور معاشرت کے اندر ضم کر لیا۔ اسی طرح جنوبی افغانستان کا تمام تر علاقہ یعنی قندھار سے لے کر زرنج (ہیلمند) تک مختلف بلوچ قبائل کے ابتدائی مساکن کے طور پر جانا جاتا ہے، کو افغان قوم نے اپنے اندر ضم کر لیا ہے۔ ان علاقوں کے باشندے اب بھی بلوچ ہیں مگر انہیں افغانوں نے اپنے ثقافتی رنگ اور معاشرتی سانچے میں ڈال کر انہیں اُن کی اصل سے جدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں خود پاکستان کے اندر جہاں بلوچ خطہ وسیع و عریض جغرافیائی حدود پر مشتمل ہے اور پوری مملکت کے تقریباً آدھے کے برابر ہے، میں بھی بلوچ قوم کی قومی ثقافت کو قائم و دائم رکھنے سے اجتناب کیا گیا اور ان کے قبائل کو مختلف قومیتوں میں تقسیم کرنے یا دیگر اقوام میں ضم کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ پنجاب میں آباد بلوچ قوم کو جب پنجابیوں میں ضم کرنے کی کوششیں ناکام ہوئیں تو انہیں ایک علیحدہ قومیت بننے کی طرف راغب کیا گیا اور انہیں یہ احساس دلایا گیا کہ وہ پاکستان میں آباد دیگر اقوام کی طرح الگ ثقافت و معاشرت کے حامل ہیں لہٰذا انہیں اپنی سرائیکی قومیت کی ترقی و ترویج اور خوشحالی و حقوق کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔ آج سب جانتے ہیں کہ الگ سرائیکی قومیت کی جدوجہد کہاں تک پہنچی ہے۔ اسی طرح سندھ میں آباد بلوچ قوم کے قبائل کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی قومیت سندھی لکھیں۔ صوبہ خیبر پختونخواہ کے اضلاع ڈیرہ اسماعیل خان اور ٹانک اور ان سے متصل علاقوں کی کثیر آبادی اور قدیم باشندے بلوچ ہیں مگر انہیں بھی اب سرائیکیوں میں شامل کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح وسط ایشیائی ممالک بالخصوص ترکمانستان میں بلوچ قوم کی بڑی تعداد بود و باش رکھتی ہے جہاں اُن کی موروثی آبائی زمینیں اور قطعات ہیں۔ ایران اور ترکی کے مابین پھیلا ہوا کوہِ

زاگروس کا تمام تر پہاڑی علاقہ وادیاں بلوچوں کے مشہور و معروف اور تاریخی قبیلہ کُرد کی آماجگاہ ہیں۔ اب یہ علاقہ ایک نئی ریاست کُردستان بن چکا ہے۔

اس طرح اگر بلوچوں کے قومی جغرافیائی حدود کو دیکھا جائے تو ان حدود کا رقبہ بہت ہی وسیع ہوگا۔ جو علاقے درج بالا سطور میں بیان ہوئے وہ تمام تر علاقے بلوچ قوم کے ابتدائی مراکز اور مساکن رہے ہیں جن پر بمرورِ زمانہ دیگر غالب اور طاقتور اقوام قابض ہوتے گئے لہٰذا اُن کا تمام تر قومی جغرافیہ کسی ایک سیاسی اور یک قومی وحدت کی شکل اختیار نہ کرسکا۔ البتہ اس بات سے کسی طور انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان درج بالا حدود پر ماضی میں طویل عرصے تک مختلف بلوچ قبائل حاکمیت کرتے رہے ہیں۔ ان بلوچ قبائل کی سیاسی حکومتوں کے تذکروں سے تاریخ کے قدیم صفحات بھرے پڑے ہیں۔

پندرہویں صدی عیسوی میں علاقہ سوراب میں جب کمبرانی بلوچوں نے اپنی حاکمیت قائم کی تو بلوچستان کے مختلف حصے مختلف قبائل اور اقوام کے قبضے میں تھے اور کوئی مرکزی حکومت نہ تھی۔ ایک جانب مکران پر مقامی قبیلہ ہوت کی حکومت قائم تھی جو بلوچستان کے علاقوں خضدار، سوراب اور قلات پر بھی تصرف رکھتے تھے تو بیلہ پر بھی ایک مقامی قبیلہ "بلفت" حاکم تھا جبکہ شمالی بلوچستان کے علاقے منگول حملہ آوروں کے قبضے میں تھے۔ مشرقی بلوچستان پر سندھیوں کا قبضہ تھا جبکہ وہ علاقے جو اب ایران اور افغانستان میں شامل ہیں مرکز قلات سے دور ہونے کے سبب کمبرانیوں کے تصرف اور سوچ سے بالکل نکل چکے تھے۔ ان حالات میں ممکن تھا کہ وہ جغرافیائی حدود جن میں اس قوم کے باشندے کثیر تعداد میں آباد تھے آہستہ آہستہ غیر اقوام کے تصرف میں چلے جاتے اور دورِ حاضرہ میں صرف کتابوں کی حد تک اس قوم کے تذکرے ملتے۔ مگر کمبرانی حکمرانوں نے انتہائی نامساعد اور حوصلہ شکن حالات میں اقتدار

سنبھالا۔ وہ بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور اپنے مرکز کی جغرافیائی حدود اور وسائل میں اضافہ کرتے رہے۔ کمبرانی قبیلہ کی دو خاندانوں نے بلوچستان پر لگ بھگ پانچ سو اڑتیس سال حکومت کی۔ اس دوران اس قبیلہ کے میروانی اور احمدزئی شاخوں سے تعلق رکھنے والے حکمرانوں نے بلوچستان اور بلوچ قوم کی سیاسی، جغرافیائی اور معاشرتی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس قبیلہ کے احمدزئی شاخ کے حکمرانوں میر احمد خان اول، میر عبداللہ خان اور میر نصیر خان نوری نے بلوچستان کے جغرافیائی حدود کو وسیع و عریض کرنے اور تمام بلوچ علاقوں کو ایک ہی لڑی میں پرونے کے لیے حتی المقدور کوششیں کیں اور بلوچستان کے جغرافیائی حدود کا کسی حد تک تعین کیا۔ بلاشبہ احمدزئی خاندان کی حاکمیت سے قبل بلوچ قوم کے وسیع و عریض جغرافیائی حدود منظم و متحد نہ تھے بلکہ مختلف علاقائی تقسیم کا شکار تھے۔ ان علاقوں پر عموماً مقامی بلوچ قبائل کی حاکمیت قائم ہوتی تھی۔ کبھی ایک قبیلہ تو کبھی دوسرا قبیلہ غالب آجاتا۔ مکران، لسبیلہ، خاران، سیستان، ڈیرہ جات (ہڑند و داجل) ایران میں شامل بلوچ علاقوں اور مشرقی بلوچستان پر مختلف اوقات میں مختلف قبائل اور اقوام کی حاکمیت قائم رہی ہے۔ جو اپنے اپنے محدود علاقوں کے حاکم ہوتے تھے۔ یہ علاقائی حاکم آپس میں مل کر اتفاق سے کوئی مشترکہ قومی حاکمیت قائم نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ کسی بڑی بیرونی طاقت کے زیرِ اثر ہوتے تھے۔ تاریخ کے مطالعہ سے اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی میں مکران پر حاکم مید قبیلہ کو وسط ایشیائی اور غزنی کے حکمرانوں محمود غزنوی اور مسعود غزنوی کی حمایت اور پشت پناہی حاصل تھی جو مکران کے حکمرانوں سے بھاری رقم وصول کرتے تھے۔ اسی طرح خضدار کے مقامی حکمران بھی غزنویوں کے باجگزار تھے۔ علاوہ ازیں رند اور ہوت قبائل نے مختلف اوقات میں وسیع و عریض حکومتیں قائم کیں مگر وہ بھی بلوچستان کے جغرافیائی حدود کو

کوئی ایک نام نہ دے سکے اور نہ ہی ان حدود کا تعین کر سکے۔ یہ اعزاز یقیناً قلات کے احمد زئیوں کو ملتا ہے کہ اس خاندان کے عظیم اور دانشمند حکمران میر نصیر خان نوری نے پہلی مرتبہ بلوچستان کے سیاسی و جغرافیائی حدود کا تعین کیا اور اپنی مملکت کے بارے میں اُس وقت کے حاکم اور ایشین ٹائیگر احمد شاہ درانی سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ:

"میری مملکت کے حدود وہاں تک ہیں جہاں تک بلوچی بولی جاتی ہے"۔

یہ حدود بلاشبہ بہت وسیع و عریض اور پیچیدہ ہوں گے البتہ میر نصیر خان نے موجودہ ایرانی، افغانستانی اور پاکستانی بلوچستان پر مشتمل ایک ایسی قومی مملکت کی بنیاد رکھی جو خالصتاً بلوچ قوم کے نفوس پر مشتمل تھی یعنی اس رقبے کی تقریباً تمام تر آبادی بلوچ قبائل پر مشتمل تھی۔ اس مملکت کا کل رقبہ تین لاکھ چالیس ہزار مربع میل تھا۔ موجودہ وقت میں سندھ، پنجاب اور خیبر پختونخواہ میں شامل بعض علاقے بھی اس جغرافیائی رقبے میں شامل تھے جنہیں انگریزوں نے اپنی انتظامی سہولیات کی خاطر نوآبادیاتی دور یعنی انیسویں صدی عیسوی میں بلوچستان کے مرکزی حکومت قلات سے مختلف حیلوں بہانوں اور معاہدات کے ذریعے حاصل کر کے درج بالا صوبوں میں شامل کیا۔

انگریزوں کی بلوچستان میں مداخلت کے وقت بلوچستان کے حدود مغرب میں بیر جند سے لے کر مشرق میں کوہِ سلیمان کے مشرقی ڈھلوانوں تک جبکہ جنوب میں ساحلِ بیلہ و مکران سے لے کر شمال میں کچلاک جبکہ قدرے شمال مغرب میں دریائے ہیلمند تک پھیلے ہوئے تھے۔ محققین اور مصنفین کے بیانات میں اس وسیع و عریض خطے کے کل رقبے اور پیمائش کے بارے میں اختلافات پائے جاتے ہیں مگر استناد کے ساتھ اس کا کل رقبہ کو تین لاکھ چالیس ہزار مربع میل بیان کیا جاتا ہے۔ انگریزوں کی آمد اور بلوچستان کے اندرونی معاملات میں بیجا مداخلت اور انگریزوں کے لاگو کردہ نوآبادیاتی نظام کی وجہ سے آہستہ آہستہ بلوچستان کا رقبہ کم ہوتا گیا۔ 1871ء میں مکران اور

خاران کے وسیع و عریض علاقوں کو تقسیم کر کے ایران کے قاجاریوں کو دے دی گئی جسے گولڈ سمتھ لائن کا نام دیا گیا۔ جبکہ 1893ء میں ڈیورنڈ لائن کے تحت بلوچستان کے کئی علاقے افغانستان میں شامل کیے گئے۔ علاوہ ازیں سندھ، پنجاب اور کے پی کے میں بھی انگریزوں نے بلوچستان کے کئی علاقے شامل کر کے بلوچستان کے اصل نقشے کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ اس طرح مختلف سازشوں اور برطانوی مفادات کی خاطر بلوچستان کا دولاکھ مربع میل سے بھی زیادہ ایریا بلوچستان سے الگ کر کے ایران، افغانستان، سندھ، پنجاب اور کے پی کے میں شامل کر دیا گیا۔

موجودہ پاکستانی بلوچستان کا کل رقبہ ایک لاکھ چونیتس ہزار مربع میل کے لگ بھگ ہے جو اصل اور حقیقی بلوچستان کے آدھے کے برابر بھی نہیں ہے۔ پاکستان بننے کے بعد جب بلوچستان کو اس نئی مملکت میں شامل کیا گیا تو حکمرانوں نے نہ تو سندھ، پنجاب اور کے پی کے میں شامل بلوچ علاقوں کو بلوچستان میں شامل کیا اور نہ ہی بلوچستان کے وہ علاقے، جو انگریزی عہد میں افغانستان اور ایران میں شامل کیے گئے تھے، کی بلوچستان میں دوبارہ شامل کرنے کے لیے اقدامات کیے۔ اس پہ المیہ یہ کہ ساٹھ کی دہائی میں ایران سے متصل بلوچستان کے بعض علاقے جو پاکستان میں شامل تھے ایران کو دے دیے گئے۔ اس طرح انگریزوں کے علاوہ پاکستان کے اپنے حکمرانوں نے بھی بلوچستان کے جغرافیائی حدود کو شدید نقصان پہنچایا۔

موجودہ دور میں منقسم بلوچستان کا جغرافیائی محل وقوع کچھ یوں ہے کہ ایران مغرب کی سمت جبکہ افغانستان شمال میں اس کے ہمسایہ ہیں۔ سندھ و پنجاب کے خطے مشرق میں اور قدرے شمال مشرق میں خیبر پختونخواہ کا علاقہ ہے۔ جنوب میں ایک طویل و عریض سمندر بلوچستان کی جغرافیائی، علاقائی اور معاشی اہمیت کو بڑھاتی ہے اسکی زمینی ساخت چار اقسام پر مشتمل ہے۔

(1) اپرہائی لینڈ (بالائی پہاڑی علاقہ) Upper High Land ۔

یہ وسطی اور مشرقی وسطی علاقہ پر مشتمل ہے اسکی پہاڑیاں سطح سمندر سے 12000 فٹ جبکہ وادیاں 5000 فٹ تک بلند ہیں۔

(2) لوئیر ہائی لینڈ (نشیبی پہاڑی علاقہ) Lower High Land ۔

مشرقی بلوچستان میں کوہ سلیمان، جنوبی حصے میں پب و کیر تھر اور مغرب میں چاغی کی پہاڑیاں شامل ہیں جنکی سطح سمندر سے بلندی 5000 فٹ تک ہے۔

(3) میدان Plains ۔

اس زمرے میں کچھی، لسبیلہ اور دشت مکران کے میدان آتے ہیں جنکی سطح سمندر سے بلندی 250 فٹ کے لگ بھگ ہے۔

(4) صحرا Desert۔

بلوچستان کا جنوب مغربی خطہ صحرا پر مشتمل ہے۔

بلوچوں کی کل آبادی کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے کیونکہ سیاسی، سماجی، معاشی، قومی، تعلیمی، جغرافیائی اور ثقافتی اختیارات سے محروم یہ قوم دنیا کے مختلف کونوں میں دربدر اور اپنی اکائی اور کل سے الگ تھلگ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس بکھری ہوئی قوم کی کل آبادی چھ سے سات کروڑ یا اس سے کچھ زیادہ ہے مگر وہ اتنے منقسم ہیں کہ انہیں یکجا کرنے اور ایک ہی جغرافیائی حدود میں لانا یقیناً ایک عظیم کارنامہ ہوگا۔ نجانے یہ سعادت کس ہادی ور ہنما کے حصے میں آئے گی۔

بلوچستان میں ہر موسم کے پھل، پھول، سبزی اور اناج کی پیداوار ہوتی ہے کیونکہ یہ خطہ زمین موسموں کا گلدستہ ہے یہاں بیک وقت چاروں موسموں سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے

کہیں گرمی تو کہیں سردی کہیں بہار تو کہیں پت جھڑ۔ کثرت سے پھلوں کی پیداوار کا یہ عالم ہے کہ یہ زمین پر پڑے پڑے سڑ جاتے ہیں۔ یہاں کے بازار کا عالم یہ ہے کہ اعلیٰ کوالٹی کی پیاز 15 روپے دڑی (۵ کلو) کے حساب سے فروخت ہو رہی ہے۔ حالانکہ یورپ میں یا قریبی ہمسایہ عرب ممالک میں ان اشیاء کی اتنی مانگ ہے کہ جس سے ایک سال کی پیداوار سے بلوچ زمیندار مالامال ہوسکتے ہیں مگر حکومتی عدم دلچسپی کی وجہ سے بلوچستان کی زرعی پیداوار کا بڑا حصہ اپنی صحیح قیمت نہیں پاتا اور نہ ہی یہ پیداوار بیرونی منڈیوں تک پہنچ پاتا ہے وگرنہ بلوچستان کے پھل دنیا بھر میں ایک اہم مقام پالیتے۔

بلوچستان کی نسلی گروہوں میں بلوچ سرفہرست ہیں جو مشرق، مغرب، جنوب اور شمال مشرق میں آباد ہیں جبکہ شمال اور قدرے شمال مشرق میں پشتون قبائل آباد ہیں بنیادی طور پر جلو گیر (کچلاک) سے بالائی جانب پشتو زبان بولنے والے قبائل افغانستان کی رعیت تھے جو عبداللہ خان قہار کے دور میں بلوچستان کا حصہ بنے مگر کچھ علاقے انگریزوں نے بھی افغانستان سے ہتھیا کر برٹش بلوچستان میں شامل کر دیئے کیونکہ نصیر خان کا قول یہی تھا کہ صرف بلوچی زبان بولنے والے اور بلوچ قوم سے تعلق رکھنے والی سرزمین بلوچستان ہے۔ لہٰذا جلوگیر سے بالائی جانب پشتو زبان بولنے والے قبائل کا علاقہ ہے جبکہ باقی ماندہ بلوچ خطہ زمانہ ماقبل تاریخ سے بلوچ قبائل کے ماتحت چلا آرہا ہے جس کا ایک حصہ بہر حال افغانستان جبکہ باقیماندہ ایران اور پاکستان کے پاس ہیں۔ قارئین کرام ایک بات ذہن نشین ہو کہ ایک زمانے میں قندھار تک کا علاقہ بلوچ قبائل پر مشتمل تھا۔ بلاتردد یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ کشان، آشکانی، ساسانی، عرب اور منگولوں کے عہد تک قندھار کی آبادی بلوچ قبائل پر مشتمل تھی جو بعد ازاں اندرونِ بلوچستان اور مکران و کرمان کے صحرائی علاقوں کی جانب ہجرت کر گئی۔ اب بھی قندھار اور اس کے مضافات میں بلوچ

باشندوں کی آبائی اور موروثی زمینیں ہیں۔ البتہ ان سطور میں جو جغرافیائی حدود بیان کیے جارہے ہیں وہ میر نصیر خان نوری کے عہد میں متعین کردہ حدود مملکت بلوچستان کا رقبہ ہے۔

بلوچوں کی معاشی حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔ ہر طرف غربت، افلاس، بھوک اور بیماریوں کا ڈیرہ ہے۔ کوئی بلوچ گھرانہ شاید ہی خوش قسمت ہو گا کہ جہاں کبھی فاقے نہ ہوں وگرنہ بلوچوں کی حالت یہ ہے کہ انھیں ایک وقت کی روٹی بھی میسر نہیں ہے حالانکہ وہ ایک ایسی سر زمین کے وارث ہیں کہ جہاں سمندر رہے، معدنیات ہیں، بین الاقوامی بری، بحری اور فضائی راستے ہیں جہاں انواع واقسام کے پھل پھول اناج سبزیاں اور جنگلی جڑی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں مگر وہاں کا مالک ننگا اور بھوکا مختلف بیماریوں سے اذیت کا مارا تڑپ تڑپ کر مر رہا ہے۔ عالمی انسانی فلاحی اداروں کو افریقہ کے بھوکے اور بیمار تو نظر آتے ہیں کہ جنگی امداد اور دیکھ بھال کیلئے تمام مغربی اور دیگر عالمی قوتیں سرگرم ہو جاتی ہیں مگر انھیں بلوچستان میں بھوک، پیاس، جہالت، بیماری اور سیاسی عدم استحکام نظر نہیں آتا۔ موجودہ دور میں مختلف وجوہات کی بنا پر ہزاروں بلکہ لاکھوں بلوچ اپنے ہزاروں سالہ قدیم آبائی مساکن کو خیر باد کہہ کر مہاجروں کی سی بدترین زندگی گذار رہے ہیں اور وہاں انھیں مہاجروں جیسے حقوق بھی میسر نہیں۔ بدترین حالات اور معاشی بدحالی میں کسی قوم کا زیادہ عرصے تک اپنا وجود برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے اور جب سیاسی اختیارات بھی ان کے پاس نہ ہوں تو شاید زوال زیادہ تیزی کے ساتھ آئے۔

دریافت شدہ آثار قدیمہ کے مطابق بلوچستان کا خطہ دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کا گہوارہ ہے اور اس کا تہذیبی سفر تقریباً 11000 سال قدیم ہے جسکی مثال مہرگڑھ کی وہ قدیم آبادی ہے جو درہ بولان کے حدود میں ڈھاڈر سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر دریافت ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ مکران، بیلہ، جھالاوان، کوئٹہ، قلات، ژوب، لورالائی، پشین، سراوان، خاران اور دیگر علاقوں

میں پھیلے ہوئے آثار قدیمہ اس قدیم انسانی تہذیب کے نقوش کے ہیں جو اس خطے میں گذری ہے جن کے بارے میں ماہرین کا خیال ہے کہ یہ انسان کے ابتدائی سکونت کے آثار ہیں اور انسانی تہذیب کے سفر کی شروعات اسی خطے سے ہوئی ہے۔

بلوچستان کا خطہ زیادہ تر پہاڑی ہے۔ بلوچستان کے زیادہ پہاڑی منطقے مرکزی اور شمال مشرقی حصوں میں واقع ہیں اس منطقہ میں سے سلیمان کے پہاڑوں کا چھوٹا سا سلسلہ گذرتا ہے اس پہاڑ کے متوازی افغانستان اور پاکستان کے سرحد کے ساتھ ساتھ تقریباً 500 کلومیٹر طویل توبہ کاکڑی، کا بڑا پہاڑی سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ توبہ کاکڑی کے سلسلہ کا جنوبی پھیلا ہوا حصہ خواجہ عمران کے پہاڑی سلسلے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جسکی اونچائی سطح سمندر سے 2704 میٹر ہے۔ خواجہ عمران کے جنوب مغرب میں سرلٹ کے پہاڑ واقع ہیں جو شررود کی وادی کو شوراوک کی وادی سے الگ کرتے ہیں۔ توبہ کاکڑی اور خواجہ عمران کے دروں میں سرسبز چراگاہیں ہیں جن میں بلوچ اور پشتون قبائل اپنے مال مویشی چرانے کیلئے لاتے ہیں۔

افغانستان کی سرحد پر مشرق سے مغرب کی جانب کوہ سلطان (چاغی) کے پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے جو ایران افغانستان اور بلوچستان کے سرحدوں کے نقطہ اتصال پر ختم ہوتی ہے جہاں کوہ ملک سیاہ واقع ہے جو سطح سمندر سے 1648 میٹر بلند ہے۔ کوئٹہ شہر کے جنوب میں کوہ ہربوئی وسطی کا سلسلہ واقع ہے۔ اس سلسلے کی عام لمبائی 355 کلومیٹر ہے اور چوڑائی 112 کلومیٹر ہے جبکہ مرکزی اونچائی 2000 میٹر تک پہنچتی ہے۔ اس سلسلے کے جنوبی دامن میں کوہ کیرتھر کا سلسلہ اپنی شاخوں کے ساتھ پھیلا ہوا ہے جو مشرقی بلوچستان کو سندھ سے جدا کرتا ہے۔ اس پہاڑی سلسلے کی سطح سمندر سے اوسطاً اونچائی 1524 میٹر ہے۔ ہربوئی سلسلے کے مغرب میں راس

کوہ کے پہاڑوں کا سلسلہ واقع ہے جو خاران کے ریگستان کو چاغی کے صحرا سے جدا کرتا ہے۔ اسکی سطح سمندر سے اونچائی 3650 میٹر ہے اور طوالت 245 کلو میٹر ہے۔

مکران کے پہاڑوں کے تین سلسلے مشرق سے مغرب اور شمال مغرب کی جانب پھیلے ہوئے ہیں مکران کے پہاڑوں کا ساحلی سلسلہ 451 کلو میٹر تک بحیرہ عرب کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے جو جنوبی ایرانی بلوچستان کے پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ اس سلسلے کے کچھ شمال میں اور متوازی مکران کے مرکزی پہاڑوں کے سلسلے کی شمالی شاخ مکران کے پہاڑوں کے تیسرے سلسلے یعنی سیاہان پہاڑوں سے جاملتے ہیں جو مکران کو خاران کے صحرا سے جدا کرتا ہے۔

بلوچستان کے پہاڑی سلسلوں کے درمیان طویل درے ہیں جو ایک شہر کو دوسرے شہر بلکہ مشرق کو مغرب سے ملاتے ہیں اور ماضی قدیم سے ان کی حیثیت مشرق اور مغرب کے درمیان دروازوں کی سی رہی ہے۔ ان دروں میں درہ بولان سراوان میں اور درہ مولہ جھالاوان میں واقع ہے۔ زمانہ ماقبل تاریخ سے ان دروں کے راستے تجارتی کاروان اور حملہ آور اقوام مغرب سے مشرق اور مشرق سے مغرب کی جانب سفر کرتے چلے آرہے ہیں۔ آریاؤں نے بھی سندھ وہند میں داخل ہونے کیلئے بلوچستان کے یہی درے استعمال کیے تھے۔ تب سے آج تک ان دروں کی تجارتی اور فوجی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ آج اس ترقی یافتہ دور میں ان دروں کی اہمیت دوچند ہوگئی ہے۔ درہ بولان کوئٹہ کے قریب کولپور سے شروع ہوتا ہے اور سبی کے قریب ڈھاڈر کے مقام پر ختم ہو جاتا ہے اور درہ مولہ خضدار کے قریب نڑ نامی گاؤں اور زہری کی سمت سے پاشتہ خان نامی گاؤں سے شروع ہوکر گنداواہ پر جاکر اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ درے تقریباً سارا سال آمدورفت کیلئے استعمال ہوتے ہیں البتہ درہ مولہ بارش اور سیلابی موسم میں بند رہتا ہے۔ درہ بولان کے ساتھ ساتھ دریا بولان اور درہ مولہ کے ساتھ ساتھ دریا مولہ بہتے

ہیں۔ ان دروں کے علاوہ مکران اور چاغی سمیت دیگر کئی علاقوں میں چھوٹے بڑے درے موجود ہیں جو ذیلی علاقوں کو آپس میں ملاتے ہیں بلوچستان افغانستان کے سرحدی شہر چمن میں خوجک کا درہ واقع ہے اور یہاں پر ایشیاء کی سب سے بڑی ریلوے سرنگ واقع ہے۔ درہ بولان میں بھی انگریزوں نے پہاڑوں میں سرنگ (Tunnel) بناکر ریلوے لائن کو سبی سے کوئٹہ پہنچایا اور دریا بولان کے کنارے کنارے قدیم شاہراہ کو زمینی سفر کیلئے از سرنو تعمیر کروایا۔

بلوچستان دریاؤں کے لحاظ سے زیادہ امیر نہیں ہے مغرب میں مکران سے لیکر مشرق میں دریائے سندھ تک ایسا کوئی دریا نہیں جو سارا سال بہتا ہو اور مسلسل جاری ہو۔ کوئٹہ ندی (لوہڑو) ناڑی، مولہ، شیرین آب (شیر ناپ) جو بلوچستان کے مختلف حصوں میں بہتے ہیں اور ایسے دشتوں میں پہنچتے ہیں جہاں تقریباً ان کے تمام پانی سے زمینوں کو آباد کرنے کے لیے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ماشکیل، بڈو اور رخشان کے دریا بلوچستان کے مغربی حصوں کے دشتوں اور صحراؤں میں پہنچ کر کھارے پانی کی جھیلوں (ہامون) میں گم ہو جاتے ہیں۔ حب، پورالی، دشت، کیچ اور کچھ دوسرے دریا جو بلوچستان کے جنوب میں بہتے ہیں سال کے بیشتر حصے میں خشک رہتے ہیں صرف ہنگول اس امر سے مستثنیٰ ہے۔ ہنگول بلوچستان کا سب بڑا دریا ہے جسکی لمبائی 573 کلو میٹر ہے جسکا پانی تمام سال جھالاوان اور مکران کے مشرقی حصے اور بیلہ کی وسیع اراضی کو سیراب کرتا ہے۔ شمال کی جانب دریائے ژوب قابل ذکر دریا ہے جس میں بارانی موسم کے علاوہ بھی عام دنوں میں تھوڑا بہت پانی بہتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ دریائے بولان میں سارا سال پانی بہتا رہتا ہے جو بولان کی وادیوں اور کچھی میں آبپاشی کے کام آتا ہے۔

بیشتر دریاؤں کی طرح جھیلیں بھی بہت جلد خشک ہو جاتی ہیں یا نمک کی ہلکی سفید چادر کی تہہ میں تبدیل ہو جاتی ہیں ان کھارے پانی والی جھیلوں کا پیدا ہونا شمال مشرقی بلوچستان کی زمینوں

کی سطح کی تشکیل کی خصوصیت ہے۔ مشہور جھیلوں میں زنگی ناوڑ (نوشکی) ہامون ماشکیل (خاران) سرندہ (لسبیلہ) ہنہ جھیل (کوئٹہ) وغیرہ شامل ہیں۔ آب وہوا کے لحاظ سے بلوچستان کے مختلف علاقوں میں سردیوں میں شدید سردی اور گرمیوں میں موسم معتدل رہتا ہے اور بعض علاقے گرمیوں میں شدید گرم اور سردیوں میں معتدل رہتے ہیں۔ سردی کا زور زیادہ تر بلند پہاڑی علاقوں میں ہوتا ہے۔ حالیہ چند برسوں میں خشک سالی اور بارشوں کی کمی کی وجہ سے گرمی کی شدت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ کوئٹہ جیسے سرد اور معتدل شہر میں بھی گرمی کی شدت میں سخت اضافہ ہوا ہے اور بعض اوقات درجہ حرارت 40 ڈگری سینٹی گریڈ سے بھی تجاوز کرجاتا ہے۔ مغربی اور جنوب مغربی صحراؤں میں سارا سال اور خاص کر گرمیوں میں جھلسا دینے والی تند و تیز آندھیاں چلتی ہیں جن میں سفر کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ ریت کے بڑے بڑے ٹیلے ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں اور نئے ٹیلے بنتے ہیں۔ یہ آندھیاں زیادہ خوفناک ہوتی ہیں بعض اوقات اگر ریت اور مٹی کے اس طوفان کے راستے میں کوئی آبادی آجائے تو اسے چند ہی گھنٹوں میں ملیامٹ کرکے رکھ دیتی ہیں۔ ان آندھیوں اور جھکڑوں کو مقامی لوگ بادصد و بیست روز یعنی 4 مہینے تک چلنے والی ہوا کہتے ہیں۔

بلوچستان کا موسم خشک ہے اور بارشوں کا تناسب انتہائی کم یعنی زیادہ سے زیادہ 12 اور کم از کم 3 انچ سالانہ ہے۔ خشک سالی یہاں کیلئے کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ یہاں کوئی قابل ذکر سارا سال بہنے والا دریا بھی نہیں ہے۔ جھیلیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پہاڑوں میں پانی کے ذرائع مفقود ہیں۔ زراعت کا زیادہ تر دارومدار کاریزات اور ٹیوب ویلوں پر ہے۔ خشک موسم ہونے کی وجہ سے جنگل میں کمی واقع ہوئی ہے اور تقریباً تمام پہاڑی سلسلے خشک، چٹیل اور سنگلاخ ہیں۔ کوہ وسطیٰ ہربوئی میں چند ایک مقامات پر اور کوہ سلیمان کی تنگ گھاٹیوں میں تھوڑے بہت درخت

دیکھنے کو ملتے ہیں۔ زرغون کے پہاڑ میں صنوبر کے جنگلات ہیں مگر وہ اب نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہیں۔ قلات میں ہربوئی کے مقام پر اور کوئٹہ اور مستونگ کے درمیان کوہ چلتن کے خوبصورت دامن اور تنگ دروں میں کچھ جنگلات نظر آتے ہیں وگرنہ پورے پہاڑی سلسلے اور میدان وصحرا، جنگلات سے خالی ہیں۔ البتہ ان پہاڑی سلسلوں کے درمیان چھوٹی بڑی خوبصورت وادیاں اور چراگاہیں ہیں۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ بلوچستان کے تقریباً تمام چھوٹے بڑے شہر جو پہاڑی منطقے میں آباد ہیں سب پہاڑی وادیاں ہیں کوئٹہ، مستونگ، قلات، خضدار، سوراب حتیٰ کہ بیشتر پہاڑی وادیاں ایسے ہیں جہاں قابل ذکر آبادی نہیں ہے لیکن وہاں بڑی بڑی چراگائیں ہیں جہاں سارا سال مقامی اور دور دراز کے چرواہے اپنے بھیڑ بکریوں کے بڑے بڑے ریوڑوں کے ساتھ چراتے نظر آتے ہیں۔ ان وادیوں میں قدرتی چشمے ہیں جن کی وجہ سے زمین نم ہو کر قدرتی گھاس وافر مقدار میں پیدا کرتی ہے۔

نباتات اور جڑی بوٹیوں کی وجہ سے بلوچستان بین الاقوامی سطح پر شہرت کا حامل ہے اور اگر کسی سال توقع سے زیادہ بارش اور برفباری ہو تو میدان اور پہاڑ مختلف اقسام کی جنگلی بیل بوٹوں اور جڑی بوٹیوں سے بھر جاتے ہیں۔ نہ صرف مقامی سطح پر ان سے بلوچ قبائل استفادہ کرتے ہیں بلکہ بڑی بڑی دواساز کمپنیاں ان جڑی بوٹیوں کو خرید کر انھیں انسانی زندگی بچانے اور مختلف دوائیوں کی تیاری میں استعمال کرتے ہیں۔

میوہ دار باغات کے لحاظ سے بلوچستان کافی اہم اور مشہور ہے۔ مکران اور خاران کے انتہائی نایاب کھجور کی مختلف اقسام، کوئٹہ، مستونگ، زیارت کے ذائقہ دار انگور، بلوچستان کے سرد علاقوں کے مختلف اقسام کے سیب، چیری، خوبانی، آڑو، انار، شہتوت وغیرہ اور گرم علاقوں کے چیکو، ناریل، آم، مالٹے، لیموں، کیلے وغیرہ اہم پیداوار میں شمار ہوتے ہیں۔ بلوچستان کے ہر

حصے میں گندم کاشت کی جاتی ہے، خضدار میں کپاس اور چاول کی بھی زبردست پیداوار ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ زیتون (olive) کے بھی درخت اور باغات لگائے گئے ہیں جن کی پیداوار اور افزائش حوصلہ افزاء ہے۔ ساحل مکران پر ناریل اور پپیتے کے بھی کامیاب تجربات ہوئے ہیں۔ غرضیکہ دنیا کا ہر وہ پھل جو بیک وقت کسی خطے میں نہیں ہوتا، بلوچستان میں یہ تمام پھل پیدا ہوتے ہیں۔

بلوچستان کے پہاڑی علاقوں میں پہاڑی دبنے، پہاڑی بکریاں، وادیوں اور پہاڑی دامنوں میں خرگوش، ہرن، اڑیال، لومڑی، گیڈر، بھیڑیے اور لگڑ بھگڑ بھی ملتے ہیں۔ ہنگول میں پہاڑی چیتے بھی پائے جاتے ہیں۔ دشتوں اور صحراؤں میں جنگلی کتے جنھیں بلوچی میں باشومہ کہتے ہیں بھی ملتے ہیں جسے بھیڑیے سے زیادہ خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ ماشکیل، رخشان اور بمپور (ایرانی بلوچستان) سمیت چاغی کے پہاڑوں اور کچھی کے میدانوں میں جنگلی سور ملتے ہیں۔ پرندوں میں چکور، شاہین کی مختلف اقسام، تیتر، تلور اور عام پرندوں کے مختلف اقسام پائے جاتے ہیں۔ نوشکی، بیلہ، خاران اور کچھی کے علاقوں میں واقع جھیلوں پر سینکڑوں اقسام کے لاکھوں پرندے سردیوں میں روس کے مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے آتے ہیں۔ رینگنے والے جانوروں میں مختلف اقسام کے سانپ اور چھپکلی ملتے ہیں اس کے علاوہ مختلف اقسام کے رینگنے والے جانور بھی ملتے ہیں۔ دریائے ہنگول میں مگرمچھ بھی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

بلوچستان کی علاقائی اور جغرافیائی محل وقوع اور اہمیت کو دیکھتے ہوئے بھی اسے ہمیشہ نظر انداز کیا اور شروع دن سے موجودہ دور تک حکمرانوں نے یہاں رسل ورسائل کو کوئی ترقی نہیں دی۔ بلوچستان کے دور دراز کے علاقے جنگی اہمیت بھی زیادہ ہے باقی ملک سے کٹے ہوئے ہیں۔ طویل ترین کچے یا نیم پختہ راستے اور ٹوٹی پھوٹی سڑکیں ہیں۔ سڑک کے ذریعے سفر کرنا کسی

عام شخص کے بس کی بات نہیں ہے ماسوائے ان علاقوں کے جہاں حکمرانوں کے معاشی مفادات وابستہ ہیں اور انھیں مالی فائدے اور لوٹ مار کی امید ہے وہاں پختہ سڑکیں بنائے گئے ہیں، باقی تمام بلوچستان میں جہاں عام بلوچ آباد ہیں سڑک اور رسل ورسائل نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ایسے علاقے بھی بلوچستان میں ہیں جہاں لوگ تو ہیں مگر آج تک انہوں نے گاڑی یا موٹر سائیکل تک نہیں دیکھی اور مشینری نام کی کسی چیز سے واقف نہیں اور وہ غاروں یا کچے گھروں میں رہتے ہیں مگر باقی دنیا سے تقریباً کٹے ہوئے ہیں۔ اندرون بلوچستان میں لوگ سفر کے دوران اکثر راستہ بھٹک جاتے ہیں، کیونکہ پختہ سڑکیں تو ہیں نہیں جو کچے راستے ہوتے ہیں اکثر و بیشتر بارش اور طوفانوں میں ان کے نشانات مٹ جاتے ہیں جس کی وجہ سے اصل راستے سے مسافر اکثر و بیشتر بھٹک جاتے ہیں البتہ جنوبی سمت میں کوئٹہ سے کراچی اور کراچی سے گوادر تک عالیشان سڑکیں تعمیر کی جارہی ہیں تاکہ وہاں کے وسائل پر دسترس حاصل کیا جاسکے۔ اسی طرح جہاں جہاں معدنی وسائل دستیاب ہیں وہاں چاہے انسانی آبادی نام کی کوئی چیز نہ ہو مگر وہاں عمدہ سڑکیں تعمیر کی جارہی ہیں جن کا مقصد ماسوائے وسائل لوٹنے کے اور کچھ نہیں۔ جہاں سڑکوں کی ضرورت ہے وہاں تو ایک انچ سڑک تعمیر نہیں ہوتی اور فنڈز کی کمی اور وسائل کی عدم دستیابی کی بات کی جاتی ہے مگر جہاں معدنی ذخائر کے خزانے موجود ہیں وہاں سڑکوں کو ترقی دینے اور تعمیر کرنے کیلئے بیرونی کمپنیوں کو ٹھیکے دیئے جاتے ہیں۔ ریلوے کی حالت بھی انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔ برطانوی دور میں قائم شدہ لائنیں ابھی تک جوں کی توں ہیں ان میں کوئی اضافہ یا ترقی نہیں ہوئی۔

بلوچستان کے پاس ایک طویل ساحل سمندر ہے اور اس پر کافی مشہور مقامات اور سواحل ہیں ان میں گوادر، پسنی، جیونی، اور ماڑہ، کلمت، چاہ بہار، میناب اور سونمیانی کافی اہم ہیں ان میں اکثر کوہی راس اور ٹاپو ہیں جن پر خوبصورت اور چھوٹی بڑی بندرگاہیں بنائی جاسکتی ہیں اور گوادر میں

ایک ڈیپ سی پورٹ منصوبہ بھی تکمیل پا چکا ہے جہاں غیر ملکی جہازوں کے ذریعے غیر ملکی تجارت شروع ہو چکی ہے۔ مگر بد قسمتی سے یہ منصوبہ بلوچستان کے عوام کیلئے کوئی خاطر خواہ فائدہ مند ثابت نہیں ہوا بلکہ اس سے پنجاب کے بجھتے چراغ روشن کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پسنی میں چھوٹی سی بندر گاہ ہے ان سمندری بندر گاہوں پر مقامی ماہی گیر پرانے اور دقیانوسی طریقے سے مچھلی شکار کر کے لاتے ہیں جبکہ ملکی اور غیر ملکی ٹرالر اور بڑے بڑے لانچ بلوچستان کی سمندری حیات کا بڑی بے دردی سے شکار کرتے ہیں۔ اور ماڑہ ایک نیوی فوجی اڈہ ہے اور وہاں پر فوجیوں کے واٹر بیس کیمپ موجود ہیں۔ باقی سمندر اور ساحلی علاقہ پسماندہ اور پراگندہ ہے اور مقامی لوگوں کو ان میگا پروجیکٹس سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہو رہا بلکہ وہ اپنی آبائی زمینوں سے بھی محروم ہوتے جا رہے ہیں جبکہ دیگر علاقوں سے لوگوں کو وہاں لا کر بسایا جا رہا ہے جس سے یقیناً مقامی آبادی پر اس کے منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں اور ان کو ایک سازش کے تحت اقلیت میں تبدیل کرنے کی سازش کی جا رہی ہے۔ گوادر میں جو پروجیکٹ شروع کیا گیا ہے اس پر بلوچستان کے لوگوں کی بڑی اکثریت کے تحفظات اور خدشات ہیں یہی وجہ ہے کہ بلوچستان میں امن عامہ کی صورتحال روز بروز خراب اور ابتر ہوتی جا رہی ہے اور حقیقی قوم پرستوں کی جانب سے اس منصوبے کی جسے وہ اپنی ہلاکت سے تعبیر کرتے ہیں شدید مخالفت کی جا رہی ہے اور اس سلسلے میں حکومت سمیت تمام سرمایہ کاروں کو بھی سخت پریشانی اور پچھتاوے کا سامنا ہے گوادر بندر گاہ کی پیداوار سے بلوچستان کو کوئی بھی فائدہ نہیں بالکل گیس اور تانبا کے پروجیکٹس کی طرح۔

باب چہارم:

بلوچ خطہ کا سیاسی پس منظر

(دورِ قدیم سے رند اقتدار کے قیام تک)

بلوچستان مشرق و مغرب کے درمیان ایک ایسے سنگم پر واقع ہے کہ جہاں نہ صرف دونوں سمتیں آپس میں بغلگیر ہوتے ہیں بلکہ اس خطے کو عبور کیئے بغیر چاروں سمتوں میں سفر نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ما قبل تاریخ دور سے ہی یہاں بنی نوع انسان کا گزر ہوتا رہا اور خصوصاً شمال اور مغربی سمت سے آنے والے حملہ آور اور وحشی اقوام کی اہم ترین گزر گاہ رہی ہے۔ درہ مولہ اور درہ بولان دو ایسے آسان اور سہل راستے ہیں کہ جہاں سے یہ حملہ آور اقوام سندھ و ہند میں دھڑا دھڑ اور صدیوں تک داخل ہوتے رہے۔ اس مسلسل آمد اور حملہ آوروں کی مار دھاڑ نے ہی مقامی آبادی کی ایک بڑی تعداد کو نہ صرف ترک وطن پر مجبور کیا بلکہ یہاں کی قدیم بستیاں آہستہ آہستہ کھنڈر میں تبدیل ہونے لگیں۔ بلوچستان کی قدیم تہذیب تاریخی دور کے آغاز سے ہی سندھ و عراق میں ابھرنے والی نئی قوتوں کی وجہ سے روبہ زوال تھی اور اسکی آبادی کی ایک بڑی تعداد غالباً سندھ منتقل ہوگئی تھی جبکہ یہاں کے کئی قصبے اور شہر ویران ہونے لگے تھے۔ رہی سہی کسر ان حملہ آور اقوام نے پوری کردی جنہوں نے نہ صرف سندھ کی قدیم تہذیب کا خاتمہ کیا بلکہ ایران کی قدیم تہذیب کو بھی ختم کرکے وہاں اپنی سیاسی مرکزیت قائم کرلی اور یہی نہیں بلکہ یہ حملہ آور اقوام یورپ تک پہنچ گئے اور وہاں بڑی بڑی تہذیبوں کی بنیاد ڈالی۔ یہ وحشی، جنگجو اور حملہ آور اقوام جن کی زیادہ تعداد شمالی خطوں سے بلوچستان، سندھ، ہند اور یورپ وغیرہ میں داخل

ہوئی، وہ وحشی اقوام تھے کہ جنہیں تاریخ نے آرین کے نام سے یاد کیا ہے جو بذات خود کئی نسلوں اور اقوام کا مجموعہ تھے۔ یہ لوگ صدیوں تک اس خطے میں آتے رہے اور مشرق و مغرب کے خطوں میں داخل ہوتے رہے۔ یہ سلسلہ کئی صدیوں تک جاری رہا۔ اور پھر صرف آرین ہی نہیں بلکہ کئی دیگر اقوام نے بلوچستان کی سابقہ تہذیب کو پاؤں تلے روندتے ہوئے مذکورہ بالا اطراف میں سفر کیا۔ آرین کے بعد بلوچستان پر ہونے والی یلغاریں آرین یلغار سے کم خونین اور تباہ کُن نہیں تھیں بلکہ آنے والی ہر قوم نے یہاں کے باشندوں اور سماج کو بربادی اور تباہی کے سوا کچھ بھی نہیں دیا۔ وہ اقوام جو آرین کے بعد اس خطے میں بلائے ناگہانی بن کر نازل ہوئیں ان میں ساکا، ہن، ہخامنشی، ساسانی، سندھی، عرب، ترک اور منگول وغیرہ شامل تھے۔ سوچنے والی بات صرف یہ ہے کہ آخر بلوچستان کے باشندوں نے ان اقوام کا کیا بگاڑا تھا جو وہ تیر و تلوار سونت کر، محل و قصر چھوڑ کر، گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر بلوچستان کے بے آب و گیاہ ویرانوں میں اپنی جھونپڑیوں اور کچے مکانات میں رہنے والے غیر مسلح اور پُرامن لوگوں پر حملہ آور ہوئے اور ان کا بے تحاشہ قتل عام کیا۔ مورخین نے صرف فاتحین کی فتوحات کی کہانیاں بیان کی ہیں اور ہر مورخ اپنے پسند کے فاتح کو اقوام عالم میں سب سے بڑا فاتح قرار دینے کے کوشش کرتا ہے جبکہ اُن کے ہاتھوں قتل و غارت ہونے والے ہر فرد کو قابل جہنم اور واجب القتل قرار دینے کے لیے لمبی تاویلیں باندھتا ہے۔ وہ فاتح کے ہر عمل کو حکمِ خداوندی کے عین مطابق قرار دیتا ہے۔ یقیناً مورخ کے اسی رویے کی وجہ سے تاریخ میں جانب داری اور تعصب کا عنصر پایا جاتا ہے بلکہ یہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام قاری تاریخ کی کتابیں پڑھنے سے اجتناب کرتا ہے کہ ان میں جانبداری، قتل و غارت گری اور تباہی و بربادی کے قصے کہانیوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ کاش مورخین تاریخ کے مختلف ادوار میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والے طبقے یعنی عوام کے بارے

میں بھی کچھ رقم کرتے اور اُن کی عام مشکلات کو بھی اپنی قیمتی اور انعام یافتہ کتب میں جگہ دیتے تو یقیناً تاریخی کتب پڑھنے اور جنگوں، معاہدات اور شاہوں کی حقیقت سمجھنے میں آسانی ہوتی۔ ورنہ اب تو عام قاری بھی یہی کہتا ہے کہ تاریخ صرف بادشاہوں کے قصے کہانیوں کا نام ہے لہٰذا اس کو پڑھنے سے انسان احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ تاریخ کی ہر کتاب بادشاہوں اور حکمرانوں کی ذاتی زندگی کے قصے کہانیوں اور اُن کے ہاتھوں مرنے، قتل ہونے اور غارت و برباد ہونے والے انسانوں کی کہانیوں سی بھری پڑی ہے مگر اُن انسانوں کا نہ تو قصور بیان کیا جاتا ہے اور نہ ہی اُن کی سماجی زندگی اور مشکلات بیان کی جاتی ہیں جو ان حملہ آوروں کے ہاتھوں برباد ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کے کسی بھی خونین واقعہ کو پڑھتے وقت ایسے محسوس ہوتا ہے کہ فاتح کے قہقہوں میں مورخ کے بے ڈھنگ قہقہے بھی شامل ہیں جو قارئین کو موہوم انداز میں سنائی دیتی ہیں۔ کچھ ایسے ہی واقعات بلوچستان کے ساتھ بھی پیش آئے جب یہاں ساڑھے تین ہزار سال پہلے ایک وحشی انسانوں کے غولِ بیابانی نے حملہ کیا اور پھر ایسے کئی دیگر وحشی اور ظالم گروہوں کے حملوں کا ایک تسلسل شروع ہوا جو ہزاروں سالوں تک جاری رہا۔ ذیل میں ان اقوام کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا جا رہا ہے اور اس بات کا بھی، کہ ان یلغاروں نے کس حد تک بلوچستان کی سابقہ تہذیب و تمدن کو متاثر کیا۔

آریائی قبائل اور بلوچستان:

عرصہ دراز سے علمی، تحقیقی، تاریخی اور لسانیات کے حلقوں میں یہ مسئلہ زیرِ بحث ہے کہ ساڑھے تین یا چار ہزار سال پہلے شمال اور شمال مغرب کی جانب سے موجودہ ایران، ہندوستان اور یورپ پر حملہ آور ہونے والے وہ لوگ کون تھے جو بنیادی طور پر آریا کہلاتے ہیں یا انہوں نے خود کو آریا کے لقب سے ملقب کیا۔ کچھ حلقے تو سرے سے ہی اس یلغار کو تسلیم نہیں کرتے جبکہ

بعض انہیں جدید ایرانیوں (فارسی زبان بولنے والے) اور شمالی ہندوستان سمیت جنوبی اور جنوب مغربی ایشیاء کے باشندوں کی اجداد سمجھتے ہیں۔ ان کے اصل وطن کے بارے میں بھی مؤرخین میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ لٰہذا ہر مورخ انہیں اپنے اختراع کردہ مفروضات کی روشنی میں بیان کرتا ہے۔ آریاؤں کی اپنی تخلیق کردہ لٹریچر اور مذہبی کتب کے مطالعے سے بعض مبہم اشاروں سے ان کے اصل وطن کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان قدیم مذہبی تحریروں کے مطابق سائبیریا اور جنوبی روس کے علاقے ان کے ابتدائی مساکن تھے کہ جہاں آخری برفانی طوفان نے ہزاروں قبائل کو ترکِ وطن پر مجبور کیا۔ یہ قبائل نئی پناہ گاہوں کی تلاش میں جنوب اور جنوب مشرقی خطوں کی جانب چل دیے۔ انہوں نے پنجاب اور شمالی ہندوستان کے گرم اور سرسبز و شاداب خطوں کا رُخ کیا اور چند قبائل موجودہ ایران کے نسبتاً زرخیز و سرسبز علاقوں میں آباد ہو گئے۔ اس سلسلے میں ان قبائل کے بارے میں مورخین و محققین مختلف بیانات دیتے ہیں۔ لٰہذا ایک مؤرخ مختلف محققین کی آرا کی روشنی میں آریائی خانہ بدوشوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

"آریا قبائل درحقیقت ایک ایسے خطے میں بود و باش رکھتے تھے جس کی آب و ہوا بری تھی کیونکہ وہ لوگ فقط سال میں دو یا تین موسموں سے واقف تھے ان کی زبان سے ظاہر ہے کہ وہ سٹیپ کی طرح لق و دق میدانی علاقے میں سکونت پذیر تھے۔ جہاں نہ پہاڑ تھے اور نہ بڑے بڑے جنگل بلکہ اس علاقے میں فقط صنوبر اور بید مجنوں کے درخت نشوونما پاسکتے تھے۔ آریا لوگ شمال کی طرف سے وارد ہوئے تھے۔ چونکہ اس قسم کے خانہ بدوش قبائل عموماً ایک وسیع خطے میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں لٰہذا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا اصلی وطن خراسان کے عین شمال میں سٹیپ کے میدانوں کے جانب واقع تھا۔ جو اس زمانے میں غالباً ایک زرخیز علاقہ تھا اور یہ علاقہ جنوبی روس کے میدانوں سے متصل ہونے کے علاوہ ان سے بہت کچھ مشابہت رکھتا تھا، جہاں پانی کے وسائل زیادہ بہتر تھے" (دھوار 1990:139)۔

ہسٹری آف پرشیا کے مصنف پرسی مولسورتھ سائیکس Persi Molsorth) (Sykes انھیں بحیرہ کیسپئین کے جنوبی ساحلی علاقے کے باشندے لکھتا ہے (سائیکس 1968: 172)۔

یہ امکان بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ ان کا اصل وطن آذربائیجان تھا۔ چونکہ آریائی لٹریچر میں آریاؤں کے اصل وطن کو آریہ ورت، آریہ ورش، آریاوتج یا آریاوائیجو تحریر کیا گیا ہے جس کو مورخین آذربائیجان کا قدیم نام قرار دیتے ہیں اور اسی بناء پر آریاؤں کا اصل وطن آذربائیجان کو قرار دیتے ہیں۔ جبکہ انہیں وسط ایشیائی اقوام سے متعلق بھی سمجھا جاتا ہے۔

مگر یہ سب مفروضات ہیں اس سلسلے میں مزید تحقیق ہورہی ہے اور دن بدن نئے مفروضات اور نظریات قائم کیے جارہے ہیں۔ اختلافات کے باوجود یہ درست ہے کہ شمالی خطوں کے برفانی طوفان، وسائل کی کمیابی، پانی اور خوراک کی قلت، موسموں کی تغیرات اور مشرق و مغرب میں قائم ہونے والی ترقی یافتہ اور وسائل سے مالامال تہذیبیں اور سلطنتیں دراصل آریائی حملوں کی اصل وجہ تھیں اور انہی وجوہات کی بناء پر ان وحشی قبائل نے ترک وطن کیا اور یہ لوگ موج در موج وسط ایشیاء کے راستے افغانستان جبکہ آذربائیجان کے راستے شمالی اور شمال مغربی ایران کے کوہ و دمن میں آباد ہونے لگے۔ دراصل یہ وحشی قبائل ہزاروں خاندانوں کی صورت میں اور مال مویشیوں کے ساتھ میدانی علاقوں میں آباد ہونے کی غرض سے آئے تھے اور یہ اپنے راستے میں آنے والی آبادیوں کو خس و خاشاک کی طرح اڑاتے اور تباہ کرتے جارہے تھے بالکل 12 ویں 13 ویں صدی کے منگول طوفان کی طرح۔

بعض مورخین آریائی قبائل کو کسی ایک مخصوص نسل سے متعلق سمجھتے ہیں جو کہ حقائق کے منافی ہے۔ دراصل آریائی قبائل ان کثیر الثقافتی اور کثیر النسلی اقوام سے تعلق رکھتے تھے جو

شمالی خطوں کے قدیم باشندے تھے۔ ان کا خطہ شروع میں سر سبز اور وسیع و عریض چراگاہوں پر مشتمل تھا۔ ان کا یہ علاقہ پانی کی دولت سے مالامال اور چراگاہوں سے بھرپور تھا۔ لہٰذا یہ سینکڑوں قبائل ان چراگاہوں اور پانی کے وسائل پر سبقت حاصل کرنے کی خاطر ہمیشہ سر گرم و سر بکف رہتے تھے یعنی ان قبائل میں اکثر خانہ جنگیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ان کا علاقہ چونکہ سرد، برفیلا اور پہاڑی تھا لہٰذا چراگائیں ہی ان کی زندگی اور خوشحالی کا ضامن ہوتی تھیں۔ زندہ رہنے کے لیے لڑائی اور بہادری ضروری امور میں شامل تھے۔ لہٰذا یہ قبائل ابتدائی طور پر ہی جنگجو اور لڑائی کے فنون میں ماہر تھے۔ بلا کے گھڑ سوار تھے اور محققین انہیں اولین گھڑ سوار اقوام میں شمار کرتے ہیں۔ یہ کسی ایک نسل سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ ایک وسیع و عریض علاقے میں مختلف اقوام اور خاندانوں کی صورت میں رہتے اور چراگاہوں کی تلاش میں مارا مارا پھرنے والے خانہ بدوشوں پر مشتمل تھے۔

آریہ کے لفظی معنی میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے مگر اکثر مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ آریا کا مطلب، معزز، اجنبی، پاک اور اعلیٰ کے ہیں۔ اس سلسلے میں معروف محقق گنکوسکی Rthemay کے بیان کردہ نظریے سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

> ”آری کے معنی ہیں اجنبی، نوارد، غیر ملکی، بیگانہ، آری سے آریا، آریہ بنا۔ یعنی نواردوں کا مددگار، میزبان، غیر میزبان وحشیوں کے مقابلے میں میزبان (یعنی مہمان نواز)۔ تو گویا آریہ اپنے آپ کو نواردوں کا مددگار سمجھتے تھے اور مقامی لوگ انھیں نوارد سمجھتے تھے اس مفہوم میں یہ متفرق قبائل آریہ کہلائے۔ کیونکہ آریہ نہ تو کسی نسل کا انسانی نام ہے اور نہ ہی کسی واحد گروہ کا۔ بلکہ بے شمار شمالی حملہ آوروں کو مشترکہ طور پر آریہ کہا جاتا ہے“ (گنکو فسکی 54:1976)۔

یہ لوگ ایک خاص زمانے (تقریباً 1600 قبل مسیح) کے دوران صوبہ سرحد کے دروں اور بلوچستان کے درے بولان اور مولہ سے ہوتے ہوئے سندھ و ہند کی سرزمین پر پہنچے تھے۔ ان کا یہ سفر اور ہندوستان میں داخلہ کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔

دریا کو آرین اپنی زبان میں سندھو کہتے ہیں۔ لہٰذا جب یہ قبائل سندھ، پنجاب اور شمالی ہندوستان کی دریائی سرزمین میں داخل ہوئے تو اسے سپت سندھو یعنی سات دریاؤں کی سرزمین کا نام دیا (جلالپوری 186:2002)۔ یہ لفظ غالباً شمالی ہندوستان، پنجاب، اور سندھ کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ چونکہ یہ خانہ بدوش وحشی مہذب دنیا سے نابلد ناواقف تھے اور نہ ہی انسانی سہولیات اور آسائشوں سے آگاہ تھے بلکہ یہ گھڑ سوار جنگجو قبائل ہمیشہ لڑائی جھگڑوں اور آتش و آہن کے کھیل میں مصروف کار نظر آتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کے کھیل کھود اور رسوم و رواجات بھی وحشیانہ تھے لہٰذا جب ان کو سندھ و پنجاب اور شمالی ہندوستان کی زرخیز زمینیں نظر آئیں، بہتے ہوئے دریاؤں پر ان کی نظر پڑی اور مہذب دنیا کی سہولیات اور رنگ ڈھنگ نظر آئے تو انہیں مستقل طور پر آباد ہونے کا موقع ہاتھ آیا۔ انہوں نے مقامی آبادی کو یا تو تہہ تیغ کر دیا یا انہیں غلام بنا لیا یا پھر علاقہ چھوڑ دینے پر مجبور کیا۔

آریائی قبائل کی کوئی ایک مشترکہ زبان نہیں تھی بلکہ یہ لوگ آریائی لسانی گروہوں سے تعلق رکھنے والے کئی زبان بولتے تھے۔ یہ لوگ دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے مگر ان کی تہذیب و ثقافت اور ادب طویل مہاجرت کے بعد دنیا میں متعارف ہوئی جب انہوں نے ایران، یورپ اور ہندوستان میں اپنی عظیم الشان حکومتیں تشکیل دیں۔ یہیں پر ان کا عظیم ادب بھی ظہور پذیر ہوا۔

سندھ و پنجاب کی طرف ہجرت کے دوران یہ قبائل پہلے پہل طویل عرصہ تک افغانستان میں رکے رہے مگر جب نو وارد آریہ قبائل مسلسل افغانستان کی طرف آتے رہے تو پہلے سے آباد قبائل ہندوستان کی طرف مراجعت کر گئے اور بعض دھڑے ایران کی طرف روانہ ہوگئے جن کے راستے میں مقامی قبائل مزاحم ہوتے رہے۔ بہر حال ایک طویل جدوجہد کے بعد آریہ قبائل کے کچھ دھڑے موجودہ ایران (مادستان) کے کچھ علاقوں میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے۔

ان کا ایک گروہ اگر ایک مقام پر آباد ہو جاتا تو کچھ عرصے بعد ان کا ہی کوئی دوسرا نسبتاً زیادہ وحشی گروہ آکر اُسے مزید آگے کی جانب دھکیلتا اور خود اُس کی جگہ لے لیتا۔ اس طرح اس دھکم پیل اور اس کے ذریعے مزید آگے بڑھنے کا یہ عمل آرین قبائل نے صدیوں تک جاری رکھا اور آہستہ آہستہ سندھ، پنجاب اور ہندوستان میں داخل ہوتے رہے جبکہ دوسری جانب انہوں نے ایران میں دخول کیا جبکہ اُس وقت ایران پر پیش دادی کردوں کی حاکمیت قائم تھی اور مقامی مید، کُرد، لوری اور دیگر ممتاز مقامی قبائل ان کی زیرِ حاکمیت زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب زاگروس کے پہاڑی دروں کے راستے آشوری پیش دادیوں کی سرزمین میں داخل ہوتے تھے اور خوب لوٹ مار اور قتل و غارت گری کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے پیش دادی حکمران اور ان کی رعایا ہمیشہ پریشان رہتی تھی۔ مشرقِ وسطیٰ کے حملے ابھی ایران پر جاری تھے کہ ادھر سے آذربائیجان کے دروں اور سیستان کی جانب سے آرین قبائل نے پیش دادی سرزمین میں داخل ہونا شروع کیا۔ اس طرح ایران کی قدیم معاشرتی وسیاسی نظام میں طاقت کا توازن بگڑنے لگا۔

آریاؤں کی وہ شاخ جو ایران پہنچی سب سے پہلے تہذیب و تمدن سے آشنا ہوئی۔ اپنے وطن کو چھوڑنے کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ بدی کی طاقتوں نے اسے ایک برفانی علاقہ بنا کر

ناقابل رہائش بنا دیا۔ اسی شدید برفباری نے انھیں ترک وطن پر مجبور کر دیا تھا مگر وہ اپنا اصل وطن اور اس کا نام تک بھول چکے تھے کیونکہ وہ برس ہا برس تک افغانستان میں بھی آباد رہے تھے اس کے بعد انہوں نے دیگر خطوں کا رخ کیا تھا۔ لہٰذا اس طویل عرصہ میں نئی نسلیں اپنا آبائی وطن بھول چکے تھے البتہ وہ اپنے آبائی خطے کو آریہ ورش یا آریہ ورت کہتے تھے (قاضی سال اشاعت ندارد: 13)۔ اسے ان کی اپنی روایت میں آریانم دائیجو کا نام دیا جاتا تھا۔ جب شدید برفباری نے ان کو اپنی ارضی جنت چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور کیا تو وہ لوگ سب سے پہلے سگدیانہ (سغد) اور (مورو) مرگیانہ (بخارا۔ مرو) یعنی وسط ایشیاء میں داخل ہوئے۔ بعد ازاں ان کے کچھ دھڑے بلخ (بخدیا) میں بھی داخل ہوگئے۔ یہاں سے عسکر آباد ہوتے ہوئے یہ لوگ ہاریو (ہرات) اور وائیکرتیا (کابل) جا پہنچے۔ دراصل یہیں سے یہ لاتعداد خانہ بدوش قبائل دو گرہوں میں تقسیم ہوگئے۔ ان میں سے ایک گروہ آراوائیتی (اراخوزیا۔ خراسان) ہائیو نت (ہلمند) اور سپت سندھو یعنی (سندھ و پنجاب) میں داخل ہوا۔ جبکہ دوسرا گروہ اردوا (طوس) دہرکانہ (گرگان) رہیگا، ورینا (گیلان) اور دوسرے مغرب میں بعض اضلاع شامل تھے، بس گئے (دھوار 1990:141-42)۔

بعض مورخین اکثر میدوں کو آرین لکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں کہ ایران میں داخل ہونے والا سب سے بڑا آرین گروہ ماد یا مید (Medians) تھا۔ جو کوہ ارارات کے دامن میں ایرانی سطح مرتفع کے مغرب میں آباد ہوا اور آہستہ آہستہ یہ قبائل خلیج فارس تک پھیلتے چلے گئے۔ مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جب آریاؤں کی شمالی ایران میں آمد شروع ہوئی تو مید قبیلہ اس وقت ایران کے حکمران خاندان پیشدادی سے رزم آرا تھا جبکہ لوری اور کرد قبائل بھی اس بغاوت اور پیشدادی خاندان کی آمرانہ اور ظالمانہ حکمرانی کے خلاف جنگ میں میدوں کے ساتھ تھے۔

تاریخ کے مطالعہ سے اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ آریائی حملوں سے پیشتر موجودہ خطہ ایران پر ایک پہاڑی قبیلہ جو بعد ازاں تاریخ میں پیشدادی کے نام سے معروف ہوا، حکمرانی کرتا تھا۔ گذشتہ اوراق میں اس خاندان کے مختلف حکمرانوں اور ان کے ادوار کے بارے میں تحریر کیا جاچکا ہے اور مختلف تحریروں اور بیانات کی روشنی میں راقم الحروف نے یہ مفروضہ بھی بیان کیا کہ ''یہ قبائل جنہیں تاریخ میں پیشدادی کے نام سے شہرت ملی دراصل کوہِ البرز کے قدیم گُرد باشندے تھے۔'' کیونکہ آریائی قبائل کے بارے میں ہر کوئی جانتا ہے کہ وہ نہ صرف خانہ بدوش تھے بلکہ میدانی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ حملہ آور ہونے کے بعد بھی یہ قبائل زرخیز میدانی خطوں کی تلاش میں رہے۔ لہٰذا خشک و بنجر اور وسائل سے محروم بلوچستان اور افغانستان میں ان کی آبادی زیادہ عرصہ تک نہیں رکھی اور نہ ہی کوہِ البرز کے پہاڑی خطے میں ان کی ضروریات پوری ہوسکتی تھیں بلکہ وہ سیدھے پنجاب اور ہندوستان کی جانب روانہ ہوئے۔ پنجاب اور ہندوستان کی زرخیز دریائی زمینوں کو دیکھ کر انہوں نے واپس جانے کی بجائے وہیں پر سکونت اختیار کرلی۔ یہ بات ذہن نشین ہو کہ بلوچستان کی غیر دریائی اور انسانی وسائل کی کمیابی کی وجہ سے یہ سرزمین آریائی حملہ آوروں کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتی تھی۔ یقیناً بلوچستان کے سنگلاخ اور اونچے پہاڑوں، جان لیوا ریگستانوں اوراونچے ٹھنڈے بے آب و گیاہ میدانوں سے ان توہم پرست انسانوں کو خوف آتا ہوگا اور وہ انہیں شدید ناپسند کرتے اور آسیبوں کا مسکن قرار دیتے ہوں گے بالکل اُن ابتدائی عرب حملہ آوروں کی طرح جو مکران کے بارے میں شدید بیزاری اور نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ لہٰذا وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ بلوچستان میں آریاؤں کی کوئی بستی آباد نہیں ہوئی اور نہ ہی کسی آریائی خاندان کے بلوچستان میں باقاعدہ بس جانے کی کوئی تصدیق اب تک ہوئی ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ بلوچستان سمیت

موجودہ ایران اور افغانستان کے حدود پر آریائی اقوام کو چھٹی صدی قبل مسیح میں غلبہ حاصل ہوا جب ایران پر پہلے آرین خاندان ہخامنشی کی حاکمیت قائم ہوئی اور انہوں نے میدوں کی حاکمیت ختم کر کے آریائی بالادستی قائم کی۔ دراصل آریاؤں کے دو بڑے قبیلے مشرق و مغرب کی جانب حملہ آور ہوئے۔ مشرق پر حملہ آور ہونے والا طاقت ور آرین قبیلہ بھرت کہلاتا تھا جس کے ساتھ کئی دیگر نسبتاً چھوٹے قبائل بھی ہمراہ تھے جبکہ ایران پر بازارگد (Pasargade) نامی آرین قبیلہ نے حملہ کیا۔ جس کے ساتھ دو دیگر بڑے قبائل مارفیئن) مارافی (Marphians اور ماراسپیئن) (مارافی Marspians) بھی شامل تھے (بدخشانی 1967:75)۔ یہ تینوں قبائل ایک گروہ کی صورت میں پہلے خراسان اور پھر وہاں سے ایران میں داخل ہو گئے اور پھر فارس اور شیراز کے علاقوں میں جا کر بس گئے۔ اسی بازارگد قبیلہ کے نام کی وجہ سے یہ علاقہ فارس، پارس، پارس گرد اور پسا گرد کہلایا۔ یہ نوارد بازارگد کہلاتے تھے لہٰذا انہوں نے اپنے خطے کو بھی یہی نام دیا جو آہستہ آہستہ پسا گرد اور بالآخر پارس بنا۔ بعد ازاں یہ لوگ پارسی کہلانے لگے اور ان کا مقبوضہ علاقہ بھی اسی نام سے موسوم ہوا۔ہخامنش اسی بازارگد قبیلہ کے ایک سردار کا نام تھا جس کے زرین کارناموں اور قومی خدمات کی وجہ سے اس کا خاندان ہخامنشی کہلایا اور آریاؤں کے شاہی خاندانوں میں شمار ہونے لگا۔ ہیروڈوٹس اور بدخشانی بھی موجودہ خطہ ایران کے قدیم قبائل کا تذکرہ کرتے وقت صرف انہی درج بالا قبائل کو آرین لکھتے ہیں جبکہ مید سمیت کئی دیگر قبائل کو غیر آرین تحریر کرتے ہیں۔ وہ ایران کے قدیم قبائل اور حقیقی باشندوں کو کسان اور خانہ بدوش تحریر کرتے ہیں (بدخشانی 1967:75)۔

محقق یحییٰ امجد بھی آرین قبائل کی پنجاب اور شمالی ہندوستان میں آباد ہونے کی تصدیق کرتا ہے اور ان کا اصل وطن خوارزم (وسط ایشیاء) کو قرار دیتا ہے۔ اُن کی تحقیق اور بیان کے

مطابق ہندی آریائی قبائل کا اصل وطن خوارزم تھا۔ یہ لوگ خوارزم سے نکل کر براستہ ایران ہندوستان پہنچے تھے (امجد 1989: 410)۔ ان کے مطابق میں ہندی آریائی قبائل پہلے باختر میں کچھ عرصے تک ٹھہرے رہے اور 2000 قبل مسیح میں کوہ ہندوکش کو عبور کر کے بر صغیر میں داخل ہوئے تھے (امجد 1989: 410)۔ پہلے یہ چراگاہوں کی تلاش یں پھرتے رہے اور ان کی معیشت مویشی پالنے تک محدود تھی۔ بعد میں یہ جنگل صاف کر کے گاؤں بسا کر آباد ہونے لگے اور کھیتی باڑی کرنے لگے۔

جدید تحقیق سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آریا تین بڑی لہروں کی صورت میں سینکڑوں قبائل اور خاندانوں کے ساتھ سندھ و پنجاب میں داخل ہوئے تھے۔ ہندوستان میں داخل ہونے والا سب سے بڑا اور اولین گروہ جو لا تعداد قبائل پر مشتمل تھا، بھرت کہلاتا تھا۔ جبکہ ایک مصنف بلوچستان میں بھرت نامی آریائی قبیلہ کی آبادکاری کا دعویٰ کرتا ہے جو آریائی قبائل میں سب سے زیادہ طاقتور قبیلہ کہلاتا تھا اور ہندوستان میں اسی قبیلہ کی اولین مہاجرت عمل میں آئی تھی۔ مصنف بھرت نامی قبیلہ کی ہندوستان کی بجائے بلوچستان میں بس جانے کے بارے میں دعویٰ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ تقریباً 14 ویں صدی قبل مسیح میں یہ گروہ کابل اور باختر کو چھوڑ کر درہ بولان کی وادیوں میں پھیل گیا (مری 2000: 62) حالانکہ یہاں خشک اور بنجر پہاڑوں میں بھرت جیسے بڑے اور سینکڑوں قبائل پر مشتمل گروہ کے بولان سمیت بلوچستان کے کسی بھی علاقے میں پھیلنے یا بسنے کے آثار یا نشانات نہیں ملتے اور نہ ہی یہاں کے کسی ٹیلے پر آرین حملوں کی تصدیق ہوئی ہے۔ لہٰذا یہ درست نہیں ہے کہ یہ خاندان یہاں بس گئے بلکہ یہاں سے تیزی کے ساتھ نکل کر وادیء سندھ میں پھیل گئے تھے۔ حتیٰ کہ یہ آرین بڑھتے بڑھتے اتر پردیش تک پہنچ گئے مگر جنوبی ہندوستان ان کی تاخت کا نشانہ بننے سے محفوظ رہا اور سندھ و ہند کے دراوڑ یا تو

آرین کے غلام (داسیو) بن گئے یا پھر جنوبی ہندوستان کے دشوار گزار علاقوں میں چلے گئے جہاں آج بھی قدیم سپت سندھو کے حقیقی باشندے رہتے ہیں۔

ماہرین اب بھی آرین کو کوئی ایک نسل ماننے کیلئے تیار نہیں۔ البتہ ان میں سے جس قبیلے نے ایران اور ہندوستان میں برتری حاصل کرلی اور سیاسی اختیار و اقتدار کا مالک بنا، اپنے آپ کو اعلیٰ نسب کہا، مثلاً ہخا منشی یا ساسانی وغیرہ اور ہندوستان میں موریا، گپتا اور دیگر راجپوت خاندان، وگرنہ یہ قبائل جب شمالی خطوں سے سندھ و پنجاب میں داخل ہوئے تھے تو انھوں نے جس بد تہذیبی کا مظاہرہ کیا تھا تاریخ کے صفحات ان کے تذکروں سے بھرے پڑے ہیں۔ جو سلوک انہوں نے ہندوستان کے مقامی باشندوں کے ساتھ کیا تھا، وہ بھی تاریخ کے صفحات پر رقم ہیں۔ آریا حملہ آور، غیر متمدن، غیر مہذب خانہ بدوش قبائل پر مشتمل تھے جن کی معیشت کا دارومدار کلیتاً گلہ بانی پر منحصر تھا۔ وہ گھوڑے، دوسرے مویشیوں اور بھیڑ بکریوں کے بڑے بڑے ریوڑ اور نگہبان کتے رکھتے تھے۔ ان کا زیادہ تر انحصار اسی گلہ بانی پر تھا۔ وہ ایک قسم کے لکڑی کے بنے ہوئے بھدی اور ناقص گاڑیوں اور (ریڑوں) میں سفر کرتے تھے۔ شادی کرنے کیلئے لڑکا لڑکی کو اغواء کرلیتا، اوریوں شادی ہوجاتی (دہوار 1990 :141-42)۔ ان میں کئی شادیاں کرنے کا بھی رواج تھا اور وہ ایک قسم کا نشہ بھی کرتے تھے۔ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ سندھ و پنجاب اور شمالی ہندوستان کے زرخیز اور دریائی میدانوں نے انھیں بس جانے کا چسکا دیا اور وہ مقامی قبائل کو طاقت کے زور پر ختم کرکے یا مطیع و فرمانبردار بنا کر ان کی زمینوں پر قابض ہوگئے اور مقامی آبادی کو اپنے ماتحت کیا۔ وہ انتہائی متنوع الصفات، جنگجو، لوٹ مار کرنے والے، کانسی کے زمانے کے پدرسری قبائل تھے۔ یہ گھڑ سوار لوگ تھے۔ لاشوں کو جلاتے تھے (امجد 1989 :411)۔ لاشوں کو جلانے کا رواج ایرانی اور ہندوستانی دونوں آرین گروہوں میں رائج تھا۔

بعض مؤرخین آریاؤں کے دس بڑے گروہوں کا ذکر کرتے ہیں کہ جنہوں نے مشرق میں سکونت اختیار کی۔ یعنی:

1۔ آبی نا۔ 2۔ بھالانا۔ 3۔ درھوتو۔ 4۔ چیوا۔ 5۔ دشانان۔ 6۔ یادو۔ 7۔ یورو۔ 8۔ آنو۔ 9۔ توروا شا۔ 10۔ پکتا (دھوار 1990: 146)۔

آریاؤں کے آخری گروہ نے وسطی ایشیاء، افغانستان، سیستان، خراسان اور شمالی بلوچستان کے علاقوں پر مشتمل ایک وسیع سلطنت قائم کرلی۔ جو آریانا کہلائی (دھوار 1990: 148)۔

بلوچستان کے مورخین ڈاکٹر شاہ محمد مری اور آغا نصیر خان میدوں کو آرین قرار دیتے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق میدوں نے 854 ق م میں (کمبرانی 1982: 106) جبکہ شاہ محمد مری کے مطابق 708 ق م میں (مری 2000: 65) ایران میں ایک مستحکم حکومت کی بنیاد ڈالی۔ جبکہ ہندوستان میں عرصہ دراز تک مقامی قبائل چھوٹی چھوٹی راجدھانیوں پر قابض رہے اور وسیع و عریض ہندوستان ہمیشہ خانہ جنگیوں کا شکار رہا۔

یہ بات بھی ذہن نشین ہو کہ آغا نصیر خان مید اور کرد قبائل کو بلوچوں کے اولین اجداد بھی تحریر کرتا ہے۔

علم آثار قدیمہ کے ماہرین کے مطابق آریاؤں کو بلوچستان اور سندھ کے باشندوں میں شناخت نہیں کیا جاسکتا ہے اور بلوچستان کے کسی بھی بستی سے آریاؤں سے متعلق کوئی نشانی نہیں ملی۔ نال کلچر کے سور دمب کے قبرستان پر کچھ علماء آثار قدیمہ نے آریائی قبرستان ہونے کا شبہ ظاہر کیا تھا (دھوار 1990: 148) مگر اس قبرستان سے گو کہ یہ کانسے اور تانبے کے دور کا ہے، ایسی کوئی شئے نہیں ملی جس کی بناء پر کہا جاسکے کہ یہ آریائی ثقافت سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی آبادی رہی ہے۔ علاوہ ازیں آرین قبائل اپنی لاشوں کو جلاتے تھے نہ کہ دفن کرتے تھے۔ البتہ

دمب لونڈو جو خضدار میں باغبانہ کے مقام پر واقع ہے، کے بارے میں بعض ماہرین آثار قدیمہ کا خیال ہے کہ اسے بعد کے ایرانی ادوار میں بسایا گیا ہوگا اور کوئی ایرانی گروہ نے یہاں کی بستی کی بنیاد ڈالی ہوگی (دہوار (1990): 149)۔ اسی طرح لسبیلہ کے ہڈت شہر کے ایک جانب بھی لونڈو کلچر کی نمائندہ ظروف اور اوزار کثرت سے ملتے ہیں (دہوار 1990 :149)۔ مکران سمیت درہ مولہ کے کئی پہاڑی چوٹیوں پر قدیم تعمیرات اور لونڈو کلچر سے مطابقت رکھنے والے ظروف کے نمونے ملے ہیں۔ وادی سوراب اور سراوان کے کچھ دیگر مقامات سے بھی اسی کلچر کی نشانیاں ملی ہیں۔ اسکے علاوہ اس کلچر کے اثرات کوئٹہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر یہ حتمی نہیں کہ اس آبادی کے باشندے آرین تھے۔ ابھی تک اس سلسلے میں کوئی قابل ذکر تحقیق نہیں ہوئی اور نہ ہی یہاں سے برآمد ہونے والی ہڈیوں کا فرانزک ٹیسٹ اور ڈی این اے کیا گیا ہے۔ اسی طرح یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہاں کے باشندوں کی تجارتی ذرائع پر آرین صنعت غالب آگئی تھی۔ ان کی سابقہ صنعت زوال پذیر ہو چکی تھی ممکن ہے کہ جو اشیاء مختلف مقامات سے ملے ہیں وہ برآمد کردہ ہوں اور مقامی منڈیوں میں بآسانی دستیاب ہوں۔ جبکہ یہاں کے باشندے نسلی یا قومی لحاظ سے ضروری نہیں کہ آرین سٹاک سے تعلق رکھتے ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ یہاں کی ثقافتی رسومات، رواجات اور اشیاء ضروریہ پر آرین غالب آگئے ہوں مگر یہاں کی آبادی میں ابھی تک قدیم آرین لوگوں کی باقیات تلاش نہیں کی جاسکی ہیں۔ ملک سعید دہوار کے اس دعویٰ سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ یہ آبادی آرین لوگوں کی بسائی ہوئی تھی کیونکہ علاقہ نال کے اسی قبرستان اور اس سے متصل قبرستانوں پر ڈاکٹر ایم آر ساہنی نے تحقیق کی ہے۔ ان ہڈیوں کی باقاعدہ ڈی این اے اور مقامی باشندوں کے ساتھ اُن کی مماثلت کے ثبوت ملنے کے بعد یہ دعویٰ کیا کہ نال کے موجودہ باشندے قدیم باشندوں ہی کی اولادیں اور انہی کا تسلسل ہیں (ساہنی 2004: 191-92)۔ اور

ان میں مردے کو دفنانے کا رواج تھا نہ کہ آرین اقوام کی طرح جلانے کا۔ ڈاکٹر ایم آر ساہنی کے اس سائنسی تحقیق کے بعد قائم کرنے والے مفروضے کے بعد بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہاں کے باشندے بلاشبہ قدیم لوگ ہی تھے البتہ اب اُن کی ثقافت زوال پذیر ہو چکی تھی اور آرین منڈی اُن کی منڈی پر غالب آچکی تھی۔

فئیر سروس (Fair A Servis) کا خیال ہے کہ یہ آبادی بعد کے ایرانی ادوار میں یہاں وارد ہوئی تھی اور بلوچستان کے ایک وسیع علاقے تک پھیل گئی تھی۔ مگر اس کے کوئی ٹھوس اور مستند شواہد اب تک دریافت نہیں ہو سکے ہیں۔ ہاں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایران میں جب آرین اقوام کو عروج حاصل ہوا تو ان کی صنعت یہاں منتقل ہو گئی ہو۔ مگر ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ اس دور تک بلوچستان کی قدیم بستیاں غیر آباد ہو چکی تھیں اور بڑی ثقافتوں اور تہذیبوں نے بلوچستان کی مقامی صنعت کو تقریباً ختم کر دیا تھا اور کثیر آبادی کو نقل مکانی پر مجبور کر چکا تھا۔ لونڈو دمب پر معمولی سا کام کیا گیا ہے۔ اگر یہاں درست طریقے سے اور وسیع پیمانے پر کھدائی اور تفتیش کی جائے تو شاید یہ بات منکشف ہو کہ لونڈو دمب ایک قدیم بستی تھی اور یہاں ایک قلعہ بھی تھا جو عین وسطی ایشیاء، ایران اور سمندر کی جانب جانے والے بین الاقوامی شاہراہ کے کنارے واقع تھا۔ راقم الحروف کو جو ظروف گلی کے نمونے اور دیگر اشیاء یہاں سے ملے ہیں ان میں اور نال کلچر کے ظروف میں زیادہ مماثلت اور مشابہت پائی جاتی ہے۔

لونڈو کلچر کی قدامت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے زیادہ تر برتن چاک پر تیار کئے جاتے تھے۔ لیکن ایسے برتنوں کی بھی کمی نہیں تھی جو ہاتھ سے گھڑ لئے جاتے تھے۔ ان کے برتنوں کی ساخت بھی کچھ زیادہ عمدہ نہ تھی۔ ان کے طرز نقاشی کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے برتنوں کی سطح اور ان کے اندر ہندسی اشکال کی خطوط پیچاں کا استعمال

بڑے پیمانے پر کرتے تھے۔ نباتاتی نقاشی کے علاوہ حیوانی نقاشی بھی کی جاتی تھی۔ بیل بوٹے، مچھلیوں اور پرندوں کی تصویریں بھی بنائی جاتی تھیں۔ اس طرح نقش و نگار والے برتن ہمیں بلوچستان کے گردونواح اور خصوصاً جھالاوان میں کثیر تعداد میں ملتے ہیں۔ اور ناچ جھلاوان اور مکران میں بھی اسی کلچر سے تعلق رکھنے والے باشندوں کی آبادیاں ملی ہیں۔ جبکہ مشکے میں میہی دمب ان کی ایک اہم اور مرکزی آبادی رہی ہے۔ نندو دمب سے ماہرین آثار قدیمہ نے وزنی پتھروں سے بنائے گئے بیشمار تعمیرات کا کھوج لگایا اور یہیں پر کسی قدیم عبادت خانے کے آثار بھی ملے ہیں جس سے سانڈوں اور بیلوں کے مجسمے ملے ہیں جو خالصتاً بلوچستانی جانور ہے۔

یہ قدیم اشیاء کی برآمدگی کسی طور پر آرین اور قدیم باشندوں کے کسی بھی تعلق اور مماثلت کو ظاہر نہیں کرتے اور نہ ہی کسی چھوٹے یا بڑے ٹیلے پر آرین حملوں کے نشانات ملے ہیں۔ یہ تو ممکن نہیں کہ یہاں کے مقامی باشندوں نے بغیر کسی مزاحمت کے اپنا سب کچھ حملہ آوروں کے حوالے کیا ہو۔

ممتاز خاتون ماہرِ آثار قدیمہ محترمہ بیٹرس ڈی کارڈی کا کہنا ہے کہ 100 قبل مسیح کے لگ بھگ آرین (ایرانی) باشندوں کا ایک گروہ بلوچستان میں آکر آباد ہوا تھا جن کے برتن بمپور (ایران) سے بھی برآمد ہوئے ہیں (دہوار 153:1990)۔ یہ ممکن ہے کیونکہ 100 ق۔م میں ایران آریائی خاندانوں کے قبضہ واختیار میں تھا اور ان کا دائرہ اثر مشرق کی جانب کافی بڑھ چکا تھا۔ جبکہ آشکانی خاندان کی حاکمیت خطے پر قائم تھی مگر آرین صنعت کافی عروج پر تھی لہٰذا مارکیٹ اُن کی اشیاء سے بھرے ہوتے تھے۔ بمپور چونکہ ایرانی سرحدات کے قریب واقع تھا لہٰذا یہاں کی آبادی پر آریائی ثقافت کو غلبہ حاصل ہوا ہوگا جبکہ ابتدائی آریاؤں کی مہاجرت 1500 قبل مسیح کے لگ بھگ شروع ہوئی تھی اور آنے والی چند صدیوں میں انہوں نے ایران، یورپ اور

ہندوستان کے وسیع رقبوں پر قبضہ کر لیا تھا اور ان کے اثرات دیگر علاقوں پر بھی پڑ رہے تھے۔ آریاؤں نے ایران میں چھٹی صدی قبل مسیح میں اپنی حاکمیت قائم کی اور قدیم مید خاندان کو شکست دے کر ان کی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ لہٰذا اگر بلوچستان کی قدیم آبادیوں میں آریائی آبادی کے ثبوت ملتے ہیں تو وہ چھٹی صدی قبل مسیح کے بعد کے ہوں گے جب خطے پر مقامی مید قبائل کی حاکمیت کا خاتمہ حملہ آور "بازار گد" آرین قبائل کی شاخ ہخامنشی کے ہاتھوں ہوا اور ایشیاء پر طویل عرصے تک ان کا پرچم لہراتا رہا۔ آریائی ہخامنشی خاندان کی حاکمیت کی تفصیلات کو مقامی مید قبائل کی حاکمیت کے حالات زیرِ تحریر لانے کے بعد بیان کیا جائے گا۔ مگر اس کے باوجود ایک اہم بات ایسی ہی جس کی وجہ سے ذہن یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتا کہ کسی آرین خاندان نے بلوچستان کے اندرونی علاقوں میں سکونت اختیار کی ہو کیونکہ آرین دشتوں اور غیر آباد علاقوں سے خوف کھاتے تھے اور ان میں بس جانے سے کتراتے تھے۔ وہ شہروں اور ترقی یافتہ مقامات پر رہنے کے عادی ہو چکے تھے جبکہ بلوچستان کے پہاڑ اور ریگستان ان کی ضروریات پورا کرنے کے لیے ناکافی تھے اور اُن کے لیے یہ خوفناک علاقے صحرائی اور پہاڑی لوگوں کے مساکن تھے۔

خاندان ماد (مید) کی حاکمیت:

اس قبیلہ کی حکومت کے آغاز کی تاریخ میں معمولی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بیشتر مورخین اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ اس خاندان کی حکمرانی کا آغاز آٹھویں صدی قبل مسیح میں ہوا تھا۔ یونانی زبان میں لکھی گئی تواریخ میں اس خاندان کے حکمرانوں کے ناموں کو یونانی زبان اور لہجے میں تحریر کیا گیا ہے جبکہ ایرانی فارسی مورخین نے ان ناموں کو اپنی زبان اور لہجے میں تحریر کیا ہے۔ علاوہ ازیں عربی، انگریزی اور دیگر زبانوں میں لکھنے والے مورخین اکثر و بیشتر

اپنے لسانی لہجوں میں ان ناموں کو ادا کرتے ہیں جس کی وجہ سے بعض قارئین کو انہیں سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے۔

اسی طرح اس خاندان کے دارالخلافہ کے بیانات میں بھی تضادات پائے جاتے ہیں۔ بعض ایرانی فارسی مورخین کے مطابق ان کا دارالخلافہ بلخ تھا جبکہ زیادہ تر مورخین موجودہ ہمدان کو ان قبائل کا اولین مرکز قرار دیتے ہیں جو اُس زمانے میں اگبتانا (اکٹھا ہونے کی جگہ یعنی آواران) کے نام سے مشہور تھا، اور یہی درست ہے کیونکہ یہی علاقہ دراصل مید، کرد، لوری اور دیگر لاتعداد قبائل کا مقامِ اتصال بھی تھا اور مید قبیلہ کا مرکز بھی۔ متفقہ طور پر مید قبیلہ کو مرکزی حاکمیت دی گئی تھی۔

مید خاندان کا پہلا حکمران قباد تھا جسے یونانی کتب میں دیوکسس تحریر کیا گیا ہے۔ قباد ایک کسان ''کیکاؤس، فراورتیش (Phraortes)'' کا بیٹا تھا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ وہ بہت ہی بہادر، ذہین، قابل، معاملہ فہم اور ہوشیار شخص تھا۔ اس کے جاننے والوں کو اُس سے بہت محبت اور عقیدت تھی۔ سب اس کی دانائی کے قائل تھے۔ تقریباً آٹھویں صدی قبل مسیح کے وسط میں زُوبن طہماسپ یعنی آخری پیشدادی حکمران کی وفات کے بعد سیستان کے فوجی سرداروں زال، طوس، گودرز اور دیگر نے آپس میں یہ طے کیا کہ زُو کے بیٹوں میں سے چونکہ کوئی بھی حکمرانی کے لائق نہیں ہے لہذا اُن کے بیٹوں کی بجائے معاملہ فہم اور ذہین قباد کو اقتدار دی جائے تاکہ خطہ پر اُن کی حاکمیت برقرار رہے اور کسی بیرونی قوت کو اقتدار ہاتھ میں نہ لینے دیا جائے۔ علاوہ ازیں قباد کو اقتدار میں لانے کا ایک مقصد مشرق وسطیٰ کے آشوریوں کے آئے روز کی مار دھاڑ کو بھی روکنا تھا جو آخری دور کے پیش دادی حکمرانوں کی کمزوری کی وجہ سے دوبارہ شروع ہو چکے تھے۔ اس طرح قباد نے برسرِ اقتدار آکر ''کے'' کا لقب اختیار کیا جو اُن کی زبان میں نیکی کے

معنوں میں آتا تھا (بدخشانی 1967:48)۔ اس طرح تمام مید حکمرانوں نے اپنے نام کے ساتھ اس لفظ کا اضافہ کیا۔ اس طرح قباد تاریخ میں ''کیقباد'' کے نام سے مشہور ہوا۔ بدخشانی طبری کے حوالے سے لکھتا ہے کہ، کیقباد نے سو سال حکومت کی اور 655 قبل مسیح میں اس کا انتقال ہوا۔ کیقباد کا زمانہ وہی تھا جو حضرت موسیٰؑ کے بعد کا زمانہ تھا (بدخشانی 1967:20)۔

کیقباد کے بعد ان کا بیٹا ''کاؤس'' برسرِ اقتدار آیا اور تاریخ میں ''کیکاؤس'' کے نام سے مشہور و معروف ہوا۔ یونانی اس کا نام ''فراورتیش'' تحریر کرتے ہیں جبکہ اس نے 655 سے 633 قبل مسیح تک حکومت کی۔ کیکاؤس مید خاندان کا ایک عظیم حکمران گزرا ہے جس نے میدی سلطنت کو خوب وسعت اور ترقی دی جس سے اس کو زبردست استحکام حاصل ہوا۔ اس نے آریاؤں سے اُن کی سرزمین پارس بھی چھین کر میدی سلطنت میں شامل کی اور آس پاس کی دیگر چھوٹی بڑی ریاستوں کو بھی فتح کر کے مید سلطنت میں شامل کیا۔ مقبوضہ علاقوں کو مستحکم و منظم کرنے کے بعد اس نے آسوریوں (آشوریوں) کی جانب توجہ دی جنہوں نے عرصہ دراز سے اہلیانِ مادستان کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ مگر یہ کیکاؤس کی سب سے بڑی غلطی ثابت ہوئی کیونکہ اس نے آسوریوں کی طاقت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ آسوری میدوں سے زیادہ طاقتور اور تجربہ کار تھے۔ انہوں نے میدوں کو جنگ میں شکست دی اور کیکاؤس (فراورتیش) اس جنگ میں مارا گیا۔ یہ جنگ 633 قبل مسیح میں لڑی گئی۔ کیکاؤس نے تیئیس سال حکومت کی۔

کیکاؤس کے بعد ''خسرو'' نے اقتدار سنبھالا اور ''کے'' کے لقب کے اضافے سے ''کیخسرو'' کے نام سے شہرت پائی۔ یونانی مورخین اس مید حکمران کا نام ''کیاکسارا یا ھووخشتر'' تحریر کرتے ہیں (بدخشانی 1967:21)۔ اس حکمران نے اپنے والد کے قتل کا بدلہ لینے کی خاطر مکمل تیاری کے بعد آسوریوں پر حملہ کیا اور نینوا شہر کا محاصرہ کیا۔ مگر مادستان پر سیتھین

(Cythians) قبائل کے حملوں کی وجہ سے محاصرہ ختم کر کے دوبارہ اپنی سلطنت کے دفاع کی خاطر مادستان لوٹ آیا۔ اس نے سیتھین قبائل سے جنگ لڑی مگر شکست کھائی اور بالآخر اُسے انتہائی ذلت آمیز شرائط پر صلح کرنا پڑا۔ بعد ازاں اس نے حیلے سے سیتھین سرداروں کو ایک دعوت پر مدعو کیا اور انہیں وہیں قتل کر دیا۔ ان وحشی قبائل کے سرکردگان کا خاتمہ کرنے کے بعد ان قبائل کو بھی مار کر اپنے ملکی حدود سے باہر کر دیا۔ کیاکسارا نے بعد ازاں بابل اور نینوا کے نئے حکمران خاندان ''نبوپلاذر'' سے صلح کر کے نبوپلاذر کے ہونہار بیٹے نبوکدنضر (بخت نصر) کو اپنی بیٹی ایمیتیس بیاہ دی۔ اس طرح بابل کے ساتھ دوستی گانٹھ کر ہوشیار اور دانا کیخسرو نے ایشیائے کوچک کی جانب توجہ دی جو اُس زمانے میں لیڈیا کہلاتا تھا۔ اُس نے لیڈیا کے ساتھ محاذ آرائی شروع کی جس کے نتیجے میں اسے ایشیائے کوچک کا ایک وسیع علاقہ ہاتھ آیا اور مادستان کی سرحدات دریائے ہالس تک پہنچ گئیں۔ مید حکمران کیخسرو 584 قبل مسیح میں انتقال کر گیا۔ یونانی تواریخ کے مطابق کیخسرو کے انتقال کے بعد اُس کا بیٹا استیاغوث یا آستیاگس حکمران بنا جو اس خاندان کا آخری حکمران ثابت ہوا (بدخشانی 1967:29)۔

مگر ایرانی حماسہ مِلی یعنی فارسیوں کی تحریر کردہ افسانوی تاریخ میں کیخسرو کے بعد اس کے چچازاد بھائی لہراسپ کی حکمرانی کا تذکرہ ملتا ہے۔ جو عظیم کلدانی حکمران بخت نصر کا ہمعصر مانا جاتا ہے۔ لہراسپ کے بعد گشتاسپ تخت نشین ہوا۔ گشتاسپ اور تورانی حکمران ارجاسپ کے مابین ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں ترکوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ مگر میدوں کے حکمران گشتاسپ نے غلط فہمی کی بنیاد پر اپنے فاتح بیٹے اسفندیار کو قید کر لیا جس پر شکست خوردہ تورانیوں کو فتح کی امید نظر آئی اور انہوں نے ایران پر حملہ کر دیا۔ گشتاسپ کے بڑے بڑے سورما اس جنگ میں مارے گئے اور میدی سردار میدان جنگ میں تورانیوں کے طوفانی جنگبازی کی بھینٹ چڑھ

گئے۔ گشتاسپ بچے کچے میدی لشکر کو لے کر پہاڑی علاقوں کی جانب فرار ہوا۔ اب اسے اسفندیار کو قید کرنے کی غلطی یاد آئی لہٰذا اس نے فوراً اسے رہا کر کے مادستان کا تاج و تخت اس کے حوالے کیا۔ اسفندیار نے اقتدار سنبھالتے ہی تورانیوں کے ساتھ جنگ لڑنے کی بھرپور تیاری کی اور ایک خونریز جنگ میں ارجاسپ کے لشکر کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا اور ارجاسپ اپنے بچے کچے لشکر کے ساتھ بھاگ کھڑا ہوا۔ اسی حکمران کے دور میں رستم بن زال سیستانی نے فنِ پہلوانی اور سپہ گری میں اپنے جوہر دکھائے اور تاریخ میں ہمیشہ کے لیے اپنے نام کو زندہ و پائندہ کیا۔ اسفندیار کے بعد اس خاندان کا آخری حکمران بہمن دراز دست برسرِ اقتدار آیا اسے اردشیر دراز دست بھی کہا جاتا ہے۔ مگر یہ مید سلطنت کو دوام نہ بخش سکا اور یہ اس خاندان کا آخری حکمران ثابت ہوا۔ اس نے سیستانیوں سے جنگ مول لی اور رستم کے خاندان کے ساتھ جنگ لڑی۔ کیونکہ رستم نے اس خاندان کے ساتھ جنگ لڑ کر اپنے مقتول بیٹے سہراب کے قتل کا بدلہ لیا تھا۔ لہٰذا جب رستم کا انتقال ہوا تو اردشیر دراز دست نے سیستان پر حملہ کر کے اس خاندان کو سخت نقصان پہنچایا اور ان کا سارا اثاثہ لوٹ لیا۔ مگر اس کے بعد مید بھی زیادہ عرصہ تک اپنی حاکمیت قائم نہ رکھ سکے اور آریائی ہخامنشیوں کے ہاتھوں ایسے فنا ہوئے کہ پھر دوبارہ اس خطے میں جو اب ایران کہلاتا ہے اپنی حکومت قائم نہ کر سکے۔ بلکہ ان کی بڑی اکثریت اپنے اپنے علاقوں سے مہاجرت کر کے ساحلِ مکران کی جانب آئی۔ میدوں نے اپنے دفاع کی آخری جنگ دارا اول کے دور میں لڑی مگر شکست کھا کر ہمیشہ کے لیے مغلوب ہو گئے (بدخشانی 1967: 93-94)۔

میدوں کی حاکمیت کا خاتمہ 550 قبل مسیح میں ہوا۔ جبکہ بعض مورخین اس کو 558 قبل مسیح بھی تحریر کرتے ہیں۔ خاندان مید نے طویل عرصہ تک حکمرانی کی اور اپنی فتوحات کے جھنڈے دور دور تک گاڑ دیئے۔ بلوچستان کے اکثر علاقے ان کے زیر اثر تھے۔ مگر بقول

ہیروڈوٹس، یہاں ہزاروں قبائل ایسے تھے کہ جنہیں اب تک زیر نہیں کیا جاسکا تھا(ہیروڈوٹس 261:2001، مزید ملاحظہ کریں: قاضی:93-89، 4) بالآخر آخری میدی حکمران کو پہلے ہخامنشی فرمانروا اسائرس اعظم نے 550 قبل مسیح میں شکست دیکر اقتدار سے محروم کر دیا۔

یقینی بات ہے کہ اس منتقلی اقتدار میں میدیوں پر جو بُرا وقت گزرا ہو گا اس سے انکار ممکن نہیں۔ بے شمار مید خاندان ادھر اُدھر بکھر گئے۔ان میں سے بعض خاندان بلوچستان کے ساحلوں کے طرف بھی نکل آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔شاہنامہ فردوسی میں مید خاندان کو کیانی کہا گیا ہے۔

جس زمانے میں ایرانی میدوں نے ایک بڑی تہذیب کی بنیاد رکھی اور اس خاندان کے نامور بادشاہوں نے طاقت کے زور پر اپنے سطوت کے پرچم گاڑے تو مشرق وسطیٰ میں آشوری ایک عظیم طاقت بن چکے تھے اور انہوں نے عظیم آشوری (آسوری) سلطنت قائم کر کے مشرقِ وسطیٰ کے سامیوں کو بامِ عروج پر پہنچا دیا تھا۔ایک مؤرخ لکھتا ہے کہ 710 قبل مسیح میں شروقین اول (Sargon I) نے میڈیا (مادستان) پر قبضہ کر لیا کیونکہ مید کمزور پڑ چکے تھے۔ مگر 632 قبل مسیح میں انہوں نے دوبارہ طاقت پکڑلی اور سیاکسارس کی سرکردگی میں اس قوم نے آشوریوں سے ان کا خطہ چھین لیا اور عراق پر قابض ہوگئے (بدخشانی 1967 : 20-21 مزید ملاحظہ کریں: اکمل:12)۔

بلوچستان کا خطہ میدیوں کے پہلو میں واقع تھا مگر دوسری جانب یعنی مشرق کی طرف وادیِ سندھ کی تہذیب کے جدید لوگ یعنی ہندوستانی آرین بھی بلوچستان کے ہمسائے تھے۔ بلوچستان کی قدیم تہذیب زمانہ ہوا زوال پذیر ہو چکا تھا اور قدیم لوگ ان عظیم شہنشاہیتوں کے درمیان پِس رہے تھے۔ان کے قدیم شہر اور قصبے کھنڈرات بن چکے تھے اور وہ چھوٹے چھوٹے

دیہاتوں یا پہاڑی وادیوں تک محدود ہو چکے تھے۔ چند ایک بڑے شہر بھی بلوچستان میں واقع تھے مگر چاروں طرف پھیلی ہوئی کثیر آبادی اب اس طرح نہیں رہی تھی کہ جو آرین کے وارد ہونے سے قبل تھی۔ اگر بستیاں قائم تھیں بھی، تو ان کی مقامی صنعت ختم ہو چکی تھی یا مقامی حدود تک محدود تھی وگرنہ سارے خطے پر آس پاس کے بڑے تمدن اور بڑی تہذیبیں حاوی ہو چکی تھیں۔ مشرق اور مغرب کے تمام تجارتی راستے اب ان کے کنٹرول میں تھے۔

یہ بات بھی ذہن نشین ہو کہ جب تک مید دیگر بلوچ قبائل کے ساتھ مل کر حاکمیت کرتے رہے تب تک وہ ایک وسیع و عریض خطہ زمین کے حاکم رہے اور جب ان بلوچ قبائل میں خانہ جنگی اور نا اتفاقی پیدا ہوئی تو ان کی حاکمیت بھی باقی نہ رہ سکی اور ایسے بکھر گئے کہ ان کا نام اور وجود صرف ساحل مکران پر باقی رہ سکا۔ جہاں آج بھی اس قدیم بلوچ قبیلہ کے افراد بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں جو اب صرف ماہی گیری کے پیشے سے وابستہ ہیں۔

ماضی قدیم میں مشرقِ وسطیٰ کے اکادی اور سندھ کے ملوہا (موہن جو دڑو) کے باشندے بھی آپس میں تجارت بلوچستان کے خشکی اور بحری راستوں سے کرتے تھے۔ یہ دعویٰ ڈاکٹر بیسنویل نے عمان میں مختلف مقامات پر کھدائی کے دوران بر آمد ہونے والے کتبوں کی صورت میں ملنے والے کتبوں اور تحریری شواہد ملنے کے بعد کیا ہے جن کی تحریروں سے اس بات کا انکشاف ہوا ہے کہ اکادی باشندے طلمون یعنی بحرین کے ساحلوں سے ماگان یعنی مکران کے ساحلوں پر آتے تھے اور پھر یہاں سے وہ ملوہا (سندھ) کی جانب سفر کرتے تھے (بلوچ فاروق (غیر مطبوعہ مقالہ پی ایچ ڈی): 83-84، مزید مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: یحییٰ امجد۔ (1989: 219 اور ڈی۔ ڈی کوسمبی 2012: 85-86)۔

یہ دور دراز اور بنجر و بے آب و گیاہ علاقہ زیادہ ثمر آور نہیں رہا تھا البتہ مشرق اور مغرب کی عظیم طاقتوں کے مابین ایک سنگم کی حیثیت ضرور رکھتا تھا۔ لہٰذا ایرانی، ہندوستانی اور سندھی حکمران اس دور دراز صوبے سے چوکی کا کام لیتے تھے اور اس علاقے کو بطور فوجی اور تجارتی گزرگاہ کے استعمال کرنے لگے تھے۔ اس حوالے سے آشوری ملکہ سیمی رامس کے ہندوستان سے واپسی کے سفر کی مثال دی جاسکتی ہے۔ یہ بابلی آشوری ملکہ تقریباً چار ہزار سال قبل میں اپنے ہندوستانی مہم میں ناکامی کے بعد جب واپس بابل کی جانب روانہ ہوئی تو اس نے واپسی کے لیے بلوچستان کے علاقہ جات بیلہ و مکران کا راستہ اختیار کیا۔ اس مشکل سفر میں اس کی پوری فوج تباہ ہوگئی اور وہ بصد مشکل اپنے صرف بیس سپاہیوں کے ساتھ بابل پہنچنے میں کامیاب ہوگئی تھی (سمتھ 125:2001)۔ اسی طرح سائرس نے بھی اس راستے کا انتخاب فوجی مقاصد کے لیے کیا تھا اور بعد ازاں سکندر بھی بلوچستان میں فتوحات کی غرض سے داخل ہوا تھا۔

لہٰذا اس بات کے ٹھوس شواہد ملتے ہیں کہ مید حکومت ان سواحل کو اور ان تجارتی راستوں کو اپنے مفادات کے حصول کی خاطر استعمال کرتی تھی۔ مکران اور اندرونِ بلوچستان کے راستے اور ساحلِ بحر اگر قدیم اکادی اور ملوہا تہذیب کے دور میں استعمال ہوسکتے تھے تو پھر مید جیسے جدید اور باشعور حکمران، جو ہندوستان کے قریب رہتے تھے اور مشرقِ وسطیٰ والوں کی نسبت اس خطے کے بارے میں زیادہ معلومات رکھتے تھے، بلوچستان کے خشکی اور بحری راستوں کی افادیت اور اہمیت سے کیونکر غافل رہ سکتے تھے۔ مگر جس طرح بعد میں ایران کے حاکم بننے والے آرین خاندانوں نے بزورِ طاقت مکران کو زیر کرنا چاہا، ان کے برعکس میدوں کے تعلقات مکران کے ساتھ دوستانہ اور دوطرفہ رہے۔ مید دور میں مکران کی جانب سے مدد و کمک کے شواہد تو شاہنامہ فردوسی میں ملتے ہیں مگر اِن حملوں یا کسی بھی قسم کی جارحیت اور تصادم کے بارے میں

کچھ بھی تحریر نہیں ہے۔ تحریری شواہد یہ معلومات فراہم کرتے ہیں کہ ایران کی جانب سے مکران پر پہلا حملہ داراول کے دور میں ہوا اور مکران ایرانی ہخا منشی حکمرانوں کا بیسواں صوبہ بنا۔ یقیناً گذشتہ طویل دور میں مکران پر مقامی قبائل کی حاکمیت رہی ہو گی۔ تاریخی نقشوں اور بیانات سے اس بات کے ٹھوس شواہد ملتے ہیں کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں جب ایران پر مید خاندان کی حاکمیت قائم تھی تو مکران پر مقامی اور مشہور و معروف بلوچ قبیلہ ہوت کی حاکمیت قائم تھی جو آزاد اور خود مختار حکمران تھے۔

خاندانِ ہخامنشی آریائی:

میداور ہخامنشی ادوار کا تفصیلی تذکرہ شاہنامہ فردوسی میں موجود ہے جس میں بلوچستان میں رہنے والے قدیم قبائل یعنی بلوچوں اور ایرانی افواج کی دوستی، مشترکہ فتوحات اور بعد ازاں آپس کی چپقلش کی طویل اور پُر اثر منظوم تصویر کشی کی گئی ہے۔

میدوں کا آخری حکمران استیاگس ستر سال کا تھا کہ معاملات نے یکایک پلٹا کھایا فارس کے نوجوان شہزادے اور کمبی سس (کمبوجیہ) کے بیٹے سائرس نے اس سے اقتدار چھین لیا۔ سائرس ایک عظیم حکمران ثابت ہوا اس نے کرمان، لیڈیا (آرمینیا اور ترکی) بابل اور چین تک فتوحات کے جھنڈے گاڑے۔ مکران کا بھی کافی حصہ اسکے زیر اثر آیا اور اس نے ایک ہزار قوموں پر بادشاہت کی (قاضی:423-30)۔

تاریخ کے مختلف کتابوں سے سائرس اعظم کے سفر مکران کا تذکرہ بھی ملتا ہے کہ جس میں سفر کے آغاز میں ہی اسکی فوج کو اتنی مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا کہ اسکے بمشکل سات سپاہی زندہ بچ سکے تھے اور وہ گھبرا کر واپس ایران آگیا تھا۔ تورا کینہ قاضی بھی سائرس کے ابتدائی دنوں کی بادشاہت یا بحیثیت ایک سالار کے سفر مکران کا تذکرہ کرتی ہے اور ساتھ ہی

مکران کے سفر کی تکالیف کا بھی تفصیلی تذکرہ کرتی ہے۔ جبکہ سمتھ اور ہیرلڈ لیم سائرس کے سفر مکران کی زیادہ تفصیلات بیان کرتے ہیں۔ مگر سائرس کی حقیقی کہانی اور ان کے بارے میں ابتدائی اور مستند معلومات ہیرودوٹس نے بیان کیے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر تمام مصنفین نے انہی کی تحریروں سے استفادہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں مولانا ابوالکلام آزاد بھی قرآن پاک کی سورہ کہف کے ایک آیت کی روشنی میں سائرس کو ذوالقرنین قرار دیتے ہوئے اُن کے مشرق کے سفر کو سفر مکران قرار دیتا ہے (آزاد 2012: 51-52)۔

ہخامنشی خاندان کا یہ تاجدار اپنے اجداد کی اولین آماجگاہ آریہ ورش کی تلاش میں وسط ایشیاء پہنچا جبکہ بعض ذرائع کا دعویٰ ہے کہ وہ زرتشت پیغمبر کی تلاش میں بلخ پہنچا اور آخر کار وہاں کے مساگت (مساجیٹ) قبیلے کے ہاتھوں 530 قبل مسیح میں مارا گیا (ہیروڈوٹس 2001: 113 مزید ملاحظہ کریں: قاضی: 475-80)۔ ہخامنشی اقتدار میں بڑے بڑے نامی گرامی حکمران گزرے ہیں کہ جنھوں نے ایک وسیع و عریض خطہ زمین پر حکومت کی۔ شاہنامہ فردوسی میں اس دور کا خوبصورت ترین نقشہ منظوم انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جس میں قدیم بلوچ اور کوچ قبائل کے کارناموں اور اُن کے سرداروں کے تذکرے ملتے ہیں۔ شاہنامہ میں سات ہخامنشی بادشاہوں کا تذکرہ آتا ہے۔ جن کی مختصر تفصیلات اور علاقہ بلوچستان پر ان کے تسلط اور مقامی بلوچ قبائل کے ساتھ اُن کے تعلقات ذیل میں دی جارہی ہیں۔

سائرس ہخامنشی خاندان کا پہلا تاجدار تھا جس نے آخری مید حاکم اور اپنے نانا آستیاگس کو شکست دے کر گرفتار کیا اور اُس کی سلطنت پر قابض ہوا۔ سلطنت پر سائرس کے قبضے کی داستان کافی طویل مگر بے حد دلچسپ ہے۔ مورخین کے بیانات کے مطابق سائرس مید حکمران آستیاگس (آستیاغوث) کا نواسہ تھا اور اُس کی والدہ کا نام ماندین تھا جسے یونانی مورخین میندانے

تحریر کرتے ہیں۔ یہ خاتون سائرس کو جنم دے کر فوت ہو گئی جبکہ ڈرامائی اور افسانوی انداز میں سائرس کی پرورش ایک چرواہے اور اس کی بیوی نے کی۔ دراصل آستیاگس کو اس کے درباری نجومیوں نے بتا دیا تھا کہ اُس کی بیٹی ایک بچہ جنم دے گی جو میدوں کی حاکمیت ختم کر کے آریائی ہخامنشیوں کی حاکمیت قائم کرے گا۔ لہٰذا آستیاگس نے اپنی افواج کے آرمینیائی النسل سپہ سالار ہارپیگ (ہارپاگس) کو حکم دیا کہ ہخامنشی سردار کمبی سس کہ جو اس کا داماد ہے، کے گھر میں ایک بچہ جنم لے گا وہ اُس بچہ کو اٹھا کر کہیں دور لے جائے اور قتل کر دے۔ ہارپیگ نے بظاہر حکم شاہی میں سرِ تسلیم خم کیا مگر جب وہ پسا گرد کے علاقے میں سردار کمبی سس کے گھر پہنچا اور ایک معصوم سے بچے کو دیکھا جس کی ماں اُس کو جنم دے کر چل بسی تھی تو اُس کا دل پسیج گیا۔ مگر چونکہ حکم شاہی تھا لہٰذا بادلِ نخواستہ بچے کو اُٹھالیا اور پہاڑوں کی راہ لی۔ پہاڑوں میں پہنچ کر اس نے سوچا کہ ایک معصوم سے بچے کے خون میں وہ کیوں اپنے ہاتھ رنگے، یہاں نہ تو شہنشاہ ہے اور نہ ہی اُس کے جاسوس جو اُسے دیکھ سکیں۔ لہٰذا بچے کو یہیں زندہ چھوڑ دیتا ہوں آگے اُس کی قسمت کہ زندہ رہے یا نہ رہے۔ ہارپیگ بچے کو زندہ چھوڑ کر چلا گیا۔ قریب ہی ایک چرواہے کا جھونپڑا تھا جہاں اُس کی بیوی نے ایک مردہ بچے کو جنم دیا تھا اور اُس کے مرنے پر نوحہ کر رہی تھی جبکہ چرواہا اپنی بیوی کو دلاسہ دے رہا تھا۔ چرواہا تھوڑی دیر کے لیے اپنے جھونپڑے سے باہر نکل آیا تو اُسے قریب کی گھاٹی سے ایک بچے کے رونے کی آواز سُنائی دی۔ پہلے تو اُس نے اسے اپنا وہم سمجھا مگر جب وہ آواز مسلسل آنے لگی اور تیز ہوتی گئی تو وہ اُس گھاٹی کی جانب آیا اور دیکھا کہ قیمتی ریشمی ملبوسات اور کپڑوں میں لپٹا ہوا ایک خوبصورت بچہ ایک چٹان پر پڑا رو رہا ہے۔ چرواہا پہلے تو ڈر گیا مگر بعد میں ہمت کر کے اُس کو اٹھالیا تو بچہ ایک دم چپ ہو گیا۔ چرواہا بچہ کو اٹھائے خوشی خوشی اپنی جھونپڑی میں آیا اور اپنی زوجہ سے مخاطب ہو کر بولا کہ دیکھو نیک بخت عورت اللہ نے

ہمارے مردہ بچہ کے بدلے ہمیں ایک خوبصورت بچہ عطا کیا ہے۔ بیوی کے پوچھنے پر سارا ماجرا اُسے بتا دیا۔ اس طرح سائرس ایک چرواہے کے گھر میں پلنے لگا۔ اُس چرواہے نے ہی اُس کا نام سائرس رکھا جس کے معنی ہیں ''چرواہا''۔

بعض روایات یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ یہ چرواہا ہارپیگ کا جاننے والا تھا اور بچہ ہارپیگ نے خود اُسے حوالے کیا تھا کہ وہ اس کو دور کسی ویران جگہ پر رکھ کر اس کی موت کا انتظار کرے اور مر جانے پر وہ اطلاع دے۔ لہٰذا اس نے اپنے مردہ بچہ کو دھوپ میں رکھا اور لاش اکھڑنے پر اُسے ہارپیگ کو دکھایا اور اسے باور کرایا کہ یہ اُسی مردہ بچے کی لاش ہے جو اُس نے اُسے حوالے کیا تھا۔

بعد ازاں کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے سائرس کا راز فاش ہو گیا۔ اُس وقت سائرس تقریباً بارہ سال کا ہو چکا تھا۔ آستیاگس نے اپنے مصاحبین اور درباریوں کے اصرار پر اُسے تو معاف کر کے اپنے اصل باپ کے ساتھ جانے کا کہا مگر ارمنی سردار یعنی اپنی افواج کے سپہ سالار ہارپیگ کو معاف نہیں کیا اور اُس کے بیٹے کو ذبح کر کے اُس کا گوشت اُسے کھلایا۔ اس طرح آستیاگس نے اپنی سلطنت کے خاتمے کا راستہ خود ہموار کیا۔ ہارپیگ اُس وقت تو خاموش رہا مگر وہ صحیح وقت کا منتظر تھا۔ جب سائرس نے میدوں کی حاکمیت کے خلاف تحریک شروع کی تو ہارپیگ نے اُس کا ساتھ دینے کا یقین دلایا اور اس بات کا بھی کہ میدوں کی بیشتر فوج بغاوت میں اُس کا ساتھ دے گی اور جو ساتھ نہیں دیں گے انہیں مار دیں گے۔ اس طرح سائرس نے ہارپیگ کی غداری اور دیگر درباری سازشی وزرا اور حکام کی مدد سے مید سلطنت پر قبضہ کر کے اپنے نانا آستیاگس کو گرفتار کر لیا۔ مورخین کے بیانات کے مطابق اس بغاوت میں بیشتر اُن قبائل نے سائرس کا ساتھ دیا تھا جو آریائی نہیں تھے۔ ان مورخین کے بیانات کے مطابق آریائی قبائل صرف تین تھے یعنی ماپی (ماپسی)، مارافی (ماراپسی) اور ہخامنشی جبکہ دیگر سات بڑے قبائل غیر

آرین اور خطے کے قدیم باشندے تھے۔ جبکہ لاتعداد پہاڑی اور دور دراز کے قبائل نے بھی سائرس کی حاکمیت کی حمایت کی تھی۔ یہ دور دراز کے پہاڑی اور ریگستانی قبائل بھی غیر آرین اور خطے کے قدیم باشندے تھے۔ دراصل ان غیر آرین باشندوں کا تعلق اُن قبائل سے تھا جنہیں یونانی مورخین نے اُن کے قبائلی جبکہ فارسی اور عرب مورخین انہیں اُن کے قومی ناموں یعنی کوچ و بلوچ سے اپنی تحریروں میں جگہ دی ہے۔ بلاشبہ سائرس نے خطے کے کئی غیر آرین قبائل کی مدد سے میدوں کی حاکمیت ختم کی تھی اور اُس کے مددگار قبائل مید، کُرد، ڈایہ، ہیرکانی، دابانی، کرمانی، پیرکانی، کولاچی وغیرہ تھے۔ بعد ازاں سائرس نے بلوچوں کے ایک وسیع و عریض خطے کو فتح کیا مگر مکران کا علاقہ فتح کرنے میں ناکام رہا۔ مکران پر حملے کا تذکرہ تاریخ کی اکثر مستند کتب میں ملتا ہے کہ جن کے مطابق سائرس کا تقریباً پورا لشکر اس صحرائی اور پہاڑی بھول بھلیوں والی سرزمین میں تباہ ہوا اور وہ بمشکل سات سپاہیوں کے ساتھ ایران پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔ البتہ وہ سیستان اور البرز کے بلوچ علاقوں پر تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ بعض مستند بیانات کے مطابق البرز اور سیستان کے بلوچ قبائل ہی کی مدد سے وہ برسرِ اقتدار آیا تھا مگر مکران اور کرمان نے اُس کی حاکمیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کرمان پر طویل مذاکرات کے بعد ہخامنشی تسلط قائم ہوا مگر مکران نے سائرس کی نہ صرف حاکمیت تسلیم نہیں کی بلکہ یہ علاقہ پناہ گزین میدوں کا مسکن بن گیا۔ لہٰذا سائرس نے اس علاقے پر حملہ کا مصمم ارادہ کیا مگر اُسے شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور اُس کی تمام فوج سفر کے آغاز میں ہی صحرا بُرد ہو گئی (سمتھ 2001 :125) علاوہ ازیں: ابوالکلام آزاد (2012:51-52)۔

بعض شواہد اور مستند ثبوتوں کے مطابق: سائرس کرمان کے راستے اس صحرائی خطے میں داخل ہوا تھا۔ اس کے لشکر کے پاس پانی کا جو ذخیرہ تھا وہ ختم ہو گیا۔ جس کی وجہ سے وہ طرح طرح

کی مشکلات کا شکار ہو گیا اور گھبرا کر واپسی کی راہ لی مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ فوج سمیت بیچ صحرا پھنس گیا اور تقریباً پوری فوج صحرا بُرد ہو گئی۔ بعض ماہرین نے اُس گمشدہ فوج کو اس خطرناک نمکین ریت والی صحرا میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے مگر انہیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ مکران کے صحرا کا یہ حصہ دشت لوت کہلاتا ہے اور دنیا کے خطرناک اور نمکین صحراؤں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس میں بغیر پانی پیئے چار گھنٹے سے زیادہ زندہ نہیں رہا جا سکتا۔ کیونکہ یہاں کی ریت میں زیادہ نمکلکیات ہونے کی وجہ سے جسم کا پانی فوراً ختم ہو جاتا ہے اور مزید پانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ پانی ختم ہونے کی صورت میں فوراً ڈی ہائیڈریشن ہو جاتا ہے اور انسان کی فوری موت واقع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ صحرا دنیا کے خطرناک ترین صحراؤں میں شمار ہوتا ہے۔

سائرس اپنی بیس سالہ حاکمیت میں ایک طویل سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوا اور مورخین کے بیانات کے مطابق اُس نے ایک ہزار قوموں پر حکومت کی مگر بلوچ قبائل کے بیشتر مشرقی علاقے اُس کی تصرف سے آزاد تھے۔

سائرس کے بعد اُس کا بیٹا کمبی سس 530 قبل مسیح میں برسرِ اقتدار آیا مگر بیس سالہ طویل حکومت میں اُس کی توجہ زیادہ تر مصر اور دیگر افریقی ممالک کی فتوحات کی جانب مبذول رہی اور سلطنت کے مشرقی اور جنوب مشرقی علاقوں کی جانب وہ زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ البتہ مختلف بلوچ قبائل کے لاتعداد جنگجو ہخامنشی فوج میں شامل ہو کر مصر کی فتوحات میں اپنا کردار ادا کرتے رہے۔

کمبی سس کی وفات کے بعد ہخامنشی سلطنت کا ایک عظیم حکمران دارا اول برسرِ اقتدار آیا اور ایرانی تہذیب کو تاریخی وسعت اور طوالت عطا کی۔ دارا کی فتوحات میں تمام تر بلوچ علاقہ تا حدودِ سندھ و پنجاب شامل تھے۔

اس دور کے بارے میں بے شمار تحریری مواد دستیاب ہے جن کے مطالعہ سے اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ دارا اول یعنی داریوش (Darius I) نے میدوں کی آخری بغاوت کو سرزمینِ مکران میں روند ڈالا میدوں اور اُن کے حلیف ہوت قبیلہ کو عبرتناک شکست دے کر مکران پر قبضہ کر لیا اور اسے اپنی سلطنت کا ایک صوبہ بنالیا۔ اس طرح مکران کے ساحلوں پر اور اندرونِ ملک پہلی بار آریاؤں کو غلبہ حاصل ہوا۔ جبکہ اُس وقت مکران کے ایک حصے پر ہوت قبیلے کی حکومت قائم تھی جبکہ مکران کا دوسرا حصہ میکوئی، میکرونی، مائشی قبائل کے زیرِ اثر تھا۔ ہوت اور مید قبائل کی اجتماعی قوت کی شکست نے باقی ماندہ بلوچستان کے دیگر قبائل کو بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا۔ اس طرح تاریخی شواہد اور بیانات کے مطابق دارا اول کے دور میں آریائی ہخامنشی سلطنت کی سرحدیں دریائے سندھ تک پہنچ گئیں (آزاد 52:2012)۔ یوں بلوچستان پر پہلی بار کسی بیرونی قوم کی حاکمیت قائم ہوئی اور بلوچستان کا علاقہ اور یہاں کے لاتعداد قبائل پہلی بار کسی بیرونی قوت کے زیرِ تسلط آگئے تھے۔ دارا اول ایک انتہائی قابل اور سیاسی بصیرت رکھنے والا حکمران تھا۔ اس نے ایران میں ایک منظم حکومت قائم کر کے اس وسیع و عریض خطے کو بیس صوبوں میں تقسیم کیا۔ بلوچ خطہ کئی صوبوں میں منقسم ہوا۔ سیستان الگ صوبہ تو مکران الگ، وسطی بلوچستان جدا تو کرمان کا جداگانہ صوبہ۔ اس طرح دیگر بلوچ علاقے بھی منقسم ہوئے یا تو انہیں جداگانہ صوبہ بنایا گیا یا پھر دیگر صوبوں کے ساتھ ملحق کر دیا گیا۔

بلوچستان اور دیگر علاقوں سے فرصت پانے کے بعد دارا نے سندھ و ہند کی جانب توجہ دی اور بالآخر 512 قبل مسیح میں سندھ اور پنجاب فتح کر کے ان علاقوں کو بھی ایرانی صوبہ بنادیا۔ اس سلسلے میں ایک مورخ لکھتا ہے کہ:

> "داریوش کی نظریں اب ہندوستان پر پڑیں اور اس نے 512 قبل مسیح میں پنجاب اور سندھ فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کر لیے۔ یہاں سکیلاس (Scylax) نے، جو

یونانی امیر البحر تھا، داریوش کے حکم سے بحری جہاز بنوائے اور مکران سے ساحل عرب تک ایک نئی شاہراہ دریافت کی۔ پنجاب اور سندھ کی فتح سے نہ صرف ہندوستان کے خزانے ایران آئے بلکہ یہاں بھی داریوش نے ایک ایرانی صوبہ قائم کیا۔"(بدخشانی 66:1967)

دارا اول کے دور میں ہخامنشی سلطنت کے صوبوں اور اُن سے وصول کیے جانے والے ٹیکس کی تفصیلات ذیل میں دی جارہی ہیں:

پہلا صوبہ: ایونیائی، ایشیاء کے میگنیشیائی، ایولی، کیریائی، لائشی، مائلی اور پمفیلیائی مل کر چار سو ٹیلنٹ چاندی ادا کرتے تھے۔

دوسرا صوبہ: مائشی، لیڈیائی، لاسونی، قبالی اور ہائی جینیوں کے جزیہ کی رقم پانچ سو ٹیلنٹ تھی۔

تیسرا صوبہ: آبناؤں میں داخل ہونے پر دائیں ساحل پر آباد ہیلس پونتی، فریجیائی، ایشیائی تھریسی، پیفلاگونی، ماریانڈائنی اور سیریائی تین سو ساٹھ ٹیلنٹ جزیہ دیتے تھے۔

چوتھا صوبہ: سلیشیائی سال کے ہر دن کیلئے ایک گھوڑے کے حساب سے تین سو ساٹھ گھوڑے اور پانچ سو ٹیلنٹ چاندی بھیجتے تھے۔ اس رقم میں سے ایک سو چالیس ٹیلنٹ علاقے کی محافظ فوج کی تنخواہ پر خرچ ہوتے، جبکہ بقیہ تین سو ساٹھ داریوش وصول کرتا تھا۔

پانچواں صوبہ: یہ علاقہ ایمفی لوکس ابنِ ایمفیاروس کے (سیریا اور سلیشیا کی سرحدوں پر) بنوائے ہوئے شہر پوسیڈیم سے لیکر مصر کی سرحدوں تک تھا، عرب سے تعلق رکھنے والا ضلع اس سے خارج اور ٹیکس سے آزاد تھا۔ یہ صوبہ تین سو پچاس ٹیلنٹ ادا کرتا تھا۔ سارا فنیقیا، فلسطین، سیریا اور سائپرس اس میں شامل تھا۔

چھٹا صوبہ: مصری صوبے کے سائیرینے اور بارکا یا بارسا شہروں سمیت لیبیا کے تمام پڑوسی علاقوں پر مشتمل اس صوبہ سے سات سو ٹیلنٹ چاندی آتی تھی۔ ان سات سو ٹیلنٹ میں جھیل موئیرس میں ماہی گیری کا منافع شامل تھا اور نہ ہی ممفس کے مقام پر فوجی دستوں کو فراہم کیا جانے والا

غلہ۔ یہ غلہ ممفس میں سفید قلعہ میں رہنے والے ایک لاکھ بیس ہزار فارسیوں اور ان کے علاوہ متعدد معاونین کو بھی فراہم کیا جاتا تھا۔

ساتواں صوبہ: ستاگیدی، گنداری، دادیکے، اپرائیتے (جنوب مشرقی افغانستان اور خیبر پختونخواہ کے کچھ حصے) مجموعی طور پر ایک سو ستّر ٹیلنٹ جزیہ ادا کرتے تھے۔

آٹھواں صوبہ: سوسا اور ششیا کے دیگر علاقوں کے ذمہ تین سو ٹیلنٹ لگائے گئے۔

نواں صوبہ: بابل اور باقی کے آشوریہ سے ایک ہزار ٹیلنٹ چاندی اور پانچ سو مخنث لڑکے لیئے جاتے تھے۔

دسواں صوبہ: اگبتانہ اور میڈیا (شمالی ایران اور مشرقی ایران کے بلوچ قبائل کا صوبہ) کے دیگر حصوں بشمول پیریکانی اور تھوکوری بانیتس سب مل کر چار سو پچاس ٹیلنٹ دیتے تھے۔

گیارہواں صوبہ: کاسپی، پوسیکے، پانتیماتھی اور داریتے ایک ہی صوبے میں شامل تھے اور دو سو ٹیلنٹ جزیہ ادا کرتے تھے۔

بارہواں صوبہ: ایگلی تک کے باکتری قبائل (افغانستان) سے وصول ہونے والا جزیہ تین سو ساٹھ ٹیلنٹ تھا۔

تیرہواں صوبہ: پاکتائیکا (پکتیکا) آرمینیا اور یہاں سے آگے بحیرہ اسود (خراسان و کردستان کے علاقے) تک کے ممالک چار سو ٹیلنٹ ادا کرتے تھے۔

چودہواں صوبہ: سیگارتی (علاقہ قندھار و مضافات)، سارنگی (زرنجی یعنی سیستان)، تھامانی، یوتی، مائیشی اور بحیرہ ایریتھریئن میں جزائر (جہاں بادشاہ جلاوطن افراد کو بھیجا کرتا تھا) پر آباد لوگ مجموعی طور پر چھ سو ٹیلنٹ دیتے تھے۔ (یہ تمام صوبہ بلوچ علاقوں اور بلوچ قبائل پر مشتمل تھا۔ اس میں سیستان وصحرا ایران کے کچھ علاقوں کے علاوہ مغربی مکران کا بڑا حصہ شامل تھا۔ مصنف)

پندرہواں صوبہ: سیکائیوں اور کاسپیوں کے ذمہ دو سو پچاس ٹیلنٹ تھے۔ (یہ صوبہ بھی بلوچ قبیلہ کرد کی مختلف شاخوں اور ساکاؤں وکاسپی (بحیرہ کیسپیئن یعنی ہیر کانیہ والبرز کے قبائل جو کردوں پر مشتمل تھے) پر مشتمل تھا۔ مصنف)

سولہواں صوبہ: پارتھیوں، کوراسمیوں، سغدیوں، آریاؤں کا جزیہ تین سو ٹیلنٹ مقرر کیا گیا۔

سترہواں صوبہ: تتیانی (ممکن ہے یہ مشوانی قبیلہ ہو۔ مصنف)، ساسپیری (سرپرہ) اور الرودیین (قبیلہ رودینی۔ لفظ رودینی کو جمع کے طور پر لکھا گیا ہے) کے ذمہ دو سو ٹیلنٹ جزیہ لگایا گیا۔ (بلوچ قبائل کا یہ صوبہ کچھ سیستان و کچھ حصہ موجودہ سراوان کے قبائل پر مشتمل تھا)

اٹھارہواں صوبہ: موئشی (غالباً مامشئی)، میکوئی (ماکا یعنی مکران کے باشندے)، تیباریني (تورانی)، میکرونی، موسینوئی (قبیلہ موسیانی) اور مریس (قبیلہ مری) کو تین سو ٹیلنٹ ادا کرنے پڑتے تھے۔ (بلوچ قبائل کا یہ صوبہ وسطی و مشرقی مکران و جھلاوان کے قبائل پر مشتمل تھا)

انیسواں صوبہ: باقی سب کے مقابلے میں کثیر التعداد ہندوستانی کسی بھی صوبے کے عوام سے کہیں زیادہ جزیہ دیتے تھے یعنی زرِ ریشہ (سونا) کے تین سو ساٹھ ٹیلنٹ۔"

بیسواں صوبہ: فارس کا تھا جو ٹیکس سے مکمل طور پر مستثنیٰ تھا (ہیروڈوٹس 2001، 258-59)۔

الغرض دارا اول نے ہخامنشی سلطنت کو بامِ عرج تک پہنچا دیا اور اسے ایسی شہرت عطا کی جس کی نظیر سابقہ تاریخ میں نہیں ملتی تھی۔ تاریخی کتب کے بیانات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ دارا اول اپنے عہد کا ایک زبردست ماہرِ معاشیات تھا اور حکمرانی کے جوہر خوب جانتا تھا۔ اُس نے اپنی منظم پالیسیوں اور حکمت عملی سے ایران کو ایک عظیم معاشی قوت بنا لیا اور انتظامی طور پر اس کی تقسیم یوں کی کہ جس کی وجہ سے اس عظیم الشان سلطنت کو بڑی آسانی کے ساتھ کنٹرول کیا جا سکتا تھا۔ دارا اول نے تیس سال حکومت کی اور 480 قبل مسیح میں اس کا انتقال ہوا۔ جس کے بعد ایران کے اُس حکمران نے تاج و تخت سنبھالا جسے تاریخ میں شہنشاہِ زرکسیز کے نام سے جانا جاتا ہے ایرانی اقوام اسے خشیارشیا کہتے ہیں۔

شہنشاہ زرکسیز کو ورثے میں ایک مضبوط، منظم اور معاشی و عسکری لحاظ سے طاقتور سلطنت ملی تھی جو بیس منظم اور وسیع و عریض صوبوں پر مشتمل تھی۔ ان صوبوں سے مرکزی حکومت کو کثیر رقم اور افرادی قوت حاصل ہوتی تھی جس کی وجہ سے ایران کے خزانے اور فوجی

چھاؤنیاں مضبوط اور طاقتور تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہخامنشی سلطنت اسی طاقتور فوج اور بے پناہ دولت کے سہارے کھڑی تھی تو بیجانہ ہو گا کیونکہ ہخامنشیوں کی سلطنت بہر حال آمرانہ ملوکیت پر قائم تھی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت اور قانونِ قدرت ہے کہ ہر عروج کا ایک زوال ہوتا ہے۔ ہخامنشی سلطنت بھی اپنے عروج کی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور دنیا کے دیگر خطوں میں قائم کوئی بھی سلطنت یا ریاست اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ وسط ایشیاء، ایشیائے کوچک، مشرقِ وسطیٰ بشمول بابل کی کلدانی سلطنت، شمالی ایران کے علاقے مازندران، گیلان، ایلان، البرز اور دماوند جبکہ قدرے مشرق ایرانی علاقے بشمول کرمان سائرس نے فتح کر کے پارس کی حکومت میں شامل کر دیے تھے جبکہ افریقی ممالک بشمول مصر کمبی سس نے فتح کر کے ہخامنشی سلطنت کو افریقہ تک وسعت دی تھی۔ اسی طرح باقی ماندہ ایشیاء کو ہندوستانی اور چینی سرحدات کے ساتھ دارا اول نے منسلک کر کے تاریخ کی سب سے بڑی سلطنت قائم کی۔ زرکسیز کے لیے ناموری اور شہرت حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ اور راستہ نہ تھا جبکہ اُس سے پہلے کے تینوں حکمرانوں نے تاریخی شہرت اور ناموری حاصل کی تھی۔ زرکسیز ناموری میں اُن سے بھی آگے نکلنے کا خواہشمند تھا۔ لہٰذا اُس نے یورپ کو فتح کرنے اور اُسے ہخامنشی سلطنت میں شامل کرنے کا مصمم ارادہ کیا۔ یورپ اُس وقت کئی آزاد اور خود مختار ریاستوں میں منقسم تھا جن کے مابین ہمیشہ تصادم اور خانہ جنگیاں ہوتی رہتی تھی۔ زرکسیز نے یورپ کی اسی انارکیت اور کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اپنی پوری سلطنت سے فوج اکٹھا کرنے کا فرمان شاہی جاری کیا۔ لہٰذا مور و ملخ کی طرح لوگوں کے جمِ غفیر مرکز میں جمع ہونے لگی۔ اس فوج کی تعداد چند ہی ماہ میں لاکھوں تک پہنچ گئی۔ ہیروڈوٹس نے شاید بہت ہی مبالغہ سے اس فوج کی تعداد رقم کی ہے جو اُن کے بیان کے مطابق باون لاکھ سے

بھی زیادہ یعنی 52,83,220 تھی (ہیروڈوٹس 2001:508-11) جبکہ باقاعدہ فوج کی تعداد جو مکمل تربیت یافتہ تھی سترہ سے اٹھارہ لاکھ کے مابین تھی۔ (ہیروڈوٹس 2001:508-11) اس فوج کا نقشہ ہیروڈوٹس کے علاوہ ابوالقاسم فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں بھی بڑے ہی خوبصورت اشعار میں بیان کیا ہے۔ جبکہ وہ مورخین جو ایران کی قدیم تاریخ لکھتے ہیں وہ بھی زرکسیز کی ان فوجی تیاریوں اور لاتعداد لشکروں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ذیل میں ہیروڈوٹس کے بیان کردہ لشکروں اور اُن اقوام و قبائل کا تذکرہ کیا جارہا ہے جنہوں نے یورپ پر حملوں اور تھرماپائلے کی مشہور جنگ میں حصہ لیا جو 481 قبل مسیح میں لڑی گئی تھی۔

"اس مہم میں درج ذیل اقوام نے حصہ لیا۔ فارسی، جو سر پہ مکٹ پہنے ہوئے تھے اور ان کے جسموں پر مختلف رنگوں کی بازوؤں والی عبائیں تھیں جن پر لوہے کے کھپرے تھے جیسے مچھلیوں کے ہوتے ہیں۔ ان کی ٹانگوں پر پائجامے تھے اور انہوں نے بچاؤ کیلئے بید کی ڈھالیں اُٹھار کھی تھیں۔ ان کے ترکش کمروں پہ لٹک رہے تھے اور ہتھیاروں میں ایک چھوٹا نیزہ، ایک غیر معمولی سائز کی کمان اور نرسل کے تیر شامل تھے۔ اسی طرح ان کے دائیں ران پر خنجر بندھے ہوئے تھے۔ زرکسیز کا سُسر اوٹینس ان کا سربراہ تھا۔ میدیوں کے حالات حرب بھی بالکل فارسیوں جیسے تھے اور درحقیقت دونوں کا مشترکہ لباس فارسی سے زیادہ میدیائی تھا۔ ان کا سربراہ اکیمینی (ہخامنشی) نسل کا تگریس تھا۔ اہلِ شسیا فارسیوں کے انداز میں مسلح تھے ماسوائے ایک لحاظ سے۔ انہوں نے اپنے سروں پر مکٹ (ہیٹ یا کلاہ) کی بجائے کپڑے باندھ رکھے تھے۔ انافینس ابنِ اوٹینس ان کی قیادت کر رہا تھا۔ اسی طرح ہیرکانی (البرز اور بحیرہ کیسپیئن کے گرد) بھی فارسیوں کے انداز میں مسلح تھے۔ ان کا رہنما وہی میگاپانس تھا جو بعد میں بابل کا صوبہ دار بنا۔ آشوری اپنے سروں پر خود (ہیلمٹ) پہن کر جنگ کرنے گئے وہ پیتل کے بنے ہوئے تھے، اور ان کی ساخت ایسی تھی کہ جسے بیان کرنا آسان نہیں۔ انہوں نے ڈھالیں، نیزے کٹاریں اُٹھار کھی تھیں

جو کافی حد تک مصریوں جیسی تھیں، علاوہ ازیں ان کے پاس لکڑی کے ڈنڈے بھی تھے جو لوہے اور لینن کے زرہوں سے بندھے ہوئے تھے۔ جن لوگوں کو یونانی سیریائی کہتے ہیں وہ بربروں کیلئے آشوری ہیں۔ کالدیوں کا سالار اوتاسپس ابنِ ارتاگینس تھا۔ باکتری کسی حد تک میدیوں سے ملتا جلتا سر کا لباس پہن کر جنگ کرنے گئے لیکن انہوں نے اپنے ملکی دستور کے مطابق بید کی کمانیں اور چھوٹے بھالے اُٹھا رکھے تھے۔ سکائے یا سیتیوں (یہ سیستان کے ساکا قبائل تھے گمان کہتا ہے کہ ان میں صحرائے بلوچستان کے باشندے شامل تھے جو بلاشبہ بلوچوں کا مشہور قبیلہ ماسنی، سنجری (سنجرانی) اور ساکا زئی ساجدیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مصنف) نے ٹراؤزر پہن رکھے تھے اور ان کے سروں پر اونچی سخت نوکدار ٹوپیاں تھیں۔ انہوں نے اپنے ملک کی کمان اور کٹار اُٹھا رکھی تھیں: اس کے علاوہ ان کے پاس جنگی کلہاڑا بھی تھا۔ داریوش اور بنت سائرس اینوسا کا بیٹا ہتساسپس ان کا سالار تھا۔ ہندوستانیوں نے سوتی لباس پہنے ہوئے تھے اور ان کے پاس بید کی کمانیں اور بید کے ہی تیر تھے جن کی انیاں لوہے کی تھیں۔ یہ تھے ہندوستانیوں کے اوزار، اور وہ ارتاباتیس کے بیٹے فرنازاتھریس کی زیرِ قیادت تھے۔ آریاؤں نے میدیائی کمانیں اُٹھا رکھی تھیں، لیکن باقی تمام حوالوں سے باکتریوں کی طرح مسلح تھے۔ ہائیڈارنیس کا بیٹا سیسامنیز اُن کا سالار تھا۔ پارتھیوں، کوراسمیوں، سغدیوں، گنداریوں اور دادیکے کے پاس بالکل باکتریوں والے ہتھیار تھے۔ پارتھیوں اور کوراسمیوں کا سالار ارتابازس ابنِ فارناسیز تھا، سغدیوں کا ازانیس ابنِ ارتیئس اور گنداریوں اور دادیکے کا ارتیفیئس ابنِ ارتابانس۔ کاسپیوں نے چمڑے کی عبائیں پہنی ہوئی تھیں اور وہ بید کی کمان اور چھوٹی تلواروں سے لیس تھے۔ وہ ان ہتھیاروں کے ساتھ ارتی فیئس کے بھائی آریومار دس کی سرکردگی میں جنگ کرنے گئے سرانگیوں (یا زرنجیوں۔ سیستان کا قدیم بلوچ قبیلہ۔ سیستان کے دارلخلافہ زرنج کی وجہ سے تاریخ میں زرنگی اور زرنجی کے نام سے معروف ہوئے۔ مصنف) کے لباس تیز رنگوں کے تھے اور ہاف بوٹ گھٹنوں تک پہنچتے تھے: انہوں نے میدیائی کمانیں اور بھالے اُٹھائے

ہوئے تھے۔ فیر انداتیس ابنِ میگابازس اُن کا سالار تھا۔ پاکتیوں (پکتیکا کے پشتون قبائل) کے جبے چمڑے کے تھے اور ان کے پاس اپنے ملک کی کمانیں اور کٹاریں تھیں ان کی قیادت ارتینیتس ابنِ اتھاماتریس کر رہا تھا۔ یوتی، (مکران کا ہوت بلوچ قبیلہ) مائشی (مامشئ بلوچ قبیلہ) اور پیریکانی (پرکانی بلوچ قبیلہ) سب پاکتیوں کی طرح مسلح تھے۔ پہلے دو کا قائد ارسامینیس ابنِ داریوش تھا، جبکہ آخری کا سیر ومیتریس ابنِ اوبازس تھا۔ عربوں نے ایک لمبی عباء زیرہ (Zeira) پہنی ہوئی تھی اور اسے کمر سے باندھ رکھا تھا، انہوں نے اپنے دائیں طرف لمبی کمانیں اُٹھار کھی تھیں جن کی تانت اتار کر پیچھے کی طرف موڑا جا سکتا تھا۔ ایتھوپیائی لوگوں نے چیتوں اور شیروں کی کھالیں اوڑھ رکھی تھیں اور ان کی کم از کم چار کیوبٹ لمبی کمانیں کھجور کے پتے کے ڈنٹھل سے بنی ہوئی تھیں۔ ان کے ایک قسم کے نرسل سے بنے ہوئے چھوٹے تیروں کی انیوں پر لوہے کی بجائے عقیق کا ایک تیز دھار ٹکڑا لگا ہوا تھا۔ جیسا مہروں پر الفاظ کندہ کرنے کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کے نیزوں کی انیاں بارہ سنگھے کے تیز کئے ہوئے سینگوں سے بنی تھیں۔ انہوں نے جنگ میں جاتے وقت اپنے جسموں کو چاک اور قرمز سے رنگ لیا۔ عربوں اور مصر کے بالائی خطے سے آئے ہوئے ایتھوپیاؤں کا سالار داریوش اور آرتی ستونے (بنت سائرس) کا بیٹا ارسامیس تھا۔ یہ آرتی ستونے داریوش کی عزیز ترین بیوی تھی اور اُس نے اِسی کا مجسمہ ہتھوڑے سے کوٹے ہوئے سونے سے بنوایا تھا۔ آرتی ستونے کا بیٹا ارسامیس ان دونوں اقوام کا قائد تھا۔ مشرقی ایتھوپیائی (جھلاوان کے براہوئی قبائل) کیونکہ فوج میں اس نام کی دو اقوام تھیں جو ہندوستانیوں کے ساتھ صف بند تھے۔ وہ اپنی زبان اور بالوں کی خصوصیت کے سوا اور کسی بات میں دیگر ایتھوپیاؤں سے تفاوت نہ رکھتے تھے۔ کیونکہ مشرقی ایتھوپیاؤں کے بال لمبے تھے، جبکہ لیبیا (افریقہ) والوں کے بال ساری دنیا کے لوگوں سے زیادہ گھنگھریالے تھے۔ ان کے ہتھیار بیشتر اعتبار سے ہندوستانیوں جیسے تھے، لیکن انہوں نے اپنے سروں پر گھوڑوں کی کھوپڑیاں بمع کانوں اور عیال کے پہن رکھی تھیں، کانوں کو اکڑا کر کھڑا کیا گیا

تھا، اور ایال کلغی کا کام دیتی تھی۔ یہ لوگ ڈھالوں کی جگہ پر سارس کی کھالیں استعمال کرتے تھے۔ لیبیاؤں نے چمڑے کا لباس پہنا ہوا تھا اور ان کے پاس آگ میں تپائی ہوئی برچھیاں تھیں۔ میسا گز (میساجز) ابنِ اوریزس اُن کا سالار تھا۔ پفلاگونی سروں پر چینٹدار خود پہن کر اور چھوٹی ڈھالیں و نیزے اُٹھا کر جنگ کرنے گئے۔ ان کے پاس برچھیاں اور خنجر بھی تھے، اور پاؤں میں ان کے ملک کے ہاف بوٹ تھے، جو پنڈلیوں کے درمیان تک اونچے تھے۔ لگیانی، متیانی، ماریاندینی اور سیریائی (کیپادوشی بقول اہلِ فارس) بھی اِس انداز میں مسلح تھے۔ پفلاگونی اور متیانی دوتس ابنِ میگاسیڈرس کی زیرِ قیادت تھے، جبکہ مریاندینی، لگیانی اور سیریاؤں کا سالار گوبریاس ابنِ داریوش و آرت ستونے تھا۔ فریجیاؤں کا لباس کافی حد تک پفلاگونیوں جیسا تھا، ماسوائے چند ایک اختلافات کے۔ مقدونیوں کے بیان کے مطابق جس دور میں فریجیائی یورپ میں سکونت پذیر تھے اور ان کے ساتھ مقدونیہ میں رہا کرتے تھے تو ان کا نام بریگیانی تھا، لیکن ایشیاء منتقل ہونے پر انہوں نے اپنا نام بدل لیا۔ فریجیاؤں کے آبادکار آرمینی فریجیاؤں کے انداز میں مسلح تھے۔ دونوں اقوام آرتوشمیز کی زیرِ قیادت تھیں جس کی شادی داریوش کی ایک بیٹی سے ہوئی تھی۔ لیڈیاؤں کے مسلح ہونے کا انداز بہت حد تک یونانیوں جیسا تھا۔ قدیم وقتوں میں یہ لیڈیائی میدونیائی کہلاتے تھے، لیکن انہوں نے اپنا نام تبدیل کیا اور اتیس (اتیس) کے بیٹے لیڈس کی نسبت سے لیڈیائی کہلانے لگے۔ ماشیوں نے سر پہ اپنے ملک کے مخصوص خود پہن رکھے تھے اور چھوٹی ڈھالیں بھی اُٹھائی ہوئی تھیں، انہوں نے اپنے برچھیوں کے سرے آگ میں تپا کر سخت کئے ہوئے تھے۔ ماشی لیڈیائی آبادکار ہیں اور اولمپس سلسلہ کوہ کی نسبت سے اولمپیائی کہلاتے ہیں۔ لیڈیاؤں اور ماشیوں دونوں کا سالار ارتافرنیس ابنِ ارتافرنیس تھا۔ تھریسی لوگ اپنے سروں پر لومڑوں کی کھالیں اور جسموں پر عبائیں پہن کر جنگ کرنے گئے، عباؤں کے اوپر کئی رنگوں کے لمبے جبے تھے۔ ان کی ٹانگیں اور پاؤں ہرن کی کھال سے بنائے گئے ہاف بوٹوں میں ملبوس تھے، ان کے اسلحہ میں برچھیاں اور کمانی دار چاقو

شامل تھے۔ ان لوگوں نے ایشیاء میں جانے کے بعد بتھینیوں کا نام اختیار کرلیا، قبل ازیں جب وہ سٹرانمون پر رہتے تھے تو انہیں سٹرانمونی کہا جاتا تھا۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق وہاں سے انہیں ماشیوں اور ٹیوکریوں نے بیدخل کیا۔ ان ایشیائی تھریسیوں کا سالار باساسیس ابنِ ارتابانس تھا۔ کالیبیائی بیل کے پہلو سے بنی ہوئی ڈھالیں اور لومڑ کے شکار میں استعمال ہونے والی قسم کی دو برچھیاں اُٹھائے ہوئے تھے۔ اُن کے سروں پر پیتل کے خود تھے اور اِن سے اوپر بیل کے سینگوں اور کانوں جیسے پیتل کے سینگ اور کان تھے۔ اُن کی ٹانگوں پر قرمزی رنگ کی پٹیاں تھیں۔ ان کے ملک میں اریس کا ایک دارالاستخارہ ہے۔ قبالیوں کے پاس بھی سلیشیاؤں جیسے ہتھیار تھے۔ قبالی اصل میں میونیائی ہیں، لیکن لاسونیائی کہلاتے ہیں۔ مِلائیوں نے چھوٹے نیزے اُٹھائے ہوئے تھے اور اُن کا لباس بکلوں سے بندھا ہوا تھا۔ اُن میں سے کچھ کے پاس لائشی کمانیں تھیں۔ انہوں نے سر پہ چمڑے کی ٹوپیاں چڑھا رکھی تھیں۔ بادریس ابنِ ہستانیس اِن دونوں اقوام کا سالار تھا۔ موشیاؤں نے لکڑی کے خود پہنے ہوئے تھے اور چھوٹے سائز کی ڈھالیں اور نیزے اُٹھا رکھے تھے: تاہم نیزوں کی نوک طویل تھی۔ اُن کے ہتھیار تیسارینیوں، میکرونیوں (باشندگان مکران) اور موسینوشیوں (ممکن ہے بلوچ قبیلہ موسیانی یا مسنی کے اجداد ہوں بہرحال قدیم بلوچستان کے صحرائی باشندے تھے۔ مصنف) کے ہتھیاروں سے ملتے جلتے تھے۔ اِن اقوام کے قائدین حسب ذیل تھے: موشیائی اور تیساریني آریومار دس کی زیرِ قیادت تھے جو داریوش اور پارمس بنتِ سمیر دیس ابنِ سائرس کا بیٹا تھا، جبکہ میکرونیوں اور موسینوشیوں کا سربراہ ارتائی کنیز تھا جو ہیلس پونٹ پر سیستوس کے حاکم کیر اِمس کا بیٹا تھا۔ مریس (قبیلہ مری۔ یونانی مصنف نے لفظ مری کو جمع کے طور پر تحریر کیا ہے) نے سر پہ اپنے ملک کا مخصوص خود پہنا ہوا تھا اور چھوٹے چمڑے کی ڈھالیں اور برچھیاں استعمال کرتے تھے۔ کولچیوں (مشہور بلوچ قبیلہ کولاچی) کے سر پر لکڑی کے خود اور ہاتھوں میں خام کھال کی چھوٹی ڈھالیں اور مخصوص نیزے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے پاس تلواریں بھی تھیں۔ ماریس اور

کولچیوں دونوں کی قیادت فیرانداتس ابنِ تیاسپس کر رہا تھا۔ الرودین (قبیلہ رودینی) اور ساسپیری (سرپرہ بلوچ قبیلہ) کولچیوں کے انداز میں مسلح تھے، اُن کا رہنما ماستیسز ابنِ سیرومتراس تھا۔ ایریتھریئن (بحیرہ بلوچ۔ یاہوتوں کا سمندر ساحل مکران وبیلہ۔ مصنف) سمندر سے آئے ہوئے جزیروں کے باسیوں کے پاس قریباً قریباً میدیوں جیسا لباس اور اسلحہ تھا۔ وہ اُن جزائر میں رہتے تھے جہاں بادشاہ کے حکم پر وطن بدر کئے گئے افراد کو بھیجا جاتا تھا۔ اُن کا رہنما ماردونیتس ابنِ باگیاس تھا جو اگلے سال ایک جہاز کی کپتانی کرتے ہوئے مائیکالے کی جنگ میں مارا گیا" (ہیروڈوٹس 2001:508-11)۔

فوج کی تقسیم اور اس کے مختلف افسران کے بارے میں ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ،

"یہ تھا بری فوج میں شامل اقوام کا بیان، اِن کے سالاروں کے نام بھی اوپر دے دیئے گئے ہیں۔ ان کے ذمہ دستوں کی قیادت اور گنتی کرنے کا کام تھا، اور انہوں نے ایک ہزار اور دس ہزار افراد پر قائدین تعینات کئے، لیکن دس اور ایک سو افراد کے قائدین دس ہزار قائدین نے نامزد کئے۔ دیگر افسران بھی تھے جو مختلف عہدوں پر اور اقوام کو احکامات جاری کرتے، لیکن اوپر مذکورہ افسران سالار تھے۔ خود اِن سالاروں اور ساری بری فوج کے اوپر چھ سپہ سالار تھے۔ یعنی ماردونیئس ابنِ گوبریاس، تریتانتے شمیز ابنِ ارتابانس (جس نے یونان پر چڑھائی نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا) سمیر دومینیس ابنِ اوٹینس۔ یہ دونوں داریوش کے بھتیجے اور زرکسیز کے چچازاد تھے۔ ماستیز ابنِ داریوش وایٹوسا، گرجس ابنِ آریزس، اور میگابازس ابنِ زوپائرس" (ہیروڈوٹس 2001:511)۔

اس طویل فہرست میں بابائے تاریخ ہیروڈوٹس نے اڑھائی ہزار سال قبل کی ایک عظیم شہنشائیت میں لاتعداد ایشیائی اور افریقی قبائل کا تذکرہ کیا ہے۔ اس طویل فہرست میں بلوچ قوم کے کئی قبائل بھی شامل ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں سے اکثر قبائل اب بھی اپنے انہی قدیم ناموں سے وجود رکھتے ہیں۔ یونانی مورخ نے اپنے لسانی لہجے میں ان قبائل کے نام تحریر کیے ہیں جن کی وجہ

سے عام قاری کو انہیں سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ علاوہ ازیں یونانی مورخ نے اکثر قبائل کے نام جمع کے صیغے میں استعمال کیے ہیں جس کی وجہ سے قاری کی مشکلات میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً جب مکران کے مغربی حصے کے حاکم قبیلہ کو جمع کے صیغے اور اپنے لسانی لہجے میں یوتیئن (Utian) تحریر کرتا ہے تو کسی عام قاری یا تاریخ کے طالبعلم کے لیے یہ سمجھنا اور یقین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ دراصل مکران کے قدیم ہوت قبیلہ کا یونانی لب ولہجہ میں ادا کردہ اور تحریر کردہ نام ہے۔ اسی طرح مری قبیلہ کو مریز یا ماریس، مید کو میڈین، رودینی کو الرودین، باشند گان مکران کو میکرونین اور دیگر لاتعداد بلوچ قبائل کے ناموں کو یونانی مورخ نے جمع کے صیغہ میں استعمال کیا ہے۔ جن کو سمجھنے اور حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ نہ صرف قدیم بلوچ قبائل، جغرافیہ، موجودہ بلوچ قبائل اور اُن کے جغرافیائی حدود کے بارے میں آگاہی اور مکمل معلومات ہونی چاہیے بلکہ قدیم دور کی حکومتوں کے بارے میں بھی مکمل معلومات رکھنا اشد ضروری ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ صرف انگریزی یا اردو میں لکھی ہوئی جدید کتب کا مطالعہ نہ کیا جائے بلکہ اُن کتب کا بھی مطالعہ ضروری ہے جو ماضی وسطیٰ اور ماضی قدیم میں لکھی گئی ہیں اور جو یونانی، عربی اور فارسی زبانوں میں تحریر شدہ ہیں۔ اس طرح مماثلتی مطالعہ میں بھی آسانی ہوگی اور حقیقت کی تلاش بھی آسان ہوگی۔

بابائے تاریخ ہیروڈوٹس کے بیان کردہ ان قبائل کو بلوچ تسلیم کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جن حدود میں انہوں نے اُن قبائل کا تذکرہ کیا ہے جو بلوچ سٹاک پر مشتمل ہیں اور جس واقعہ سے متعلق اُن کا تذکرہ کیا ہے تو غزنوی دربار کے مشہور و معروف شاعر اور شاہنامہ فردوسی کے خالق ابوالقاسم فردوسی بعینیہہ اسی واقعہ میں انہی حدود میں آباد اور شہنشاہ زرکسیز کی مدد کرنے والے قبائل کو کوچ و بلوچ تحریر کرتا ہے اور اُن کے عظیم لشکروں کا تذکرہ کرتا ہے اور

ساتھ ہی ان کے قبائلی و علاقائی ناموں سے بھی انہیں یاد کرتا ہے۔ جیسا کہ تھرماپائلے کی اس جنگ میں شامل لشکروں کا تذکرہ کرتے ہوئے فردوسی کہتا ہے کہ:

ستایش همی کردبر کردگار

که ای برتر از گردش روزگار

تو دادی مرافرّوفرهنگ ورای

تو باشی بهر نیکیئی رهنمای

هر آن کس که یابد زمن آگهی

ازین پس نجوید کلاه مهی

همه کهتری رابسازند کار

ندارد کسی زهرهٔ کارزار

بکوه اندرون مرغ وماهی بر آب

چو من خفته باشم نجویند خواب

همه دام وددپاسبان منند

مهان جهان کهتران منند

کرابر گزینی تو او خوار نیست

جهان راجز از تو جهاندار نیست

تو نیرو دهی تا مگر در جهان

نخسبد زمن مور خسته روان

چنین پیش یزدان فراوان گریست

نگر تا چنین در جهان شاه کیست

بتخت آمد از جایگاه نماز

زگرگان برفتن گرفتند ساز

بر آمد خروشیدن گاودم

زدرگاه آواز روینه خم
سپه برنشست وبنه برنهاد
زیزدان نیکی دهش کردباد
زدینارودیباو تاج و کمر
زگنج درم هم زدروگهر
زاسبان و پوشیدرویان تاج
دگرمهد پیروزه و تخت عاج
نشستند برزین پرستندگان
بت آرای وهرگونه ای بندگان
فرستاد یکسر سوی طیسفون
شبستان چینی بپیش اندرون
بفرخنده فال و بروز آسمان
برفتند گرداندرش خادمان
سرموبدان بودمهران ستاد
بشدباشبستان خاقان نژاد
سوی طیسفون رفت گنج وبنه
سپاهی نماندازیلان یک تنه
همه ویژه گردان آزادگان
بیامد سوی آذر آبادگان
سپاهی بیامد زهر کشوری
زگیلان و زدیلمان لشکری
زکوه بلوچ وزدشت سروچ
گرازان برفتندگردان کوچ

همه پاک باهدیه و باثار
بپیش سراپردهٔ شهریار
بدان شهر شد شهر یار بزرگ
که ازمیش کوته کند چنگ گرگ
بفرّ جهاندار کسری سپهر
دگر گونه تر شد بکین وبمهر
بشهری کجا برگذشتی سپاه
نیاز اردزان کشتمندی براه
نجستی کسی ازکسی نان وآب
بره بربیا راستی جای خواب
بریشان همی گردگیتی بگشت
نگه کردهرجای هامون ودشت
جهان دید یکسر پراز کشتمند
درودشت پرگاووپر گوسفند
زمینی که آباد هرگزنبود
بروبر ندید ند کشت و درود
نگه کردکسری برومند یافت
بهرخانه ای چندفرزندیافت
خمیده سرازبارشاخ درخت
بفر جهاندار بیدار بخت

(فردوسی۔شاہنامہ نسخہ مسکو۔ماسکوروس:456)

جس طرح اس واقعہ اور خونریز جنگ میں ہیروڈوٹس نے ایران کی لاتعداد لشکروں کی تفصیلات بیان کی ہیں بالکل اسی طرح ابوالقاسم فردوسی اس جنگ میں شہنشاہ ایران کی عظیم جنگی تیاریوں اور لاتعداد لشکروں کا تذکرہ منظوم انداز میں کر رہا ہے۔ جس سے اس بات کی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ شہنشاہ ایران نے صرف آریائی اقوام ہی نہیں بلکہ اپنی وسیع و عریض سلطنت میں آباد تمام اقوام کی مدد سے یورپ پر حملہ کیا تھا۔ مورخین کی مہربانی اور دانشمندی سے ان قبائل و اقوام کے تذکرے تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہوگئے۔ یقیناً ہیروڈوٹس کے علاوہ بھی کئی قدیم مورخین نے ان اقوام اور علاقوں کے بارے میں معلومات محفوظ کی ہوں گی مگر وہ شاید انقلابات زمانہ اور حملہ آوروں کی تباہ کاریوں کی نذر ہوگئے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ ہیروڈوٹس اور ایرین جیسے مورخین کی کتب محفوظ ہیں جن میں ان قدیم واقعات اور قبائل کے تذکرے تفصیلات کے ساتھ ملتی ہیں اور اس بات پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں کہ یہی وہ قدیم قبائل ہیں جو بلوچستان کے اولین ثقافت اور قدیم باشندوں کے نمائندے ہیں۔ فردوسی جیسے عالم نے ہیروڈوٹس کے بیانات کی تصدیق کر کے گویا اس دعوے کو حقیقت میں بدل دیا کہ بلوچ قبائل اس وسیع و عریض خطے میں زمانہ قبل از آرین زمانے سے آباد ہیں اور بلوچستان کی قدیم ثقافت کے حقیقی نمائندے ہیں۔ اس سے قبل راقم الحروف نے اپنی کتاب "بلوچ اور اُن کا وطن" میں بھی ہیروڈوٹس اور ابوالقاسم فردوسی کی عظیم الشان اور شہرت یافتہ مستند تحریروں کی بنیاد پر یہی مفروضہ قائم کیا تھا کہ بلوچ اس خطے کے اصل اور قدیم باشندے ہیں۔ اب ان تاریخی تحریروں کے مزید عمیق و دقیق مطالعہ کرنے اور کئی دیگر قدیم کتب کی ورق گردانی کے بعد راقم الحروف اپنے پرانے اور پہلے سے ہی قائم کردہ مفروضہ کا اعادہ کرتے ہوئے یہی لکھتا ہے کہ بلوچ قبائل تاریخی دور کے آغاز سے بھی قبل اسی خطے میں منظم اور مربوط طرز زندگی گزار رہے تھے جب کہ ابھی تک آرین کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا اور نہ

ہی سامی اقوام منظر عام پر آئے تھے۔ تاریخی کتب میں دور قدیم میں جس طرح اُن کے جمِ غفیر کا تذکرہ ملتا ہے تو اس سے ہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ قوم ایک وسیع و عریض علاقے میں پھیلی ہوئی تھی اور لاتعداد قبائل پر مشتمل تھی۔ جو اپنے وسیع و عریض خطے میں کئی مراکز بنا کر رہتی تھی۔ ان کے قدیم مراکز میں دماوند (کوہِ البرز) سیستان (ہیلمند و نیمروز) مکران و بیلہ، توران (خضدار) قلات وغیرہ شامل تھے۔ تاریخی ادوار میں بھی ان قبائل کے کارنامے تاریخی کتب میں مرقوم ہیں ضرورت صرف انہیں تلاش کرنے اور ترتیب دینے کی ہے۔ ان بیانات کے مطابق تاریخ کے کسی بھی دور میں بلوچ قبائل کا منظم سلسلہ یا مرکزیت ختم نہیں ہوئی البتہ معمولی تعطل ضرور آیا اور زیادہ سے زیادہ مرکز کی تبدیلی عمل میں آئی۔

ہیروڈوٹس اور فردوسی سمیت کئی دیگر مستند مورخین کے بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ بلوچ قبائل قدیم پیشدادی، میدی اور ہخامنشی ادوار سمیت ایشیاء پر راج کرنے والے ہر خاندان کی حکومت میں اپنا کلیدی کردار ادا کرتے رہے ہیں اور دربار شاہی میں اکثر ان صحرائی اور پہاڑی قبائل کے فیصلوں اور آرا کو اہمیت دی جاتی تھی۔ شاہنامہ فردوسی میں ابوالقاسم فردوسی میدی لشکر میں بلوچوں کی نمایاں حیثیت کو اُجاگر کرتے ہوئے اُن کی تعریف و ثنا میں یوں قصیدہ گوئی کرتا ہے:

سپاهش زگردان کوچ و بلوچ
سگالیده جنگندو بر آورده خوچ
کسی در جهان پشت ایشان ندید
برهنه یک انگشت ایشان ندید
درفشی بر آورده پیکر پلنگ
همی ازدرفش بیارید جنگ

(فردوسی، شاہنامہ نسخہ مسکو۔ ماسکو روس: 125)

یہ مستند قدیم تاریخی کتب اس دعویٰ کے حقیقت کی مزید تصدیق کرتے ہیں کہ بلوچ باہر سے آمدہ اقوام کی باقیات نہیں بلکہ اس خطے کے قدیم اقوام میں سے ایک ہے جو قبل از آرین دور سے لے کر تاحال خطے کی سیاست میں بھرپور کردار ادا کر رہی ہے۔ دورِ حاضرہ میں اس قوم کے نمائندے تین ممالک میں نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں اور عوامی نمائندوں کی حیثیت سے ان ممالک کے با اختیار اداروں میں کردار ادا کر رہے ہیں۔ پاکستان، افغانستان اور ایران کی اسمبلیوں میں اس قوم کے نمائندے موجود ہیں اور ان ممالک کی قانون سازی میں اپنا بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان ممالک کی نمائندہ اسمبلیوں میں بیٹھنے سے ہی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس خطے کی ماضی کی سیاست سے لے کر دورِ حاضرہ تک اس قوم کا کردار اور اس کی نمائندگی اس خطے میں مسلّم رہی ہے۔ اور ساتھ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان قبائل کا خطہ عظیم بھی ماضی کی شہنشائیتوں اور سلطنتوں کے عروج وزوال میں اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔

میدی سلطنت اُن قبائل کی قائم کردہ تھی جو بلوچ سٹاک اور قبل از آرین اقوام پر مشتمل تھے جن میں مید، کُرد، لوری (لوڑی)، ڈایہ، دابانی (دھبانی کرد) وغیرہ شامل تھے۔ ان قبائل کے کردار کا تذکرہ ہیروڈوٹس سمیت وہ تمام مورخین کرتے ہیں جو قدیم ایران کی تاریخ تحریر کرتے ہیں۔ لہٰذا جب آرین قبیلہ ہخامنشی نے خطے میں طاقت حاصل کی اور میدی سلطنت کے خاتمے کے درپے ہوا تو انہی قبائل نے ہخامنشی آرین قبیلہ کی بغاوت میں اُس کا ساتھ دیا اور میدی سلطنت کے خاتمے کا سبب بنے۔ ہخامنشی سلطنت کے قیام میں تو ان قبائل کا بھرپور کردار رہا مگر بہت جلد مید اور ہوت قبیلہ نے اتحاد کرکے ہخامنشیوں کے خلاف بغاوت کردی اور میدی سلطنت کے دوبارہ قیام کے لیے سرگرم ہوگئے مگر تیسرے ہخامنشی حاکم ”دارا اول“ نے بالآخر ایک زبردست اور خونریز جنگ کے بعد مکران میں ہونے والی اس جنگ میں مید اور ہوت قبیلہ کی

بغاوت کو نہ صرف کچل دیا بلکہ مکران سمیت بیلہ اور جھلاوان پر بھی ایرانی اقوام قابض ہو گئے اور بلاشبہ بلوچستان کے راستوں سے ہی ایرانی افواج دریائے سندھ اور پنجاب کے حدود تک پہنچ گئے تھے۔ زرکسیز کے برسرِ اقتدار آنے تک یہ تمام قبائل پُرامن ہو کر ہخامنشی شہنشاہ کے جھنڈے تلے متحد ہو چکے تھے۔ لہٰذا ہخامنشیوں نے اپنی لاتعداد فوج میں ان قبائل کو بنیادی اور مرکزی حیثیت دی تھی۔ اسی لیے شاہنامہ فردوسی ان قبائل کو ان کے قومی نام سے مخاطب کر کے ان کے فوجی کردار اور کارناموں کا تذکرہ کرتا ہے اور ساتھ ہی ان کے کئی قومی و قبائلی رہنماؤں کا بھی تذکرہ کرتا ہے جنہوں نے ہخامنشی حکومت کو مضبوط بنیاد فراہم کی۔

زرکسیز کے دور میں یونان (یورپ) کے ساتھ ہخامنشیوں کی جھڑپیں اور جنگیں شروع ہوئیں۔ ابتدا میں تو آریائی ہخامنشیوں کو زبردست کامیابیاں ملیں اور ان کی سلطنت ایشیاء، افریقہ اور یورپ تک پھیل گئی اور دنیا کی عظیم ترین قوت اور سلطنت بن گئی۔ مگر جیسا کہ قانونِ فطرت ہے کہ ہر عروج کا ایک زوال ہوتا ہے، ہخامنشی سلطنت بھی اپنی معراج پانے کے بعد بالآخر زوال کی جانب رواں ہو گئی۔ یونان کی جنگوں پر زرکسیز نے ملکی دولت کو پانی کی طرح بہایا اور یونان میں فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ فتوحات کے پرچم اڑاتا ہوا سلامس کے مقام پر پہنچا جہاں یونان کی فوجوں نے اسے شکست فاش دی اور شہنشاہ زرکسیز پسپا ہو کر ایران آیا۔ ایران پہنچ کر اُس نے سلامس کی جنگ میں شکست کا بدلہ لینے کے لیے یونانیوں کے خلاف نئے سرے سے جنگی تیاریاں کرنے کی بجائے خاموشی اختیار کر لی اور اپنی باقی ماندہ زندگی ایران میں عیش و عشرت میں گزارنے لگا 566 قبل مسیح میں اُس کو اس کے محافظ دستے کے سالار ''اردوان (Artabanus) '' نے قتل کر دیا۔ خشیارشا کے ساتھ ہی تخت کے اصل وارث اور خشیارشا کے بڑے بیٹے داریوش کو بھی اردوان نے قتل کر کے خشیارشا یعنی زرکسیز کے چھوٹے بیٹے ''اردشیر درازدست'' کو نیا حاکم مقرر کیا۔

اردشیر درازدست 425 قبل مسیح تک حاکمیت کرتا رہا مگر جس انداز میں اس نے تاج و تخت حاصل کیا تھا اسے ایران اور دیگر ممالک کے حکام، زعماء، سربراہان اور عوام نے قبول نہیں کیا جس کی وجہ سے ملک کے مختلف حصوں میں بغاوت شروع ہوگئی۔ یونانی مقبوضات ہاتھ سے نکل گئے اور وہاں متعین ایرانی فوج کو شکست فاش ہوئی۔ دوسری طرف اردشیر کا ایک اور بڑا بھائی اُس کی ناجائز حکمرانی کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا مگر اردشیر نے اُسے شکست دے کر اُس کی آواز اور دعوے کو ہمیشہ کے لیے دبا دیا۔ بدخشانی لکھتا ہے کہ:

"اردشیر کا ایک اور بڑا بھائی ویشتاسپ تھا جو بلخ کا حکمران تھا۔ تخت و تاج کا اصل حقدار یہی تھا۔ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اس نے اردشیر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اردشیر نے بغاوت فرو کرنے کے لیے لشکر بھیجا لیکن پہلی مرتبہ کامیابی نہ ہوسکی۔ آخر اردشیر خود لشکر لے کر آیا اور 466 قبل مسیح میں ویشتاسپ کو شکست دی۔ اس شکست کے بعد ویشتاسپ کا دعویٰ ختم ہوگیا، کیونکہ پھر کہیں اس کی آواز سنائی نہ دی" (بدخشانی 1967: 116-17)۔

یہی مصنف زرکسیز کی ناکام پالیسیوں کو ایران میں بغاوتوں کی وجہ قرار دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ:

"آل ماد کے عہد سے داریوش اعظم کے زمانے تک مملکت ایران میں لگاتار توسیع ہوتی رہی۔ صرف خشیارشا کے زمانے میں حکومت کی کمزوری کی وجہ سے ایران کے وقار کو ٹھیس لگی۔ اردشیر کا دور آیا تو مختلف علاقوں کے حکمرانوں کو، جو حکومت ایران کے اطاعت گزار تھے، خودسری اور خودمختاری کا خیال آیا۔ چنانچہ ایشیاء اور مصر میں پے در پے شورشیں رونما ہونے لگیں" (بدخشانی 1967: 117)۔

ان لگاتار شورشوں پر قابو پانا اردشیر کے بس سے باہر تھا لہٰذا ان کی زندگی کے آخری ایام تک ہخامنشی سلطنت بدترین انارکیت اور طوائف الملوکی کا شکار ہوچکی تھی۔ تقریباً تمام مقبوضات مرکز سے نکل چکے تھے اور مقامی امیر اور علاقائی حکمران آزاد اور خودمختار ہوچکے تھے۔

اردشیر دست دراز کے دور میں پورا ایران طوائف الملوکی کا شکار ہوا۔ اسی افراتفری میں اردشیر دست دراز کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا خشیارشا یعنی زرکسیز دوم حاکم بنا مگر وہ صرف ڈیڑھ ماہ حکومت کرنے کے بعد اپنے سوتیلے بھائی سغدیانو کے ہاتھوں مارا گیا۔ سغدیانو کی حاکمیت کو اہلِ ایران اور بالخصوص ہخامنشی زعمائے نے اس لیے قبول نہیں کیا کیونکہ اول تو اُس نے اپنے بھائی کا خونِ ناحق کیا تھا اور دوم یہ کہ وہ ایک لونڈی کے بطن سے تھا۔ لہٰذا اہل ایران اُس کے خلاف آوازیں اٹھانے لگے۔ اُس نے انہیں انعام و اکرام اور لالچ و رشوت سے منانے اور اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ سغدیانو کو بلخ کے حکمران اوکس سے خطرہ تھا اور اُسے ڈر تھا کہ عوام اُسے اپنا لیڈر مان کے اُس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے لہٰذا اُس نے اوکس کو اپنے دامِ فریب میں پھنسانا چاہا مگر ناکام رہا۔ بالآخر دونوں کے مابین ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں سغدیانو کو گرفتار کر لیا گیا اور اُسے بھائی کے قتل کے جرم میں گرم خاکستر میں دبا دیا گیا۔ اُس نے تقریباً ساڑھے چھ ماہ حکومت کی۔ یہ پے در پے واقعات اور سیاسی انتشار اس بات کا ثبوت تھے کہ اب ہخامنشی سلطنت تیزی کے ساتھ اپنے زوال کی جانب گامزن ہو چُکا ہے۔ سغدیانو کو قتل کر کے اوکس داریوش دوم کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

داریوش دوم انتہائی کمزور حکمران ثابت ہوا۔ حکومتی امور اُس کی چالاک اور سفاک بیوی پری ستی اور چند خواجہ سراؤں کے ہاتھ میں تھی جو تمام سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ داریوش دوم کے عہد میں پورے ملک میں بغاوتیں جاری رہیں جنہیں طاقت کی بجائے دولت کے ذریعے فرو کیا گیا البتہ داریوش اور اُس کی ظالم بیوی پری ستی اپنے دشمنوں پر قابو پانے کے بعد انہیں عبرت ناک سزائیں دیتے تھے۔ وہ اپنے دشمنوں کو گرم خاکستر میں دباتے تھے۔ اُس نے ایرانی سیاست میں یونانیوں کے عمل دخل کو کم کرنے کے لیے انہیں بھاری رقومات دیے۔ اس طرح

حیلوں اور دولت کے سہارے داریوش دوم 424 قبل مسیح سے لے کر 404 قبل مسیح تک تقریباً 20 سالوں تک حاکم رہا۔ اُس کے دو بیٹے تھے یعنی ارشک اور کوروش (سائرس)۔ ملکہ پری ستی کی خواہش تھی کہ داریوش کوروش کو ولی عہد نامزد کرے مگر زندگی میں پہلی مرتبہ بادشاہ نے اپنی چہیتی ملکہ کے حکم کو رد کر کے ارشک کو اپنا ولی عہد نامزد کیا۔ اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ کوروش نے باپ کی زندگی میں اُس کے خلاف بغاوت کی تھی اور اُسے ہٹا کر حاکمیت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ گو کہ اُس کا یہ منصوبہ ناکام ہوا مگر باپ کا دل اُس سے ٹوٹ چکا تھا لہٰذا داریوش نے کوروش کی بجائے ارشک کو اپنا ولی عہد نامزد کیا جو 404 قبل مسیح میں باپ کی وفات پر ہخامنشی سلطنت کا حاکم بنا اور اردشیر دوم کے لقب سے اپنی حکمرانی کا آغاز کیا۔

ارشک ہخامنشی خاندان کے کامیاب ترین حکمرانوں میں شمار ہوتا ہے جس نے ہخامنشیوں کی عظمت پارینہ اور اس تہذیب کی گرتی ہوئی ساکھ کو بحال کیا۔ اس نے اپنے باغی بھائی کوروش کو ایک ہولناک جنگ میں شکست دے کر مار ڈالا اور اپنی والدہ پری ستی کے حکومتی امور میں مداخلت کو ختم کر کے ایران کو از سرِ نو فتوحات کی جانب گامزن کیا۔ اس نے یونان کو اُس کے اندرونی معاملات میں الجھائے رکھا۔ اُس نے مصر کی بغاوت کو بھی طاقت اور حیلے سے نمٹایا اور وہاں کی آزادی پسندوں کو بُری طرح کچل کر نہ صرف اُسے دوبارہ سلطنت ہخامنشی کا حصہ بنایا بلکہ وہاں سے یونانی مداخلت اور اُن کے اثرات بھی ختم کر دیے۔ اسی طرح صوبہ گیلان کے کدوسی کردوں کی بغاوت کا بڑی مشکلوں کے بعد خاتمہ کیا اور انہیں مرکز کا مطیع و فرمانبردار بنایا۔

اُس نے البتہ ایک بڑی غلطی ضرور کی جو مستقبل میں ہخامنشیوں کے خاتمے کی ایک اہم وجہ بن گئی۔ یعنی اُس نے یونانی جنگجوؤں کی اجرتاً خدمات حاصل کیں۔ یونانی فوجی ہزاروں کی تعداد میں اُس کی فوج میں شامل تھے۔ انہوں نے کئی بار جنگوں کے دوران ایرانی حکمرانوں اور سپہ

سالاروں کو دھوکہ دیا اور انہیں بلیک میل کرتے رہے۔ عین محاذ جنگ پر پہنچ کر جنگ میں حصہ نہ لینے کا یا تو اعلان کرتے یا پھر دھمکیاں دیتے جس پر سپہ سالار اور حاکم انہیں بھاری معاوضے دے کر لڑنے کے لیے راضی کرتے۔ ارشک جیسا ایک جہاندیدہ اور قابل حکمران بھی اُن کی خدمات لیتا تھا اور انہیں اس کے عیوض بھاری اجرت دیتا تھا۔ یہی یونانی مستقبل میں یونانی حملہ آور سکندر کے لیے رہنما اور مدد گار بن گئے جنہیں ایرانی سرزمین، اُن کے رہن سہن اور طریقہ جنگ سے خوب آگاہی حاصل تھی۔ لہٰذا جب یونانیوں کی مڈبھیڑ ایرانیوں سے ہوئی تو یہ یونانی جنگجو جنہیں فارسی مورخین آجر لکھتے ہیں (بدخشانی 1967: 125-26)۔ سکندر کی رہنمائی اور مدد کے لیے پہلے سے ہی ایران میں موجود تھے۔

ارشک نے چونسٹھ سال حکومت کی اور 358 قبل مسیح میں ایران کی عظمت رفتہ کو بحال کر کے انتقال کیا۔ مورخین کے مطابق اُس کی تین سو ساٹھ بیگمات تھیں جن سے اس کی ایک سو پندرہ اولادیں ہوئیں۔ اُس کی اکثر اولاد کا انتقال اُس کی زندگی ہی میں ہوا۔ مورخین نے اُس کے انتقال کے وقت اُس کے صرف چار بیٹوں کا ذکر کیا ہے جن کے نام یہ تھے۔ داریوش، ترياسپ، اوکس، ارسام۔

اردشیر اپنے بڑے بیٹے کو اپنا ولی عہد نامزد کرنا چاہتا تھا مگر اُسے اردشیر کے دوسرے بیٹے اوکس نے قتل کروادیا جبکہ مختصر عرصہ میں ہی اُس نے اپنے باقی ماندہ دونوں بھائیوں کو بھی قتل کر دیا۔ اس برادر کشی کو اردشیر دوم برداشت نہ کر سکا اور 358 قبل مسیح میں اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ باپ کے مرنے کے بعد اوکس نے اردشیر سوم کے لقب سے تاج و تخت سنبھالا اور حکمران بنا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے شاہی خانوادہ کے سینکڑوں افراد کو مار ڈالا حتیٰ کہ اپنے چچا کے ایک سو بیٹوں اور پوتوں کو بھی مروادیا۔ اس نے شاہی خواتین اور بیگمات کو بھی معاف نہیں

کیا۔ اس طرح اپنے خاندان کے لاتعداد لوگوں کے خون میں ہاتھ رنگنے کے بعد اس نے تاج شاہی کو سر پر سجایا اور حکومت کرنے لگا۔

اردشیر سوم کے دور میں اس کی ناقص پالیسیوں اور ظلم و جبر کے خلاف ملک کے مختلف حصوں میں بغاوت برپا ہوئی۔ اردشیر طویل عرصہ تک ان بغاوتوں کو فرو کرنے میں مصروف رہا۔ مصر ان بغاوتوں کا گڑھ تھا جہاں سے بغاوتوں کا آغاز ہوا اور پھر کئی علاقوں تک یہ بغاوت پھیلتی چلی گئی۔ کئی مقامات پر ایرانی افواج کو شکست ہوئی اور اُسے شدید نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر ایک طویل کشمکش اور جدوجہد کے بعد اوکس نے ان بغاوتوں کو فرو کیا اور مصر کو بھی فتح کر کے ایرانی سلطنت کا حصہ بنایا۔ اُس نے مصریوں کا بڑی بیدردی کے ساتھ قتل عام کیا اور بغاوتوں کا انتہائی خوفناک انداز میں انتقام لیا۔ شدید محنت اور جدوجہد کے بعد اوکس ملک میں امن بحال کرنے میں کامیاب ہوا۔ وہ مزید اقدامات کرنا چاہتا تھا مگر ایرانی روایات کا سلسلہ جاری رہا اور یہ برادر کُش مگر پُر عزم حکمران بھی محلاتی سازشوں کا شکار ہوا۔ اُسے اپنے خواجہ سرا باگواس پر اندھا اعتماد تھا کیونکہ اُس کی کامیابیوں اور دشمنوں پر قابو پانے میں باگواس کا بہت بڑا کردار تھا مگر شہنشاہ کو یہ علم ہرگز نہ تھا کہ اُس کے خلاف تمام تر محلاتی سازشوں کا ماسٹر مائنڈ بھی یہی شخص ہے۔ باگواس کو دربار شاہی میں اعلیٰ مقام حاصل تھا اور وہ شہنشاہ کے بہت ہی قریب رہتا تھا۔ باگواس یہ اعلیٰ مقام و مرتبہ اور اپنی کامیابیوں کو دیکھ کر خود حکمران بننے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ لہٰذا ایک دن موقع پا کر اُس نے اوکس یعنی اردشیر سوم کو زہر دے کر مار ڈالا۔ یہ 338 قبل مسیح کا زمانہ تھا (بدخشانی 1967:133)۔

اردشیر سوم کے قتل کے بعد اس خاندان کا آخری حکمران داریوش سوم یا دارا سوم حکمران بنا جس کا اصل نام کدمان تھا۔ یہ شخص اردشیر کے خواجہ سرا باگواس کی جانب سے

حکمرانی کے لیے شاہی خاندان سے منتخب کیا گیا تھا جس کی آڑ میں اصل حکمران باگواس تھا۔ مگر اب ہخامنشی سلطنت ختم ہونے والی تھی۔ حالات و واقعات بتاتے ہیں کہ سوائے اندرونِ ایران چند علاقوں کے باقی ماندہ مقبوضات اور علاقے خومختار اور آزاد ہو چکے تھے انہوں نے ہخامنشی سلطنت کی غلامی کا جوُ اُتار پھینکا تھا۔ دارا سوم کے دور میں یونانیوں نے مقدونیہ کے شہزادے سکندر (Alexander) کی سرکردگی میں ایران پر حملہ کیا اور ہخامنشی سلطنت کا 331 قبل مسیح میں خاتمہ کر دیا۔ سکندر کے حملے کے وقت کے حالات کی کافی تفصیلات ملتی ہیں جن میں کئی ممالک اور خطوں کے بارے میں کافی حد تک معلومات دستیاب ہیں۔ یہ تحریریں ماضی قریب کے زمانے ہی میں نہیں بلکہ سکندر کے حملوں اور اس کے فوراً بعد تحریر ہوئی ہیں۔ بعد ازاں انہی اولین تحریروں کی روشنی اور رہنمائی میں اس علاقے کی تاریخیں مختلف زبانوں میں رقم ہوتی رہیں۔ لہٰذا ان قدیم تاریخوں کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ وہ علاقے جن میں قدیم بلوچ قبائل آباد تھے بھی ہخامنشی تسلط سے زمانہ ہوئے خلاصی پا چکے تھے اور آزاد و خود مختار تھے۔ شمالی ایران میں بعض علاقے گو کہ ہخامنشیوں کے تسلط میں تھے مگر زرکسیز کے بعد ان میں بھی اکثر و بیشتر بغاوتیں ہوتی رہتی تھیں۔ دارا سوم کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے یہ علاقے اردشیر سوم کے دور میں ہی آزاد اور خود مختار ہو گئے اور سکندر کے حملوں کے وقت یہ علاقے ہخامنشی سلطنت سے الگ تھے۔ اسی لیے شمالی ایران سمیت وہ تمام علاقے جن میں بلوچ قبائل سکونت رکھتے تھے سکندر نے شدید جھڑپوں اور خونریز جنگوں کے بعد فتح کیے۔ مثلاً سکندر نے کرمان، سیستان، مکران، لسبیلہ اور جھلاوان کے علاقوں کو مختلف سالوں میں اور مرکزی ایران کی فتح کے کئی سال بعد فتح کیے۔ ان علاقوں کے مزاحمت کار ہخامنشی اور آرین سپاہی نہیں تھے بلکہ مقامی باشندے تھے۔ ایرین، سٹرابو، جارج میک کرنڈل، ونسنٹ اے سمتھ، ہیرلڈ لیم اور ابوالقاسم فردوسی سمیت تمام علماء

تاریخ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ مکران اور دیگر علاقوں میں سکندر کے سامنے مقامی باشندے مزاحمت کرتے رہے جبکہ ایرانی ہخامنشی 331 قبل مسیح میں دارا سوم کے قتل کے ساتھ ہی ہتھیار ڈال چکے تھے اور انہوں نے مزید مزاحمت ترک کر دی تھی۔

ہخامنشی دور میں بلوچ علاقوں کے تفصیلی حالات تو دستیاب نہیں ہیں مگر بعض ایسے بیانات تاریخی کتب میں ملتے ہیں جن کی بنیاد پر رہنما مفروضات قائم کیے جاسکتے ہیں اور بلوچ قبائل اور اُن کے خطے کے حالات کو ان مفروضات کی روشنی میں بہتر طور پر زیرِ تحریر لایا جاسکتا ہے۔

بلوچ قبائل کے زیرِ سکونت اکثر و بیشتر علاقے دارا اول کے دور تک آزاد و خود مختار تھے۔ شمالی ایران میں واقع مختلف بلوچ قبائل نے ہخامنشی قبائل کی بالادستی کو پہلے ہخامنشی حکمران سائرس (کوروش) کے دور میں ہی قبول کر لیا تھا۔ ان مشہور قبائل میں مید، لوری، کرد، ہیرکانی، دابانی، ڈایا وغیرہ شامل تھے جبکہ کرمان اور اس کے مضافات کے بلوچ قبائل نے بھی طویل مذاکرات کے بعد سائرس کی بالادستی کو قبول کر لیا تھا۔ اسی طرح آشکانی اور کشانی قبائل بھی اپنی پوری طاقت کے ساتھ ہخامنشی سلطنت میں شامل ہو گئے جو خراسان اور سیستان کے بعض حصوں پر حاکم تھے۔ سیستان نے تو حکمرانی کے حصول میں ہخامنشیوں کو بھرپور مدد فراہم کی تھی جبکہ میدوں نے اپنے ہی قوم کے حاکم کو دغا دیتے ہوئے ہخامنشیوں کا ساتھ دیا تھا۔ البتہ سائرس مکران اور مزید مشرق کی جانب مراجعت کرنے اور فتوحات کے حصول میں ناکام رہا اور اُس کے قدم مکران میں داخل ہونے سے پہلے ہی رُک گئے۔ مکران کا وسیع و عریض علاقہ مکمل طور پر آزاد اور خود مختار رہا جبکہ تاریخی بیانات سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ مکران پر اُس زمانے میں ہوت قبیلہ برسرِ اقتدار تھا جنہیں یونانی مورخین یوت تحریر کرتے ہیں اور جمع کے صیغہ میں اُن کا نام یوتین (Utian) لکھتے ہیں۔ ماہرینِ جغرافیہ نے چھٹی صدی قبل مسیح کے جو نقشے وضع کیے ہیں

اُن میں بھی یوت قبیلہ کی حاکمیت اور اُن کے سیاسی و جغرافیائی حدود کو دکھایا گیا ہے جو ہخامنشی سلطنت سے الگ اور خود مختار تھے۔ اسی طرح شمالی اور شمال مغربی بلوچستان پر حاکم قبیلہ پر کانی کے حدود کی بھی وضاحت کی گئی ہے جن کے ملک کو پیریکانیہ کہا جاتا تھا۔ وسطی بلوچستان پر سکندر کے حملوں کے وقت اربوئی قبائل (براہوئی قبائل) جبکہ لسبیلہ پر ہوت قبیلہ کی حاکمیت قائم تھی۔ وسطی مکران پر میکوئی اور میکرونی قبیلہ حاکم تھا جن کی وجہ سے ہخامنشی دور میں وسطی مکران کو ماکا کہا جاتا تھا۔ جبکہ سکندر کے مکران میں داخلے کے وقت وسطی مکران پر گدرو قبیلہ حاکمیت کرتا تھا۔ لہٰذا یونانی مورخین نے ان قبائل کی حاکمیت کی وجہ سے ان کے علاقوں کو بھی انہی کے ناموں سے منسوب کیا۔ مثلاً اربوئی قبائل کے علاقے یعنی جھلاوان کو اسی نام سے تحریر کیا، لسبیلہ کو ہوت قبیلہ کی حاکمیت کی وجہ سے اوریتائی اور وسطی مکران کے علاقے کو گدرو قبیلہ کی وجہ سے گدروشیا یونانیوں نے تحریر کیا۔ تاریخی کتب کے مطالعہ سے اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ ان علاقوں پر دارا اول کے دور میں ایرانی تسلط قائم ہو گیا تھا مگر زرکسیز کے بعد جب ہخامنشیوں کی سیاسی طاقت کمزور ہونے لگی، ریاستی امور پر ان کی گرفت کمزور ہونے لگی اور محلاتی سازشوں نے حکومت کے در و بام ہلا کر رکھ دیے تو ہخامنشیوں کے مرکز پارس گرد سے دور دراز واقع یہ ممالک اور علاقے آزاد ہو گئے اور اپنے قبائلی قوانین کے مطابق اپنی حاکمیت قائم کی۔ تاریخی واقعات کے مطالعہ سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ علاقے ہخامنشی دورِ زوال میں آزاد اور خود مختار ہو چکے تھے اور اپنی قبائلی طاقت کے بل بوتے پر انہوں نے سکندر کی فوج ظفر موج کا مقابلہ کیا تھا۔

یونانی حملے اور بلوچستان:

سکندر (Alexander) یونان کی ریاست مقدونیہ کے حکمران فلپ (Philip) کا بیٹا تھا جسے ایشیائی مورخین فیلکوس تحریر کرتے ہیں۔ سکندر 356 قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ ننھے

شہزادے کی تعلیم و تربیت کا خصوصی بندوبست کیا گیا۔ عسکری تربیت کے علاوہ دنیاوی علوم کے لیے بھی بہترین اساتذہ مقرر کیے گئے۔ لہٰذا اُن کی تربیت اور دنیاوی علوم کے لیے مشہور زمانہ فلاسفر حکیم افلاطون کے ہونہار ترین شاگرد ''ارسطو'' کو اتالیق مقرر کیا گیا جو سکندر کی ذہنی تربیت کے ساتھ ساتھ انہیں مختلف علوم کی تربیت بھی دیتا تھا۔ کم عمری میں ہی یونانی رواج کے مطابق سکندر کو عسکری تربیت دی جانے لگی اور اسے شہہ زوری، شہ سواری، شمشیرزنی، سنان بازی، تیر اندازی اور دیگر جنگی فنون سکھائے جانے لگے۔ جبکہ ارسطو جیسا استاد اُسے دنیاوی علوم کے ساتھ ساتھ جہانگیری کا درس بھی دیتا تھا اور اُسے دنیاوی فتوحات کے لیے ذہنی طور پر تیار کرتا تھا۔

انتہائی کم عمری میں وہ عسکری میدان میں نام کمانے لگا اور بہت جلد اُس نے یونان بھر کو فتح کر کے ایک ہی لڑی میں پرو دیا۔ اس کے بعد وہ یورپ سے باہر نکل آیا اور ایشیاؔ و افریقہ کی فتوحات میں مصروف ہوا۔ وہ گیارہ سالوں تک ایشیاء و افریقہ میں فتوحات کرتا رہا اور دنیا کا عظیم ترین فاتح بنا۔

تاریخی کتابوں میں مذکور دنیا کے مختلف خطوں سے تعلق رکھنے والے دیگر حکمرانوں اور فاتحین کی طرح سکندر کی فتوحات اور یلغاروں کا مقصد بھی ہوس ملک گیری اور دولت کے حصول کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ لاکھ فاتح سہی بہر حال لوٹ مار کرنے والے برے انسانوں میں جہاں اٹیلا دی ہُن، مہر گل دی ہُن، اشوکا موریا، کنشکا کشانی، تیمور لنگ گرگانی کرد، چنگیز تاتاری، نادر شاہ افشار قزلباش، الفانسو آف سپین، ایسٹ انڈیا کمپنی وغیرہ کا نام آتا ہے تو اس فہرست میں سکندر کا نام سر فہرست ہونا چاہیے۔ سکندر نے تمام یورپ کی طاقتوں کو متحد کر کے مصر کو لوٹا، بابل کو برباد کیا۔ ایران کو تہس نہس کرتا ہوا ہندوکُش تک پہنچا۔ وہاں سے شمال مغربی دروں سے ہوتا ہوا شمالی ہندوستان اور پنجاب پر پل پڑا۔ حتیٰ کہ گیارہ سال وہ اپنے گھر سے باہر کی دنیا کو تسخیر کرتا

رہا۔ بیاس سے آگے اس کے سپاہیوں نے جانے سے انکار کیا تو وہ بٹالہ (سندھ) آیا۔ یہاں سے اس نے فوج کو تین حصوں میں تقسیم کر کے تینوں حصوں کو بلوچستان کے مختلف علاقوں سے گزارتا ہوا ایران پہنچنے کا حکم دیا تھا ان تین حصوں میں سے ایک حصہ کی کمان خود اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کی فتح کردہ سلطنت میں ترکی، لبنان، اسرائیل، اردن، مصر، لیبیا، قبرص، شام، عراق، ایران، افغانستان، وسطی ایشیاء، اور سندھ و پنجاب شامل تھے۔ سکندر کے سفر کی داستان بہت طویل ہے مگر یہاں اس کے کل سفر سے جو کہ گیارہ سالوں پر محیط ہے صرف ان دو مہینوں کی روداد ہمارا موضوع ہے جو سکندر اور اسکی فوج کیلئے پچھلے گیارہ سالوں کی تمام تر تکالیف سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئی اور وہ اس یونانی جرنیل اور اسکی فوج ظفر موج کا سفر بلوچستان ہے جسے ذیل کے سطور میں مختصراً پیش کیا جارہا ہے۔ تاکہ یہ بات واضح ہو کہ سکندر کے حملوں کے وقت بلوچ خطے کی ہیت اور سیاسی و جغرافیائی کیفیت کیا تھی اور یہ بھی کہ وہ کون کون سے قبائل تھے جنہوں نے سکندر کے حملوں کے سامنے مزاحمت پیش کی اور اس کے خلاف خونریز جنگیں لڑیں۔

331 قبل مسیح میں سکندر نے آخری ہخامنشی فرمانروا کدمان الملقب بہ دارا سوئم (Darius III) کو شکست دیکر ہخامنشی اقتدار اکا خاتمہ کر دیا اور اس خطہ پر ایران کی آرین تہذیب کا خاتمہ کر کے یونانی عملداری قائم کی۔ ایران کے بعد وسط ایشیاء کو تاخت و تاراج کرتی ہوئی یونانی فوج شمال مغربی سرحدی علاقے کے دروں کے راستے پنجاب کے میدانوں میں داخل ہوئی اور شمالی ہندوستان کی جانب مار دھاڑ کرتی ہوئی دریائے بیاس کے کنارے جا پہنچی۔ مگدھ (پنجاب) کی ریاست کے مضبوط حکمران راجہ پورس کو شکست دی مگر بعد ازاں اسے اس کے تخت پر بحال کر دیا اور اپنا ایک نمائندہ اس کے ساتھ کر کے واپسی کی راہ لی۔ واپسی پر کئی قبائل کی بیخ کنی کرتا ہوا بٹالہ نامی مام پر پہنچا جو غالباً ٹھٹھہ اور حیدر آباد کے درمیان میں واقع تھا۔ (یہ غالباً

گھارو کا مقام تھا یعنی ضلع ٹھٹھہ صوبہ سندھ، جہاں اُس زمانے میں دریائے سندھ کا دہانہ واقع تھا اور اسی مقام پر دریائے سندھ بحیرہ عرب میں گرتا تھا۔ یہاں ایک شہر بھی تھا جو بعد ازاں تاریخ میں بھمبھور کے نام سے مشہور و معروف ہوا۔ یقیناً یہی شہر اُس زمانے میں جب سکندر کا یہاں ورود ہوا تھا، بٹالہ کہلاتا تھا۔) یہاں اس نے لشکر کا وہ حصہ جس میں معذور اور ناکارہ سپاہی، خواتین، بچے، بوڑھے، غلام، مال غنیمت وغیرہ تھے انھیں اپنے ایک سالار کریٹیرس کی سربراہی میں اندرونِ سندھ سے ہوتے ہوئے درہ بولان کے راستے ایران کی جانب روانہ کیا اور فوج کا ایک چاک و چوبند دستہ اسکے ساتھ کر دیا۔ جبکہ بعض مورخین کے مطابق کریٹیرس درہ مولہ کے راستے علاقہ زہری سے ہوتے ہوئے سوراب اور وہاں سے خاران کے راستے ایران پہنچا تھا۔ 8 ہزار سپاہیوں کا ایک دستہ اپنے امیر البحر نیروخس (یہ کسی دستے کا سالار تھا یہ سفر بطور چیلنج قبول کیا تھا) کی سرکردگی میں ساحل مکران کے ساتھ ساتھ خلیج فارس کی جانب روانہ کیا۔ جبکہ 40 ہزار سپاہیوں اور جنگجوؤں پر مشتمل فوج کا سب سے اہم ترین دستہ اپنے زیر کمان رکھا اور اپنے لئے بلوچستان کے ساحلی علاقوں لسبیلہ اور مکران سے ہوتے ہوئے ایران کی جانب جانے والا راستہ چُنا۔ حالانکہ راہبروں اور تاریخ دانوں نے اس خطرناک سفر سے اسے منع کیا تھا مگر وہ اس سفر کا مکمل ارادہ کر چکا تھا جو اٹل تھا۔

سکندر کا معتمد سالار کریٹیرس بٹالہ (سمتھ 123:2001) کے مقام سے فوج کے ایک حصے کو لے کر جس میں ہاتھیوں کا ایک بڑا گلہ بھی شامل تھا اور جس کے لشکر کی تعداد 90 ہزار تھی بلوچستان سے ہوتے ہوئے اراخوزیا اور درنگیانا (خراسان و سیستان) کے راستے کرمان کیلئے روانہ ہوا۔

نیروخس یعنی اس امیر البحر کو جس نے نہایت کامیابی کے ساتھ بیڑے کی دریائے جہلم سے لیکر سمندر تک دس مہینے کے سفر میں رہنمائی کی تھی، کو حکم دیا گیا کہ تمام بیڑے کو ساحل

سمندر کے گرد ہوتا ہوا خلیج فارس میں دریائے فرات کے دہانے تک لے آئے اور راستے میں جتنے عجیب و غریب ممالک اور سمندروں سے گزرے ان کے حالات نہایت احتیاط کے ساتھ لکھتا جائے۔ سکندر نے بذات خود فوج کی کمان لی تاکہ وہ اس جنگلی علاقے جسے اُس زمانے میں گیدروسیہ (گیدروشیا) اور آج کل مکران کہتے ہیں سے ایران کو جائے اور جہاں سے اس سے قبل سوائے سیمی رامس کی فوجوں کے اب تک کوئی اور نہ گزرا تھا(سمتھ 125:2001)۔

سمتھ کے مطابق سکندر اکتوبر 325 قبل مسیح میں بٹالہ سے روانہ ہوا جبکہ موسم کے ناموافق ہونے کی وجہ سے نیر وخس کو دو یا تین ہفتوں بعد روانہ ہونا پڑا۔ سمتھ یہ بھی لکھتا ہے کہ :

> ”اگرچہ گیدروسیہ (گیدروشیا) کا علاقہ عام طور پر ہندوستانی فرمانروائی یا سیاست کے دائرے سے باہر ہے۔ مگر یہ تمام صوبہ یا اس کا کچھ حصہ وقتاً فوقتاً راجاؤں کی سلطنتوں کے ساتھ ملحق رہا اور اسی وجہ سے اس کی تاریخ بھی تاریخ ہند سے کسی طرح جدا اور غیر متعلق نہیں سمجھی جاسکتی۔ مگر بلاشک وشبہ گیدروسیہ کی ستر ابی (صوبہ) ہندوستان کی اصل حدود سے باہر تھی“(سمتھ 125:2001)۔

سمتھ سمیت کئی دیگر مؤرخین بھی اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ بلوچستان کی جغرافیائی کیفیت ہندوستانی اور ایرانی زمینوں کی طبعی کیفیت سے مختلف ہے اور یہ بھی اقرار کرتے ہیں کہ یہاں کے قبائل قومی، سماجی، ثقافتی اور تہذیبی لحاظ سے بھی ان سے الگ ہیں مگر اسکے باوجود جب بھی بلوچستان کے حالات لکھے جاتے ہیں یہاں کے اقوام کا ذکر کیا جاتا ہے اور جب یہاں کی تاریخ بیان کی جاتی ہے تو ان عنوانات کو ہندوستان یا ایران کی تاریخوں کے ساتھ منتھی کر لیا جاتا ہے جو کہ تاریخی لحاظ سے بالکل بھی درست نہیں۔

سکندر کا سفر بڑا دشوار گزار تھا کیونکہ راستے میں لسبیلہ اور مکران کے دشت و جبل خشک و ویران تھے اور انسانی آبادیاں خال خال نظر آتی تھیں۔ خوراک اور پانی سکندر اور اس کے فوج

کیلئے بڑا چیلنج بن سکتے تھے مگر اس باعزم و حوصلہ مند نوجوان نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ سیمی رامس بمشکل اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ زندہ بچ کر یہاں سے نکل سکی تھی اور سائرس بھی مکران کے تباہ کن سفر سے دوچار ہوا تھا مگر اسکے باوجود وہ اپنے فیصلے پر قائم رہا اور نیر وخس کو بٹالہ (موجودہ حیدر آباد یا ٹھٹھہ) میں چھوڑ کر عازمِ ایران ہوا۔ جہاں کریٹیرس اسکا منتظر تھا۔

نیر وخس کو چند روز دریا میں ٹھہرنا پڑا۔ آخر کار چند دنوں کے بعد وہ اپنا بیڑہ بندر گاہ کی ایک رکاوٹ کو، جو مغربی شاخ کے دہانے کو بالکل روکے ہوئے تھی، دور کر کے پار لے جانے میں کامیاب ہوا۔ باد مخالف کی وجہ سے اسے آگے چل کر 24 دن تک ایک محفوظ بندگاہ میں پناہ لینی پڑی اس کا نام اس نے سکندر کی بندر گاہ (الیگزینڈر ہیون) رکھ دیا۔ سمتھ اس کو کراچی کے آس پاس کہیں واقع قرار دیتا ہے۔ (ممکن ہے کراچی کا علاقہ منوڑا یا پھر حب چوکی کے قریب کا کوئی مقام ہو۔ مصنف) سمتھ لکھتا ہے کہ اس دوران بیڑے میں شامل سپاہیوں کو پانی اور خوراک کی قلت کا سامنا کرنا پڑا بعد ازاں بیڑہ دریا اربیئس (سمتھ اسے پورالی لکھتا ہے) کے دہانے سے کھلے سمندر میں داخل ہوا سمتھ لکھتا ہے کہ یہ دریا ''اربوئی'' قوم جو اس اطراف میں آباد تھی اور ''اوریتائی'' قوم کے درمیان حدِ فاصل تھا جو دریا کے مغربی جانب ایک وسیع قطع میں آباد تھی (سمتھ 126:2001)۔

یہاں سمتھ اربوئی (یا اربوئی یا براہوئی) کو آخری ہندی قبیلہ لکھ کر ایک بار پھر اسی غلطی کا مرتکب ہوا ہے جو اس سے پہلے جغرافیائی طور پر بیلہ اور مکران کو ہندوستان سے الگ مانتے ہوئے بھی ان کی تاریخ کو ہندی تاریخ کے ساتھ ملا کر بیان کی ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو اربوئی یا براہوئی الفاظ تھوڑی سی الٹ پھیر کے ساتھ ایک جیسے یا قریب قریب بن جاتے ہیں اور آج بھی یہ سلسلہ کوہِ جو بیلہ سے شمال کی طرف کوئٹہ کی جانب پھیلا ہوا ہے سلسلہ وسطی ہربوئی کہلاتا ہے اور چونکہ

یونانیوں اور خصوصاً سکندر کے عہد اور مابعد کے مؤرخین نے بلوچستان کے مختلف علاقوں کو خود سے نام دیئے اور وہاں آباد قبائل کو ان ہی علاقوں سے منسوب کر کے بجائے قبائلی یا قومی نام تحریر کرنے کے (جیسا کہ ایرانی مجموعی طور پر لفظ بلوچ استعمال کرتے تھے) ان کے شہریتی اور علاقائی ناموں کو ہی ان کی قومیت بنادی مثلاً علاقہ اربوئی سے اربوئی قبائل (یعنی براہوئی قبائل) ہوت یا یوت اور اوریتائی علاقہ لسبیلہ اور مکران کے قبائل کو تحریر کیا گیا۔ اسی طرح یونانی مورخین گیدروشیا یعنی وسطی مکران کے قبائل کو گیدروشیائی اور ساحل سمندر کے مید قبائل کو اچھیتافیگوئی یعنی مچھلی خور وغیرہ تحریر کرتے ہیں۔ یہ یقیناوہ قدیم بلوچ قبائل تھے جن کا ذکر سکندر سے قبل کے یونانی مؤرخ بابائے تاریخ ہیرڈوٹس اور شاہنامہ فردوسی کے مصنف ابوالقاسم فردوسی نے اپنی تصنیف میں کیاہے۔ ان قبائل نے سکندر کو دوماہ کے سفر میں اپنے خطے پر حملے کی پاداش میں سخت تنگ کیا۔ کئی بار مسلح حملے بھی کیئے اور سکندر کے سفر میں سخت رکاوٹیں ڈالیں۔

سکندر کا بحری بیڑہ امیر البحر نیروخس کے زیر کمان ساحل مکران کے ایک مقام جسے کو کلایا کو کالا کہتے تھے پہنچا۔ یہاں جو لوگ تھکے ماندے تھے ان کو اجازت دی گئی کہ وہ خشکی پر اتریں اور آرام لیں جس کی ان کو بہت ضرورت تھی۔ اس اثناء میں جب ملاح ایک قلعہ بند چھاؤنی میں آرام کر رہے تھے نیروخس نے لیوناٹوس کی خبر سنی جسے سکندر نے ایک فوج کے ساتھ اوریتائی قوم کو زیر کرنے کیلئے روانہ کیا یہ معلوم ہوا کہ ایک عظیم جنگ میں ہولناک قتل وخونریزی کے بعد لیوناٹوس نے دیسی لوگوں کو شکست دی۔ ان کے چھ ہزار لوگ اس جنگ میں کام آئے اور تمام سردار مارے گئے۔ ان کی فوج کی تعداد آٹھ پیادے اور تین سو سوار پر مشتمل تھی۔ مقدونیوں کا نقصان اگرچہ بہت نہیں ہوا تھا، مگر اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس میں لیوناٹوس کا ساتھی اپالوفینس، جو کچھ عرصے پہلے اس علاقے کا گورنر مقرر ہو کر آیا تھا، مقتولین میں شامل

تھا۔ اس طرح سکندر نے بیڑہ کے ساتھ اپنا رابطہ بحال کیا اور اسکے لئے پانی و رسد کا بندوبست کیا۔ بحری فوج کے ناکارہ سپاہیوں کو بری فوج کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔ بیڑے کی مرمت کی گئی اور آدمیوں کی کمی لیوناٹوس کے سپاہیوں سے پوری کی گئی اور اسکے بعد بحری بیڑے نے اپنا سفر جاری رکھا۔ دریائے ٹمروس (اسمتھ نے اسے ہنگول لکھا ہے موجودہ کھُنڈ ملیر اور بوزی ٹاپ کے درمیان کا علاقہ) کے دہانے پر ان کی مڈبھیڑ ایک نہایت وحشی اور پسماندہ قوم سے ہوئی جن کے بدن میلے کچیلے اور جانوروں کی مانند بالوں سے ڈھکے ہوئے تھے جانوروں کے پنجوں کے مانند ان کے ناخن پنجے کی قسم کے اور اتنے مضبوط تھے کہ وہ ان سے کچا گوشت چیر پھاڑ سکتے تھے اور نرم قسم کی لکڑیوں کو چیر لیتے تھے۔ ان کا لباس وحشی جانوروں یا بڑی بڑی مچھلیوں کی کھالوں کا بنا ہوا تھا۔ ان وحشیوں سے ایک چھوٹی سے لڑائی کے بعد بیڑہ وہاں پر پانچ دن تک مرمت کیلئے ٹھہرا رہا اور چھٹے دن وہ کوہ راس پر پہنچا جسے ملنا یا راس مالن کہتے ہیں اور جو قوم اور ریتائی کی مغربی سرحد تھی۔ یہ لوگ خود وحشی نہ تھے بلکہ ہندوستان کے باشندوں کی طرح مسلح و ملبوس تھے۔ اگرچہ زبان اور رسم ورواج کے لحاظ سے ان سے مختلف تھے۔

راس مالن سے گزرنے کے بعد اندرونی ممالک کے باشندوں کا نام گیدروسی یا گیدروسیائی (مترجم نے گیدروسو لکھا ہے) تھا۔ یونانی مورخین خود لکھتے ہیں کہ ان قبائل کے اوضاع واطوار اور رسوم ورواج ہندیوں سے بالکل مختلف تھے۔ (دراصل یہ ساحل پر رہنے والے مید تھے) انکے پاس مچھلی کھانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لیے ساحلی باشندوں کو نیروخس نے اچھیتافیگوئی (مترجم نے اختھئوفے گئو) تحریر کیا ہے۔ وہیل یا شارک مچھلی جو بکثرت ساحل سمندر پر پائے جاتے تھے جو اگرچہ بیڑے کے ملاحوں کے لئے باعث خوف وتردد تھے مگر ساحلی باشندوں کیلئے بہت بڑی نعمت تھے۔ کیونکہ ان کی کھال سے ان کے پوشاک اور ہڈیوں سے انکے مضبوط گھر بنتے

تھے۔ اور اس مچھلی کے جبڑوں سے وہ دروازے تیار کرتے تھے۔ نیروخس کا بحری بیڑہ جزیرہ ہفت تلار، ستادیپ (مترجم نے اسٹولا، استلو، ہشتلو، یا ہفتلا لکھا ہے) کے قریب سے ہو کر گزرا۔ اور یہی جزیرہ ہے جسے یونانی مؤرخ فلاسٹریٹاس، سلیرا تحریر کرتا ہے (سمتھ 2001:126-28)۔ یہ پسنی اور اورماڑہ (جسے یونانی مؤرخین ارمیرا تحریر کرتے ہیں) کے درمیان واقع ہے۔ جس کے بارے میں عجیب و غریب کہانیاں پیش کی جاتی تھیں اور مقامی ملاح اس جزیرے یا اس کے آس پاس جانے سے کتراتے تھے۔ یونانی ویسے ہی توہم پرست تھے لہٰذا وہ اس جزیرے سے سخت خوف زدہ ہوئے اور اس سے کترا کر آگے بڑھ گئے۔ نیروخس کا باقی ماندہ سفر بھی حقیقی و خیالی خطرات میں گزرا اور بصد مشکل یہ بیڑہ اور اسکے سپاہی انتہائی خستہ اور بری حالت میں ایران کے بندرگاہ ہرمز پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

وہ مصائب جو سکندر اور اسکی بری فوج کو اٹھانے پڑے وہ ان سے کہیں زیادہ تھے جو نیروخس کو سمندری سفر کے دوران پیش آئے۔ اکتوبر 325 قبل مسیح میں سکندر نے دریائے اربیئس (پورالی) کو عبور کیا۔ اس نے اپنی فوج کے ایک حصے کو اپنے ایک فوجی افسر ہافاسچین کے سپرد کر دیا اور باقی ماندہ فوج کو جو زیادہ تر سوار دستوں پر مشتمل تھی اپنے ساتھ لیکر سمندر کا رخ کیا۔ اس کا ارادہ سمندر کے ساتھ ساتھ سفر کرنے کا تھا تاکہ بحری بیڑے کو بوقت ضرورت خوراک اور پانی مہیا کیا جاسکے اور ساتھ ہی اوریتائی قبائل (قبیلہ ہوت) کو بھی زیر کیا جائے۔ جنہوں نے ابھی تک سکندر کی اطاعت قبول نہیں کی تھی اور آزاد و خود مختار تھے۔ دریائے اربیئس کے کنارے ایک اور قبیلے اریبائی (اربوئی) کا ذکر سمتھ اور میک کرنڈل، ایرین کے حوالے سے کرتے ہیں (میک کرنڈل 1984:21,22)۔ اُس نے اربوئی قبائل کے لشکر کو معمولی جھڑپ کے بعد شکست دے کر پسپا کر دیا اور انہیں پہاڑوں میں منتشر کر دیا۔ اس کے بعد

سکندر نے دریائے اریبئیس کو عبور کیا جو ایک پایاب ندی تھی۔ وہ رات کے وقت صحرا کے بڑے حصے کو عبور کرنا چاہتا تھا۔ صبح کے قریب وہ ایک آبادی کے قرب وجوار میں پہنچ گیا۔ یہاں سے اس نے توپخانے کو منظم صورت میں چلنے کا حکم دیا اور گھڑ سواروں کو اپنے ساتھ لے کر ان کو کئی دستوں میں تقسیم کر کے میدانی علاقے کے ایک وسیع رقبے میں پھیلا دیا۔ اس طرح اس نے اوریتائی (اوریتئی) کے علاقے پر اپنا حملہ شروع کیا۔ ان میں وہ لوگ جنہوں نے مزاحمت کی مار دیئے گئے اور بہت سارے لوگ زندہ گرفتار کر لئے گئے۔ اسکے بعد وہ پانی کے ایک جوہڑ کے قریب ٹھہر گیا اور جب ہافاسچین کی سرکردگی میں فوج کا باقی ماندہ حصہ آکر اس سے مل گیا تو اس نے اپنا سفر دوبارہ شروع کیا اور آگے بڑھ کر رمبیکیہ یا رمبکیہ کے قصبے میں پہنچ گیا جو اوریتائی قبیلے کا سب سے بڑا قصبہ تھا۔ وہ اسکے محل وقوع سے بڑا خوش ہوا اور خیال کیا کہ اگر یہاں ایک نو آبادی قائم کی جائے تو یہ ایک خوشحال بستی بن سکتی ہے۔ اس نے ہافاسچین کو اس مقصد کی خاطر پیچھے چھوڑ دیا تاکہ وہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکے۔ اسکے بعد اس نے اپنا سفر گیدروزیائی (گیدروشیائی) اور اوریتائی کی درمیانی سرحد کی طرف جاری رکھا۔ جس کے بارے میں اسے اطلاع ملی تھی کہ آگے اس کا راستہ ایک تنگ درے سے ہو کر گزرتا ہے اور اس درے کے اوپر اوریتائی اور گیدروزیائی قبیلوں کا ایک لشکر اس کا راستہ روکے بیٹھا ہے (یہ یقیناً اور بلا مبالغہ بوزی پہاڑ تھا جو بیلہ اور مکران کے درمیان ایک فصیل کی طرح ایستادہ ہے اور آجکل اس کو کاٹ کر کوسٹل ہائی وے کے ذریعے گوادر اور لسبیلہ کے اضلاع کو آپس میں ملا دیا گیا ہے) ہلکی سے جھڑپ کے بعد انہوں نے اطاعت قبول کی۔ مؤرخین کے مطابق اس پہاڑی کو عبور کرنا ناممکن پا کر سکندر نے واپس دریائے ہنگول کا راستہ اختیار کیا جس کی وجہ سے وہ سمندر سے کافی دور شمال کی طرف نکل گیا۔ اس دوران اسے سخت تکالیف اور مصائب کا شکار ہونا پڑا۔ اس کی فوج کے بیشتر

سپاہی ایک برساتی نالے میں اچانک طغیانی آنے سے بہہ گئے۔ رات کے وقت چونکہ سفر جاری رہتا تھا اور دن کو گرمی کی شدت کی وجہ سے تھکے ماندے سپاہی آرام کرتے تھے۔ لہٰذا اکثر اونگھ آنے کی وجہ سے سپاہی راتوں کو راستے میں سو جاتے اور صبح وہ راستہ بھول کر باقی فوج سے بچھڑ جاتے۔ چونکہ سردیوں کا موسم تھا مگر اس خطے میں دن کو بلا کی گرمی پڑتی تھی اور رات کو ایندھن کی ضرورت ہوتی تھی۔ لہٰذا سپاہی آگ جلانے کی خاطر چھکڑوں کو توڑ دیتے ان کی لکڑی کو بطور ایندھن استعمال کرتے اور خوراک کی قلت کی وجہ سے سواری کے جانوروں کا گوشت بے تحاشہ استعمال کرتے۔ سکندر سب کچھ دیکھتا رہا اور حالات کی نزاکت اور بدحالی کی وجہ سے چپ رہا۔ سکندر چاہتا تھا کہ وہ ساحل کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ یہاں کس قسم کی بندر گاہیں موجود ہیں مگر اب وہ دریا ہنگول کے ساتھ ساتھ شمال کی جانب سفر کرتا ہوا سمندر سے کافی دور نکل چکا تھا۔ بے شمار تکالیف کے بعد سکندر اور ماڑہ کے میدانی علاقے میں پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ یہاں سے گید روشیائی علاقہ شروع ہوتا تھا جس کا ساحلی علاقہ بھی بہت غیر آباد تھا۔ سکندر نے اپنے ایک جرنیل ٹوس کو ساحل کی خبر لینے بھیجا تو اس نے واپس آکر خبر دی کی ساحل بالکل ویران ہے کچھ ماہی گیر وہاں پر رہتے ہیں جن کی اپنی خوراک صرف مچھلی ہے انکے پاس جو پانی ہے وہ سخت کھارا ہے (میک کرنڈل 1984 : 22) لہٰذا سکندر نے ساحلی علاقے کی جانب مڑنے کا خیال ترک کرکے اندرون مکران سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ سکندر کو گید روشیا میں ایک مقام پر غلے کا وافر ذخیرہ ملا تو اسکے بھوکے سپاہیوں نے سرکاری تحویل میں لیا گیا غلہ کو مہریں توڑ کر لوٹ لیا۔ سکندر نے انھیں اس عمل پر بھی کچھ نہ کہا اور باقی ماندہ غلہ بحری بیڑے کیلئے روانہ کر دیا اور مقامی باشندوں کو تاکید کی کہ وہ جتنا غلہ کھجور اور بھیڑیں مہیا کریں گے انھیں ان کا معاوضہ دیا جائے گا۔ ایک مقام پر تیز آندھی اور گرد و غبار کی وجہ سے جو راہبر سکندر کے ساتھ

تھے وہ راستہ بھول گئے سکندر اس صورتحال سے سخت گھبرا گیا وہ فی الفور سمندر کی طرف بائیں جانب مڑ گیا مگر اسکے گھوڑوں اور سپاہیوں کی ہمت جواب دی گئی تھی لاچار وہ سب لوگوں کو چھوڑ کر چند سپاہیوں کے ساتھ ساحل کی طرف روانہ ہوا اور اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہوا۔ یہاں ریت کے نیچے کھدائی کرنے سے انھیں میٹھا اور صاف پانی مل گیا۔ بعد ازاں پوری فوج یہاں پہنچ گئی اور سیر اب ہو کر ساحل کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس سفر کے دوران ایک بار حالت یہ ہوگئی تھی کہ پیاس کے مارے سپاہی بلک رہے تھے۔ ان کے حلق سوکھ چکے تھے اور ان کی حالت موت کے قریب ہوگئی تھی۔ خود سکندر کی حالت بھی اتنی غیر تھی کہ پوری فوج ان کیلئے پریشان ہوگئی۔ اتنے میں چند سپاہی کہیں سے کسی خود (فوجی ٹوپی) میں چند قطرے پانی کے کہیں سے لے آئے اور بڑے اعزاز کے ساتھ سکندر کو پیش کیا۔ سکندر نے ان کے ہاتھ سے خود لے کر پیاس اور بھوک سے بدحال اور خستہ حال سپاہیوں پر ایک نظر ڈالی جن کی حالت ان سے بھی غیر تھی۔ سکندر نے وہ پانی زمین پر پھینک دیا اور اٹھ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کی اس غیر متوقع حرکت سے جیسے پوری فوج میں جان آگئی اور وہ تروتازہ ہو کر اپنے سفر پر روانہ ہوگئے۔ سکندر بڑی مشکل سے گیدروشیا کے صدر مقام پورہ (پہرہ یا فہرج) پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ اپنا سفر مکمل کرنے میں اسے پورے ساٹھ دن لگ گئے تھے۔

ملک سعید دھوار ایرین کے بیانات کی روشنی میں لکھتا ہے کہ:

”دھوپ جھلسائے دیتی تھی اور پانی کی کمی نے فوج کے ایک بڑے حصے کو تباہ کر دیا۔ خاص کر بار برداری کے جانوروں نے بہت نقصان اٹھایا اور ریت کی گہرائی کی وجہ سے مر گئے۔ گرمی آگ کی طرح سب کو جھلسائے دیتی تھی اور آدمیوں کی ایک کثیر تعداد پیاس کی تڑپ سے مر گئی“ (دھوار 174:1990)

تقریباً تمام مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ سکندر اور اس کی فوج کو ایشیاء بھر میں جتنی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا وہ اس سے کہیں کم تھیں جو اس کو بلوچستان کے راستے ایران جاتے ہوئے سفر کے دوران پیش آئی تھیں۔ پورہ (Pura) (پہرہ یا فہرج) سے چند دن بعد کرمان پہنچا جہاں اسکی ملاقات کریٹیرس سے ہوئی جو کامیابی کے ساتھ اپنی مہم مکمل کر کے کرمان پہنچا تھا۔ بعد ازاں امیر البحر نیروخس بھی بڑی مشکلوں اور مصائب کا سامنا کرتا ہوا اہرمز اور وہاں سے کرمان پہنچنے اور سکندر سے ملنے میں کامیاب ہوا۔ کرمان سے سکندر عازم یونان ہوا مگر بابل کے مقام پر جون 323 قبل مسیح میں نمونیا میں مبتلا ہو کر 33 سال کی عمر میں فوت ہوا (سمتھ 2001:129)۔

سکندر کے بعد اسکے مقبوضات کو شدید خانہ جنگی کے بعد اس کے جرنیلوں نے آپس میں تقسیم کر دیا اور ایشیائی مقبوضات سکندر کے مایہ ناز جرنیل سیلوکس نکوٹار کے حصے میں آ گئیں۔ اس نے غالباً 306 قبل مسیح میں اپنی الگ شہنشاہیت کا اعلان کیا۔ اس اولعزم بادشاہ کے عہد حکومت میں یونانیوں نے ایران افغانستان، ہندوستان اور سندھ کے بیشتر علاقوں اور وسط ایشیاء پر مشتمل ایک عظیم سلطنت باختریا کے نام سے قائم کی۔ مگر 305 قبل مسیح میں سیلوکس کو ہندوستان کی نئی ابھرتی ہوئی طاقت چندر گپت موریا کے ہاتھوں شکست ہوئی جسکے نتیجے میں چندر گپت نے ایک معاہدے کے تحت افغانستان اور بلوچستان کے علاقے سیلوکس سے لے لیے۔ سیلوکس نے خیر سگالی اور ہندوستان کے ساتھ دوستانہ مراسم بڑھانے کی خاطر اپنی بیٹی کی شادی چندر گپت موریا کے ساتھ کر دی۔ اس کے بعد وہ اپنے یونانی حریف اینٹی گونوس کے جانب متوجہ ہوا اور اسے بالآخر شکست دے کر مار ڈالا اور یونانی مقبوضات کا واحد مالک بن بیٹھا (سمتھ 2001:129)۔

اس طرح بلوچستان میں یونانی عہد واقتدار ایک طوفانی ریلہ اور گرداب ثابت ہوا جس نے جھلاوان، بیلہ اور ساحلی علاقوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور انھیں تہس نہس کرتا ہوا گزر گیا۔

بلوچ قبائل کے کئی دیگر علاقے بھی سلیوکس نکوٹار کے حصے میں آئے۔ سیستان، جنوبی خراسان، شمالی ایران کے علاقہ جات مازندران، ایلان، گیلان کوہِ البرز سمیت زاگروس کا پہاڑی علاقہ مختلف اور لاتعداد بلوچ قبائل پر مشتمل تھے۔ شمالی ایران کے کثیر قبائل کرد بلوچوں پر مشتمل تھے جبکہ سیستان اور جنوبی خراسان میں زرنگی، الشاری، سنجری، آشکانی، کشانی، سیستانی، پیریکانی اور کئی دیگر بلوچ قبائل سکونت پذیر تھے۔ یہ تمام علاقے سلیوکس نکوٹار کے قبضے میں آگئے جن کو اُس نے اپنی قائم کردہ باختری سلطنت کا حصہ بنایا۔ ازاں بعد وسطی بلوچستان تاحدودِ مکران کا تمام تر علاقہ ہندوستان کے حکمران چندر گپت موریا کے قبضہ میں آگیا اور اسے ہندی موریا سلطنت میں شامل کیا گیا جبکہ سیستان اور جنوبی خراسان سمیت باقی ماندہ بلوچ خطہ سلیو کی باختری سلطنت میں شامل رہا۔

سلیو کی دور کا دورانیہ کم رہا اور جتنے عرصے تک یونانی حاکم رہے یہ تمام تر علاقہ جو کئی اقوام و قبائل پر مشتمل تھا انتہائی بدنظمی اور انتشار کا شکار رہا۔ پورے ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا اور دو مقامی خاندانوں نے قوت حاصل کر کے خطے میں اپنی عملداری قائم کی۔ ان دو مقامی خاندانوں کے نام آشکانی اور کشانی تھے۔ یہ بات ذہن نشین ہو کہ یہ دونوں قبائل آج بھی بلوچ قوم میں شامل ہیں اور بعینیہ اپنے انہی ناموں سے معروف ہیں۔ ان قبائل کا تذکرہ ہندی خاندان کے بعد کیا جائے گا کیونکہ بلوچستان کے کچھ حصوں پر پہلے پہل ہندیوں کو دسترس حاصل ہوئی تھی۔

بلوچستان پر ہندی موریا خاندان کا تسلط:

شمالی ہندوستان پر چندر گپت موریا کے عہد میں نند خاندان کی حاکمیت قائم تھی جبکہ پنجاب پر راجہ پورس حاکم تھا اور سکندر کا متعین کردہ ایک نائب مالی امور کی نگرانی پر مامور تھا۔ پنجاب ایک دور افتادہ خطہ زمین تھا گو کہ وہ بہت زرخیز اور ثمر آور خطہ تھا مگر یونان سے اتنا دور تھا

کہ یونانیوں نے مال غنیمت پر ہی اکتفا کیا اور بہت جلد ان کا دل اس سرزمین سے اچاٹ ہو گیا۔ ان کے جانے کے بعد ساری ذمہ داری راجہ پورس نے سنبھال لی۔ 317 قبل مسیح میں راجہ پورس کو اس کے یونانی نائب نے 120 ہاتھیوں کی خاطر قتل کر دیا (سمتھ، 2001، 129)۔ یونانیوں کے باقی اثرات ہندوستان کے نوجوان راجہ چندر گپت موریا نے ختم کر دیئے۔ چندر گپت موریا نے 322 قبل مسیح میں مگدھ کے تاج و تخت پر قبضہ کر لیا اور نند خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر کے موریا خاندان کی بنیاد رکھی۔ چندر گپت موریا بذات خود کچھ نہ تھا مگر اس کے ہوشیار اور لائق ترین قانون دان وزیر اچاریہ چانکیا کوتلیہ وشنو گپتا کے مشوروں نے نہ صرف چندر گپت کو ایک کامیاب اور کامران حکمران ثابت کیا بلکہ بعد ازاں اسی موریا خاندان نے تاریخ میں بڑا نام پیدا کیا۔ اس نے ایک بڑی فوج کے ساتھ تمام تر شمالی ہندوستان کو زیر کر لیا اور اسکی سلطنت خلیج بنگال سے بحیرہ عرب تک پھیل گئی۔

عین اس وقت جبکہ چندر گپت اپنی سلطنت کو مضبوط اور مستحکم کرنے میں مشغول تھا اس کا ایک یونانی حریف مغربی اور وسطی ایشیائی ممالک میں اپنی طاقت کی بنیاد قائم کر رہا تھا اور سکندر کی ہندی فتوحات کو دوبارہ حاصل کرنے کیلئے تگ و دو میں مصروف تھا۔ سکندر کے مختلف جرنیلوں کی آپس کی خانہ جنگی کے نتیجے میں دو جرنیل ایشیاء میں اپنی طاقت قائم کرنے کے لئے ایک دوسرے کے مد مقابل تھے یعنی انٹی گونوس اور سلیوکس جو بعد میں نکوٹار یعنی فاتح کے لقب سے مشہور ہوا۔ سلیوکس نکوٹار یہ جنگ جیت گیا اور سکندر کی ایشیائی مقبوضات کا مالک بن کر بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔ اس کی سلطنت کے مشرقی صوبے ہندوستان کی سرحد تک پہنچتے تھے۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ ہندوستان پر بھی دوبارہ اس کا قبضہ ہو جسے یونانی چھوڑ گئے تھے۔ اپنے مقصد کے حصول کی خاطر سلیوکس نے 305 ق م میں دریائے سندھ عبور کر کے ہندوستان پر حملہ کر دیا مگر

جنگ میں اپنی بقا اور فائدہ نہ پاکر سلیوکس نے چند شرائط پر چندر گپت سے معاہدہ کر لیا۔ جس کے نتیجے میں چندر گپت کا افغانستان اور بلوچستان پر قبضہ تسلیم کیا گیا۔ چندر گپت نے سلیوکس نکوٹار کی بیٹی سے شادی کر کے اسے اپنے حرم میں شامل کر لیا۔ سمتھ کے مطابق یہ معاہدہ 303ق م میں طے پایا جس کے بعد سلیوکس نے اپنے یونانی حریف انٹی گونوس کی گوشمالی کی خاطر 2500 میل کا فاصلہ طے کیا اور فرانگیہ کے علاقے میں اپساس کے مقام پر اسے قتل کر دیا (سمتھ 2001: 148-129)۔

بلوچستان کے علاقے دور دراز اور کم از کم وسطی اور مغربی و جنوبی بلوچستان کے علاقے زیادہ ثمر آور اور ہندی حکمرانوں کیلئے زیادہ پر کشش نہیں تھے۔ ان کا قبضہ بس برائے نام تھا وگرنہ بلوچستان کے قبائل جو چھوٹے چھوٹے دیہاتوں یا مختصر قصبوں میں آباد تھے اندرونی طور پر آزاد اور خود مختار رہتے تھے۔ افسوس بلوچستان کے اس وقت کے حالات کی زیادہ تفصیلات دستیاب نہیں ہیں ۔ البتہ مؤرخین اور خصوصاً میگستھنیز موریا دربار کی شان و شوکت، ملکی استحکام، تعمیرات، فنون لطیفہ، حرب و ضرب، ٹیکسٹائل، معیشت، زراعت، کاروبار و تجارت، باشندگان، رسوم و رواجات اور جغرافیائی حالات پر خاصی روشنی ڈالتا ہے۔ ان کے دور میں بدھ مت کو بڑا فروغ حاصل ہوا اور اس کے اثرات دور دور تک پھیل گئے۔ مگر میگستھنیز کے بیانات سے اس بات کی وضاحت نہیں ہوتی اور نہ ہی شواہد ملتے ہیں کہ وہ خطہ جہاں بلوچ قبائل آباد تھے موریا سلطنت میں شامل تھے یا نہیں۔ بلوچستان کے بعض اضلاع یعنی مستونگ، قلات، خضدار، کچھی، کوئٹہ اور لسبیلہ میں ہندو عہد کے کئی قدیم مقامات، آستانے اور منادر ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں قدیم عہد میں ہندو تہذیب و تمدن کا غلبہ رہا ہے۔ یہ مذہبی مقامات کثیر تعداد میں ہیں اور ان کے بارے میں ہندو ساکنانِ بلوچستان بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ قدیم منادر اور مقامات اُن

کے ابتدائی مشاہیر اور بزرگ ہستیوں کے ہیں اور انتہائی قدیم عہد سے تعلق رکھتے ہیں جو ہزاروں سال قبل یہاں سکونت رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں بلوچستان میں ساتویں صدی قبل مسیح میں رائے اور برہمن خاندان کا بھی قبضہ رہا۔ بالخصوص لسبیلہ اور وسطی بلوچستان پر برہمن اثرات کافی نمایاں تھے۔ مگر عرب حملوں کے دوران قدم قدم پر ان حملہ آوروں کا مقابلہ مقامی قبائل سے ہوا تھا کسی بھی سندھی فوج نے مقامی باشندوں کی مدد نہیں کی تھی۔ اس دعویٰ کے ٹھوس شواہد موجود ہیں جنہیں اگلے صفحات میں زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس بات کے بھی ٹھوس شواہد ملتے ہیں کہ وسطی بلوچستان اور مکران کا علاقہ عربوں کی فتح سندھ کے وقت آزاد اور خود مختار تھے اور عرب حملوں کے دوران سندھی لشکر کا یہاں کوئی عمل دخل نہ تھا بلکہ مقامی باشندوں نے ہی عربوں کے سامنے مزاحمت پیش کی تھی۔ بالکل اُسی طرح جس طرح یونانیوں کے حملوں کے وقت یہ خطہ ایرانی تسلط سے آزاد تھا اور یونانیوں کی مقامی افراد کے ساتھ ہی مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ جیسا کہ ایرین نے یہ بیان دیا ہے کہ اربوئی قبائل نے اپنے علاقے میں جبکہ اوریتائی اور گدروشیائی قبائل نے اپنے اپنے خطوں میں سکندر کی فوج ظفر موج کے خلاف مزاحمت پیش کی تھی۔ لہٰذا ان شواہد کی بنیاد پر بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ موریا خاندان کے عہد حکومت یعنی دوسری اور تیسری صدی قبل مسیح کے دوران بلوچ خطے کے کچھ حصے وقتی طور پر ہندی موریا خاندان کے قبضہ میں چلے گئے تھے جن پر موریا حکمرانوں کی کوئی خاص توجہ نہ رہی اور یہ علاقے اندرونی طور پر مقامی قبائل کے ماتحت آزاد اور خود مختار ہوتے گئے۔ ہندی قبائل زیادہ تر ان علاقوں کو قدیم عبادت گاہوں، مقدس مقامات اور بزرگوں کے آستانوں کی زیارت گاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ قدیم رسوم ورواجات کا سلسلہ اب بھی بلوچستان کے بعض علاقوں میں مستعمل ہے۔ قلات، مستونگ، لسبیلہ اور کچھی میں واقع مقدس مقامات اب بھی ہندی زائرین کا مرکز ہیں اور وہ سالانہ تہواروں پر اپنے ان

مقدس مقامات کی زیارت اور دیگر مناسک کی ادائیگی کے لیے آتے ہیں۔ یہ بات ذہن نشین ہو کہ یہ مقدس مقامات ہندو روایات کے مطابق موریا خاندان کے برسرِ اقتدار آنے سے بھی سینکڑوں سال قبل کے ہیں جہاں ہندو بزرگ (پنڈت اور سادھو) چلہ کشی کرتے اور گیان حاصل کرنے کے لیے دیگر عبادات میں مشغول و مصروف رہتے تھے۔

ملک سعید دہوار بلوچستان پر ہندی قبائل کے تسلط اور بلوچستان میں بدھ مت کے اثرات کو تسلیم کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ بلوچستان بھی یقینا بدھ مت اور موریا خاندان کی حاکمیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا ہو گا (دہوار، 1990: 193)۔ بلوچستان میں کچھی سمیت کئی مقامات دالبندین، چاغی، نوشکی اور لسبیلہ وغیرہ سے بدھ مت کے آثار و شواہد ملے ہیں۔ بلوچستان کے بعض مقامات اور شہر مثلاً سونمیانی، قلات، مستونگ اور خضدار وغیرہ اس زمانے میں ہندی آبادی سے سخت متاثر ہوئے جو بلا شبہ موریا خاندان کی بلوچستان میں در اندازی اور مداخلت کی گواہی دیتے ہیں۔ ملک سعید دہوار کے بقول لسبیلہ میں ہنگلاج کے مقام پر مہادیو کا ستھان، مستونگ میں شیواجی کا مندر اور مکران میں ستادیپ کا ستھان غالباً اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں (دہوار 1990: 194)۔ مکران کے بارے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے جو ہندی دور میں اپنے ساحلو ں کی وجہ سے کافی اہم تھا۔

چندر گپت کے بعد اسکا بیٹا بندوسار 298 قبل مسیح میں حکمران بنا، بعد ازاں 273 قبل مسیح میں اشوک اعظم ہندوستان کا حکمران بنا۔ اسکی سلطنت میں شمالی مغربی سرحد کی نیم وحشی اقوام اور افغانستان، بلوچستان، سندھ، کشمیر، نیپال، ہمالیہ اور تمام ہندوستان ماسوائے جنوبی ہندوستان کے شامل تھا (سمتھ 2001: 199)۔ اشوک کے بعد موریا خاندان زوال پذیر ہوا۔ اشوک نے چالیس سال حکمرانی کی اور موریا خاندان نے کل ایک سو ستّر سال حکمرانی کی بالآخر 185 قبل مسیح میں اسکا

خاتمہ ہوا (سمتھ 241:2001)۔ اس کے بعد ہندوستان بھی متحد نہ رہ سکا اور اسکا ہر حصہ جداگانہ حیثیت اختیار کرتا گیا اور یہ وسیع و عریض خطہ زمین کئی خاندانوں میں منقسم ہو کر چھوٹی چھوٹی راجدھانیوں میں تقسیم ہوئی۔

مطالعہ سے یہ بات شنید میں آتی ہے کہ موریا خاندان بھی اس دور دراز علاقے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ البتہ ہندو مذہب کے جو مقدس مقامات بلوچستان میں پائے جاتے ہیں اُن کے حوالے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بلوچستان میں ہندو مذہب کے اولین سادھو اور پنڈت چلہ کشی اور دیگر گیان دھیان کی خاطر آتے تھے اور یہاں کسی پہاڑی کھوہ یا کسی ویرانے کو ٹھکانہ بنا کر اپنی عبادات اور گیان دھیان میں مصروف رہتے تھے۔ جہاں تک بلوچستان میں پائے جانے والے ہندومت کے مقدس مقامات کا تعلق ہے تو تحقیق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ مقامات موریا خاندان کے برسرِ اقتدار آنے سے بھی صدیوں پیشتر کے ہیں بلکہ بعض شواہد تو اس بات کی بھی تصدیق کرتے ہیں کہ بلوچستان میں ہندو مذہب کے مقدس مقامات آرین حملہ آوروں کی آمد سے بھی قبل کے ہیں۔ جیسا کہ ہنگلاج ماتا کا مندر لسبیلہ اور کالی ماتا کا مندر قلات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ابتدائی ہندو عہد سے تعلق رکھتے ہیں جب تازہ تازہ ہندو مذہب و عقائد کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ لہٰذا یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ موریا خاندان کا بلوچستان پر قبضہ برائے نام تھا جبکہ یہ علاقے اپنے قوانین اور طریقہ کار کے مطابق مقامی قبائل کے زیرِ اثر تھے اور وہی یہاں حاکمیت کرتے تھے۔ تاریخی کتب میں موریا عہد کے حوالے سے بلوچستان کے تذکرے کم ملتے ہیں مگر جو بیانات دستیاب ہیں اُن کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ بلوچستان میں ہندی اثرات صرف مذہبی رسومات کی ادائیگی تک محدود تھے جبکہ سیاسی طور پر موریا خاندان کا ان علاقوں پر کوئی اختیار نہ تھا۔

ساکا قبائل:

مقدونیہ کی یونانی ریاست کے شہزادے اور فاتح سکندر کی وفات کے بعد سلیوکس نکوٹار نے جب وسط ایشیاء میں اپنی حاکمیت قائم کی اور باختری سلطنت کی بنیاد رکھی تو اس دور میں وسط ایشیاء سے کئی ترک اور منگول نژاد اقوام کی ہجرتوں کا آغاز ہوا۔ اس دوران ہن قبائل نے چین پر حملہ کر دیا اور صوبہ کانسو کو اپنی تاخت و تاراج کا نشانہ بنایا اور بڑی تباہی مچائی۔ ہنوں کا حملہ اتنا شدید اور تباہ کُن تھا کہ جس کی وجہ سے وسط ایشیاء اور چین سے متصل اور سرحدی صوبوں اور علاقوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس بھگدڑ کے نتیجے میں لاتعداد وسط ایشیائی قبائل مثلاً یوچی اور آوار قبائل (Hurrian) مزید جنوب اور جنوب مغرب کی طرف کھسک گئے۔ یوچی اور ہوری قبائل کا ایک بڑا ریلہ دریائے جیحوں کے شمال میں آباد ہو گیا اور طخاریوں کو بھی اپنا مسکن چھوڑ کر اسی جانب ہجرت پر مجبور ہونا پڑا۔ طخاریوں کی ہجرت کی وجہ سے وسط ایشیاء کے علاقے فرغانہ اور خراسان کے کچھ علاقوں سے ساکاؤں کو ہجرت کرنا پڑا۔ فرغانہ کے ساکا قبائل پہلے ہرات میں فروکش ہوئے مگر انہیں وہاں سے بھی جلد ہی علاقہ چھوڑنا پڑا لہٰذا وہ اراخوسیا (خراسان) سے ہوتے ہوئے سیستان کی طرف آنکلے جو اس زمانے میں درنگیانا یا درنجیانا (Darangiana) کہلاتا تھا اور پورے علاقے میں پھیل گئے۔ یہ علاقہ بعد ازاں ساکاؤں کی نسبت سے سکستان کہلایا جو کثرت استعمال سے سیستان بنا (دھوار 1990:196)۔

جبکہ سمتھ کے مطابق کہ یہ قبائل پہلے سے خراسان میں موجود تھے اور وہ انھیں پارتھیوں (خراسانیوں) کی ہندی شاخ لکھتا ہے۔ ساکا قبائل کی یہ ہجرت غالباً دوسری صدی عیسوی کے دوران عمل میں آئی تھی۔ انہوں نے سیستان پر ایک سو بیس سال حکومت کی۔ ان کا پہلا حکمران ماوس یا میوس تھا جو غالباً 120 قبل مسیح پنجاب کا مالک بنا تھا اور شہنشاہ اعظم کا لقب اختیار کیا

تھا (سمتھ 286:2001)۔ ساکا قبائل کے حکمران خاندان کے کچھ افراد کے نام سکوں سے معلوم کئے گئے ہیں جن میں ماوس، آزس، ازلائیسیس اور ازس کے نام شامل ہیں۔ سمتھ لکھتا ہے کہ

"ہندی پارتھی بادشاہوں کے دو بڑے خاندان تھے ان میں سے ایک اراکوسیا (خراسان) اور سیستان میں حکمران تھا اور دوسرا مغربی پنجاب یا ٹیکسلا کی سلطنت پر حکومت کرتا تھا۔ میوس غالباً 120 ق م میں موخر الذکر صوبے کا بادشاہ ہوا جس کو متھراڈیٹس اول نے 138 ق م میں پارتھیا کی سلطنت کے ساتھ ملحق کر لیا تھا" (سمتھ 287:2001)۔

ان دو خاندانوں کی آپس کی خانہ جنگی سے جو 120 یا 130 قبل مسیح کے درمیان ہوئی تھی میوس نے فائدہ اٹھایا اور پنجاب و سندھ پر قابض ہوا۔ سمتھ یہ بھی لکھتا ہے کہ ممکن ہے کہ میوس کا تعلق سک (ساکا) قوم سے ہو (سمتھ 287:2001)۔ ملک سعید دھوار میوس کا دور حکمرانی 97 قبل مسیح اور 77 قبل مسیح کا درمیانی عرصہ رقم کرتا ہے (دھوار 174:1990)۔ اس نے ٹیکسلا (ٹیکساشیلا) کو اپنا دارالحکومت بنایا اور سیلو کی یونانی باختریوں کے اقتدار کا یہاں سے خاتمہ کیا۔ ان کی وفات کی بعد دونونیس نامی ایک ساکا پارتھی حکمران بنا۔ (سمتھ 287:2001) اس نے اراکوسیہ اور سیستان پر حکمرانی کی۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ ازیس ثانی تھا۔ جو اپنے باپ اور دونونیس کے بھائی سپل ریسیس کا نائب السلطنت یا شریک الحکومت تھا۔ ازیس اول نے لمبے عرصے تک حکمرانی کی۔ ان کے بعد ازی لائیس اور بعد ازاں آخری حکمران ازس ثانی تھا (دھوار۔ 196:1990)۔

سر اولف کیروان ساکا قبائل کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ میدانی علاقوں میں گومل ٹوچی اور پائے دار کے راستوں سے داخل ہو گئے تھے جو ان کے سکوں سے ثابت ہے۔ ان میں سے کچھ قبائل سیستان سے روانہ ہونے کے بعد بلوچستان میں وارد ہوئے اور یہاں سے دریائے سندھ کے بالائی علاقوں سے ہو کر گندھارا کی طرف نقل مکانی کی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ

تھی کہ ان کے ہم نسل مخالف گروہ یعنی پارتھیوں کے طاقت میں زبردست اضافہ ہو گیا تھا لہٰذا انہوں نے ساکاؤں پر دباؤ ڈال کر انھیں سیستان سے بلوچستان اور پھر سندھ و ہند کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کیا (کیر و 1996: 46-49)۔ بلوچستان میں ساکاؤں کے کچھ طائفے مقامی آبادی کے اندر اس طرح ضم ہوئے کہ انھیں ڈھونڈ نکالنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ ساجدی قبیلے کا سردار خیل طائفہ ساکازئی کہلاتا ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ یہ انہی قدیم ساکاؤں کی نشانی ہو۔ جبکہ ساجدی بذات خود ایک قدیم بلوچ قبیلہ ہے جو مید اور ہخامنشی سلطنتوں کے قیام اور وسعت میں دیگر بلوچ قبائل کے ساتھ مل کر کردار ادا کرتا رہا ہے۔ اس قبیلہ کا ذکر ہیروڈوٹس نے جمع کے صیغے میں سجیدین (Saggedian) کے نام سے کیا ہے جو سیستان اور جنوبی خراسان میں آباد تھے۔ جبکہ کچھ تحریروں میں ساجدیوں کو ترک تحریر کیا گیا اور شمالی ایران اور بحیرہ کیسپیئن کے اردگرد اُن کی حاکمیت کا تذکرہ بھی تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے (ابراہیم کیفس اوغلو و دیگر 2002: 67-79)۔ ساکا نام بلوچ قبائل میں مقبول عام ہے۔

بعض مورخین دارا اول کے دور کے کتبوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ساکاؤں کا اصل وطن دریا آمو (وسط ایشیاء) کا مغربی علاقہ تھا جہاں سے ان کے کچھ قبائل عظیم ہجرتوں کے دوران اراخوزیا اور درنگیانا تک نکل آئے تھے۔ ان کے مغرب میں پارتھ کا علاقہ (بحیرہ خزر کا شمالی علاقہ۔ خراسان) پارتھیوں کے پاس تھا۔ پارتھیوں نے ساکاؤں کو اپنے علاقے میں داخل ہونے سے روکا اور انھیں مشرق کی طرف دھکیل دیا۔ یہی قبائل سیستان سے بلوچستان اور دوسری طرف درہ گومل و درہ ٹوچی کے راستے پنجاب میں داخل ہو گئے۔

ہیروڈوٹس اور بعد ازاں ایرین دونوں ہی ساکاؤں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ شلوار قمیض میں ملبوس ہوتے تھے۔ ان کے سر پر لمبی لمبی سرے والے نوکیلی ٹوپیاں ہوتی تھیں۔ ان کی

گردنوں میں ایک روایتی خنجر اور ان کے کندھوں پر ان کے وطن کے تیر کمان آویزاں رہتے تھے۔ یہ ایک نہایت جنگجو اور اعلیٰ پایہ کی شہسوار قوم تھی۔ میدان جنگ میں وہ دشمن پر اچانک اور بڑی پھرتی کے ساتھ یکبارگی پل پڑتے تھے اور لڑائی کے دوران دہشت طاری کرنے والی جنگی چالوں کا مظاہرہ کرکے دشمن پر خوف و ہراس طاری کرتے تھے۔ ان کے سر کے بال لمبے اور داڑھیاں گھنی ہوتی تھیں۔ ان کے بدن پر بال بکثرت ہوتے تھے ان کا جسم مضبوط اور بڑا گٹھا ہوا اور خدوخال خوبصورت ہوتے تھے۔ (کیرو 1996:48) تقریباً 20 سنہ ء میں ان کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور بلوچستان پر پارتھی اقوام قابض ہو گئے۔

بلاشبہ ساکاؤں کی بڑی اکثریت ہندوستان کی جانب مہاجرت کر گئی اور کچھ دھڑے افغانستان کے پشتونوں میں ضم ہو گئے جبکہ ان کی ایک معمولی تعداد بلوچ قبائل کے اندر مدغم ہو گئی۔

ایران کے پارتھی (خراسانی۔ آشکانی):

سمتھ ساکا اور پارتھیوں کی تاریخ کو ایک ہی سمجھتا ہے اور ان کے باشاہوں کو بھی ایک ہی خاندان سے خیال کرتا ہے۔ لہٰذا وہ لکھتا ہے کہ 20 سنہ ء کے لگ بھگ ازس کے جانشین گنڈو فرئیس ہوا۔ جس نے اراکوسیہ (خراسان) اور سندھ کا ایک بہت بڑا علاقہ فتح کر لیا اور ساکاؤں کی نگرانی سے بالکل آزاد ہو کر ایک بڑی وسیع سلطنت کا مالک بن گیا۔ 60 سنہ ء میں جب وہ مر گیا تو اسکی سلطنت دو حصوں میں منقسم ہو گئی (سمتھ 2001:288)۔ مغربی پنجاب کا علاقہ تو گنڈو فرئس کے ایک بیٹے ابدگسیس کو ملا جبکہ خراسان اور سندھ آرتھگنیس کے حصے میں چلے گئے۔ مگر ان بھائیوں کی حکومت زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی کیونکہ وسط ایشیاء کے ایک طاقت ور، مضبوط اور زبردست قوم کشان نے ان پر حملے شروع کئے اور ان کے علاقوں پر قابض ہونے لگا۔

مگر بدخشانی کا بیان سمتھ سے کافی مختلف ہے وہ آشکانیوں اور ساکاؤں کو ایک ہی لکھتا ہے مگر آشکانی حکومت کا آغاز 249 قبل مسیح میں بیان کرتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں وہ لکھتا ہے کہ:

"ایران میں سلیوکیوں کی حکومت کے دوران اشکانیوں نے 249 قبل مسیح میں ایک نئی حکومت قائم کی جو ایران کی چوتھی قدیمی حکومت تھی۔" (بدخشانی 1967:224)

بدخشانی کے بیان کے مطابق اس حکومت کی تشکیل خراسان میں ہوئی جسے اکثر پارتھ لکھا جاتا ہے۔ اس علاقے کے مشرق میں سیستان، مغرب میں بحیرہ ہیرکانیہ اور گرگان، شمال میں وسط ایشیائی ممالک جبکہ جنوب میں ایران کا مفازہ یعنی صحرا کویر اور صحرا لوت (لوط) واقع ہیں۔ جبکہ اس کے مشہور شہر دامغان، جوین، شاہرود، سبزوار، نیشاپور، مشہد، ترشیز اور تربت حیدری ہیں۔ بدخشانی کے مطابق خراسان کو "پہل شاہستان" بھی کہا جاتا ہے۔ جبکہ دارا اول کے عہد سے تعلق رکھنے والے تخت جمشید کی تحریروں میں اس علاقے کو "پرتو" کہا گیا ہے۔ موصوف انہیں نسلی طور پر ساکا النسل قرار دیتا ہے جو ڈاہی (Dahae) کے علاقے سے موجودہ خراسان منتقل ہوئے اور پھر یہیں بس گئے (بدخشانی 1967:224-25)۔

عام طور پر اس خاندان کا بانی اور جدِ اعلیٰ "اشک" یا "ارشک" کو قرار دیا جاتا ہے جس کے نام کی وجہ سے یہ خاندان تاریخ میں "ارشکانی" کہلانے لگا جو بعد ازاں "اشکانی" بنا۔ قدیم ایران سے متعلق تاریخی تحریروں میں دو بھائیوں کا ذکر ملتا ہے کہ، "اشک" اور "تیرداد" نامی دو بھائی تھے جو بلخ کے رہنے والے تھے۔ وہ بڑی جدوجہد کے بعد اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور اشکانی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اشک کی بے پناہ جدوجہد اور مقبولیت کی وجہ سے ان کے حکمرانوں کا لقب ہی اشک بنا۔ لہٰذا ہر اشکانی حکمران اپنے ساتھ پہلے اشک کے لفظ کا لاحقہ لگاتا۔ لہٰذا پہلا حکمران اشک اول تھا تو دوسرا حکمران اشک دوئم یا تیرداد تھا اسی طرح باقی حکمران بھی اشک سوم، اشک چہارم وغیرہ کے لقب کے ساتھ تاریخ میں معروف ہوئے۔ بدخشانی کے بیان

کے برخلاف ملک سعید دھوار اور سر اولف کیرو دیگر طرح کے بیانات دیتے ہیں اور وہ ساکاؤں اور پارتھی اشکانیوں کی حکومت کو آپس میں خلط ملط کرتے ہیں۔ ملک سعید دھوار کے خیال میں پارتھیوں کی حکومت اولاً ارشک نامی شخص نے ترتیب دی یہ لگ بھگ 50 سنہ ء کا زمانہ تھا (دھوار 1990: 198)۔ اور ان کا ارادہ تھا کہ وہ سابقہ ہخامنشی سلطنت کو اپنے زیر اثر لا سکیں۔ لہٰذا انھیں سندھ و پنجاب پر بھی دسترس حاصل ہوگئی۔ ان کی حکومت افغانستان، وسط ایشیاء، ایران، سندھ اور پنجاب تک پھیل گئی مگر 60 سنہ ء تک ان کا زوال شروع ہوا۔

سمتھ اس بات کا بھی دعویدار ہے کہ گنڈو فریئس اور اسکے بھائی گڈ نے ایک عیسائی مبلغ سینٹ ٹھامس کے ہاتھوں عیسائیت قبول کی تھی۔ سینٹ ٹھامس (تھامس) حضرت عیسیٰؑ کے بارہ حواریوں میں سے ایک تھا جو رومیوں کے ظلم و ستم اور موت کے خوف سے ہندوستان کی جانب فرار ہوا تھا۔ وہ افغانستان سے ہوتا ہوا ہندوستان میں داخل ہوا۔ اسے تھامانبی بھی تحریر کیا گیا ہے۔ قاضی یوسف فاروقی انہی بزرگ ہستی کی افغانستان آمد اور ان کے ہاتھوں لاتعداد افغان قبائل کی قبول عیسائیت کا تذکرہ کرتا ہے (کاکڑ، عبدالقاہر، غیر مطبوعہ مقالہ ایم فل: جامعہ بلوچستان۔ کوئٹہ)۔ یہ خاندان یا قبیلہ علاقہ پارتھ یا خراسان کی وجہ سے پارتھی کے ساتھ ساتھ خراسانی بھی کہلاتا ہے جبکہ ان کا اجدادی نام آشکانی تھا۔ مشہور و معروف سیاح، جغرافیہ دان اور مورخ البیرونی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب میں اس قبیلہ کے حکمرانوں کی تفصیلات دی ہیں۔ درج بالا سطور میں اس خاندان کے حکمرانوں کے نام یونانی زبان کے لہجے میں تحریر کیے گئے ہیں جبکہ البیرونی نے ان کے نام مشرقی زبان میں تحریر کیے ہیں جن کے مطالعہ سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ یہ نام اکثر بلوچی زبان کے ہیں اور بلوچ قبائل کے مقبول ترین ناموں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ نام ذیل میں دیے جا رہے ہیں جن سے اس مفروضہ کی حقیقت اور سچائی کا بہتر طور پر اندازہ لگایا

جاسکتا ہے کہ یہ قبیلہ دراصل بلوچ سٹاک سے تعلق رکھتا تھا اور آج بھی یہ قبیلہ بلوچوں کے مضبوط ترین قبائل میں شمار ہوتا ہے۔ اسے آسکانی اور آشخانی بھی کہا جاتا ہے جبکہ آشخان نامی ایک علاقہ بھی بلوچستان میں واقع ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حکومت چلے جانے اور سیاسی طور پر کمزور پڑ جانے کے بعد اس قبیلہ نے بلوچ سٹاک کو اختیار کیا ہو البتہ یہ حقیقت ہے کہ آسکانی یا آشکانی قبیلہ خطے میں صرف بلوچ سٹاک میں نظر آتا ہے۔ آشکانی حکمرانوں کے نام درج ذیل تھے۔

۱۔ اشک بن دارا۔ ۲۔ اشک بن اشکان۔ ۳۔ شاہ پور بن اشکان۔ ۴۔ بہرام (مکمل بلوچی نام) بن شاپور۔ ۵۔ بالاش (بالاچ) بن شاپور۔ ۶۔ ھرمز بن بالاش (بالاچ)۔ ۷۔ فیروز (پیروز) بن ھرمز۔ ۸۔ بالاش (بالاچ) بن فیروز (پیروز)۔ ۹۔ خسرو بن ملاذان۔ ۱۰۔ بالاشان (بالاچ خان)۔ ۱۱۔ اردوان (اردوخان) بن بالاشان (بالاچ خان)۔ ۱۲۔ اردوان کبیر (اعظم) بن اشکانان۔ ۱۳۔ خسرو بن اشکانان۔ ۱۴۔ بہافرید بن اشکانان (ایک مقام پر بہافرید کی بجائے بیزن اشکانی لکھا ہوا)۔ ۱۵۔ گودرز بن اشکانان۔ ۱۶۔ بالاش (بالاچ) بن اشکانان۔ ۱۷۔ نرسی بن اشکانان۔ ۱۸۔ اردوانِ آخر (البیرونی 2002:157-58)۔

اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو ان میں اکثر نام اب بھی بلوچ قبائل میں مستعمل ہیں اور خوب پسند کیے جاتے ہیں۔ بلوچی زبان میں لفظ ''خ'' کا استعمال نہیں ہوتا بلکہ اُس کی جگہ ''الف'' یا ''ہ'' سے کام لیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میر جلال خان کو بلوچی زبان میں میر جلال ہان تحریر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح میر جنگی خان کو میر جنگیان لکھا جاتا ہے، خانی کو حانی بولا اور لکھا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر آشکانی حکمرانوں کے ناموں کو دیکھا جائے تو اُن میں بھی ایسی ہی مماثلت نظر آئے گی۔ مثلاً کچھ نام تو براہِ راست بلوچی کے معروف نام ہیں جیسا کہ بالاش یعنی بلوچی میں بالاچ، بہرام خالص بلوچی نام، گودرز (رستم کے اجداد میں اور شاہنامہ فردوسی میں مرقوم ایک قدیم سیستانی پہلوان،

جبکہ رند قبائل میں اب بھی ایک مضبوط اور معزز طائفہ گودری کہلاتا ہے)، پیروز انتہائی مقبول بلوچی نام ہے جو مرد وخواتین دونوں اصناف میں رکھے جاتے ہیں مثلاً پیروز حان، پیروز حاتون (فیروز خان، فیروز خاتون)، بیزن، معروف بلوچی نام، جو اب بھی ایک معروف سیاستدان بیزن بزنجو کا نام ہے۔ بیزن صاحب بلوچستان کے سابقہ مشہور و معروف سیاسی ہستی اور سابقہ گورنر بلوچستان جناب غوث بخش بزنجو کے صاحبزادے اور میر حاصل خان بزنجو کے بھائی ہیں۔ ان کے قبیلہ کا نام بھی لفظ بیزن سے ہی ماخوذ ہے یعنی بیزن سے بیزنجو۔ یہ چند آشکانی حکمرانوں کے نام تھے جو براہِ راست بلوچی زبان کے معروف ناموں میں شمار ہوتے ہیں جبکہ بعض نام بلوچی کے ہیں اور ان کے ساتھ لفظ "خان" کو بھی بلوچی زبان میں "ان یا آن" تحریر کیا گیا ہے۔ مثلاً بالاشان یعنی بالاچ خان، اردوان۔ اردوخان، اشکانان۔ اشکان خان، وغیرہ۔

اتنی مماثلت اور موجودہ عہد میں بھی اس قبیلہ کی صرف بلوچ سٹاک میں موجودگی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ یہ قبیلہ قدیم سیستانی اور جنوبی خراسان کے بلوچ قبائل تھے جنہوں نے طویل حاکمیت کی اور جب ان کی حاکمیت کا عہد ختم ہوا تو وہ اپنے اصل میں ہی نظر آنے لگے جبکہ باقی ماندہ ایرانی اور وسط ایشیائی خطے میں ان کی سیاسی سرگرمیاں کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گئیں۔

ایران کی قدیم تاریخ پر لکھنے والے مورخین میں مرزا مقبول بیگ بدخشانی منفرد مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایرانِ قدیم کی تاریخ کو اپنی مشہور کتاب "تاریخ ایران: از قوم ماد تا آلِ ساسان" جسے انتہائی محققانہ اور ماہرانہ انداز میں تحریر کیا ہے، میں اس انداز میں بیان کیا ہے کہ جسے پڑھنے کے بعد ایران کی قدیم تاریخ کا کوئی گوشۂ خفیہ نہیں رہتا۔ اس کتاب کو زیرِ تحریر لانے کے لیے انہوں نے ہیروڈوٹس، سٹریبو، ایرین، سائیکس، حسن پیرینا، کرسٹین سین، علامہ طبری

اور ابو القاسم فردوسی سمیت کئی دیگر مشہور و معروف مورخین کی مستند اور معرکتہ الآرآ کتب سے استفادہ کیا ہے۔ بد خشانی اپنی کتاب میں آشکانی حکومت اور اس حکمران خاندان کے حکمرانوں کی تفصیلات تحقیقی انداز میں بیان کرتا ہے۔ البیرونی نے آشکانی حکمرانوں کی تعداد سترہ تک بیان کی ہے جبکہ بد خشانی اس خاندان کے زیادہ حکمرانوں کے نام تحریر کرتا ہے اور ان کی حکومتوں کا مفصل حال بیان کرتا ہے۔ ذیل میں آشکانی حکومت کے بارے میں بد خشانی کی کتاب سے چند اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں۔ لکھتا ہے کہ:

> "اہل پارت نے اشکانی عہد کی ابتدا کا سال 249 قبل مسیح بتایا ہے۔ یہ شاید اشک اول (Arsaces) کی پہلی فتح کا سال ہے۔ اشک اور اس کے بھائی تیرداد نے پارت کے حکمران فربک لیس (Pherecles) کو قتل کر دیا تھا۔ اس زمانے میں ایران کا سلیو کی بادشاہ اینٹی اوکس (Antiochus) تھا جس کی کمزوری کی وجہ سے سلیوکیوں کی حکومت متزلزل ہو رہی تھی" (بد خشانی 1967: 227)۔

مزید لکھتا ہے کہ بلخ یونانیوں کی عملداری سے آزاد ہو گیا۔ آذربائیجان کی بغاوت بھی کامیاب ہو گئی اور اس نے یونانیوں کے قبضے سے آزادی حاصل کر لی۔ اینٹی اوکس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا اینٹی اونس دوم کے لقب سے تخت پر متمکن ہوا۔ اپنی عیش پسندی کی وجہ سے ایشیائے کوچک، ایرانی مقبوضات، شام، اور دیگر ممالک میں بغاوتیں ہوئیں جنہیں بصد مشکل فرو کرنے میں اسے کامیابی ہوئی مگر وہ آذربائیجان کی جانب متوجہ نہ ہو سکا۔ خراسان کی بغاوت بھی کامیاب ہو گئی جسے اشک اور اس کے بھائی تیرداد نے برپا کیا تھا۔ اس طرح 249 قبل مسیح میں پارت میں اشکانی حکومت کی داغ بیل پڑی اور اشک اول اس کا حکمران بنا۔ مگر اشک نے صرف دو سال حکومت کی اور اندرونی مسائل کے حل میں لگا رہا۔ دو سال بعد وہ اپنے محافظ کے ہاتھوں مارا گیا اور اس کی جگہ اس کا بھائی تیرداد اشک دوم کے لقب سے حکمران بنا۔ اس نے 247 قبل

مسیح سے 214 قبل مسیح تک حاکمیت کی اور اشکانی سلطنت کو دوام بخشا۔ تیرداد کو یونانیوں کی جانب سے شدید حملوں کا سامنا رہا مگر اس نے اپنی نوزائیدہ سلطنت کا کامیابی کے ساتھ دفاع کیا۔ اس نے اپنی سلطنت کے طول و عرض میں اہم اور جنگی نوعیت کے مقامات پر دفاعی قلعے تعمیر کروائے اور کئی نئے شہر بسائے۔ دارالخلافہ کے لیے اس نے گرگان کے علاقے میں ''دارا'' کے نام سے ایک نیا شہر بسایا۔ چاروں طرف پہاڑوں میں گھرا ہوا خوبصورت اور سیرگاہ کی مانند یہ شہر اشکانی حکمرانوں کا دارالخلافہ بنا اور آنے والے اشکانی حکمرانوں کا بھی دارالخلافہ بنا رہا (بدخشانی 1967: 229)۔ اشک دوم تیرداد اشکانی سلطنت کو مضبوط بنیادیں فراہم کر کے 214 قبل مسیح میں اس دارفانی سے کوچ کر گیا۔ ان کی جگہ اردوان اول اشک سوم کے لقب سے اشکانی سلطنت کا نیا حکمران بنا۔ اس حکمران نے 196 قبل مسیح تک حکومت کی اور ایشیاء کے یونانی حکمرانوں کی آپس کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھایا اور اپنی سلطنت کو وسعت دینے کی خاطر کئی علاقے فتح کیے۔ اس نے میڈیا، کردستان، ہمدان، کلدہ اور بین النہرین کے علاقوں پر اشکانی پرچم لہرایا۔ مگر بہت جلد یونانیوں نے اس کے فتح کردہ علاقے اس سے چھین لیے۔ حتیٰ کہ یونانیوں نے اس کے دارالحکومت کا محاصرہ کر لیا۔ مگر بعد ازاں ان کے مابین ایک معاہدہ طے پایا۔ ممکن تھا کہ اشکانی سلطنت کا خاتمہ ہو جاتا مگر اشک سوم اردوان اول نے حملہ آور یونانی حکمران اینٹی اوکس کی یہ شرط مان کر اپنی سلطنت بچالی کہ وہ بلخ پر حملے کے لیے اینٹی اوکس کا ساتھ دے گا (البیرونی 2002:233)۔ اینٹی اوکس کی بلخ کی مہم ناکام ہوئی مگر اس نے سکندر اعظم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اُن علاقوں کا رخ کیا جنہیں اس سے قبل سکندر فتح کر چکا تھا۔ اس کا ارادہ یہی تھا کہ وہ اُن علاقوں کو دوبارہ یونانی قلمرو میں شامل کرے جنہیں اس سے قبل سکندر نے اپنی قلمرو میں شامل کیا تھا۔ اس طرح اُس کا مقصد یورپ اور ایشیاء کے یونانیوں میں اپنا قد کاٹ بڑھانا تھا۔ یونانیوں نے

بھی اس کی مہم کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا۔ اس نے اپنی اس مہم میں ایک وسیع و عریض علاقے کی سیاحت کی مگر اپنا مقصد حاصل کرنے میں اُسے ناکامی ہوئی اور وہ ان علاقوں پر قابض ہونے اور انہیں اپنے دائرہ کار میں لانے میں ناکام ہوا۔ اینٹی اوکس کی مہم کے بارے میں معروف محقق و مورخ بدخشانی لکھتا ہے کہ:

"بلخ سے اینٹی اوکس سکندر اعظم کے نقش قدم پر چلا اور ہندوکش کو عبور کر کے کابل کا رخ کیا۔ پھر درہ خیبر سے گزر کر پنجاب میں داخل ہوا۔ راجا اشوک کے جانشین نے اسی میں عافیت دیکھی کہ سلیو کی حکمران سے مصالحت کر لے۔ چنانچہ زرِ کثیر اور ہاتھیوں کا تحفہ پیش کیا جسے اس نے قبول کر لیا۔ اس خیر مقدم کے بعد اینٹی اوکس نے ہند پر دست درازی تو نہ کی، البتہ سرحدوں کو پامال کرتا ہوا ہلمند دریا کے کنارے کنارے سیستان جا پہنچا اور صحرائے لوط کو عبور کر کے نرم شیر آیا اور سردیوں کا موسم کرمان میں بسر کیا۔ یہاں سے اس نے خلیج فارس کا رخ کیا اور گرا (؟) کو مسخر کر کے اپنی مہم کو ختم کر دیا۔" (بدخشانی 233:1967)

اینٹی اوکس کی ہند سے مصلحت اور مہم کی ناکامی سے بلخ کے یونانی حکمران سخت مایوس ہوئے بالآخر یہ کام انہوں نے سرانجام دیا۔ بلخ کے حکمران یوتی دیموس نے مشرقی افغانستان کا علاقہ فتح کیا ور اسے بلخ کی سلطنت میں شامل کیا جبکہ اس کے بیٹے نے مزید آگے بڑھ کر سندھ و پنجاب پر بھی قبضہ کر لیا (بدخشانی 234:1967)۔

دوسری طرف اشک سوم بھی بلخ کی فتح کا ارادہ رکھتا تھا مگر اسے زندگی نے مہلت نہیں دی اور وہ اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ ان کے بعد ان کا بیٹا فریاپت اشک چہارم کے لقب سے 196 قبل مسیح میں نیا اشکانی حکمران بنا۔ اشکانی حکومت کے قیام کے وقت یونانی حکمران کمزور ہو چکے تھے مگر انہیں وسط ایشیاء سمیت ایک وسیع و عریض خطہ زمین پر اب بھی سیادت حاصل

تھی اور ان کی برتری اب بھی ایک وسیع علاقے پر برقرار تھی۔ بلخ کا علاقہ بھی ان کے پاس تھا جہاں یونانیوں کا ایک اور گروہ حکمرن تھا۔ اشکانی دور میں بلخ کے حکمران اتنے طاقت ور ہو گئے تھے کہ جنہوں نے 206 قبل مسیح سے 185 قبل مسیح میں کافی عروج حاصل کیا۔اس دوران انہوں نے بلخ کی یونانی حکومت میں بلخ، سغد، مرو، کوہ پارا، پامیر (شمالی افغانستان) زرنگ (سیستان) اور قندھار وغیرہ کے علاقے شامل کر لیے تھے (بیُس۔2012:2214-15)۔

تاریخی کتب کے مطالعہ سے اس بات کے ٹھوس شواہد ملتے ہیں کہ بلوچستان کا علاقہ یونانی دستبرد سے محفوظ رہا۔ گمان کہتا ہے کہ اینٹی اوکس نے ہند سے واپسی پر بولان اور کوئٹہ سے ہوتے ہوئے سیستان کی راہ لی تھی کیونکہ مکران کی نسبت یہ راستہ زیادہ آرام دہ اور پُر سہولت تھا اور وسائل کی بھی کمی نہ تھی۔ اینٹی اوکس وسطی اور جنوبی بلوچستان کی جانب تو نہ گیا مگر شمال بلوچستان، بشمول نیمروز و سیستان، کرمان اور ساحل مغربی مکران کو اپنی تاخت کا نشانہ بنایا مگر یہ علاقے اُس کے نکل جانے کے بعد دوبارہ یونانی تسلط سے آزاد ہو گئے۔

بلخ کی طاقت سے اشکانی حکمران اردوان اول اور فریاپت سہمے رہے اور انہیں بلخ کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ فریاپت اشکانی سلطنت کے لیے کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام دیے بغیر 181 قبل مسیح میں فوت ہوا لہٰذا ان کی جگہ ان کے بیٹے فرہاد اول نے لی جس نے اشک پنجم کے لقب سے تاج و تخت سنبھالا۔ اشک پنجم نے تخت نشین ہوتے ہی سب سے پہلے دریائے آمل کے قریب رہنے والے مارد قبائل (یہ کردوں کا ایک مضبوط اور جنگجو قبیلہ تھا جو عرصہ دراز سے ان علاقوں یعنی البرز اور گیلان میں سرگرم تھا۔ ان کے قریب کدوسی کرد آباد تھے جو انہی کی طرح جنگجو اور ایرانیوں کے شدید مخالف تھے۔ ان کا ذکر ہیروڈوٹس نے ماردی کے نام سے کیا ہے) پر حملہ کیا جو کافی عرصہ سے پارت کے حدود میں لوٹ مار کر رہے تھے۔ وہ سلیو کی حکمرانوں کی رعیت تھے

مگر سلیوکی اب بہت ہی کمزور ہو چکے تھے لہٰذا وہ انہیں روکنے سے قاصر تھے لہٰذا اشک پنجم نے ان کے خلاف لشکر کشی کی اور طویل جنگوں کے بعد ان کا زور توڑنے میں کامیاب ہوا۔ اس نے رے کو فتح کر کے پارتھ میں شامل کیا۔ وہ پارتھی حکومت یعنی اشکانی سلطنت کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا تھا مگر عمر نے وفا نہ کی اور وہ بیمار ہوا۔ جب بیماری نے شدت اختیار کی اور انہیں بچنے کی کوئی امید نظر نہ آئی تو انہوں نے ایک انتہائی دانشمندانہ فیصلہ کیا اور اپنے خورد سالہ بیٹوں میں سے کسی کو اپنا جانشین مقرر کرنے کی بجائے اپنے بہادر اور عاقل بھائی مہرداد کو عنانِ حکومت سونپ دی۔ اس طرح ان کی دانشمندی کی وجہ سے سلیوکی اور بلخی حکومتوں کے مابین گھرے ہوئے پارتھی حکومت کو ایک مضبوط حکمران ملا جس میں ان دونوں دشمنوں سے اپنے ملک کو محفوظ رکھنے اور ان کا مقابلہ کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود تھی۔ لہٰذا اشک پنجم کی وفات 174 قبل مسیح میں اشک ششم کے لقب سے مہرداد اول نے عنانِ اقتدار سنبھالا۔ بقول مورخین:

> "اشک ششم نے اپنے چونیتس سالہ دورِ حکومت میں اشکانی سلطنت کو اتنا مستحکم اور وسیع کیا کہ بعد میں یہی سلطنت روم کی حریف اور ہمسر بنی" (بدخشانی 1967:236)۔

دوسری طرف سلیوکی یونانی حکومت اب ایشیاء میں پہلے جیسی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اس کا سارا وقار اور دبدبہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ سلیوکس چہارم کی وفات کے بعد اس کا بھائی اینٹی اوکس چہارم تخت پر براجمان ہوا۔ اس فضول خرچ حکمران نے بہت جلد شاہی خزانہ خالی کر دیا۔ بعد ازاں اس حکمران نے مصر اور اس کے شہروں کو فتح کیا اور لوٹ مار کر کے اپنے خزائن بھرے۔ یہودیوں پر حملہ کیا اور ان کے خزانے لوٹ کر سلیوکیوں کی دولت میں اضافہ کیا۔ مگر اس کے باوجود وہ یونانی دبدبہ قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد اینٹی اوکس مغرب کی جانب سے مایوس ہوا اور اس بات کا اسے احساس ہوا کہ مغرب اب مضبوط ہو چکا ہے اور وہاں سے مفادات کا حصول ناممکن ہو چکا ہے لہٰذا اس نے مشرقی ممالک کی جانب اپنی فتوحات کا رخ کیا۔

اس مقصد کے لیے اس نے پہلے آرمینیا والوں کو گھٹنے ٹیکنے اور خراج ادا کرنے پر مجبور کیا۔ بعد ازاں بلوچ قبائل کے قدیم مساکن مادستان اور لورستان پر حملہ کیا۔ پہلے میدوں کے دارالخلافہ ہمدان کا رخ کیا اور بغیر کسی تصادم کے اسے فتح کیا۔ اس کے بعد سلیو کی فوجوں نے لوریوں کے ملک لورستان کا رخ کیا اور اس کے مندروں سے دولت لوٹنے کی خاطر حملہ آور ہوا مگر لورستان کے پہاڑی باشندوں (کُرد و لوڑی قبائل کے جنگجوؤں) نے انہیں عبرت ناک شکست دی جس کی وجہ سے اینٹی اوکس مایوس ہوا پہلے وہ پاگل ہوا اور بعد میں اسی حالت میں 164 قبل مسیح میں انتقال کر گیا۔ اشک ششم نے سلیوکیوں سے طویل جنگیں لڑیں اور ان کے فتح کردہ اکثر علاقے ان سے چھین لیے۔ اسی طرح خراسان، وسط ایشیاء اور ایشیائے کوچک میں بھی اشک ششم فتوحات حاصل کرتا رہا اور اشکانی سلطنت کو وسعت دیتا رہا۔

اشک ششم نے اڑتیس سال حکومت کی اور اشکانی سلطنت کو خوب مستحکم کیا۔ اس کی سلطنت میں گرگان، بلخ، مرو، خوارزم، ہرات، سیستان، رخج، پنجاب، مارد قبائل (مردی کرد قبیلہ) کا علاقہ، رے، میڈیا، خوزستان (عیلام) پارس اور بابل شامل تھے۔ اشک نے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی اہم تجارتی شاہراہوں پر قبضہ کر کے اشکانی سلطنت کی وسعت اور دولت میں زبردست اضافہ کیا۔ اشکانی سلطنت کا یہ عظیم حکمران 136 قبل مسیح میں کچھ عرصہ بیمار رہ کر داعی اجل کو لبیک کہا اور اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ ان کی جگہ ان کا بیٹا فرہاد دوم اشک ہفتم کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ فرہاد دوم اپنے والد کے زمانے سے سلیوکیوں سے جاری جنگ میں مزید شدت لے آیا۔ بالآخر فرہاد دوم نے ہمدان میں اینٹی اوکس کو مار ڈالا اور سلیوکیوں کو عبرت ناک شکست دی۔ مگر بدقسمتی سے اسی دوران ساکا قبائل اور اشکانیوں میں اختلافات پیدا ہو گئے جس کی وجہ سے انہوں نے اشکانی سلطنت پر حملہ کیا۔ سلیوکیوں نے بھی ساکاؤں کا ساتھ

دیا جس کی وجہ سے اشکانیوں کو بدترین شکست ہوئی اور اس جنگ میں فرہاد دوم بھی مارا گیا۔ یہ جنگ 127 قبل مسیح میں لڑی گئی۔ فرہاد کے قتل کے بعد اس کا چچا اردوان دوم اشک ہشتم کے لقب سے تخت نشین ہوا اور صرف تین سال ہی حکومت کی گدی پر بیٹھنا اسے نصیب ہوا۔ اردوان دوم سابقہ اشکانی حکمران فریاپت کا بیٹا تھا۔ اشک ہشتم اردوان دوم کو تخت نشین ہوتے ہی کئی چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف ساکا اُس کے جان کے درپے تھے تو دوسری طرف سلیو کی یونانی پارتھ کی حکومت پر قبضہ کرنے کے خواہاں تھے جبکہ بابل اشکانیوں کے قبضہ میں ہونے کے باوجود اشکانیوں کو مدد دینے سے قاصر تھا۔ اسی دوران اشکانی سلطنت کو ایک اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا یعنی چین کے سرحدی علاقے کانسو سے وحشی یوچی قبائل نے مختلف ممالک اور ریاستوں پر حملے شروع کیے جس کی وجہ سے طخاری ساکاؤں کو اپنا علاقہ چھوڑ کر پارتھ کی جانب منتقل ہونا پڑا۔ طخاریوں نے پارتھ کے حدود میں گھس کر لوٹ مار شروع کی جس کی وجہ سے اشک ہشتم کو ان کے خلاف لشکر کشی کرنا پڑا۔ مگر اس حملے میں اشک ہشتم اردوان دوم زخمی ہوا اور ان زخموں کی وجہ سے انتقال کر گیا جس کی وجہ سے اشکانی لشکر کو مایوس اور شکست خوردہ حالت میں مرکز کی جانب لوٹنا پڑا۔ اشک ہشتم اردوان دوم کی وفات کے بعد اشکانی سلطنت کا مشہور حکمران مہرداد دوم 124 قبل مسیح میں تخت نشین ہوا جن کے دور میں اشکانی سلطنت ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی اور ایشیاء کی سیاست میں بڑی تبدیلی آئی۔ وہ علاقے جو بلوچ قبائل کی آبادی پر مشتمل تھے مہرداد دوم کے عہد کے دوران ان کی سیاست میں خاموشی چھائی رہی اور یہ علاقے زیادہ تر آزاد اور خود مختار رہے۔ البتہ سیستان اور شمالی ایران کے وہ علاقے جن میں بلوچ آبادی کی کثرت تھی، اشکانی سیاست میں سرگرم رہے۔ مہرداد دوم کے دور کے اہم واقعات میں ایک نئی ریاست پانٹس کا قیام، رومیوں کی دریائے فرات تک آمد اور چینیوں کا پہلی مرتبہ مغرب کی دنیا سے واقفیت اور

سفیروں کو پارتھی دربار میں بھیجنا شامل تھا۔ مہرداد دوم کا انتقال 86 قبل مسیح میں ہوا (بدخشانی 1967:246-251)۔

86 قبل مسیح سے لے کر 55 قبل مسیح تک ایران کی تاریخ مکمل طور پر واضح نہیں ہے۔ بعض ذرائع کے مطابق اس دوران تین آشکانی حکمران گدی نشین ہوئے یعنی سنتروک، فرہاد سوم اور مہرداد سوم۔ مگر ان کے حالات مکمل طور پر بیان نہیں ہوئے۔ سنتروک (اشک دہم) نے 86 قبل مسیح سے 67 قبل مسیح، فرہاد سوم (اشک یازدہم) نے 67 قبل مسیح سے 60 قبل مسیح تک اور مہرداد سوم (اشک دوازدہم) نے 60 قبل مسیح سے 55 قبل مسیح تک حاکمیت کی۔ ان حکمرانوں کی رومیوں کے ساتھ خونریز جنگیں اور شدید مخاصمت رہی۔ لہٰذا مشرق، شمال مشرق اور جنوب مشرق کی جانب اس دوران کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ شمالی ایران کے بلوچ علاقے اشکانیوں کے زیرِ تسلط تھے جبکہ مشرق کی جانب صحرا سے لے سندھ کی سرحدات تک اور جنوبی سمندر کے ساحلوں تک پھیلا ہوا بلوچ قبائل کا وسیع و عریض علاقہ آزاد و خودمختار رہا۔ گو کہ اس دوران بلوچستان کی تاریخ واضح نہیں ہے مگر اشکانیوں کی تاریخ میں اس خطے کا تذکرہ نہ ملنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ علاقے اشکانیوں کے تسلط سے آزاد تھے اور دیگر اقوام بھی اس جانب توجہ دینے کی بجائے زیادہ تر مغرب کی جانب رجوع کرتے رہے۔ اس دوران، مصر، روم، وسط ایشیاء، ایشیاءِ کوچک، شمالی ایران، خراسان اور آذربائیجان کی جانب سیاست کا زور رہا۔ 55 قبل مسیح میں اُردوان اول اشک سیزدہم کے لقب سے اشکانی حکمران بنا تو اس کی رومیوں کے ساتھ شدید اور خونریز جنگیں ہوئیں۔ حتیٰ کہ 37 قبل مسیح تک اُردوان اول حکمران رہا اس دوران ان کی مکمل توجہ مغربی محاذ کی جانب رہی۔ لہٰذا اس دوران بلوچ قبائل کے علاقوں کا تذکرہ تاریخ کے صفحات پر ناپید ہے۔ کم از کم اشکانیوں کی تاریخ میں ان علاقوں کے تذکرے نہیں ملتے۔ 37 قبل مسیح سے 2 قبل

مسیح تک فرہاد چہارم (اشک چہاردہم) 2 قبل مسیح سے 4ء تک فرہاد پنجم (اشک پانزدہم)، 4ء سے 8ء تک اُردوان دوم (اشک شانزدہم)، 8ء سے 16ء تک وونن اول (اشک ہفدہم)، 16ء تا 40ء تک اردوان سوم (اشک ہژدہم)، 40ء تا 46ء تک اردوان (اشک نوزدہم)، 46ء تا 51ء تک گودرز (اشک بیستم)، 51ء وونن دوم (اشک بیست و یکم) صرف چند ماہ، بالاش اول (بالاچ) (اشک بیست و دوم) 51ء سے 77ء تک اشکانی سلطنت کے حکمران رہے۔ ان کے دور میں اشکانی سلطنت زیادہ تر رومیوں کے ساتھ برسرِ پیکار رہی جبکہ مشرق کی جانب ان کی توجہ نہیں رہی۔ لہٰذا اگمان کہتا ہے کہ بلوچ قبائل کے علاقے مکمل طور پر اشکانیوں کے تسلط سے آزاد اور خود مختار ہو چکے تھے۔ افسوس اب تک ایسے ذرائع دستیاب نہیں ہو سکے جن کہ بنیاد پر بلوچ قبائل کی بود و باش رکھنے والے علاقوں کے بارے میں کوئی مفروضہ قائم کیا جا سکتا۔ صرف امکانی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ بلوچ علاقے زیادہ ثمر آور اور گنجان نہیں رہے تھے اور نہ ہی اس وسیع و عریض پہاڑی اور ریگستانی علاقے میں کوئی قابل ذکر شہر تھا اور نہ ہی یہاں دولت کے انبار تھے۔ آبادی کی کمی، وسائل کی ناپیدی، پانی کی شدید قلت اور علاقے کی پیچیدگی کی وجہ سے حکمرانوں کی توجہ اس جانب کم ہی مبذول رہی۔ لہٰذا انہی وجوہات کی بناء پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ بلوچ قبائل اپنے اپنے خطوں میں اپنے قبائلی روایات کے مطابق آزاد و خود مختار زندگی گزارتے تھے اور روزمرہ کے معمولات کو باہمی مشاورت سے سرانجام دیتے تھے۔

77ء میں اشکانی سلطنت کا زوال شروع ہوا اور یہ زوال بھی طویل ہوتا گیا۔ اس دوران کئی دیگر حکمران مسند آرا ہوئے مگر اشکانی سلطنت کے زوال کو نہ روک سکے۔ ان حکمرانوں کی آخر تک رومیوں کے ساتھ مخاصمت رہی۔ آخری اشکانی حکمران اردوان پنجم (اشک بیست و نہم)

تھا جسے پارس کے ساسانی گورنر اردشیر پاپکان نے شکست دی اور اشکانی سلطنت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ اس طرح اشکانی سلطنت کا طویل سفر اختتام پذیر ہوا۔

محققین کے مطابق اشکانی سلطنت میں خراسان (پارت)، دامغان، سمنان، ماد بزرگ یا عراق عجم، ہمدان گروس، کرمانشاہان، نہاوند، توپسرکان، عراق یعنی (سلطان آباد)، ماد کوچک (آذربائیجان)، آدیابن (آسور قدیم)، کردستان، آرمینیا بزرگ و کوچک، قزوین، رے، اصفہان، یزد، خوانسار، گلپائگان وکمرہ، ہترا، کلدۂ قدیم، بابل سے خلیج فارس تک، خوزستان، پارس، کرمان، سیستان، ساگارتی، شمالی ہند کا سلسلۂ کوہ، خراسان سے جیحوں تک کے علاقے شامل تھے۔ گوکہ یہ وسیع و عریض سلطنت تھی مگر ان علاقوں کی تفصیلات سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ شمالی ایران کے بلوچ علاقوں اور سیستان کے علاوہ باقی ماندہ بلوچ خطہ آزاد و خودمختار تھا اور آشکانی حکمرانوں کے قبضہ واختیار سے باہر تھا۔

کشان قبائل کی حاکمیت اور بلوچ خطے کی سیاسی حیثیت:

پارتھیوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک مقامی قبیلہ کشان نے پنجاب میں پارتھی حکمران کو شکست دی اور ٹیکسلا پر قبضہ کرلیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ پارتھی (آشکانی) اور کشانی حملے شروع ہونے کے دو صدی کے بعد تک ہندوستان کی سرحد کا شمالی حصہ پر، جس میں غالباً وادی کابل وسوات اور پشاور کے شمال اور شمال مغرب کے قرب وجوار کے چند اضلاع اور مشرقی پنجاب شامل تھے، یونانی بادشاہوں کی حاکمیت رہی۔ جو خواہ خود مختار تھے یا پارتھی طاقت کے زیر نگیں، چاندی اور کانسی کے سکے ڈھالنے کے مجاز ضرور تھے۔ ان ہندی یونانی بادشاہوں میں سے آخری بادشاہ ہرمیئس تھا جس کو کشان سردار کدفائس اول (کچولہ کدفیزا) نے 60ء میں مغلوب کیا۔ کدفیزس (کچولہ کدفیزا) نے گنڈوفریئس کے جانشین سے ایک طرف کابل اور

پنجاب کا تمام علاقہ چھینا اور پارتھیوں سے اسکے جانشین ویمہ کد فائزس نے شمالی ہندوستان بھی چھین لیا اور ایران کے خطے پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔ حتیٰ کے دریائے سندھ کے دھانے تک کا علاقہ اس نے اپنے عظیم الشان قلمرو میں شامل کر لیا۔ اس طاقت ور مقامی خاندان کی سلطنت میں کابلستان، ہرات، اراخوسیا (خراسان)، سکستان یا سیستان اور گیدروشیا (مکران) شامل تھے۔

125ء کے قریب وسیع و عریض سلطنت اس خاندان کے مشہور بادشاہ کنشک یا کنشکا کے زیر اقتدار آیا۔ جس نے اسے مزید وسعت دے کر تمام تر شمالی ہندوستان پر قبضہ کر لیا اور اپنی سرحدیں دریائے گنگا تک پہنچا دیں جبکہ ہندوستان کے شہر متورا کو اپنا دارالحکومت بنایا۔

کشان حکمران بدھ مت مذہب کے پیروکار تھے اور کنشکا بذات خود بدھ مذہب کا بڑا مبلغ تھا۔ بلوچستان کے اضلاع لورالائی اور بارکھان کی مختلف تحصیلوں کے قدیم مقامات سے اسی خاندان کے بادشاہوں سے متعلق کئی کتبے اور سکے برآمد ہوئے ہیں جبکہ بارکھان سمیت موسیٰ خیل، کوہلو کے قرب وجوار اور اس علاقے کے کئی دیگر مقامات پر عجیب وغریب اور غیر اسلامی طرز کے قبرستان ملتے ہیں جن کے بارے میں گمان ہے کہ یہ قبرستان آشکانیوں، یونانیوں اور کشانوں کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں اور کوہِ سلیمان کے مغربی پہلو کے قصبوں میں ان عجیب و غریب قبرستانوں کو باآسانی دیکھا جا سکتا ہے جن کی تعداد بیسیوؤں میں ہے۔ ان کی ہیت مختلف ہے اور یہ مختلف طرز کے ہیں۔ کہیں گول دائروں میں سینکڑوں قبریں ملتی ہیں تو کہیں بلند و بالا اور ہیبت ناک کتبوں والے قبرستان ہیں جن کے کتبوں پر خوناک انسانوں کی تصویریں اور مختلف شبیہیں بنی ہوئی ہیں۔ اسی طرح بعض کتبے دیو ہیکل تلواروں کی طرح ہیں جن کی لمبائی چھ فٹ کے لگ بھگ ہے تو کہیں پر سرونز (ایک بلوچی موسیقی کا آلہ) کی طرز کے کتبے ہیں۔ یہ کتبے منقش اور آراستہ ہیں جب کہ ان میں سے بعض انسانی قد سے زیادہ اونچے اور انتہائی وزنی اور

بھاری بھر کم ہیں۔ یہ غالباً لائم سٹون اور سینڈ سٹون سے تراش کر بنائے گئے ہیں۔ انسانی اور دیگر شبیہوں کی اور ان قبروں کی ہیبت ناک ہیئت کی وجہ سے بِلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ غیر اسلامی ادوار سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح بارکھان میں ایسے قبرستان بھی ہیں جن میں ہر قبر کے لیے الگ باؤنڈری وال بنی ہوئی ہے۔ یعنی ہر قبر کو الگ الگ بنایا گیا ہے اور ہر قبر کے چاروں طرف پتلے تراشیدہ اور غیر تراشیدہ پتھروں کی چھ سے آٹھ انچ یا اس سے کچھ کم و بیش اونچی باؤنڈی وال بنائی گئی ہے جس کی وجہ سے ہر قبر الگ الگ اور مکمل واضح نظر آتا ہے۔ اسی طرح کئی دیگر اقسام کے قبرستان بھی علاقہ بارکھان اور اس سے متصل اضلاع میں نظر آتے ہیں۔ ان علاقوں کی آثار قدیمہ پر تفصیلی تحقیق اور تفتیش کی اشد ضرورت ہے تاکہ بلوچستان کی ماضی کے تاریخ کی بہتر انداز میں پردہ کشائی ہوسکے اور یہاں کی تاریخ کو ترتیب اور صداقت کے ساتھ لکھنے میں مدد مل سکے۔ امکان یہی ہے کہ یہاں پر آثار قدیمہ کی کھدائی سے کشان عہد کے بارے میں زبردست انکشافات ہوں گے کیونکہ یہاں اسلامی عہد سے قبل کے لاتعداد مقامات ہیں جن کے بارے میں مقامی سطح پر عجیب وغریب حکایات وروایات پائی جاتی ہیں۔

ذیل میں ان حکمرانوں کے بارے میں مختصر معلومات اور اس خاندان کے حکمرانوں کے نام اور ادوارِ حکومت بیان کیے جارہے ہیں۔

۱۔ کجولہ کدفیزا۔(30سنہ ء سے 80سنہ ء تک) ۲۔ ویمہ تکتو یا سد اشکانہ (80سنہ ء سے 95سنہ ء تک)۔ ۳۔ ویمہ کدفائزس۔(95سنہ ء سے 127سنہ ء تک) ۴۔ کنشکا۔(127سنہ ء سے 140سنہ ء تک) ۵۔ وسشکا۔(140سنہ ء سے 160سنہ ء تک) ۶۔ ہوِشکا (اوِشکا)۔(160سنہ ء سے 190سنہ ء تک) ۷۔ وسودیوا اول (190سنہ ء تا 230سنہ ء تک)(wikipedia)۔

اشکانی اور کشان حکومتوں کا موازنہ:

کشان حکمرانوں نے جو سلطنت قائم کی اگر اس کا موازنہ اشکانی حکومت کے ساتھ کیا جائے تو بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کشانوں کا دور زیادہ منظم اور پُر امن تھا جبکہ ان کی حکومت مکمل طور پر مستحکم تھی۔ ان کے دشمن ان سے خوف کھاتے تھے اور ان کے خلاف سر اٹھانے سے اجتناب کرتے تھے جبکہ ان کے برعکس کشانوں کے طویل دور میں بغاوتوں اور جنگوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری رہا جو ان کے زوال اور خاتمے تک جاری تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اشکانیوں کی سلطنت کے حدود طویل و عریض تھے مگر اس طویل و عریض جغرافیہ میں اشکانی حکمرانوں نے ایک دن بھی سُکھ کا سانس نہیں لیا۔ انہیں روز کسی نہ کسی مہم پر جانا پڑتا۔ کشانوں کو امن کے مواقع ملے اور ان کے مخالفین نے اُن کے سامنے سرِ اطاعت خم کیا جس کی وجہ سے کشان حکمرانوں کو ملکی فلاح و بہبود اور ترقی کی جانب توجہ دینے کا موقع بھی ملا اور جنگی اخراجات نہ ہونے کی وجہ سے دولت کا بڑا حصہ ملکی ترقی اور عظیم الشان تعمیرات پر لگا گیا۔ ملکی دولت سے کئی نئے شہر بسائے گئے اور ملکی صنعتوں کو ترقی دی گئی۔ اس کے برعکس اشکانیوں کی دولت کا بڑا حصہ جنگی اخراجات کی نذر ہو جاتا تھا اور فوجی مہمات پر کثیر اخراجات خرچ ہوتے تھے۔ حکمرانوں کے ٹاٹ بھی شاہانہ تھے اور ضرورت پڑنے پر وہ عوام سے جبراً ٹیکس اور فوجی خدمات بھی لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اشکانی سلطنت میں ملکی ترقی اور تعمیرات پر زیادہ اخراجات نہ کیے جا سکے اور نہ ہی عوامی فلاح و بہبود کی جانب زیادہ توجہ دی جا سکی۔ اس کے باوجود کہ اشکانی سلطنت صدیوں تک جنگی حالت میں رہی اور بیرونی جنگوں کے ساتھ ساتھ اندرونی خلفشار اور طوائف الملوکی کا بھی سامنا کرنا پڑا، ایک عظیم الشان سلطنت تھی اور ایران کی عظمت پارینہ کو بحال رکھنے میں بنیادی کردار ادا کرتی رہی۔ کشانوں نے ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی جو بعد ازاں گندارا تہذیب کے نام

سے مشہور و معروف ہوئی جبکہ بدھ مت کی ترویج کے لیے بھی کشان حکمرانوں کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ اشکانی حکمران اپنی قدیم تہذیب و تمدن کو فنا ہونے سے بچانے کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور نہ صرف ایران کی عظمت پارینہ کو بحال کیا بلکہ زرتشتی مذہب کو یونانیوں کے ہاتھوں پہنچنے والے نقصانات کا بھی ازالہ کیا اور انہیں عیسائیت کی یلغار سے بھی بچائے رکھا۔ انہوں نے زرتشتی مذہب کی مقدس کتاب اوستا کو دوبارہ تحریر کروایا اور زرتشتی مذہب کو بحال کیا۔ کشانوں کی تعمیرات کی طرح اشکانیوں نے بھی تعمیرات کیے مگر چونکہ ان کی ساری زندگی مدافعانہ و جارحانہ جنگوں میں گزری اس لیے وہ اس میدان میں کشانوں سے پیچھے رہ گئے مگر اتنے بھی نہیں کہ ان کی کوئی نشانی نہ رہ گئی ہو۔ ایران اور وسط ایشیاء سمیت آرمینیا اور ایشیائے کوچک میں اب بھی اشکانی عہد کی لاتعداد نشانیاں آثار قدیمہ کی شکل میں بکھرے ہوئے ہیں جن کی نشاندہی کئی حضرات اور مصنفین نے کی ہے۔ اس حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں کہ کشان اور اشکانی ایک ہی سرزمین کے باشندے تھے اور قریب قریب آباد تھے مگر انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف کبھی جارحیت نہیں کی بلکہ اشکانی مغرب کی جانب متوجہ رہے تو کشانوں کا سارا زور مشرق کی جانب رہا۔ اس طرح ان دونوں ہمسایوں نے ایک دوسرے کو چھیڑنے یا نیچا دکھانے کی بجائے اپنے اپنے دائرہ اثر کو دیگر جوانب بڑھانے پر توجہ دی۔ کشانوں نے ہندوستان، پنجاب، سندھ، موجودہ پاکستان، بلوچستان، کسی حد تک وسط ایشیاء اور افغانستان وغیرہ کی جانب توجہ دی جبکہ کشانوں نے یورپ، ایشیائے کوچک، ایران، وسط ایشیاء اور مشرقِ وسطیٰ کی جانب دھیان دیا۔ اس طرح ان دونوں قوتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ مخاصمت اور دشمنی کرنے کی بجائے اپنی اپنی سلطنتوں کی وسعت اور استحکام اور اپنے مخالفین کے خاتمے کی جانب توجہ مبذول رکھی۔ لہٰذا صدیوں تک ان دونوں خاندانوں نے لگ بھگ تمام ایشیاء کو اپنے زیرِ اثر رکھا۔ حتیٰ کہ ان

دونوں خاندانوں کی حاکمیت کا خاتمہ ساسانی ایرانیوں کے ہاتھوں ہوا جنہوں اشکانی اور کشانی سلطنتوں کو فتح کرنے کے بعد ایک وسیع و عریض خطہ زمین پر حاکمیت کی اور سابقہ ایرانی تہذیب کو بامِ عروج تک پہنچایا۔

آشکانی اور کشانی قبائل کا بلوچ قوم کے ساتھ تعلق:

آشکانیوں اور کشانوں کے ادوار میں بلوچستان اپنی پوری وسعت کے ساتھ ان دو خاندانوں کے زیرِ اثر رہا۔ حتیٰ کہ مکران کا وسیع و عریض علاقہ بھی انہی خاندانوں کی حکومتوں میں شامل تھا۔ یقیناً آشکانیوں کے زیرِ اثر علاقے زیادہ تر طوائف الملوکی اور انتشار کا شکار رہے ان مقامی بغاوتوں کا سلسلہ ان کی حکومت کے اختتام اور زوال تک جاری رہا مگر اس کے باوجود وہ علاقے جو بلوچ قبائل پر مشتمل تھے نسبتاً پُرسکون اور پُرامن رہے۔ اسی طرح کشان عہد میں بھی بلوچ علاقے دیگر علاقوں کی نسبت زیادہ پُرسکون اور پُرامن رہے۔ امکان یہی ہے کہ بلوچ علاقوں سے ان حکمرانوں نے کوئی تعرض نہ رکھا اور نہ ہی ان کو کسی جارحیت کا نشانہ بنایا گیا۔ لہٰذا ممکن ہے کہ بلوچ علاقے یا تو ان کے دائرہ اختیار سے باہر تھے یا پھر مکمل طور پر ان قبائل کی حکومتوں کو دوام بخش رہے تھے۔

عجیب بات تو یہ ہے کہ جب ان خاندانوں کی حاکمیت کو زوال آیا اور ایرانی ساسانیوں نے ان کی حاکمیت کا خاتمہ کیا تو ان قبائل کا تذکرہ ہی تاریخ سے غائب ہوا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ قبائل صفحہ ہستی سے مٹ گئے اور ان کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا؟ نہیں یقیناً نہیں بلکہ جب ان کا سیاسی کردار نہیں رہا اور آہستہ آہستہ دیگر اقوام غالب آتے گئے تو یہ قبائل بھی غیر معروف ہوتے گئے۔ آج یہ قبائل اپنے اصل میں ہی نظر آتے ہیں یعنی ان کا جس سٹاک سے تعلق تھا

حاکمیت کے خاتمے اور غیر معروف ہو جانے کے بعد ان کا انفرادی نام آہستہ آہستہ تاریخ کے صفحات سے مٹتا اور محو ہوتا گیا مگر یہ اپنے اجتماعی سٹاک کے اندر زندہ رہے اور آج بھی ان قبائل کے کئی نامور لوگ بلوچستان کی سیاست سمیت کئی شعبوں میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ یقیناً اگر ان کا تعلق خطے کے دیگر اقوام میں سے ہوتا تو یہ قبائل ان میں بھی نظر آجاتے مگر نہ تو یہ قبائل خطے کے ایرانی آرین میں ملتے ہیں اور نہ ہی افغانوں میں۔ یہ جہاں بھی آباد ہیں خود کو بلوچ کہتے ہیں۔ چاہے ایران میں ہوں یا افغانستان میں، سندھ میں ہوں یا پنجاب میں کشانی اور آشکانی قبائل خود کو بلوچ ہی کہتے ہیں۔ لہٰذا اس مماثلت اور جذباتی و نظریاتی تعلق کی بناء پر ہی تو کہا جاسکتا ہے کہ ماضی کی آشکانی اور کشانی حکومتیں دراصل مقامی بلوچ قبائل نے قائم کی تھیں جو اُس زمانے میں منظم اور خوب طاقت ور تھے اور انہیں دیگر تمام بلوچ قبائل کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ یہ قبائل شمالی بلوچ خطوں سے تعلق رکھتے تھے اور ان علاقوں میں زمانہ قدیم سے اقامت پذیر تھے۔ جنوبی خراسان اور سیستان ان کی آبائی و اجدادی زمینیں ہی تو تھیں کہ جن کی محبت کی وجہ سے یونانی حملہ آور اور قبضہ گیروں کے خلاف علاقے کی دیگر قبائل کی بہ نسبت زیادہ سرگرم رہے وگرنہ جنوبی خراسان اور سیستان میں دیگر آباد کار بھی تھے مگر ان میں سے کسی نے بھی یونانیوں کے خلاف اس طرح سرگرمی نہیں دکھائی جس گرمجوشی اور مستعدی کے ساتھ ان قبائل نے اپنا کردار ادا کیا۔ خاندان اشکانی کا بلوچ سٹاک میں ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ جب اردشیر نے آرمینیا فتح کیا تو وہاں کے عوام کو اشکانیوں سے سخت ناراض اور نفرت کرنے والا پایا گیا۔ کیونکہ اشکانیوں نے ان کی مذہبی اور سماجی آزادی چھین کر ان پر بیجا سختیاں کر رکھی تھیں اور ان کے آتش کدے بندھ کروا کر انہیں قدیم بت پرستی اور مظاہر پرستی کی جانب رجوع کرنے کے لیے زور دیتے تھے جس کی وجہ سے اہل آرمینیا جو مذہباً زرتشتی تھے اور آتش پرست تھے وہ اشکانیوں کی ان پابندیوں کی وجہ سے

اُن سے سخت نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔ ان کی دل جوئی کے لیے اردشیر نے دین آتش پرستی پر قائم رہنے کی اجازت دے دی اور اشکانی شہزادوں اور امرا کو موت کے گھاٹ اتروا دیا۔ بعض جو بچ گئے بین النہرین، ہند اور افغانستان کی طرف نکل گئے۔ ان میں سے اُن بعض علاقوں میں، جہاں اشکانی خاندان کے افراد اپنے اپنے آپ کو مضبوط سمجھتے تھے، وہیں مقیم رہے (بدخشانی 1967:237-38)۔ اس بیان سے لگتا ہے کہ اشکانی غیر آرین اور ایرانیوں سے مختلف لوگ تھے۔ وہ اگر آرین ہوتے تو اُن حدود میں رہائش پذیر ہوتے جہاں اُن کی برادری اور قومیت کے لوگ آباد تھے مگر مورخین کے بیانات اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ فارسی حدود میں اُن کی نوآبادیات قائم تھیں جبکہ اُن کی اصل آبادی فارسی بولنے والے حدود سے باہر رہتی تھی۔ اُن میں سے جس کو بھی فرار کا موقع ملا اُس نے مشرق کی جانب فرار ہونے کو ترجیح دی۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ اشکانی مشرق میں اپنی اصل طاقت کو دیکھتے تھے اور انہیں اس بات کی تسلی تھی کہ اس جانب اُن کی اپنی قومی طاقت ساسانیوں سے زیادہ ہے اور وہ ساسانیوں سے اپنے علاقوں میں نبرد آزما ہوسکتے ہیں۔ وہ جنوبی اور جنوب مغربی افغانستان کے باشندے تھے جو زمانہ قدیم سے تاحال بلوچ قبائل کی آماجگاہ رہی ہے۔ آج بھی جنوبی افغانستان میں بلوچوں کی کثیر آبادی اقامت پذیر ہے جہاں اُن کی آبائی، اجدادی اور قدیمی جائیدادیں اور زمینیں ہیں۔ وہ اس خطہ کے قدیم ترین باشندے ہیں جو میدی دور میں بھی یہیں آباد تھے۔ لہٰذا اشکانی اپنی اسی اصل کی جانب لوٹ آئے اور ساسانیوں کے انتقام کے ڈر نے انہیں فوراً اپنی ہی برادری کے اندر جانے پر مجبور کیا۔ یہ تمام دلائل اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ موجودہ آشکانی بلوچ قبیلہ قدیم آشکانیوں ہی کا تسلسل ہے جنہوں نے آج تک اپنے قدیمی نام کو زندہ اور قائم رکھا ہوا ہے۔ یہی کچھ کشانوں کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ اس قدیم بلوچ قبیلہ کا تعلق موجودہ افغانستان میں شامل بلوچ علاقوں سے تھا جو

حاکمیت کے خاتمے کے بعد آشکانیوں کی طرح اپنے اصل کی جانب لوٹ آئے اور یہیں پر اپنے قدیمی نام کے ساتھ زندہ رہے۔

ان قبائل کی حاکمیت کے خلاف اکثر اقوام نے سرکشی کی اور بغاوت پر اُتر آئے مگر وہ علاقے جہاں بلوچ قبائل آباد تھے یا ان کی اکثریت تھی مکمل طور پر خاموش اور پُر امن رہے۔ حالانکہ بلوچ آبادی والے علاقے حملہ آوروں کے خلاف ہمیشہ مزاحم رہے ہیں۔ اسلامی دور کی مثال لیجیے جب عربوں نے بلوچستان کے مختلف علاقوں پر حملے کیے اور مقامی باشندوں کے ساتھ جنگیں لڑیں۔ ان جنگجوؤں اور حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت اُس وقت بھی جاری رہی جب پنجگور، کیچ، خضدار اور قلات میں اذانیں گونجتی تھیں یعنی مقامی باشندوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی مزاحمت جاری رکھی کیونکہ وہ عربوں کو حملہ آور سمجھتے تھے۔ اسی طرح محمود غزنوی اور مسعود غزنوی دونوں مسلمان تھے مگر مقامی باشندوں نے اُن کی مداخلت اور حملوں کے خلاف شدید مزاحمت پیش کی اور انہیں ہمیشہ حملہ آور کے روپ میں دیکھا۔ اس طرح کی کئی دیگر مثالیں اور بھی موجود ہیں جن میں مقامی باشندوں کی مزاحمت کی داستانیں ملتی ہیں مگر اشکانی اور کشانی عہد میں ایسی مثالیں ناپید ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ چونکہ مقامی قبائل انہیں اپنی حکومت سمجھتے تھے لہٰذا اسی وجہ سے بلوچ علاقے دیگر علاقوں کی نسبت پُر سکون اور پُر امن رہے سابقہ میڈ حکومت میں بھی بلوچ قبائل مکمل طور پر خاموش اور پُر امن رہے تھے اور میڈوں کی ہر سطح پر حمایت کی تھی کیونکہ وہ انہیں اپنی حکومت سمجھتے تھے۔ جبکہ ہخامنشیوں کے دور میں ان قبائل کی بغاوتیں تاریخ کے صفحات پر مرقوم ہیں۔ اسی طرح اس کے بعد بھی مقامی قبائل کی حکومتوں کے دوران بلوچ علاقے پُر امن رہے جبکہ غیر بلوچ حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت کا میدان ہمیشہ گرم رہا۔

ممتاز بلوچ ادیب و محققین ملک الشعرآ جناب میر گل خان نصیر اور جناب پروفیسر نادر قمبرانی اس بات کے دعویدار ہیں کہ بلوچستان کے براہوئی قبائل کشانوں کی باقیات میں سے ہیں۔ اپنے اس دعوے کو درست ثابت کرنے کے لیے وہ کشانی عہد کی ایک تحریر کو ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اُن کے مطابق یہ تحریر کشان عہد سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں جو کچھ تحریر ہے وہ واضح اور مکمل طور پر براہوئی زبان کے الفاظ ہیں جو کشانوں کی زبان تھی اور اُس زمانے میں اس پورے خطے میں رائج تھی۔ وہ الفاظ کچھ یوں ہیں:

”مہاراجہ سا، راجہ داراجہ سا، داؤ پوترہ سا، کجولہ کدفیزاسا“ (نصیر 1984:215)

مزید لکھتا ہے کہ:

ماہرین نے ان الفاظ کے معانی ”مہاراجہ ہے، راجاؤں کا راجہ ہے، آسمانوں کا بیٹا ہے، کجولہ کدفیزا ہے“ بیان کیے ہیں۔ اب ذرا غور کیجیے کہ ایک معمولی تغیرِ حرفی کے بعد یہ الفاظ براہوئی کے بن جاتے ہیں۔ مثلاً اس جملے کے لفظ ”سا“ کو براہوئی کے لفظ ”سے“ اور ”دا“ کو براہوئی کے ”تا“ یعنی ”د“ کو ”ت“ سے بدل کر دیکھی تو جملہ یوں بن جاتا ہے:

”مہاراجہ سے، راجہ تاراجہ سے، داؤ پوترہ سے، کجولہ کدفیزاسے“ (نصیر 1984: 215 علاوہ ازیں: نادر قمبرانی 1985 قلم قبیلہ میگزین)

جناب میر گل خان نصیر کشانی عہد کی اس تحریر کی بنیاد پر براہوئی زبان اور بعض براہوئی قبائل کو کشانوں سے متعلق بیان کرتا ہے۔ جبکہ نادر قمبرانی صاحب میر گل خان نصیر کے اس بیان کی حمایت اپنے ایک مضمون میں کرتے ہیں جو 1985ء میں قلم قبیلہ نامی ادبی جریدے نے شائع کیا تھا۔

میر گل خان نصیر اور نادر قمبرانی کے اس بیان سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے کہ تمام براہوئی قبائل یا براہوئی زبان کشانوں کی باقیات ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ کشان قبیلہ اب بھی

بلوچ اور براہوئی زبان بولنے والے قبائل میں ملتا ہے اور ایک جداگانہ بلوچ قبیلہ بھی ہے۔ اسی طرح اشکانی قبیلہ بھی ایک جداگانہ اور مضبوط بلوچ قبیلہ ہے جو مکران سمیت بلوچستان کے کئی دیگر اضلاع اور سندھ و پنجاب تک آباد ہے اور مضبوط جمعیت رکھتا ہے۔

مگر حیرت انگیز طور پر کشانوں اور اشکانیوں میں سے کسی نے بھی اپنے طویل دورِ حکومت میں بلوچستان کی ترقی کی جانب توجہ نہیں دی۔ بلوچستان کے طول و عرض میں نہ تو کشان عہد کا کوئی یادگار نظر آتا ہے اور نہ ہی اشکانی عہد کی کوئی نشانی یہاں ملتی ہے۔ حالانکہ کشانوں کی کئی یادگاریں اور مقبول و معروف مقامات پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخواہ اور شمالی علاقہ جات میں ملتی ہیں مگر بلوچستان میں ایسی کوئی نشانی نہیں ہے یا اب تک دریافت نہیں ہو سکی ہے جسے کشانوں سے منسوب کیا جاسکے۔ اسی طرح اشکانیوں نے بھی جنوبی سمت کے وہ علاقے جو بلوچ قبائل کی آبادیوں پر مشتمل تھے، میں کوئی ایسی نشانی نہیں چھوڑی کہ جو ان کے یادگار کے طور پر ان علاقوں میں ہوتی۔ لہٰذا ایسا اوقات ان کی یہ غفلت اس بات پر دلالت کرتی ہے یا یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ شاید یہ علاقے اُن کی دسترس میں ہی نہیں تھے بلکہ آزاد و خود مختار تھے شاید مورخین نے ویسے ہی ان علاقوں کے نام اُن کی سلطنتوں میں شمار کیے ہیں۔

ایران کے نئے حکمران خاندان ساسانی نے ان غافل حکمرانوں کو بہت جلد سبق سکھایا اور انہیں ان کی سلطنتوں سے محروم کر کے یہ تمام خطے اپنی قلمرو میں شامل کیا اور انہیں ان کی نااتفاقی اور کمزوری کی بھرپور سزا دی۔ اس کے بعد اشکانی اور کشانی قبائل کبھی بھی برسرِ اقتدار نہیں آئے اور نہ ہی ان کے اقتدار کے بعد کے حالات اور نہ ہی اُن کے کسی بھی سیاسی و سماجی کردار کا تذکرہ کتب تواریخ میں ملتا ہے۔

بلوچستان ساسانی ایرانیوں کے عہد میں:

ساسانی خاندان نے ایران کی قدیم تہذیب کو جو صدیوں سے انتشار و افراتفری، توڑ پھوڑ اور زوال کا شکار تھا دوبارہ استحکام دیا اور وہ عروج اسے عطا کیا کہ جو صرف ہخامنشی خاندان کے دور میں اسے حاصل تھا۔

بدترین ملوکیت کی بنیاد پر قائم کردہ ساسانی حکوت کا بانی اردشیر پاپکان (بابکان) تھا کہ جس کے باپ کا نام ساسان بتایا جاتا ہے۔ اس نے 226ء میں ایک مختصر سی فوج کے ساتھ طوائف الملوکی کا شکار ایران کو متحد کرنا شروع کیا اور مقامی خود مختار مگر آپس میں نبرد آزما تمام بادشاہوں کو الگ الگ شکست دے کر ان کے علاقوں اور مال و اسباب پر قابض ہوتا گیا اور آخر کار ایک وسیع خطہ زمین اس کے زیر اثر آیا۔ تب اس نے پارتھی (آشکانی) حکمران اردوان کو شکست دے کر ایک وسیع و عریض ملک کا حکمران بنا۔ ان فتوحات کے بعد اس نے سب سے پہلے اپنے ملک اور فوج کو نئے سرے سے منظم کیا۔ ملک میں اقتصادی اور زرعی اصلاحات کئے جس سے ملک کی آمدنی میں زبردست اضافہ ہوا اور ملک میں خوشحالی آگئی۔ مگر در حقیقت یہ تمام تر دولت کا حصول ایران کے قدیم جغرافیائی حدود کو بحال کرنے کیلئے تھا جو حدود ہخامنشیوں اور پارتھیوں کے دور میں قائم تھے مگر اس وقت تک تنزل اور تقسیم کا شکار تھے۔ باقی ماندہ حصہ تو وہ منظم کر چکا تھا مگر ایک حصے پر ابھی تک شاہان کشان کا اقتدار قائم تھا فوج اور معیشت کو از سر نو منظم اور طاقت ور بنانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ شاہان کشان سے دو دو ہاتھ کر کے ان سے ان کا علاقہ چھین کر سابقہ ایرانی شہنشاہیت کے حدود بحال کئے جا سکیں اور آخر کار اردشیر نے شاہان کشان کو کئی لڑائیوں میں پے در پے شکست دے کر ان سے وہ تمام علاقے چھین لئے جو کبھی شاہان ایران کے زیر اقتدار تھے اور اس نے سابقہ ایرانی تہذیب کو اسکے پورے جاہ و جلال اور وقار و اعزاز کے ساتھ بحال کر دیا۔

ملک سعید دہوار پروفیسر آرتھر کرسٹن سین کے حوالے سے لکھتا ہے کہ اردشیر نے درج ذیل علاقے فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کئے۔

> ”پروپانیساد، کاوا (کابل) اراخوزیا، درنگیانا، گندارا، بلخ، سغد، مرو، آرمینیا، خوارزم، ہرات، ترکستان، پنجاب، مکران۔“ (دہوار 1990:205-06)

جبکہ ہرٹفلسٹ کی تحقیقات کے حوالے سے مذکورہ مصنف ان علاقوں کی نشاندہی کرتا ہے جو بہرام دوئم کے دور تک ساسانی مملکت میں شامل تھے۔

> ”ہرکیانا (گرگان)، تمام خراسان، سغد، سیستان، مکران، توران، گزرگائے سندھ کا درمیانی علاقہ، اس کے دہانے کے آس پاس کے علاقے، کچھ، کاٹھیاواڑ، مالواہ اور اس کے پرے کا علاقہ شامل تھا اور فقط گندارا اور کابل شاہان کشان کے زیر فرمان تھے۔“ (دہوار 1990:205-06)

ساسانی خاندان میں بڑے بڑے اور نامور حکمران گزرے ہیں کہ جنہوں نے ایرانی تہذیب کا ہر ایک سے لوہا منوایا۔ اس خاندان کے دور اقتدار میں بلوچستان اور یہاں کے بلوچ باشندوں کا نہایت اہم کردار رہا ہے جنکی تفصیلات شاہنامہ فردوسی میں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں بھی کئی دیگر کتب، جن میں ساسانی خاندان کی ایران پر حاکمیت کی تاریخ ملتی ہے، میں بلوچ قبائل اور ان کے وطن کے تذکرے ملتے ہیں۔ ساسانیوں میں بڑے بڑے نامور حکمران گزرے ہیں جنہوں نے ایرانی تہذیب کو وہ بلندی اور معراج عطا کیا جو اسے دارا اول کے زمانے میں بھی حاصل نہ تھا۔ ساسانی تہذیب دنیا کی سب سے بڑی اور اعلیٰ تہذیب بن گئی۔ اس خاندان نے اُس وقت کی معلوم دنیا پر اپنا رعب و دبدبہ اور دھاک بٹھا دیا۔ ایران کے ساسانی خاندان کے حکمرانوں اور ان کے دورِ حکومت کے چیدہ چیدہ واقعات کی تفصیلات ذیل میں مختصر بیان کی جا رہی ہیں۔ ان بیانات میں بلوچ قبائل اور خطے کے ساتھ ساسانیوں کے تعلقات کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔

ایران کے ساسانی حکمران:

ایران کا پہلا ساسانی حکمران اردشیر پاپکان (بابکان) ابنِ ساسان تھا جس کا شمار ایران کی تاریخ کے عظیم حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ اردشیر نے ساسانی خاندان کے حاکمیت کی بنیاد 226ء میں رکھی۔ اس سے قبل وہ ایک گورنر کی حیثیت سے اشکانی سلطنت میں خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ لہٰذا اس نے ساسانی خاندان کی حکومت کا بانی بننے سے قبل ہی اشکانی سلطنت سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے فارس میں اپنی خودمختاری قائم کرلی تھی جس کی خبر آخری اشکانی حکمران اردوان پنجم کو بھی ہو چکی تھی اور اب وہ کسی نہ کسی طرح اردشیر کو راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ پھر جب اس نے اردشیر کی درخواست پر چند دیگر علاقوں کی حاکمیت اُسے نہ دی جنہیں اردشیر نے بزور فتح کیا تھا اور وہاں کے اشکانی حکومت کی جانب سے متعین کردہ گورنر کو قتل کر دیا تھا تو اردشیر سیخ پا ہوا۔ لہٰذا اردوان پنجم اشکانی اُس سے سخت برافروختہ اور ناراض تھا۔ ان حالات میں اردشیر نے بھی اشکانیوں سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے قابل ترین لوگوں کو اپنے معتمدین اور مشیروں میں شامل کیا اور فارس بھر میں ایسا نظام اور ایسی سختی قائم کی کہ کسی کو بھی اس کے خلاف سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس نے اپنے باغی بھائیوں اور چند فوجی جرنیلوں کو ایسی عبرت ناک سزا دی کہ جس کی وجہ سے اہل فارس میں سے کسی کو اس کی مخالفت کا یارا نہ رہا۔

یہ انتظامات کرنے کے بعد اُس نے کرمان پر حملہ کیا جہاں اشکانی حکومت کی طرف سے متعین کردہ گورنر بالاش (بالاچ) تھا۔ اسے بدخشانی نے طبری اور البیرونی کی تقلید کرتے ہوئے بلاش تحریر کیا ہے۔ حاکمِ کرمان بالاش فوج لے کر مقابلے کو نکلا مگر شکست کھائی اور کرمان پر اردشیر نے قبضہ کر لیا (بدخشانی 1967: 233)۔

دوسری طرف جب اردوان پنجم کو اردشیر کی اس حرکت کا علم ہوا تو سخت غضبناک ہوا اور اُسے سزا دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اُس نے اردشیر کو درج ذیل مضمون پر مشتمل ایک مراسلہ بھیجا:

> ”تم استخر کے رہنے والے ایک دہقان کے بیٹے ہو۔ تمہارا باپ بابک اپنے گاؤں کا معمولی سردار تھا۔ تم اپنی ہستی کو بھول گئے ہو۔ تم نے میرے ماتحت علاقوں، یعنی فارس اور کرمان کے حاکموں کے خلاف فوج کشی کی، انہیں قتل کیا اور اپنی حکومت قائم کر لی۔ تمہیں تخت و تاج سے کیا نسبت ہے۔ میں نے اہواز کے حاکم کو حکم دیا ہے کہ تمہارے خلاف فوج کشی کرے اور تمہیں اسیر کر کے دربار شاہی میں بھیجے“ (بدخشانی 1967: 233)۔

اردوان کے اس خط کا اردشیر نے درج ذیل جواب دیا:

> ”ملک اور ملک کا تاج و تخت اہورمزدا کی بخشش سے مجھے ملا ہے۔ مجھے یقین ہے، میں عنقریب تم پر فتح پا کر تمہیں کیفر کردار تک پہنچاؤں گا“ (بدخشانی 1967: 233)۔

اس کے بعد اردشیر نے اپنی فتوحات کا نہ رُکنے والا ایسا سلسلہ شروع کیا جو بالآخر اردوان پنجم کی موت اور اشکانی سلطنت کے اختتام تک جاری رہا۔ اُس نے الاہواز کو فتح کیا اور اپنا دارالخلافہ وہیں منتقل کیا۔ بعد ازاں اصفہان فتح کیا اور اسے اپنی نوخیز سلطنت میں شامل کیا اس کے بعد اردوان اور اس کا آمنا سامنا ہوا۔ بعض مورخین اس واقعہ کو 224ء جبکہ اکثر 226ء کا واقعہ لکھتے ہیں۔ اردوان پنجم اور اردشیر کے مابین ہرمز کے علاقے میں ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں اردوان پنجم مارا گیا اور اشکانی سلطنت پر اردشیر نے قبضہ کر لیا۔ اس طرح اُس نے اپنے سابقہ آریائی خاندان کے ہخامنشی حکمرانوں کی پیروی کرتے ہوئے شہنشاہ کا لقب اختیار کیا اور اپنے مورث اعلیٰ ساسان کے نام پر ساسانی عہد کی بنیاد رکھی۔ بلوچستان اور بلوچ قبائل کے اکثر علاقے اس وقت تک کوشان حکمران کے زیر اثر تھے۔ بدخشانی ہرٹفسلڈ کی تصدیق کردہ علامہ طبری کے حوالے سے لکھتا ہے کہ:

”شاہِ کوشان نے جس کے قبضے میں وادیِ کابل، پنجاب، توران، مکوران (کوئٹہ) اور مکران تھے، اردشیر کے پاس اپنے سفیر بھیجے“ (بدخشانی 1967 :235)۔

مورخین کے مطابق اردشیر نے پنجاب تک کے علاقے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کیے اور ہندوستان کے حکمران ”جونہ“ سے خراج وصول کیا۔ اور اس پر سالانہ خراج بھی عائد کیا(بدخشانی۔1967 :236)۔

یہ درست ہے کہ اردشیر ایک نیک سیرت اور عادل حکمران تھا اور اشکانیوں کے ظالمانہ ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے عوام کو انہوں نے کافی مراعات دیے اور ان کی محصولات میں خاطر خواہ کمی کر کے اُن کے دل جیت لیے۔ ان کی فلاح و بہبود کی خاطر شاہی خزانے کے منہ کھول دیے۔ بالخصوص زراعت کو خوب ترقی دی۔ اُس کے ان کاموں اور عدل و انصاف کی وجہ سے مشرق کے اُن علاقوں نے بھی بخوشی اُس کی اطاعت قبول کی جنہوں نے اس سے قبل اشکانیوں کے تسلط کو بھی قبول نہیں کیا تھا۔ بلاشبہ ایران کے مشرق میں بلوچ قبائل کے علاقے تھے جو اشکانیوں کے تسلط سے آزاد تھے۔ ان علاقوں میں مکران، موجودہ جھلاوان (سابقہ توران) قلات، مستونگ اور کوئٹہ وغیرہ شامل تھے۔ ان علاقوں میں ساسانی عہد کی کئی یادگاریں قدیم آثار کی شکل میں ملتے ہیں۔ ان میں قدیم ٹیلے، کاریزات اور قبرستان وغیرہ شامل ہیں۔ مگر ان آثار پر اب تک وسیع پیمانے پر کام نہیں کیا گیا ہے۔ اگر بلوچستان کے آثار قدیمہ پر وسیع پیمانے پر کام کیا جائے تو ساسانی عہد کی کئی یادگاریں منظر عام پر آسکتی ہیں جن سے اس دور میں بلوچستان کے حالات کی درست تصویر کشی کی امید ہے۔

ساسانی حکومت کا بانی اور عظیم حکمران اردشیر پاپکان 240ء میں فوت ہوا اور ان کی جگہ اُن کا بیٹا شاہ پور اول نیا ساسانی حکمران بنا۔ شاہ پور اول کی زیادہ تر توجہ آرمینیا اور عراق کی

بغاوتوں پر رہی اور ساتھ ہی رومیوں کے ساتھ قدیم مخاصمت بھی مسلح تصادم کی صورت میں جاری وساری رہی۔

شاہ پور نے طویل مدت تک حاکمیت کی اور 271ء میں انتقال کر گیا۔ اس کے انتقال کے بعد ساسانی تاج و تخت ہُرمز اول کو ملے مگر اس نے صرف ایک سال اور چند ماہ حکومت کی۔ اس کے ساتھ عمر نے وفا نہ کی اور وہ 272ء میں استخر میں انتقال کر گیا۔ ہرمز کے مرنے پر اس کے بھائی بہرام اول کو حاکم بنایا گیا۔ یہ بھی طویل حکمرانی نہ کر سکا اور صرف چار سال کی حاکمیت کے بعد 275ء میں اس کا بھی انتقال ہوا۔ ہرمز اور بہرام اول کے حکومتوں کے دورانیے چونکہ کم تھے اس لیے ان میں بلوچ قبائل کے علاقوں کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ بہرام اول کے دور میں مانی مذہب نے مقبولیت حاصل کی اور بابل اور اس کے مضافات کے لوگوں میں عام ہوا تو اسے ایران میں پھیلانے کی کوشش کی گئی۔ پہلے یہ کوشش شاہ پور اول کے دور میں کی گئی مگر مانی کو ناکامی ہوئی اب وہ بہرام اول کی کم عمری سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا مگر بہرام نے اس کی باتیں سن کر اس کی کھال کھینچنے کا حکم دیا لہٰذا فوراً اس کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ بہرام اول 275ء میں انتقال کر گیا تو اس کی جگہ بہرام دوم تخت نشین ہوا۔ بہرام دوم نے بھی طویل عرصہ تک حکومت کی ان کی حاکمیت تقریباً سترہ سال رہی اور 292ء میں وہ فوت ہوا۔ ایران کی تاریخ میں بہرام دوم کو ایک ظالم حکمران کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ اس نے اپنی حکومت کو بھی جبر و ظلم کے ذریعے مستحکم کرنا چاہا مگر ایران کی رعایا نے اس کے رویے کے خلاف بھرپور احتجاج کیا اور امرآ کے ایک گروپ نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ اسے تاج و تخت سے سبکدوش کیا جائے اور اس کی جگہ کسی معقول شخص کو زمامِ حکومت سونپ دی جائے۔ مگر ملک کے مذہبی سربراہ یعنی موبدِ موبدان نے امرآ کو ایسا کرنے سے منع کیا اور خود بہرام کو پند و نصائح کیے تو اُس

کی طبیعت میں بھی خوشگوار تبدیلی آئی اور اس نے اپنا طریقہ کار بدل دیا۔ بہرام دوم کے دور میں بلوچ قبائل کے اہم ترین علاقے سیستان اور افغانستان کے کچھ حدود میں بغاوت ہوئی۔ یہ بغاوت اُن ساکاؤں نے کی جو عرصہ دراز سے یہاں سکونت پذیر تھے۔ مگر بہرام نے انتہائی بیدردی کے ساتھ اس بغاوت کو کچل ڈالا اور ساکاؤں کو اطاعت پر مجبور کیا۔ اس کے علاوہ بہرام دوم بھی اپنے اجداد کی طرح رومیوں کے ساتھ الجھا رہا۔ اسے کچھ اندرونی مسائل کا بھی سامنا رہا مگر وہ انہیں سلجھانے میں کامیاب رہا۔ اس نے بھی دیگر آریائی حکمرانوں کی طرح تخت جمشید کی چٹانوں پر اپنے یادگار چھوڑے ہیں۔ اس کا انتقال 292ء میں ہوا تو ان کی جگہ اُن کا بیٹا بہرام سوم حکمران بنا مگر اسے صرف چار ماہ حکومت کرنے کے بعد بڑے شاہ پور یعنی شاہ پور اول کے بیٹے نرسی نے ایک جنگ میں شکست دی اور اس کی جگہ 293ء میں ایران کا نیا ساسانی حکمران بنا اور اس کی رسم تاج پوشی ادا کی گئی۔ نرسی اعلیٰ ظرف رکھنے والا مگر سیدھا سادھا حکمران تھا البتہ اُسے روز نئے کپڑے پہننے کا شوق تھا جبکہ کھانا وہی کھاتا جو سب کے لیے پکتا تھا۔ اُن کی ساری توجہ رومیوں کی جانب رہی جنہوں نے ایک جنگ میں اسے شکست دے کر اس کے پانچ اہم صوبے اُس سے چھین لیے۔ اس ساسانی حکمران کی اہم ترین اور غور طلب بات یہ تھی کہ وہ کبھی معبد میں نہیں گیا اور نہ ہی کبھی آگ کی پوجا کی۔ جب اُس سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے جواباً کہا کہ :

”خدا کی پرستش مجھے اتنی مہلت نہیں دیتی کہ میں آگ کی پرستش کر سکوں“۔

اس کا انتقال 301ء میں ہوا۔ ان کے بعد ان کا بیٹا آذر نرسی حکمران بنا مگر اس کے بیجا ظلم وستم اور جبر و تشدد کی وجہ سے دربار کے امرا ٔ اور عام وخاص اس سے سخت نالاں ہو گئے۔ پھر جب نرسی آذر نے درباری امرا ٔ میں سے چند ایک کو قتل کر دیا تو امرا ٔ بھی بپھر گئے انہوں نے نرسی آذر کو بھائیوں سمیت مار ڈالا اور اس کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ شاہی خاندان میں اب کوئی بھی نرینہ نہ تھا جسے حاکمیت سونپ دی جاتی۔ نرسی آذر کا ایک بھائی بھاگ کر رومیوں کے پاس پناہ

لے چکا تھا مگر ایرانی اُس سے سخت نفرت کرتے تھے اور اُسے تخت و تاج کے قابل بالکل نہیں سمجھتے تھے۔ اتفاق سے ہرمز دوم کی ملکہ امید سے تھی اور مذہبی پیشواؤں نے یہ پیشگوئی کی تھی کہ ملکہ کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا۔ لہٰذا ایرانی امراء نے بچے کی پیدائش سے قبل ہی ملکہ کی خواب گاہ میں شاہی تاج کو ایک کھونٹے سے لٹکا دیا۔ ثعلبی لکھتا ہے کہ

> ”یہ دنیا کا پہلا اور آخری بادشاہ ہے جسے شکم مادر ہی میں بادشاہ تسلیم کیا گیا۔“ (شاہنامہ ثعالبی مترجم: محمود ہدایت :273)

لہٰذا جب بچہ پیدا ہوا تو اس کا نام شاہ پور رکھا گیا۔ شنید میں ہو کہ یہ وہی شاہ پور ہے جسے تاریخ میں شاہ پور اعظم کہا جاتا ہے۔ اس کی تخت نشینی شکم مادر سے ہی یعنی 309ء سے شروع ہوئی اور 379ء تک رہی۔ شاہ پور نے ستّر سال حکومت کی اسے اس کے چوڑے شانوں کی وجہ سے شاہ پور ذوالاکتاف بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی ساری زندگی جنگ و جدل اور اپنے دشمنوں کو زیر کرنے میں گزری۔ ان کے دور میں روم میں قسطنطین کی حکومت تھی جس نے عیسائی مذہب قبول کر کے اسے روم کا سرکاری مذہب قرار دیا اور اپنے آپ کو تمام دنیا کے عیسائیوں کا سرپرست اعلیٰ قرار دیا۔ ان کی اس پالیسی کی وجہ سے روم اور ایران کے مابین جاری سابقہ دشمنی میں مزید شدت آگئی کیونکہ وہ ایرانی آتش پرست تھے اور عیسائیت کو اپنے مذہب کے مقابلے میں کمتر سمجھتے تھے۔ اس طرح روم اور ایران کی سیاسی جنگ میں مذہب نے شامل ہو کر اس دشمنی میں مزید شدت پیدا کی۔ روم اور ایران کی جنگیں شاہ پور کی حکومت کے پورے دورانیے میں جاری رہے۔ علاوہ ازیں ان کے دور میں آرمینیا کا قضیہ بھی جاری رہا جو روم اور ایران کے مابین ہمیشہ وجہ نزع بنا رہا۔ یہ بیدار مغز حکمران نے ایران کے وہ علاقے جو عراق میں تھے اور نرسی کے دور میں رومیوں کے قبضے میں چلے گئے تھے، رومیوں سے واپس لینے میں کامیاب ہوا۔ شاہ پور اعظم کے دور میں سندھ و ہند کی حکومتوں کو مراسلے لکھے گئے اور انہیں سالانہ خراج بروقت ادا کر

نے کی ہدایت کی گئی جن پر سندھ و ہند کے حکمرانوں نے فوراً عمل کیا (بدخشانی 1967 :396)۔ بلوچستان میں کئی مقامات ایسے ہیں جن پر گمان کیا جاتا ہے کہ وہ اسی عظیم ساسانی حکمران کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں یا ان کے عہد میں ان کو شہرت ملی۔

شاہ پور اعظم کے دور میں بلوچستان کی تاریخ پردہ اخفائیں ہے اور اس کے بارے میں تفصیلات ناپید ہیں۔ گمان کہتا ہے کہ ان کے دور میں بلوچستان کا خطہ پُرامن رہا اور مقامی حکمرانوں نے نظام عدل اور نظام سلطنت بہتر ہونے کی وجہ سے ایرانیوں سے مخاصمت کی بجائے ملکی ترقی کی جانب توجہ دی۔ بلوچستان کے علاقہ مستونگ میں ایک ٹیلہ سام پور کے نام سے موسوم ہے مگر اصل میں اس ٹیلہ کا نام شاہ پور کا ٹیلہ ہے مگر مقامی آبادی اسے اپنے لب و لہجے اور زبان میں سام پور کے نام سے موسوم کرتی ہے۔ مستونگ ہی میں کئی دیگر ٹیلے بھی ہیں جو کسی نہ کسی ساسانی حکمران سے منسوب ہیں۔ شیخ واصل کے قریب ایک مشہور ٹیلہ ہے جسے دمبِ بہمن کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی طرح سپید بلندی کا ٹیلہ بھی مستونگ میں واقع ہے جو اسی دور کی یادگار ہے۔ یہاں سے ساسانی عہد کی کئی اشیاء بھی برآمد ہوئے ہیں۔ ان ٹیلوں کی مزید کھدائی اور ان پر سائنسی طریقہ کار کے مطابق طویل المدتی کام سے یقیناً کئی نئے اور اہم علمی و تاریخی انکشافات کی امید ہے۔ علاقہ مستونگ کے علاوہ بھی بلوچستان کے دیگر اضلاع میں ایرانی اور بالخصوص ساسانی عہد کی یادگاریں ملتی ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں تلاش کرکے ان پر مزید تحقیق و تفتیش کی جائے اور بلوچستان کی تاریخ کے بند اوراق کھولنے کے لیے سعی و کوشش کی جائے۔

شاہ پور ستّر سال کی طویل حکمرانی کرنے کے بعد 379ء میں انتقال کر گیا۔ ان کے انتقال کے بعد اردشیر دوم ایران کا نیا ساسانی شہنشاہ بنا۔

اردشیر دوم ایک نیک اور ہمدرد حکمران تھا مگر اسے عمر نے مہلت نہ دی اور وہ صرف چار سال حکمرانی کرنے کے بعد 383ء میں انتقال کر گیا۔ البتہ اس نے اپنے عہد میں ایک ایسا کام کیا کہ جس کی وجہ سے اس کا نام تاریخ میں ہمیشہ کے لیے زندہ رہا یعنی اس نے برسرِ اقتدار آکر عوام کے سارے ٹیکس معاف کر دیے جس کی وجہ سے وہ عوام میں اردشیر نیکوکار کے نام سے معروف ہوا اور تاریخ میں بھی اسے اسی نام سے یاد رکھا گیا۔ اردشیر دوم کے انتقال کے بعد شاہ پور اعظم کا بیٹا شاہ پور سوم 383ء میں ساسانیوں کا نیا شہنشاہ بنا۔ ان کے دور کا اہم واقعہ آرمینیا کی دو حصوں میں تقسیم تھی جس سے آرمینیا کا مشرقی علاقہ ایرانیوں جبکہ مغربی حصہ رومیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ پانچ سال حکومت کرنے کے بعد 388ء میں شاہ پور سوم کا انتقال ہوا تو اس کے بھائی بہرام چہارم کو بالاتفاق تختِ ایران پر متمکن کیا گیا۔ بہرام چہارم نے گیارہ سال حکومت کی۔ شہنشاہ بننے سے قبل وہ کرمان کا گورنر تھا اور وہاں وہ انتہائی معروف اور ہر دلعزیز تھا لہٰذا ایرانی عوام میں وہ کرمان شاہ کے نام سے معروف و مقبول تھا (بدخشانی 1967: 400)۔

بہرام چہارم کے عہد کے اہم واقعات میں ایک تو آرمینیا کی بغاوت تھی جسے اُس نے بزورِ طاقت کچل دیا۔ ایک اہم واقعہ رومی سلطنت کی دو جداگانہ حصوں میں تقسیم تھی۔ یعنی روم کی سلطنت دو حصوں روم اور بازنطینیہ میں تقسیم ہوگئی۔ بازنطینیہ کا دارالخلافہ قسطنطنیہ تھا جو ایران کا ہمسایہ تھا۔ علاوہ ازیں ان کے دور میں ایرانی فوج میں بھی پھوٹ پڑ گئی اور نوبت تصادم تک پہنچی جس میں 399ء میں بہرام مارا گیا۔ ان کے قتل کے بعد ساسانی شہنشائیت کا تاج یزدگرد گنہگار کے سر پر سجا جس نے اکیس سال حکومت کی۔ یزدگرد گنہگار گو کہ ہمدرد اور نرم مزاج تھا مگر عیسائیوں کے لیے نہ کہ اپنے ہم وطن و ہم قوم ایرانیوں کے لیے۔ کیونکہ اُس نے اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائیت قبول کی تھی جس کی وجہ سے وہ مجوسیوں میں گنہگار جبکہ رومی عیسائیوں میں

نیکوکار کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے باز نطینی شہزادے یعنی ولی عہد کی تربیت خود کی جبکہ اپنے بیٹے کو تربیت کے لیے عربوں کے حوالے کیا۔ حکمرانی کے آخری سالوں میں وہ عیسائیوں کے مظالم، ناروادارى، آتش پرست زرتشتیوں کے عبادت خانوں کی بربادی اور انہیں ایزارسانی کی وجہ سے عیسائیت سے تائب ہو کر دوبارہ اپنے مذہب پر لوٹ آیا اور عیسائیوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ لہٰذا انہیں دی گئی تمام تر مذہبی آزادی اور مراعات واپس لے لیے۔ اُس نے اکیس سال حکومت کی اور 420ء میں اس کا انتقال ہوا۔ یزدگرد کے تین بیٹے تھے بڑا بیٹا شاہ پور آرمینیا کا حکمران تھا، جبکہ نرسی اور بہرام ابھی نابالغ اور کم عمر تھے جبکہ ایرانی امرا ٔیزدگرد جیسے حکمران سے چھٹکارا پانے کے بعد اب اُس کے کسی بھی بیٹے کے حکمرانی کے حق میں نہ تھے لہٰذا انہوں نے ایک غیر معروف شہزادے خسرو کو تخت نشین کیا اور اُس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ شاہ پور اور نرسی تو امرا ٔکے اس فیصلے پر خاموش رہے مگر بہرام نے بزور شمشیر اپنا حق لینے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں عربوں سے مدد طلب کی۔ عرب بہرام سے بہت پیار کرتے تھے کیونکہ اُس کی تربیت انہوں نے کی تھی۔ لہٰذا عرب سردار نعمان بن امرا ٔالقیس نے عربوں کا لشکر فراہم کیا اور خود بھی بہرام کے ساتھ ہو لیا۔ عرب لشکر کی آمد کا سن کر مدائن میں ہلچل مچ گیا اور عوام و خواص میں پریشانی کی لہر اُٹھی۔ بہرام نے مدائن کی فصیلوں کے قریب سے امرائے سلطنت کو پیغام بھیجا کہ میں خون خرابہ نہیں چاہتا اور نہ ہی جنگ کی نیت سے آیا ہوں مگر اپنے حق سے کسی بھی طور دستبردار نہیں ہوں گا۔ تاج و تخت پر میرا حق ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے باپ کے برعکس میں عدل و انصاف سے حکومت کروں گا لہٰذا میرا حق مجھے دے دیا جائے وگرنہ انکار کی صورت میں وہ ہوگا جو آپ نے نہ کبھی سوچا اور نہ دیکھا ہوگا۔ بہرام کے اس پیغام سے مدائن کے ایوانوں میں پریشانی کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ حکمران اور امرائے سلطنت پریشانی میں جمع

ہو گئے۔ انہیں اس بات کا علم تھا کہ جنگ کی صورت میں بہرام کا اعرابی صحرائی لشکر اُن کے پرخچے اڑا دے گا اور ان سے زبردستی حاکمیت حاصل کرے گا۔ ایسی صورت میں بعد ازاں ان میں سے کوئی بھی نہیں بچے گا جو بہرام کا مخالف ہو گا۔ لہٰذا امراء نے تھوڑی سی سوچ و بچار کے بعد بالآخر بہرام کو حکمران تسلیم کیا اور اُس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ سب سے پہلا بیعت کرنے والا بذاتِ خود خسرو تھا جو چند دن پہلے ہی شہنشاہ منتخب ہوا تھا۔ بہرام 420ء میں تخت مدائن پر برسرِ اقتدار آیا اور ساسانی حکمرانوں کے صفِ اول کے حکمرانوں میں شامل ہوا۔ اس نے بیس سال حکومت کی۔ بہرام اپنی بہادری اور فہم و فراست کی وجہ سے برسرِ اقتدار آیا اور اپنے بدترین حریفوں کو اپنا حلیف بنایا جو اُس کی اعلیٰ قائدانہ خوبیوں اور صلاحیتوں کی عکاسی کرتی ہیں مگر ایرانی متعصب مورخ نے اپنے روایتی اور افسانوی اندازِ تحریر کی عادت کو جاری رکھتے ہوئے اس عظیم حکمران کی ذات سے ایسے ایسے افسانے منسوب کر رکھے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ ان افسانوی داستانوں کا مقصد سوائے بہرام کے قد کاٹ کو بڑھانے کے اور کچھ نہیں۔ مثلاً بہرام کا تاج و تخت کی خاطر بھوکے شیروں کے پنجرے میں جا کر تاج اٹھانا، اسی طرح اس کے تیر اندازی کے کئی افسانوی قصے کہانیاں وغیرہ۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ بہرام ساسانی عہد کے عظیم حکمرانوں میں شمار ہوتا ہے اور ساسانی حکومت کو معراج عطا کرنے میں ان کا بڑا کردار تھا۔

بہرام گور ایک بہترین شکاری بھی تھا اور اسے زیبرے یعنی گورخر کے شکار کا بہت شوق تھا۔ ان کے بارے میں بعض روایات سے اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ وہ مغربی بلوچستان کے صحرائی علاقوں میں بھی گورخر اور ہرن سمیت کئی جانوروں کا شکار کھیلتے رہتے تھے جو اُس زمانے میں چاغی، اور رخشان (خاران وواشک) کے صحراؤں میں بکثرت پائے جاتے تھے۔

بہرام گور نے برسرِ اقتدار آتے ہی ایران کے قدیمی دشمن یعنی روم کی طرف توجہ دی اور اس کے خلاف فوج کشی کی۔ رومیوں نے مصالحت میں ہی عافیت خیال کیا اور بہرام کی خدمت میں اپنے ایلچی بھیجے تاکہ وہ بہرام سے مصالحت اور معاہدہ کریں۔ اس طرح روم کو 421ء میں ایران کے ساتھ سو سالہ معاہدہ کرنا پڑا۔ رومیوں کی جانب سے فرصت اور خلاصی پانے کے بعد بہرام ہنوں کی جانب متوجہ ہوا جو وسط ایشیاء اور چینی سرحدات کی جانب سے ایران کی جانب بڑھتے چلے آرہے تھے جو ایران کی سالمیت اور بقا کے لیے بڑا خطرہ تھے۔ یہ ہن قبائل وہی تھے جو رومیوں میں ہفتالی جبکہ ایرانیوں میں ہپتالی کے نام سے مشہور تھے۔ انہیں Apthelite بھی کہا جاتا ہے اور تاریخ میں انہیں سفید ہن بھی کہا گیا ہے۔ ہنوں کا ٹڈی دل لشکر طوفانی بگولوں کی طرح ایران کی جانب بڑھتا چلا آرہا تھا لہٰذا بہرام نے انہیں وسط ایشیاء ہی میں روکنے اور ان کا زور توڑنے کا مصمم ارادہ کیا۔ چنانچہ بہرام نے پہاڑی قبائل (پہاڑی بلوچ قبائل) کی مدد حاصل کی اور ہنوں کے مقابلے میں بہترین لڑاکا فوج کی تیاری میں مصروف ہوا۔ بدخشانی لکھتا ہے کہ:

> "اس نے اپنے بھائی نرسی کو نائب السلطنت مقرر کیا اور تین ہزار سوار ساتھ لے کر کوہِ البرز کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے پہاڑی اقوام (بلاشبہ یہ کوچ و بلوچ اور کرد قبائل تھے جن کو ایرانی پہاڑی باشندے کہتے تھے یعنی مردمانِ کوہ وصحرا) کا لشکر فراہم کرنا شروع کیا اور اپنے اقدامات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی۔ وہ اصل میں یہ چاہتا تھا کہ ملک کی بہترین فوج جمع کر کے اچانک ہنوں کی جمعیت پر ٹوٹ پڑے" (بدخشانی 1967 :416)۔

کوہِ البرز کے بلوچ قبائل کی ایرانی فوج کو مدد کی یہ پوری داستان شاہنامہ فردوسی سمیت ایران کی تاریخ پر لکھی گئی ہر کتاب میں مذکور ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایرانی اقوام کو بلوچوں کی بہادری اور وفاداری پر پورا پورا بھروسہ تھا اسی وجہ سے بہرام گور جیسے ایک بیدار مغز

حکمران نے دیگر اقوام کی بجائے بلوچ قبائل کی مدد کو ترجیح دی اور یہ بھی کہا کہ ایک بہترین لڑاکا فوج کے ساتھ ہنوں کے جمِ غفیر کا مقابلہ کیا جائے۔ اس واقعہ کے علاوہ بھی ایران کی تاریخ پر لکھی جانے والی مستند کتب میں اس بات کا اعادہ کیا گیا ہے کہ ایران کی تمام حاکموں کو بلوچوں کی بہادری اور وفاداری پر بے انتہا بھروسہ تھا اور افواج کی جمع آوری کی جب بھی ضرورت پڑتی ایرانی حاکم انہی قبائل کی جانب رجوع کرتے اور ایران کی بہترین فوجیں ترتیب دیتے تھے۔

مورخین بہرام کی ہندوستانی مہم اور مہاراجہ شنکلت کے رویے کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

"بہرام گور نے ہندوستان پر بھی لشکر کشی کی مگر ہندوستان کے ہوشیار بادشاہ مہاراجہ شنکلت اس وجہ سے بہرام کا شکر گزار تھا کہ اس نے ایک مشترکہ دشمن یعنی ہن قبائل کی ٹڈی دل کو ایران کی سرحدوں سے لوٹا کر ایران کو تو بچایا تھا لیکن اس سے ہند بھی محفوظ ہو گیا۔ اس احسان مندی کے خیال سے شنکلت نے ایرانی لشکر کا خیر مقدم کیا اور مکران اور ایران کی سرحد سے ملتے ہوئے کئی علاقے حکومت ایران کے سپرد کر دیے" (بدخشانی 1967:417-18)۔

جبکہ علامہ ثعالبی بہرام گور اور شنکلت کے باہمی تعلقات اور آپس کی قائم کردہ رشتہ داری کے بارے میں بھی لکھتا ہے یعنی شنکلت نے ایران اور ہندوستان کے بہترین تعلقات کی خاطر اپنی بیٹی کو بہرام گور کے عقد میں دے دیا۔ (شاہنامہ ثعالبی، مترجم: محمود ہدایت:269)

بلوچوں کا ایک مشہور و معروف قبیلہ لوڑی کہلاتا ہے۔ یہ معروف قبیلہ بلوچستان کے تمام علاقوں میں آباد ہے اور زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ ہے۔ یہ صناع قبیلہ ہے جو آہن گری، میوزک اور دیگر کئی شعبوں اور صنعتوں سے وابستہ ہے۔ پرسی مولسورتھ سائیکس اس معروف قبیلہ کے بارے میں ایک من گھڑت کہانی بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"بہرام کی ہند پر فوج کشی کی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی لیکن ثعالبی کے اس قول سے انہیں اتفاق ہے کہ بہرام کی خواہش کے مطابق مہاراجہ شنکلت نے چار ہزار (بقول سائیکس بارہ ہزار) سازندے اور خوش الحان موسیقار دربار ایران میں بھیجے تھے جنھیں بہرام نے ایران کے مختلف علاقوں میں بسایا۔ سیاہ پوست لوری (لوڑی) ان ہی کی نسل سے ہیں "(سائیکس 1968 :434، علاوہ ازیں، شاہنامہ ثعالبی مترجم: محمود ہدایت : 271)۔

مگر سائیکس اس بات کی وضاحت نہیں کرتا کہ اگر یہ ہندوستانی سازندے اور موسیقار ایرانیوں کو تحفے میں دی گئی تھیں تو یہ آج ایرانیوں کی بجائے بلوچوں کے مابین کیوں نظر آتے ہیں اور ایران کے کسی شہر کی بجائے بلوچوں کے قصبوں میں کیوں آباد ہیں۔ وہ آج ایرنیوں کے پاس کیوں نہیں ہیں۔ سائیکس کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ لوڑی سازندوں کا کوئی گروہ بہرام کو دیا گیا تھا۔ ممکن ہے کہ ہندوستانی گویے ایرانیوں کو دیے گئے ہوں اور جن کی سیاہ جلد کی وجہ سے سائیکس انہیں لوڑی قرار دے رہاہے مگر وہ یہ لوگ نہیں تھے جن کے بارے میں سائیکس بیان کر رہاہے۔ جہاں تک لوڑیوں کا تعلق ہے تو گذشتہ اوراق میں بھی اس بات کی وضاحت ہوئی ہے کہ لورستان کے باشندوں کو لوری کہاجاتا تھاجو ایران کا ایک صوبہ تھا۔ انھی لوڑیوں نے اپنے سردار کاوہ آہن گر کی سربراہی میں علاقہ کے دیگر قبائل کے ساتھ مل کر بہرام گور سے صدیوں پیشتر پیش دادی خاندان کی حاکمیت ختم کی تھی۔ اگر ان ہندی گویوں کو لوڑی مانا جائے تو وہ لوڑی کون تھے جنہیں تاریخ میں لورستان کے باشندے ہونے کی وجہ سے لوری کہا گیا؟ جبکہ اُن کا پیشہ بھی آہن گری اور آلات موسیقی بنانا اور بجانا تھا۔ بلاشبہ سائیکس کا بیان ایک خود اختراع کردہ مفروضہ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

بہرام گور ساسانیوں کے کامیاب حکمرانوں میں شمار ہوتا ہے جس نے ایران کی سرحدات کو خوب وسعت دی اور ایران کے دشمنوں کو بزورِ طاقت زیر کیا۔ اس نے ایران کے تمام شعبوں کو ترقی دی اور کئی ممالک کو ایران کا باج گزار بنا کر ایران میں دولت کے انبار لگا دیے۔ اس نے ایران کی ترقی کے لیے بہت کام کیا اور ساسانی سلطنت کو خوب عروج عطا کیا۔ بہرام بیس سال انتہائی طمطراق کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد 440ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ اُس کی موت حادثاتی طور پر ہوئی وہ شکار کھیلنے گیا تھا کہ گھوڑے سمیت ایک گہرے کنویں میں گر گیا اور ان کی موت واقع ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ گھوڑا کو تو صحیح سلامت نکالا گیا مگر بہرام کی جسد کا کوئی پتہ نہ چل سکا (بدخشانی 1967: 422)۔ بہرام کے بعد اُس کا بیٹا یزدگرد دوم تاج و تخت کا وارث بنا اور 440ء میں اس کی تاج پوشی ہوئی۔ یزدگرد میں اپنے والد بہرام گور کی طرح بہادری، شجاعت اور مدبرانہ صفات نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ یزدگرد کی ان کمزوریوں سے اس کے دشمنوں نے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ لہٰذا اس کے لیے کئی چیلنجز تھے جن کا مقابلہ کر کے ایران پر منڈلانے والے خطرات کا سدِباب کیا جا سکتا تھا۔ مگر اس نے بہادری اور تدبر نہ ہونے کے باوجود ایران پر آنے والے مصائب کا مقابلہ کیا اور ایران کی سرحدات کو محفوظ و مامون بنایا۔ اس نے ہنوں کے حملوں کا بھی سدِباب کیا اور ایران کی جانب اُن کے بڑھنے والے قدم وسط ایشیاء میں ہی روک دیے۔ یزدگرد دوم کے خلاف آرمینیا میں بھی بغاوت کی چنگاریاں سلگنے لگی تھیں اور عیسائی علماء نہ صرف کھلم کھلا عیسائیت کی تبلیغ کرنے لگے تھے بلکہ وہ زرتشتی مذہب کے بارے میں انتہائی سخت اور ناگوار الفاظ استعمال کرنے لگے تھے۔ ان حالات میں زرتشتی اور عیسائی ایک دوسرے کے مدِمقابل آ گئے جس کی وجہ سے آرمینیا میں حالات انتہائی کشیدہ ہو گئے اور جنگ کی سی صورتحال پیدا ہو گئی۔ حالات کو قابو میں رکھنے کے لیے یزدگرد نے

بھی جنگ کا راستہ اختیار کیا اور بصد مشکل اور شدید خون خرابے کے بعد بالآخر آرمینیا میں امن قائم کیا اور ایک ایرانی معتمد کو آرمینیا کا گورنر مقرر کیا۔ یزدگرد دوم 457ء میں فوت ہوا تو اس کا چھوٹا بیٹا ہرمز سوم نے اپنے بڑے بھائی اور حاکمِ سیستان فیروز کا حق چھینتے ہوئے چند سازشیوں کی مدد سے تخت ایران پر متمکن ہو کر اپنی شہنشائیت کا اعلان کیا جسے موبد اور دیگر درباری امرا نے بھی تسلیم کیا۔ مگر فیروز نے اپنی حق تلفی کو برداشت نہیں کیا اور ہرمز کی حاکمیت کو ماننے سے انکار کیا جس کی وجہ سے اس کی سیستان کی گورنری خطرے میں پڑ گئی۔ لہٰذا ان ناموافق حالات میں اسے کسی مددگار کی ضرورت پڑی کیونکہ اس کے اپنے پاس اتنی فوج اور وسائل نہ تھے کہ وہ شاہی افواج کا مقابلہ کرتا۔ میجر سائیکس کے مطابق ان حالات میں سیستان کے ایک مقامی سردار رہام اس کے کام آیا اور اس کی بھرپور مدد کی۔ لکھتا ہے کہ:

> "خاندان مہراں کا ایک طاقت ور سردار رہام نامی فیروز کا حامی تھا۔ اس نے لشکر فراہم کیا اور ہرمز پر حملہ کیا۔ ہرمز نے شکست کھائی اور اسیر ہو کر بالآخر اپنے کیفرِ کردار کو پہنچا۔ رہام نے فیروز کو سیستان سے بلا کر 559ء میں اسے تخت نشین کیا اور سب امرا نے اس کی اطاعت کا حلف اٹھایا" (سائیکس 1968: 436)۔

جبکہ طبری کا بیان کچھ مختلف ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ فیروز کی مدد و کمک ہنوں کے سردار خوش نواز نے کی تھی (تاریخ طبری بلعمی، ڈاکٹر محمد جواد مشکور: 128) جبکہ شاہنامہ فردوسی بھی اپنے اشعار میں طبری کے بیان کی تصدیق کرتا ہے:

چو ہرمز بر آمد بہ تخت پسر
بسر بر نہاد آن کئی تاج زر
تو فیروزہ را ویژہ گفتی بخشم
ہمی آب رشک اندر آمد بچشم
سوی شاہ ہپتال شد ناگہان

ابا لشکر و گنج و چندی مهمان
بدو داد شمشیرزن سی ہزار
زہپتالیان لشکری نامدار
بر آویخت با ہرمز شہریار
فراوان نہ برداشت شان کارزار
سرانجام ہرمز گرفتار شد
ہمہ تا جہا بیش او خوار شد

(شاہنامہ فردوسی۔ ابوالقاسم فردوسی۔ ماسکو)

ممکن ہے کہ ہپتالیوں نے اپنے مفادات کی خاطر فیروز کی بھرپور مدد کی ہو کیونکہ ایران میں داخل ہونے، وہاں پر بسنے اور اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے لیے وہ برسوں سے کوششیں کر رہے تھے مگر ایرانیوں کی مزاحمت اور طاقت کے سامنے ان کا بس نہیں چل رہا تھا لہٰذا انہیں ایران میں داخل ہونے میں اب تک کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ اب چونکہ ایک ایرانی جو تخت کا دعویدار تھا خود ان سے مدد طلب کر رہا تھا تو ہنوں کو اپنے برسوں پرانے خواب کی تکمیل ہوتی نظر آئی۔ اسی وجہ سے انہوں نے بخوشی فیروز کے مدد کی حامی بھری ہو گی۔ بعد میں ایران میں پیش آنے والے واقعات نے بھی اس بات کو سچ ثابت کر دکھایا کیونکہ اس کے بعد ہنوں نے ایران میں اپنی اجارہ داری قائم کی اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب ایرانی حکمران اُن کی قید میں تھا اور وہیں اس کا انتقال ہوا جب کہ ایران کے تمام تر امور پر ان کی اجارہ داری قائم ہو گئی۔

شاہنامہ جیسے ایک مستند منظوم تاریخی نسخے اور طبری جیسے عالم اور مورخ کے بیان سے انکار کی گنجائش نہیں مگر یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ فیروز طویل عرصہ سے سیستان میں تعینات تھا اور وہاں کے باشندوں کے ساتھ اُس کے بہترین تعلقات تھے۔ ویسے بھی سیستان کے باشندوں

نے ہر آڑے وقت میں ایران کے حکمران خاندانوں کی مدد کی تھی لہٰذا یہ بھی درست ہے کہ ھنوں کے ساتھ ساتھ سیستان کے سردار رہام نے بھی اپنے قبائلی سرداروں اور اُن کے لشکر جرار کے ساتھ فیروز کی مدد کی تھی اور اسے تخت و تاج دلانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ سردار رہام کی فیروز کو دی جانے والی کمک اور مدد کے قصے بھی شاہنامہ میں مرقوم ہیں۔

گذشتہ اوراق میں کئی بار اس بات کا تذکرہ ہوا کہ سیستان زمانہ قدیم سے ہی بلوچ قبائل کی آماجگاہ رہا ہے۔ اس خطے کی آبادی اب بھی بلوچ قبائل پر مشتمل ہے۔ عرب دور میں بھی یہاں کی کثیر آبادی بلوچوں کی تھی جنہوں نے عربوں کے خلاف برسوں تک شدید مزاحمت پیش کی تھی۔ قدیم ایرانی تاریخ میں بھی یہاں کے باشندوں کو بلوچ کہا گیا ہے۔ رستم، زال، گودرز، اشکش، رہام وغیرہ مختلف اوقات میں سیستان کے مرکزی سردار رہے ہیں جن کے تذکروں سے شاہنامہ فردوسی کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ ان کو ہمیشہ کوچ و بلوچ لشکروں کی نمائندگی کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ جیسا کہ امیر اشکش اور اس کے کوچ و بلوچ سپاہیوں پر مشتمل لشکر کے بارے میں فردوسی لکھتا ہے کہ:

گزین کرد از آن نامداران سوار	ان (جمع شدہ) نامور شہسواروں سے منتخب کر لیے
دلیرانِ جنگی دہ و دو ہزار	بارہ ہزار جنگ آزما سورما
ہمی از پہلی پارس کوچ و بلوچ	یہ پارس کے کوچ و بلوچ سپاہی ہیں
زگیلانِ جنگی و دشتِ سروچ	جو گیلان کے جنگجو اور دشتِ سروچ کے لڑاکے ہیں
پس از گستہم اشکش تیز ہوش	گستہم کے بعد ہوش مند اشکش آیا
کہ باری دل بود و با مغز و ہوش	جو بہت ہی صاحبِ دل و دماغ تھا
یکی گرزدار از نژاد ہمای	وہ شاہی نژاد کا گرزدار تھا
برای کہ جستیش بودی بپای	اس کی رفتار سے اس بات کا پتہ چلتا تھا
سپاہی زگردان کوچ و بلوچ	کوچ و بلوچ بہادروں کا ایک لشکر ساتھ تھا

سگالیدہ جنگند مانندِ قوچ	جو مینڈھے کی مانند بپھرے ہوئے تھے
کہ کس در جہان پشت ایشان ندید	دنیا میں انھیں پیٹھ دکھاتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا
برہنہ یک انگشت ایشان پدید	نہ ہی ان کی کوئی انگلی تک زرہ بکتر سے باہر ہوتی ہے
سپہدار شان بود رزم آزمای	ان کا سالار ایک جنگ آزما شخص تھا
کز د بود کاہ دنکوئی بجای	جس کے دم سے نیکی اور بہی خواہی قائم دائم ہے
درفش بر آورد پیکر پلنگ	وہ ایک چیتے کی شبیہہ بنی پرچم ساتھ لایا
ھمی از درفش بیارید جنگ	یہی پرچم جنگ و پیکار کی علامت ہے

(حسین شریف الدین کے مرتب کردہ نسخے سے اقتباس)

لہٰذا ببانگِ دہل یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ سردار رہام سیستان کا ایک بلوچ سردار اور رستم و گودرز کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو ہمیشہ سے تخت ایران کے وفادار اور مددگار چلے آرہے تھے لہٰذا سردار رہام نے بھی اس مشکل اور آڑے وقت میں تخت کے اصل وارث اور حقدار کو تنہا نہیں چھوڑا اور اس کی بھرپور مدد کرکے اسے تاج و تخت دلانے میں مرکزی کردار ادا کیا اور اپنے آباؤ واجداد کے اصولوں کی پیروی کی۔

فیروز نے ہرمز کے انجام پذیر ہو جانے کے بعد 459ء میں ساسانی خاندان کی حاکمیت سنبھالی اور تاج و تخت کا وارث بنا۔ فیروز نے تخت و تاج کے حصول کے لیے سفید ہنوں سے مدد طلب کی تھی جو اب ایران کے اندرونی معاملات میں مداخلت کررہے تھے۔ انہوں نے روم کے بعد اب ایران پر بھی حملے شروع کر دیے تھے۔ فیروز نے کئی مہمات سفید ہنوں کی سرکوبی کی خاطر بھیجے مگر سفید ہن کبھی حیلے سے تو کبھی اپنی جنگی حکمت عملیوں سے فیروز کو شکست دیتے رہے اور بالآخر انتہائی ذلت آمیز شرائط پر فیروز کو ان سے صلح کرنا پڑا۔ مگر بعد ازاں فیروز نے سفید ہنوں کو دھوکہ دیا جس کی وجہ سے جنگ ہوئی اور فیروز کو ہنوں نے دھوکہ سے مار ڈالا۔ اور

ایران پر خراج عائد کر دیا۔ فیروز کے بعد اس کا بھائی بالاش بر سرِ اقتدار آیا مگر وہ بھی حالات کو قابو میں کرنے اور ایران کو اس کے عہد رفتہ والے مقام پر لانے میں ناکام ہوا۔ بالاش کے دور میں سفید ہنوں کے ساتھ معاہدہ ہوا اور ایران پر خراج عائد کیا گیا۔ علاوہ ازیں بالاش آرمینیا کے مسئلے کے علاوہ عیسائی اور زرتشتی اختلافات اور عیسائیوں کے دو فرقوں کے آپس کی جنگ میں مصروف رہا۔ بالاش کے دور میں اس کے بھتیجے اور فیروز کے بیٹے قباد نے بغاوت کی جسے فرو کیا گیا جبکہ قباد نے سفید ہنوں کے ہاں پناہ لی۔ بعد ازاں درباری امرا ایران نے بالاش کو تخت سے اتار کر اندھا کر دیا (بدخشانی 1967: 436)۔ قباد 487ء میں بر سرِ اقتدار آیا۔ اس حکمران کے دور میں کئی اہم واقعات رونما ہوئے جن کے ایران کی داخلی اور خارجی سیاست پر انتہائی گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ قباد کے دور میں ایک مشہور امیر اور علاقائی حکمران سوفرا کو قتل کیا گیا۔ قباد کا خیال تھا کہ سوفرا عوام میں بہت ہر دلعزیز ہو چکا تھا اور اس نے کافی طاقت حاصل کر لی تھی۔ لہٰذا قباد نے اسے اپنے راستے سے ہٹانے کی خاطر قتل کروا دیا۔ اسی دوران ترکوں کے خزری قبائل نے ایران پر یلغار شروع کر دی۔ یہ صحرا نورد اور خانہ بدوش وحشی قبائل ہمسایہ سلطنتوں میں لوٹ مار کرتے تھے جو ان کا مرغوب مشغلہ تھا۔ انہی خزری قبائل کی وجہ سے بحیرہ کیسپیئن کا نام بحیرہ خزر کہلایا جانے لگا۔ خزر قبائل نے کوہِ قاف (قفقاز) سے ہوتے ہوئے وادی کور پر یلغار کر دی۔ قباد نے ان کے خلاف لشکر کشی کر کے ان کی سرکوبی کی۔ خزر قبائل کے بیشترافراد تہ تیغ ہوئے اور بہت سا مال غنیمت ایرانیوں کے ہاتھ لگا۔ قباد ہی کے دور میں اشتراکیت کا علمبردار مزدک کا ظہور ہوا جس نے خود کو پیغمبر کہا اور ایرانیوں میں اپنے فاسد عقائد کی تبلیغ کرنے لگا۔ قباد بھی مزدک کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گیا اور اس کے مذہب کو قبول کر لیا۔ ایران کے امرا سلطنت جافرا کے قتل کے بعد کافی آزاد ہو گئے تھے کیونکہ جافرا ایک بہترین منتظم تھا اور اس نے

ایسے انتظامات کر رکھے تھے جس کی وجہ سے ریاست اور قانون کے خلاف کسی کو سر اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ اس کے قتل کے بعد سازشی عناصر کا راستہ کھل گیا اور وہ ریاست اور حکمران کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ لیکن جس خبر سے ایرانی امرا اور عوام سخت خفا اور ناراض تھے وہ قباد کا دینِ مزدکیت کی قبولیت تھی جس کی وجہ سے آتش پرست ایرانی اس کے قتل تک کے درپے ہو گئے تھے۔ ایران کے آتش پرست مجوسیوں کو بادشاہ کی یہ حرکت بالکل پسند نہیں آئی اور وہ اس کے اس اقدام کو نفرت آمیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ بالآخر انہوں نے ایک انتہائی قدم اٹھایا اور قباد کو گرفتار کر کے خوزستان کے مشہور زمانہ گیل کرد کے بندی خانۂ فراموشی میں قید کر دیا اور اس کے بھائی جاماسپ (طہماسپ) کو نیا شہنشاہ مقرر کیا۔ مگر قباد تین سال بعد کسی نہ کسی طرح قید خانے سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا اور سیدھا ہن سردار خوش نواز کے پاس پہنچا جس نے نہ صرف اس کی بھرپور مدد کی بلکہ اپنی بیٹی کی شادی بھی اس سے کر دی جو فیروز کی بیٹی کے بطن سے تھی۔ قباد ایران آیا تو جاماسپ نے اپنے آپ کو اس کے مقابلے میں کمزور پا کر خود اسے تخت نشین ہونے میں مدد دی۔ لہٰذا قباد تین سال کے عبوری عرصہ کے بعد دوبارہ تخت نشین ہوا۔ قباد ایک ہوشیار اور مدبر حکمران تھا وہ ساری زندگی ہنوں سمیت اپنے کئی دشمنوں سے رزم آرا رہا اور بالآخر اپنی مشکلات اور مصائب پر قابو پانے میں کامیاب ہوا۔ اس نے رومیوں کو بھی مصروف رکھا اور ان سے خونریز جنگیں لڑیں اور عربوں سمیت دیگر اقوام کے ساتھ بھی سیاسی حکمت عملیوں کے تحت تعلقات رکھے۔ ہنوں کے خلاف اپنی آخری مہم دس سال تک مستقل مزاجی کے ساتھ جاری رکھی اور بالآخر اس استقلال کا اسے اچھا پھل ملا اور ہنوں کا زور ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔ اس نے نہ صرف اُن سے فیروز کے قتل کا بدلہ لیا بلکہ اُن کی سابقہ تمام قتل و غارت گریوں کا انہیں ایسا مزہ چکایا کہ جس کے بعد وہ دوبارہ ایرانی حدود میں نظر نہ

آئے (بدخشانی 1967: 444)۔ ہنوں کی یہ شکست قباد کے عظیم کارناموں میں شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح اس حکمران نے سیاسی مصلحتوں کی خاطر مزدکیوں کے عقائد کو قبول کیا تھا جسے ایران کے زرتشتیوں نے قبول نہیں کیا اور اس کی پاداش میں قباد کو تاج و تخت سے محروم ہو کر پسِ زندان جانا پڑا تھا۔ دوسری بار حکومت ملنے کے بعد اس کی ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ وہ عسکری مہمات میں ایسا مصروف ہوا کہ مزدکی فتنے کی جانب کوئی توجہ نہ دے سکا۔ مگر جب اس نے اپنی ڈھلتی عمر کو دیکھا تو گذشتہ قوانین اور رواجات کے برخلاف اس کو اپنا جانشین مقرر کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ حالانکہ ایران میں گذشتہ کئی عرصہ سے ولی عہد کی نامزدگی کی روایت ختم ہو چکی تھی۔ ایرانی امرا حاکم کے بیٹوں یا بھائیوں میں سے کسی کو بھی حکمران بنا سکتے تھے۔ مگر قباد نے اس رسم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنا ولی عہد نامزد کیا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا کاؤس مزدکی عقائد کا علمبردار تھا لہٰذا اس نے اسے نظر انداز کیا۔ دوسرا بیٹا ایک آنکھ سے نابینا تھا لہٰذا وہ بھی اس منصب کے لیے نااہل قرار پایا۔ تیسرا بیٹا باپ کا لاڈلا بھی تھا اور حکمرانی کے منصب کے لیے ہر لحاظ سے موزوں اور ایرانیوں میں ہر دلعزیز بھی تھا۔ اس کا نام انوشیروان تھا جو تاریخ میں نوشیروان عادل کے نام سے مشہور و معروف ہوا۔ لہٰذا باپ نے اسے اپنا ولی عہد نامزد کیا۔ قباد چاہتا تھا کہ نوشیروان کو ایک مضبوط اور پُرامن سلطنت ملے تاکہ وہ اس میں مزید بہتری لا سکے مگر مزدکی عقائد کی ایران میں موجودگی نوشیروان کے لیے بڑا خطرہ تھا۔ اب قباد نے مزدکیوں کی جانب توجہ دی تاکہ اس کے بیٹے کے لیے حاکمیت کا راستہ آسان اور سہل ہو جائے۔ لہٰذا اس نے مزدکیوں اور زرتشتیوں کے مابین ایک مناظرہ کروایا جس میں مزدکی ہار گئے لہٰذا ایرانی سپاہیوں نے مزدکی علماء کا بدترین قتل عام کیا۔ اس قتل عام میں مزدک بھی مارا گیا۔ اس طرح قباد نے اس فتنے کا بھی خاتمہ کیا۔

قباد کے دور کے اہم ترین واقعات میں ایک واقعہ پہاڑی قبائل اور گرجستان کے باشندوں کی بغاوت بھی تھی۔ کوہِ البرز کے باشندے اور اس سے متصل شہروں کے لوگ قباد سے متنفر تھے اور آمادہ بغاوت تھے۔ شاہنامہ فردوسی میں مرقوم ایک واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ البرز کے باشندے عرصہ دراز سے ایرانی حکام کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ حتیٰ کہ ان قبائل کو جب بھی موقع ملتا وہ ایرانیوں کے خلاف ہتھیار اٹھاتے اور اُن کے قصبوں اور شہروں پر پِل پڑتے۔ لہٰذا شمالی ایران کے اکثر علاقے قباد کے عہد میں بدنظمی کا شکار رہے۔ راقم الحروف نے اپنی کتاب ''بلوچ اور ان کا وطن'' میں اس واقعہ کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ جن کے مطابق یہ قبائل کئی وجوہات کی بناء پر قباد کے خلاف آمادۂ بغاوت ہو گئے۔ ان وجوہات میں ایک وجہ مذہبی بھی تھی۔ قباد کے مزدکیت قبول کرنے کو ان تند و تیز پہاڑی قبائل نے قبول نہیں کیا۔ دیگر زرتشتی ایرانیوں کی نسبت ان قبائل نے زیادہ تندی اور جارحیت کا مظاہرہ کیا اور قباد کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئے۔ لہٰذا قباد نے ان کے خلاف لشکر کشی کی مگر اسے ان قبائل کو زیر کرنے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ قباد کے بھائی جاماسپ کے تین سالہ عہد میں یہ قبائل خاموش رہے مگر جب قباد دوبارہ برسرِ اقتدار آیا تو یہ قبائل دوبارہ ایرانیوں سے متصادم ہو گئے۔ بالآخر نوشیروان نے جب اقتدار سنبھالا تو اس نے ان بغاوتوں کا سدِ باب کیا۔ شاہنامہ فردوسی میں ان واقعات کی تفصیلات ملتی ہیں۔ شاہنامہ کے ان اشعار کو نوشیروان کے عہد میں بیان کیا جائے گا۔ گرجستان کے حکمران گرگین کی بغاوت اور روم کی جانب فرار کا تذکرہ بدخشانی نے بھی کیا (بدخشانی 1967: 445)۔

قباد ساسانیوں کے عظیم حکمرانوں میں شمار ہوتا ہے جس نے چالیس سال ایرانی سلطنت پر حاکمیت کی۔ اس نے ایرانی تہذیب کو بامِ عروج پر پہنچا دیا اور اپنی دانشمندی، تدبر، بہادری اور اصلاحات کے ذریعے بالآخر راسخ ایرانی عوام کا دل جیت لیا۔ اس نے اپنے عہد میں خونریز جنگیں

لڑیں۔ زبردست فتوحات حاصل کیے اور کئی دشمنوں کو زیر کیا۔ وہ رومی اور ہن اقوام کے بیچ میں تھا مگر اس نے دونوں کو الگ الگ ایسا عبرتناک سبق سکھایا اور ایسے نقصانات پہنچائے کہ جس کے بعد ان دونوں کو ایران کی طرف بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی اور برسوں اپنے ہی زخم چاٹتے رہے۔ بالخصوص ہُن جیسے وحشی اقوام کو لگام دے کر اس نے عظیم کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ اس نے ملک میں زرعی اصلاحات کا اعلان کر کے زمینوں کی پیمائش شروع کروادی جو نوشیروان کے عہد میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ اسے تعمیرات کا بھی بڑا شوق تھا لہٰذا اس نے کئی نئے شہر بسائے اور کئی معروف عمارات اور پُل تعمیر کروائے۔ ایرانی تاریخ کا یہ عظیم حکمران چالیس سال حکمرانی کرنے کے بعد 531ء میں انتقال کر گیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا انوشیروان برسرِ اقتدار آیا۔ جسے خسرو اول اور نوشیروان عادل بھی تحریر کیا جاتا ہے۔ ایران کے ساسانی آرین خاندان کا یہ درخشندہ ستارہ صرف ایران ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی تاریخ میں اعلیٰ مقام و مرتبہ رکھتا ہے۔ اس نے ایرانی تہذیب و تمدن کو عظیم الشان معراج عطا کیا اور اس کی شہرت و عظمت کو چار چاند لگا دیے۔

نوشیروان کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد اس کے مخالفین نے اس کے راستے میں بہت روڑے اٹکائے اور ہر طرح سے اسے ناکام کرنے اور اقتدار سے ہٹانے کی کوششیں ہوئیں۔ ترک، ہن، رومی اور مقامی مخالفین نے نوشیروان کے لیے کئی محاذ کھولے اور اُسے ہر طرف سے مصائب میں مبتلا کرنے کی کوشش کی مگر نوشیروان نے ایک ایک کر کے نہ صرف اپنے مخالفین پر قابو پایا بلکہ سلطنت کے اندر ایسی سخت گیر پالیسی نافذ کی جس کی وجہ سے اس کے دشمن اُس سے خوف کھانے لگے۔ اس نے ہنوں کو شکست دی، ترکوں کو تتر بتر کر کے رکھ دیا اور ان کی قوت توڑ دی۔ اس نے رومیوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا۔ اس نے ایرانی ساسانی سلطنت کی سرحدات میں اضافہ کیا اور اپنے ملک کو مکمل طور پر محفوظ و مامون بنانے کی کوشش کی۔ بیرونی یلغاروں کے

علاوہ اندرونِ ملک بھی نوشیر وان کے خلاف مسلح بغاوتیں ہوئیں مگر نوشیر وان نے ان بغاوتوں کو کامیابی کے ساتھ اور طاقت کے بل بوتے پر فرو کیا۔ شاہنامہ فردوسی میں بیان کردہ ایک واقعہ سے لگتا ہے کہ کوہِ البرز کے بلوچ باشندوں نے بھی نوشیر وان کے خلاف بغاوت کی۔ یہ بغاوت نوشیر وان کے والد قباد کے دور میں شروع ہوئی مگر قباد اس پر قابو پانے اور اس بغاوت کو فرو کرنے میں ناکام ہوا تھا۔ نوشیر وان کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد اس مسئلے نے زیادہ زور پکڑا اور البرز کے باشندے ایرانی شہروں اور قصبوں پر پِل پڑے اور خوب تباہی مچائی۔ لہٰذا نوشیر وان بذاتِ خود ان قبائل کی سرکوبی کو نکلا اور شدید جنگوں اور خونریزی کے بعد بالآخر اس پر قابو پانے میں بصد مشکل کامیاب ہوا۔ اس واقعہ کے بارے میں شاہنامہ فردوسی میں لکھا ہے کہ:

ہمی رفت آگاہ آمد بہ پادشاہ	دورانِ سفر شہنشاہ کو اطلاع پہنچی
کہ گشت از بلوچی جہانے تباہ	کہ بلوچوں کے ہاتھوں بڑا علاقہ تباہ و برباد ہو گیا
زبس غارت و کشتن و تاختن	جنہوں نے قتل و غارت گری اور تاخت و تاراج سے
زمین را بہ آب اندر انداختن	زمین کو خون کے دریا میں ڈبو دیا ہے
ز گیلان تباہی فزوں است ازیں	مگر گیلان زمین میں تباہی اس سے بھی زیادہ ہے
ز نفرین پراگندہ گشت آفرین	آفرین نفرت میں بدل گئی ہے
دلِ شاہ نوشیر واں شد غمی	شہنشاہ نوشیر وان کا دل غموں میں ڈوب گیا
بر آمیخت اندوہ با خُرّمی	اس کی ساری خوشیوں کو غموں نے چھین لیا
بہ ایرانیان گفت اُلانان وہند	ایرانیوں سے مخاطب ہو کر کہا الانی و ہندی تو
شد از شمشیر ما چون پرند	ہماری تلوار سے مات کھا گئے
پسندہ نباشیم با شہر خویش	مجھے دارالسلطنت راس نہیں آئے گا
ہمی شیر جو ہیم، پیچان زمیش	کیونکہ میں شیر ڈھونڈتا ہوں بھیڑ نہیں

بدو گفت گوینده کایہ شہریار	اس سے ایک نے کہا کہ اے بادشاہ زادے
بہ پالیز نیست بے رنج وخار	چمن میں پھولوں کے ساتھ خار بھی ہوتے ہیں
ہمان مُرزو تابود بارنج بود	وہ (بلوچوں کی) سرزمین ازل سے بدامنی کیلئے بنی ہے
ز بہرِ پراگندنِ گنج بود	وہاں انتشار سے فرق نہیں پڑتا
زکارِ بلوچ ارجمند اردشیر	آپ کے دادا ارجمند اردشیر نے بلوچوں سے کارزار کئے
بکوشید باکارِ دانانِ پیر	اور کارآزمودہ وجہاندیدہ عمر رسیدوں سے مشورے کئے
نبُد سُود مندیا فسون ورنگ	مگر اسے کسی افسون اور طریقے سے کامیابی نہیں ہوئی
نہ از بند ورنج ونہ پیکار وجنگ	نہ قید و تکالیف اور نہ پیکار و جنگ سے فائدہ ہوا
اگرچند بُد این سخن ناگزیر	اگرچہ یہ بات قدرِ دل پر بھاری گذری
بیوشید بر خیشتن اردشیر	مگر اردشیر کے پوتے نے برداشت کر ہی لیا
ز گفتارِ دہقان بر آشفت شاہ	دہقان کی بات سے شہنشاہ کو غصہ آیا
بہ سوی بلوچ اندر آمد بہ راہ	اور وہ بلوچوں سے نمٹنے کیلئے روانہ ہوا
چو آمد بہ نزدیکِ آن بُرز کوہ	جب اس بلند پہاڑ کے قریب پہنچا تو
بگردید گرداندرش باگروہ	اس کو گروہ در گروہ گھیرے میں لے لیا
بدان گونہ گرداندر آمد سپاہ	اس طرح افواجِ شاہی نے گھیرا تنگ کیا کہ
کہ بستند بر بادو بر مور راہ	چیونٹی اور ہوا کو باہر جانے کیلئے راستہ نہ ملا
ہمہ دامنِ کوہ تاروی شخ	دامنِ کوہ سے چوٹیوں تک
سپاہ بُد وبرسانِ مور وملخ	مور و ملخ کی طرح افواجِ شاہی تھیں
منادی گرے گرد لشکر بگشت	جارچین (ڈھنڈورچی) نے لشکر کے گرد پھر کر آواز دی
خروش آمد از کوہ واز غار ودشت	جس کی آواز سے پہاڑ و دشت و غار گونج اٹھے
کہ ہر گز بیابند بلوچی خورد	کہ اگر کوئی بھی بلوچ ہاتھ آئے خواہ وہ بچہ ہو
چہ از تیغ داران و مردانِ گُرد	تیغ زن ہو یا مردِ جنگی ہو

دگر انجمن باشد یا اندکے	اور پورا مجمع ہو یا تھوڑی سی تعداد ہو
نباید کہ یابد رہائی یکے	کسی کو بھی رہائی مت دو
چو آگاہ شد لشکر از خشمِ شاہ	جب شاہی افواج کو شہنشاہ کا فرمانِ غضب ملا
سوار و پیادہ ببستند راہ	گھوڑ سواروں اور پیادوں نے راستوں کی ناکہ بندی کر دی
از ایشان فراوان اندک نماند	ان (بلوچوں) سے زیادہ اور کم کچھ بھی نہیں رہا
زن و مرد و جنگی و کودک نماند	نہ عورتیں بچیں نہ مرد نہ بچے اور نہ جوان
سراسر بہ شمشیر بگذاشتند	تمام کے تمام تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے
ستم کردن کوچ بر داشتند	اور کوچوں کے ظلم کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہو گیا
بشد ایمن از رنجِ ایشاں جہاں	ان (بلوچوں) کے ظلم سے لوگ پُر امن ہوئے
بلوچے نماند آشکار و نہاں	بلوچوں کا نام و نشان تک مٹ گیا
چنان بُد کہ بر کوہ ایشان گلہ	ایسی حالت تھی کہ پہاڑوں پر ان کے ریوڑ
بودی بے نگہبان و گردی یلہ	بغیر گڈریوں کے آزاد پھرتے تھے
شبانے نبودی بر گوسفند	بھیڑوں کا کوئی چرواہا نہیں تھا
بہ ہامون و بر تیغِ کوہِ بلند	نہ (کنارِ) ہامون (بحیرہ ہیر کانیہ) اور نہ ہی بلند پہاڑ پر
ہمہ رنجہا خوار بگذاشتند	مظلوم لوگوں کو ایسی آزادی ملی
در و کوہ را خانہ پنداشتند	کہ پہاڑ اور وادیوں کو اپنا مسکن خیال کرتے
از آنجایگہ سوی گیلان کشید	وہاں (البرز اور مازندران) سے گیلان کی زمین پر پہنچا
چو رنج آمد از گیل و دیلم پدید	کیونکہ گیل قبیلہ اور دیلم کے لوگوں نے ظلم کئے تھے
ز دریا سپاہ بود تیغِ کوہ	دریا سے پہاڑوں کی بلند چوٹیوں تک شاہی افواج تھیں
ہوا پُر درفش و زمین پُر گروہ	ہوا میں جھنڈے لہراتے تھے زمین پر ہجوم تھا
پراگندہ بر گردِ گیلان سپاہ	گیلان زمین میں افواجِ شاہی پھیل گئیں
کہ شُد روشنائی ز خورشید و ماہ	جیسا کہ سورج اور چاند ابھی طلوع ہوئے ہوں

زبس کشتن وغارت و سوختن　　　بس پھر کیا تھا قتلِ عام و آتش زنی کا وہ عالم تھا
خروش آمد از نالہِ مرد و زن　　　کہ مردوں اور عورتوں نے فریاد اور آہ وزاری کی
(مسکو۔ ص۔36-435)

غزنوی دربار کے اہم ترین رکن، محمود غزنوی کے قریبی ساتھی ایک مشہور و معروف اور اعلیٰ پائے کے عالم اور شاعر کے یہ شہرہ آفاق اشعار یہ ثابت کرتے ہیں کہ بلوچوں کی ایک کثیر آبادی کوہ البرز اور اس کے گرد و نواح میں آباد تھی۔

اس مستند بیان سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ کوہِ البرز اور اس کے مضافات کے صوبے بلوچ قبائل پر مشتمل تھے۔ صوبہ مازندران، صوبہ گیلان اور صوبہ ایلان کی کثیر آبادی بلوچوں کے کرد قبائل اور اس کی لاتعداد شاخوں پر مشتمل تھی۔ یہ پہاڑی لوگ دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور ایران کے علاوہ شام، خراسان، سیستان کے پہاڑی خطے میں آباد تھے جبکہ ریگستان کے علاقے بھی انہی قبائل کے تصرف میں تھے۔ ایرانی مورخین اور عرب وقائع نگار، سیاح اور مورخین ان قبائل کے انفرادی ناموں کے علاوہ انہیں ان کی اجتماعی مجموعی نام سے بھی اپنی کتب میں تحریر کرتے ہیں۔ ابوالقاسم فردوسی انہیں اپنے شاہنامہ میں اکثر و بیشتر کوچ و بلوچ تحریر کرتا ہے مگر بعض مقامات پر انہیں کئی دیگر ناموں سے بھی یاد کرتا ہے۔ بسا اوقات اشعار کا اوزان برابر کرنے کی وجہ سے بھی وہ انہیں مختلف الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ یعنی ایک مقام پر وہ انہیں ''کفچ و لفچ'' لکھتا ہے جبکہ ایک جگہ وہ ''کوچ و بال'' لکھتا ہے۔ مگر یہ قبائل تاریخ میں بلوچ اور کوچ و بلوچ کے نام سے زیادہ مقبول و معروف ہوئے۔

مشرقی ایران میں واقع ایک پہاڑی علاقے کے کرد باشندوں کی بغاوت کے بارے میں مرزا مقبول بیگ بدخشانی آرتھر کرسٹن سین کی کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

”صوبہ کرمان میں ایک پہاڑی قوم بسی ہوئی تھی، جو پاریز (دراصل یہ کوہِ باریزی کے کرد باشندے تھے جو اسی نام سے موسوم تھے۔ ابنِ خلدون نے بھی ان قبائل کا تذکرہ کیا ہے وہ انہیں البازیزی لکھتا ہے) کے نام سے موسوم تھی۔ ان لوگوں پر نوشیر وان نے فتح پائی تو انھیں مختلف مقامات پر منتقل کراکے گھروں میں آباد کر دیا۔ ابخار (باشندگانِ بلخ و بخار)، خزر (خزری ترک) اور آلان قبائل (ایلان کے کرد باشندے جو ایلان یا آلانی کہلاتے تھے) پر فتح پائی، جو ایرانی سرحدوں پر حملہ آور ہوتے رہتے تھے، تو انھیں آذربائیجان اور اس کے گرد و نواح میں لابسایا اور فوجی خدمات سپرد کر دیں۔ انطاکیہ کو فتح کرنے کے بعد نوشیر وان نے وہاں کے تمام باشندوں کو ایک نئے شہر میں لابسایا، جسے اس نے مدائن کے قریب رومیہ کے نام سے آباد کرایا تھا، وحشی اقوام کے لوگ جو کسانوں سے بھی زیادہ تنومند ہوتے تھے، انھیں عموماً غیر محفوظ علاقوں میں آباد کرایا کرتا تھا تاکہ دشمن کے حملوں کو روک سکیں۔ اس طریقے سے نوشیر وان نے جو فوج تیار کی اس میں چیدہ چیدہ سواروں کے علاوہ وہ مہاجرین بھی شامل تھے جو نقل مکانی کرنے کے بعد مختلف مقامات پر بسائے گئے تھے۔“ (بدخشانی 1967 :478-79)

شاہنامہ ثعالبی کے ایک بیان سے نوشیر وان کی سلطنت کے صوبوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق موجودہ وہ بلوچستان جو پاکستان میں شامل ہے، نوشیر وانی سلطنت کا حصہ نہیں تھا ثعالبی لکھتا ہے کہ:

”نوشیر ان نے اپنی مملکت کو چار حصوں میں منقسم کیا، پہلے حصے میں خراسان تھا، جس میں طخارستان، زابلستان، اور سیستان کے علاقے شامل تھے۔ دوسرے حصے میں میڈیا تھا، جس میں ری (رے)، ہمدان، نہاوند، دینور، کرمان شاہ، اصفہان، قم، کاشان، ابہر، زنجان، آرمینیا، آذربائیجان،، جرجان (گورگان) اور طبرستان شامل تھے، تیسرے حصے میں فارس، کرمان، اہواز (خوزستان)، شامل تھے۔ چوتھے حصے میں عراق سے یمن تک کا

علاقہ، حدود شام اور سرحدات روم شامل تھے("شاہنامہ ثعالبی مترجم: محمود ہدایت : 293)۔

اس فہرست میں ماسوائے افغانی بلوچستان کے علاقوں سیستان اور ایران میں شامل علاقہ کرمان کے باقی ماندہ بلوچستان ایرانی قبضہ و اختیار سے باہر تھا۔ ساسانی خاندان کا یہ عظیم حکمران اڑتالیس سال بڑے طمطراق اور کامیابی کے ساتھ حاکمیت کرتا رہا اور 579ء میں انتقال کیا۔ اس کی وصیت کے مطابق اس کے بیٹے ہرمز کو تخت نشین کیا گیا جو ہرمز چہارم کے نام سے تخت نشین ہوا۔ ہرمز اپنے والد نوشیروان کے نقش قدم پر چلنا چاہتا تھا مگر اُس میں اپنے والد جیسی دور اندیشی نہ تھی جس کی وجہ سے اس کی حاکمیت کو زوال آیا۔ وہ امرأ سے سختی اور تضحیک آمیز طریقے سے پیش آتا تھا مگر غربأ اور مساکین کا خیال رکھتا تھا۔ مطلب یہ کہ اُس میں دور اندیشی نہ تھی کہ وہ میانہ روی اختیار کرتا اور غربأ کے ساتھ ساتھ حکومت کے اہم عہدیداروں اور امرأ سلطنت سے بھی بہتر انداز اور رویہ اختیار کرتا۔ لہٰذا جب ترکوں کے خلاف اس نے محاذ پر آذربائیجان کے حاکم اور مہران قبیلہ کے سردار کے بیٹے بہرام چوبیں کو روانہ کیا تو بہرام نے انتہائی بہادری اور کامیابی کے ساتھ ترکوں کا سدباب کیا اور انہیں عبرت ناک شکست دے کر اُن کے سردار ساوہ شاہ کو قتل کر دیا اور اُس کے بیٹا پرمودہ کو گرفتار کر لیا۔ اس نے دور دور تک شکست خوردہ ترک لشکر کا پیچھا کیا اور ان کا شدید قتل عام کیا۔ اس فتح سے بہرام چوبیں نے ایرانی عوام میں وہ مقبولیت حاصل کی جو کسی امیر اور سپہ سالارِ لشکر نے حاصل نہیں کی تھی۔ اس سے ہرمز کو شدید حسد ہوا اور اس نے لازیکا کی مہم پر بہرام کو بھیجا تاکہ اُسے شکست ہو اور ایسا ہی ہوا لہٰذا اس نے بہرام چوبیں جیسے مقبول سپہ سالار کی شدید بے عزتی کی۔ جس کی وجہ سے بہرام نے اس کے خلاف بغاوت کی اور اُس کا بیٹا خسرو پرویز بھی اُس کے خلاف ہو گیا۔ ایرانی عوام بھی اُس کی جان کے

در پے ہو گئے آخر کار اُسے گرفتار کر کے اُس کی دونوں آنکھیں نکال دی گئیں بعد ازاں اُسے قتل کر دیا گیا۔ اور اُس کی جگہ اس کے بیٹے خسرو پرویز کو ساسانی تاج و تخت حوالے کر دیا گیا۔

جیسا کہ قانونِ فطرت ہے کہ ہر عروج کا ایک زوال ہوتا ہے، بالکل اسی طرح خسرو پرویز کی تخت نشینی سے قبل اُس کے دادا نوشیروان کے عہد حکومت میں ہی ساسانی خاندان کی حاکمیت کے خاتمے کا آغاز ہو چکا تھا اور اس کی خبر بذریعہ رویا نوشیروان کو دے دی گئی تھی۔ یعنی جب نوشیروان کی حکومت کے چالیس سال پورے ہو گئے تو 571ء میں عرب کے شہر مکہ مکرمہ میں نبیوں کے سردار حضرت محمد ﷺ کی ولادتِ باسعادت ہوئی اور نوشیروان کو خواب میں یہ دکھایا گیا کہ اُس کے بعد صرف چودہ حکمران مزید ایران پر حاکمیت کریں گے۔ اور پھر ساسانی تاج و تخت صحرائی عربوں کے سبک رفتار گھوڑوں کے سموں تلے روندا جائے گا۔ نوشیروان کے اس خوب کا تذکرہ تاریخ ایران اور اسلامی تاریخ کی تمام مستند کتب میں مرقوم ہے۔ لہٰذا ہرمز کی تخت نشینی سے قبل ہی وہ حالات پیدا ہونا شروع ہو چکے تھے۔ ہرمز نے ہمدرد اور رحمدل حکمران ہونے کے باوجود وہ غلطیاں کیں جو آخر کار ساسانیوں کے اقتدار کے خاتمے پر منتج ہوئیں۔

خسرو پرویز نے برسرِ اقتدار آتے ہی شدید مشکلات اور مصائب کا سامنا کیا مگر جب ان مصائب پر قابو پایا تو ساسانی سلطنت کو ایسا عروج عطا کیا جو اس سے قبل صرف ہخامنشیوں کے دور میں ہی اسے حاصل تھا۔ ابتدائی مشکلات میں بہرام چوبیں کی بغاوت اور مدائن پر قبضہ خسرو پرویز کے لیے کافی تکلیف دہ ثابت ہوئیں اور اس کو ملک سے فرار ہونا پڑا۔ اس سفر میں اس کے دو ماموؤں اور چند دیگر وفاداروں نے بھرپور ساتھ دیا۔ بہرام کے ایک فوجی دستے نے اس کا کافی تعاقب کیا مگر خسرو پرویز اُن سے بچ نکلنے اور روم پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ بعد ازاں اس نے رومیوں کی حمایت سے بہرام کو مختلف مقامات پر شکست دی اور اقتدار دوبارہ حاصل کیا۔ بہرام

شکست پر شکست کھا کر مختلف مقامات پر چھپتا پھر رہا تھا بالآخر وہ کسی نامعلوم شخص کے ہاتھوں مارا گیا۔ خسرو پرویز کو ایک بڑے اور بہادر دشمن سے نجات مل گئی۔ تب وہ ساسانی حکومت کو منظم اور مستحکم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو وسیع کرنے میں مصروف ہوا۔ روم میں اس وقت خانہ جنگی چل رہی تھی اور ایک انتہائی کمزور حکمران کے ہاتھوں میں روم کی باگ ڈور تھی۔ لٰہذا خسرو پرویز نے روم کی ایشیائی مقبوضات پر حملہ کیا۔ اس وقت تک اس کا محسن اور سُسر قیصر روم مارس (مارسیئس) فوت ہو چکا تھا اور روم مارسیئس کے دشمنوں اور قاتلوں کے پاس تھا لٰہذا روم پر حملہ کرنے کے لیے اس کے پاس ایک مناسب، بہترین اور معقول بہانہ تھا۔ اس نے روم کی ایشیائی مقبوضات حتیٰ کہ فلسطین کا علاقہ بھی عیسائیوں سے چھین لیا اور وہ مقدس صلیب بھی اُٹھا کر مدائن لے گیا جس پر عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کیا گیا تھا۔ اس فتح سے روم سمیت تمام عیسائی مملکتوں میں کہرام مچ گیا۔ خسرو پرویز نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے بازنطینی رومی سلطنت کے دارالحکومت قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ ساسانیوں کے عروج کی انتہا تھی۔ لٰہذا قسطنطنیہ کے طویل محاصرے کے دوران ہی ساسانی سلطنت کا زوال شروع ہوا اور روم نے انگڑائی لی۔ رومی سلطنت کی قیادت نوجوان ہرکلیئس (ہرقل) کے ہاتھ آیا اور اس نے زخمی و مجروح روم کو ایسا مرہم لگایا کہ ان کی مردہ ہوتی رگیں زندگی کی حرارت سے بھر گئیں اور انہوں نے ایران پر ایسے حملے شروع کیے کہ مختصر عرصہ میں ہی رومی فوجیں مدائن میں داخل ہو گئیں۔ یہ خسرو پرویز کے بھاگنے کے دن تھے۔

جس زمانے میں خسرو پرویز نے روم کا محاصرہ کیا ہوا تھا تو اسی دوران حضرت محمد ﷺ کا نامہ مبارک اس تک پہنچا جسے اُس نے اقتدار کے نشے میں چُور ہونے کی وجہ سے پھاڑ دیا اور قاصدوں کو ملک سے نکال دیا۔ اس کے بعد خسرو پرویز اپنے بیٹے شیرویہ کی سازش کی بھینٹ

چڑھ کر قتل ہوا۔ اس کے باقی سولہ بیٹے بھی قتل ہو گئے جبکہ شیرویہ قباد دوم کے نام سے 628ء میں تخت نشین ہوا۔

خسرو پرویز کے بارے میں بعض تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے سندھ و ہند کو دوبارہ ایرانی مملکت میں شامل کیا تھا یا ان سے خراج حاصل کیا تھا۔ ان مستند تحریروں کے مطابق خسرو پرویز نے 615ء میں ایران کے مشرقی سرحدی علاقوں پر حملہ کیا تاکہ کوشانیوں کی جارحیت کا سدِ باب کیا جا سکے۔ اس حملے کی مکمل تفصیلات دستیاب نہیں ہو سکے البتہ اس حد تک حوالے ملتے ہیں کہ ہندوستان کے بعض حصوں پر اُس کی فوجوں نے حملہ کیا اور انہیں ایرانی حلقۂ اقتدار میں لے آئے۔ اس کا ثبوت وہ سکے ہیں جو ان علاقوں سے کثیر تعداد میں اور مختلف مقامات سے ملے ہیں جو خسرو پرویز کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں (بدخشانی 1967:502)۔

علاوہ ازیں بہرام چوبیں، جنہوں نے خسرو پرویز کے خلاف بغاوت کی تھی، کو مورخین اشکانی تحریر کرتے ہیں مگر بعض مورخین اسے مہرانی قبیلہ سے متعلق بیان کرتے ہیں جس کا شمار شمالی اور شمال مغربی ایران کے کرد قبائل میں ہوتا ہے۔ علامہ ابنِ خلدون نے بھی اسلامی عہد میں میرانی یا مِروانی کرد قبیلے کی شمالی ایران اور اس سے متصل علاقوں پر حاکمیت کا تذکرہ کیا ہے۔ جس کی تفصیلات ان کی کتاب تاریخ ابنِ خلدون میں ملتی ہیں (ابنِ خلدون جلد چہارم: 2009: 27-381,426 علاوہ ازیں ابنِ خلدون، جلد پنجم: 2009: 459-464)۔ بہرام چوبیں کے کرد بلوچ قبیلہ کا فرد ہونے کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جب خسرو پرویز کے مقابلے میں اسے شکست ہوئی تو وہ کردستان کے قبائل کے پاس پناہ لینے پہنچا۔ خسرو پرویز چونکہ اس کا پیچھا کر رہا تھا لہٰذا کردوں نے خود کو خسرو پرویز کے مقابلے میں کمزور پا کر بہرام کو بحفاظت ترکوں کے پاس پہنچا دیا۔ اگر وہ کرد نہ ہوتا تو شکست اور فرار کے بعد وہ کردوں کی بجائے کسی اور

کی پناہ میں چلا جاتا، اور اگر وہ کرد نہ ہوتا تو کرد اُسے پناہ دینے یا بحفاظت ترکوں تک پہنچانے کی بجائے خسرو پرویز کے حوالے کر سکتے تھے اور اس کے بدلے میں انعام اور دیگر مراعات حاصل کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے شدید خطرات اور خسرو پرویز کی دشمنی مول لے کر بھی بہرام کی حفاظت کی اور اپنی تحویل میں اسے ترکوں کے خاقان کے پاس پہنچا دیا۔

اس میں شک نہیں کہ ایران کے زیرِ اثر علاقوں کے بلوچ قبائل ساسانی دربار پر چھائے ہوئے تھے اور ان کے دربار میں بلوچ قبائلی زعمأ اور امرأ کا کافی اثر و رسوخ تھا۔ اس بات کی تصدیق بلوچی زبان و ادب کے ممتاز محقق اور ادیب جناب سید ظہور شاہ ہاشمی کی تحریروں سے بھی ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ سید صاحب دربارِ خسروی میں بلوچ خواتین کی موجودگی کی بھی تائید کرتا ہے کہ جو خسرو کے محل کی شہزادیاں تھیں۔ لہٰذا ظہور شاہ ہاشمی دختر خسرو کے عنوان سے اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ایرانی آثار سے ایسی تحریر دریافت ہوئی ہے جس پر گمان کیا جاتا ہے کہ وہ محل کی کسی شہزادی یا خاتون کی تحریر ہے جو بلوچی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ:

"دیم خسروءِ سیاہ کہ نامہ یءِ پیغمبرءِ دِرت" (ہاشمی 1986:63)

اس دعویٰ میں کس حد تک صداقت ہے کہ یہ تحریر درست ہے اور محل کی کسی شہزادی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ ساسانی دربار میں ملک کے طول و عرض اور بالخصوص کوہِ البرز اور اس سے متصل علاقوں کے بلوچ قبائلی امیروں کے علاوہ سیستان اور کرمان کے امرأ کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ جبکہ باقی ماندہ بلوچستان ساسانی حکومت کے دائرہ اختیار سے باہر تھا۔

شیرویہ نے ایک سال حکومت کی اور 629ء میں طاعون کے مرض میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ اس کے دور کا اہم واقعہ یہ تھا کہ یمن کے حاکم بازان نے اسلام قبول کر لیا اور آہستہ آہستہ پورا یمن حلقۂ بگوش اسلام ہوا۔ شیرویہ کی وفات کے بعد اس کا نو عمر سات سالہ بیٹا اردشیر سوم

تخت نشین ہوا مگر ایک غیر ساسانی قسمت آزما تخت ایران پر جلوہ گر ہونے کے لیے قسمت آزمائی کرنے لگا۔ اس کا نام شہر براز تھا جو ایک غیر ساسانی تھا اور ایران کی فوج کا ایک بہادر سالار تھا۔ اس نے سات سالہ شہنشاہ کی سرپرستی کے بہانے تخت ساسان پر قبضہ کیا اور بعد ازاں خورد سالہ شہزادے کو قتل کر کے خود تاج و تخت سنبھال کر حکمرانی کرنے لگا۔ مگر اہل ایران کب کسی غیر ساسانی کو یہ حق دیتے کہ وہ تخت ایران پر آکر براجمان ہو۔ لہٰذا ایک دن شہر براز اپنے ایک خراسانی آشکانی محافظ ''پس فرخ'' کے ہاتھوں مارا گیا (بدخشانی 1967:524)۔

اردشیر سوم کے دور میں ایران اور عرب کے مابین تصادم اور مسلح چپقلش کا آغاز ہوا اور عربوں نے جنگِ سلاسل میں ایرانیوں کو زبردست شکست دی۔ ایرانی فوج کا سپہ سالار ہرمز حضرت خالدؓ بن ولید کے ہاتھوں مارا گیا۔ ایرانیوں کو شکست ہوئی اور عربوں کو کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اس طرح عرب افواج نے ساسانی سلطنت پر حملے شروع کیے جو چند ہی سالوں میں پورے ایران پر حاوی آگئے اور ساسانیوں کی سلطنت کا بوریا بستر لپیٹ دیا۔

اردشیر سوم کے بعد اہل ایران بڑی تیزی کے ساتھ زوال کی جانب گامزن ہوئے۔ اردشیر کے بعد قباد کا بیٹا خسرو سوم تخت نشین ہوا مگر بہت جلد اپنے منطقی انجام کو پہنچا اور حکومت کی باگ دوڑ ایک عورت ''پوران دخت'' کے ہاتھ میں آگئی جو خسرو پرویز کی بیٹی تھی۔ مگر وہ صرف چھ ماہ حاکمیت کرنے کے بعد بیمار ہو کر مر گئی تو اس کی جگہ خسرو سوم کا بھائی ''گشتاسپد'' حاکم بنا مگر اُسے نااہل قرار دے کر تخت سے اتار دیا گیا اور اس کی جگہ خسرو پرویز کی دوسری بیٹی ''آذرمی دخت'' کو تخت ساسان پر متمکن کیا گیا۔ وہ ایک خوبصورت اور عقلمند عورت تھی۔ اس نے دانش مندی کے ساتھ حاکمیت کی اور امورِ سلطنت سنبھالے۔ اس وقت ''فرخ ہرمز'' نامی ایک قبائلی سردار خراسان کا گورنر تھا۔ اس نے ''آذرمی دخت'' سے شادی کی درخواست کی جس کو ''آذرمی دخت'' نے ٹھکرادیا اور فرخ ہرمز کو خراسان سے مدائن مشورہ کرنے کے بہانے بُلا کر قتل کر دیا۔

اس پر اُس کا بیٹا رستم جو خراسان کا نیا گورنر مقرر ہوا تھا سخت برافروختہ ہوا اور اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے خراسان کا لشکر لے کر نکلا اور مدائن پر حملہ کر کے آذرمی دخت کو گرفتار کر کے اس کی آنکھیں نکلوا کر اسے قید میں ڈال دیا اور بعد ازاں اسے قتل کر دیا۔ آذرمی دخت کے بعد صرف چار سالوں میں تین حکمران ہرمز پنجم، خسرو چہارم اور فرخ زاد خسرو یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے اور ساسانی تخت و تاج بازیچۂ اطفال بنا رہا۔ فرخ زاد کے بعد ایک گمنام شہزادے کو تاج و تخت پر بٹھایا گیا جو یزدگرد بن شہریار بن خسرو کا بیٹا تھا اور گمنامی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہ ساسانی سلطنت کا آخری حکمران ثابت ہوا اور اس کے دور میں عرب فوجیں ایران پر چڑھ دوڑیں اور 644ء تک ایران کے اکثر علاقے مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے اور عرب فوجیں مکران میں داخل ہو گئیں۔ بعد ازاں یزدگرد حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں ایک خراسانی کسان کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس طرح ساسانی سلطنت کا سورج غروب ہوا اور ایران پر عربوں نے قبضہ کر لیا۔

ساسانی اور بلوچستان:

ابتدائی ساسانی نظام حکومت میں گیدروشیا جو ایران اور بلوچستان کے موجودہ بلوچی علاقوں پر مشتمل تھا، ایک گورنری صوبے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور Oral (بلاشبہ علاقہ کیچ کا قدیم نام جو یونانیوں میں مستعمل تھا) اور گیدروشیا دونوں مل کر گیدروشیا (ماکا) کے نام سے موسوم تھے۔ گمان ہے کہ جھالاوان اور بیلہ کے علاقے بھی اس صوبے میں شامل تھے۔ یہ سارا علاقہ ساسانیوں کا صوبہ ماکا تھا۔

محققین کے بعض بیانات کے مطابق شمالی بلوچستان اراخوسیا (خراسان) کے صوبے کا جنوبی حصہ تھا جسے عرب الرخاج کا نام دیتے تھے۔ بست اس صوبے کا صدر مقام تھا جو دریائے ہیلمند اور دریائے ارغنداب کے سنگم یا مقام اتصال پر واقع تھا (دہوار 1990:215)۔ گیدروشیا کا دارالمقام پورہ تھا جیسا کہ سکندر کے سفر نامے سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ عرب اسے فہرج جبکہ

بلوچ قبائل پہرہ کہتے تھے (سٹر یٹج 1986:501)۔اسی قدیم بستی کے ما قبل از تاریخ دور سے تعلق رکھنے والے کھنڈرات اب بھی بمپور کے نزدیک غیبی اور کلاگان نامی قصبوں کے درمیان واقع ہیں (دہوار 1990:215)۔

ساسانی عہد سے تعلق رکھنے والے اور بھی کئی قدیم ٹیلے بلوچستان کے مختلف مقامات پر پائے جاتے ہیں جو گو کہ ساسانی عہد سے قبل آباد تھے مگر ساسانی عہد میں چونکہ یہ تمام تر خطہ ان کے زیر اثر آچکا تھا لہٰذا ان بستیوں میں ساسانی عہد سے تعلق رکھنے والے اشیاء کے نمونے دریافت ہوئے ہیں۔ مثلاً مستونگ میں سام پور اور سپید بلندی (سفید بلندی) کے ٹیلے، کوئٹہ کے شمال میں چند میل کے فاصلے پر کچلاک اور سرانان کے قدیم ٹیلے اور سبی میں لونی ٹیلہ سے اس عہد کے برتنوں کے نمونے ملے ہیں۔ سام پور سے ایک چاندی کا بڑا پیالہ بھی دریافت ہوا تھا جس کا پینداا اتلا تھا۔ اس قسم کے اتلے پیندے والے برتن ایران میں پارتھی (آشکانی) عہد میں بنائے اور استعمال کئے جاتے تھے (دہوار 1990:220)۔

بلوچستان میں پائے جانے والے قدیم کاریزات، بندات اور آبپاشی کی غرض سے بنائی گئی پانی کی نالیوں کو بھی ماہرین اس دور سے منسوب کرتے ہیں۔ مگر ابھی تک یہ حتمی نہیں کہ آبپاشی کے ان ذرائع کو کب بنایا گیا۔ البتہ مکران میں کاؤسی اور خسروی کاریزات قدیم میدی اور ہخامنشی حکمرانوں سے منسوب ہیں۔ جبکہ بلوچستان کے دیگر حصوں میں بھی قدیم ایرانی ناموں سے منسوب کئی علاقے، پہاڑ اور ندی نالے پائے جاتے ہیں۔ ممکن ہے ساسانیوں نے اس نظام آبپاشی کو مزید ترقی دی ہو اور کئی نئے کاریزات احداث کیے ہوں۔ پرانے کاریزات کی صفائی ستھرائی کی ہو۔ کیونکہ ساسانیوں کو زراعت سے بڑی دلچسپی تھی۔ ان کے اس ذوق کے بارے میں تاریخی کتب میں کئی حوالے ملتے ہیں۔ ساسانی حکمران زراعت کو ریاست کی کمر کی ہڈی قرار دیتے تھے۔ لہٰذا ایسا ممکن

ہے کہ ساسانیوں نے بلوچستان کے حدود میں کئی نئے کاریزات احداث کر کے زراعت کی ترقی کے لیے اقدامات کیے ہوں گے۔ اس دعویٰ کی حقیقت اور سچائی اس وقت ثابت ہو گی جب بلوچستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے سینکڑوں بلکہ ہزاروں کاریزات پر ماہرینِ آثارِ قدیمہ وسیع پیمانے پر کام کریں گے۔ یہ کاریزات اب بڑی تیزی کے ساتھ ختم اور منہدم ہوتے جارہے ہیں اور ٹیوب ویلوں کی کثرت کی وجہ سے ان کاریزات کی بڑی تعداد خشک ہو چکی ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ ماضی کی یہ اہم نشانیاں اپنے اندر سربستہ رازوں سمیت ہمیشہ کی نیند سو جائیں۔

ساسانی دور اقتدار میں بلاشبہ بلوچستان کا وسیع و عریض رقبہ ایرانی سلطنت کے زیرِ اثر آچکا تھا اور ان کا سیاسی اور آئینی نظام یہاں قائم ہو چکا تھا جس کے یہاں کے سماجی نظام پر کافی گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ شاہنامہ فردوسی میں ایک واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ بلوچوں اور ساسانیوں کے درمیان طویل جنگیں ہوئی تھیں اور بالآخر 531ء میں نوشیروان نے برسر اقتدار آ کر بلوچوں کی جنگ آزادی کو کچل دیا تھا اور بلوچوں کو شدید نقصان پہنچایا تھا۔ اسکے بعد بلوچستان میں خسرو پرویز کے دور تک کسی بڑی بغاوت کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ملتی۔

خسرو پرویز کے دور میں روم اور ایران میں طویل جنگوں کے نتیجے میں بلوچستان پر ایرانی گرفت کمزور پڑ گئی مگر یہاں کے قدیم باشندے اس سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکے اور علاقے پر سندھ کے برہمن خاندان نے قبضہ کر لیا۔ مگر برہمن خاندان کے ذکر سے قبل سفید ہنوں (Apthilites) کا تذکرہ ضروری ہے کہ جو غالباً پانچویں صدی قبل مسیح میں وسط ایشیاء سے نکل کر ایران پر حملہ آور ہوئے تھے۔ ان ہنوں کے ساتھ گذشتہ کئی صدیوں سے ایرانی حکمران لڑتے چلے آرہے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کا ایران میں زور ٹوٹ گیا اور وہ ہندوستان کی جانب بڑھنے لگے اور شمالی ہندوستان پر یلغار کر دی۔ ہندوستان جانے کے لیے سفید ہنوں نے بلوچستان

کے دروں کو استعمال کیا۔ لہٰذا یقینی بات ہے کہ اس طرح یہاں کی مقامی آبادی کے ساتھ ان کی مڈ بھیڑ ہوئی ہو گی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہنوں کی ایک معمولی تعداد نے یہاں سکونت اختیار کی ہو۔ گو کہ اس دعویٰ کا کوئی ٹھوس ثبوت دستیاب نہیں ہے مگر بلوچستان کے چند مخصوص قبائل پر قدیم سفید ہنوں کی باقیات کا شبہ ہوتا ہے۔ ایسے قبائل جن پر سفید ہنوں کی باقیات کا گمان ہوتا ہے ان کا تذکرہ گذشتہ سطور میں ہو چکا ہے اور چند دیگر ممکنہ ہن قبائل کی باقیات کا تذکرہ اگلے سطور میں کیا گیا ہے۔

سفید ہنوں کی بلوچستان میں مداخلت :

وحشی سفید ہن ایک ایسا طوفانی ریلہ تھا جس نے ہندوستان، ایران اور یورپ کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ ہنوں کا اصل وطن اور قومیت کے بارے میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بعض مؤرخین انھیں منگولیا کے باشندے لکھتے ہیں جہاں وہ آوار (Horrian) قبائل کے ساتھ رہتے تھے۔ (کیرو۔ 1996:47) انہی کے مظالم اور جابرانہ رویے سے تنگ آکر ان وحشیوں نے بلخ پر حملہ آور ہو کر کداریوں پر حملہ کر کے وسط ایشیاء پر قبضہ کر لیا۔ اولف کیرو کے مطابق یہ وحشی قبائل تقریباً دس لاکھ خاندانوں پر مشتمل تھے۔ 360ء میں کداریوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور ان کی جگہ باختر میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

سفید ہن قدیم ہنوں کی طرح منگولیا کے علاقے ذنگاریہ کے باشندے تھے۔ مگر اصل ہنوں کے برعکس سفید ہن منگولوی زبان سے نابلد تھے۔ مگر ان کی فوجی تقسیم بالکل اصل ہنوں جیسی تھی۔ یعنی ہزار افراد پر ایک سالار جسے وہ منگ کہتے تھے (دہوار 1990: 233)۔

ونسنٹ اے سمتھ مایہ ناز مورخ گبن (Gibbon) کے حوالے سے ہنوں اور ان کی ظاہری شکل و شباہت کے بارے میں رقمطراز ہے کہ:

”ہنوں کی کثرت تعداد، سرعت نقل و حرکت اور سفاکانہ بے رحمی کو متحیر و پریشان گاتھ محسوس کرتے تھے، اس سے ڈرتے اور مبالغہ آمیز باتوں کے ساتھ ان کو بیان کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے کھیت اور گاؤں ان کے سامنے جلا کر خاکستر کر دیئے جاتے تھے اور ان کو مقتولوں اور کشتوں سے بھر دیا جاتا تھا۔ ان حقیقی ہیبتوں کے پہلو بہ پہلو وہ نفرت بھی تھی جو ان لوگوں کے دلوں میں ہنوں کی تیز آواز، نامہذب حرکات و سکنات اور انکی عجیب و غریب بدصورتی سے پیدا ہوتی تھی۔ دیگر انسانی اقوام کی نسبت وہ لوگ وسیع شانوں، چپٹی ناکوں اور سر کے اندر گھسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی وجہ سے ممیز تھے۔ لیکن ان کی داڑھی گویا نہ تھی بلکہ نہ ہوتی تھی اس لیے جوانی میں نہ تو ان کی شکل بارعب ہوتی اور نہ بڑھاپے میں وہ معزز اور قابل احترام معلوم ہوتے تھے“ (سمتھ 2001: 287)۔

باختر میں جب سفید ہنوں نے کامیابی حاصل کر لی اور ان کی جمعیت خوب مضبوط ہو گئی تو انہوں نے ایران اور ہندوستان پر حملے شروع کر دیئے۔ 427ء میں ایران کے نامور ساسانی حکمران بہرام پنجم (الملقب بہ بہرام گور) نے انھیں سخت نقصان پہنچایا اور ان کا زور توڑ دیا۔ جس کے نتیجے میں بہرام کے ساتھ ان کے تعلقات بعد ازاں خوشگوار ہو گئے (دہوار 1990: 224)۔

بہرام گور کے بعد جب ان کے پوتے فیروز اور ان کے بھائی ہرمز کے درمیان جنگ تخت نشینی شروع ہوئی تو فیروز نے مدد کیلئے سفید ہنوں کو طلب کیا جو اب تک اپنی بکھری اور ٹوٹی ہوئی قوت کو مجتمع کر چکے تھے۔ ہرمز کی شکست کے بعد سفید ہنوں کی ایران میں مداخلت بڑھ گئی حتیٰ کہ فیروز بھی ان سے تنگ آ گیا۔ مگر جب دونوں فریقوں کے مابین نوبت جنگ تک آ پہنچی تو ہنوں نے فیروز کو کئی لڑائیوں میں پے در پے شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ فیروز 484ء میں ہنوں کی قید میں فوت ہو گیا۔ سمتھ کے مطابق چھٹی صدی عیسوی تک ایران ہنوں کا باجگزار تھا اور اسی زمانے میں ہنوں کا ایک ریلہ بلوچستان میں بھی وارد ہوا (سمتھ 2001: 385-86)۔

یہی وہ زمانہ تھا کہ جب ہنوں کا ایک بڑا لشکر ہندوستان کے گپتا خاندان پر حملہ آور ہو چکا تھا لہٰذا ایران ان کی مزید تباہی سے بچ گیا اور ایرانی ہن فوجی دستے، ہندوستان پر حملہ آور فوج کی کمک کیلئے برابر بلوچستان کے راستے ہندوستان پہنچ رہے تھے۔ ان کی تصدیق سمتھ کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ ان کے مطابق اولاً 455ء کے موسم بہار میں ہنوں نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ جبکہ اس وقت نیا گپتا حکمران سکند گپت تخت نشین ہوا تھا۔ سکند گپت نے پہلی بار بڑی جرأت مندی سے ہنوں کو شکست فاش دی اور ان میں سے بیشتر کو تہ تیغ کر کے ہندوستان کو تحفظ فراہم کیا۔ مگر جب دوسری بار ہن ہندوستان پر حملہ آور ہوئے تو سکند گپت ان کا مقابلہ نہ کر سکا۔ مؤرخ لکھتا ہے:

"465ء کے قریب ان خانہ بدوش اقوام کا ایک از سر نو طوفان سرحد کی طرف سے در آیا اور گندھارا اور شمال مغربی پنجاب پر قابض ہو گیا۔ جہاں ایک بے رحم اور کینہ توز سردار نے کشان کے تخت و تاج کو غصب کیا اور حد درجہ کی وحشیانہ حرکتیں کیں۔ اس کے تھوڑے زمانے کے بعد ہی 470ء میں ہن اندرون ملک کی طرف بڑھے اور دوبارہ سکند گپت کی سلطنت کے عین قلب میں آکر اس پر حملہ آور ہوئے لیکن اب وہ گزشتہ مرتبہ کی طرح ان کا مقابلہ نہ کر سکا اور بالآخر اس کو ان بیرونی اقوام کے متواتر حملوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا پڑا۔ اغلب یہ ہے کہ ان حملہ آوروں کو برابر وطن سے امداد پہنچتی رہتی تھی اور وہ سب کے سب ہندوستان کے لوٹ کے شائق تھے۔" (سمتھ 2001: 387)

یقیناً سمتھ اسی امداد کا تذکرہ کر رہا ہے جو انھیں ایرانی ہن مہیا کر رہے تھے اور یہ امداد بلوچستان کے راستے ہندوستان پہنچ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس دوران ایران میں ہن مکمل طور پر خاموش رہے اور انہوں نے کوئی گڑبڑ نہیں کی۔

531ء میں ایران میں نوشیروان یا انوشروان برسر اقتدار آیا۔ شاہنامہ فردوسی میں منظوم ایک واقعے سے اس بات کا علم ہوتا کہ بلوچوں اور ایرانی حکومت کے مابین عرصہ دراز سے

خونی چپقلش چلی آرہی تھی اور بلوچوں نے کئی دیگر اقوام کے ساتھ ملکر، ایلم، گیلان، اور مازندران کے صوبوں میں قیامت بپا کی تھی۔ بلوچ قبائل جو کبھی ایرانی شہنشاہیت کے مضبوط ستون اور استحکامت کی علامت سمجھے جاتے تھے عرصہ دراز سے ایرانی حکومت کے خلاف آمادہ بغاوت تھے۔ مگر نوشیروان نے ان باغی اقوام کی قوت کو بری طرح کچل دیا اور انھیں اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ بعد ازاں نوشیروان نے خاقان ترک کے ساتھ اتحاد کرکے ان ہی بلوچ قبائل اور ترکوں کی مدد سے وسط ایشیاء میں ہنوں کو شکست فاش دی اور ان کی قوت کو توڑ کر وسط ایشیاء کو ایران کا حصہ بنا دیا۔ شاہنامہ فردوسی میں ہنوں کے خلاف اس ایرانی مہم میں بلوچوں کی جانبازی کے قصے مرقوم ہیں۔ لہٰذا اس پورے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے ابوالقاسم فردوسی لکھتا ہے کہ:

بُخارا پُر از گُرزو گوپال بود	بُخارا گُرزو گوپال اُٹھانے والوں سے بھرا ہوا تھا
کہ لشکر گہِ شاہِ ہپتال بود	جو ہپتالیوں کے بادشاہ کا لشکر گاہ تھا
کشانی وسغدی شدند انجمن	جہاں کشانی (بلوچ) وسغدستانی (ترک) جمع تھے
پُر از آبِ رُخ کودکِ مرد وزن	عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے آنسو بہہ رہے تھے
بی اندازہ لشکر شدند انجمن	بیشمار افواج کا اجتماع تھا
ز چاچ وز چین وترک وختن	جو چاچ، چین، ترکستان اور ختن سے آئے تھے
ہمہ مرزبانان بہ زریں کمر	تمام صوبائی گورنر سنہری کمر بند کے ساتھ
بلوچی وگیلی بہ زریں سپر	بلوچ وگیل اقوام سنہری ڈھالوں کے ساتھ
سراسر بہ آن بارگاہ آمدند	تمام کے تمام بارگاہ میں حاضر ہوئے اور
پرستندہ نزدیکِ شاہ آمدند	نہایت عقیدت مندی کے ساتھ بادشاہ کو آداب بجالائے
سپاہے بیامد زہر کشورے	ہر ایک ملک سے ایک لشکر آیا تھا
گیلان واز دیلمان لشکرے	جیسے گیلان اور دیلم کے لشکر
ز کوہِ بلوچ وزدشتِ سروچ	جیسے پہاڑی اور صحرائی بلوچ

گر ازان بر فتند گر دانِ کوچ | اور پہلوانان کوچ بھی ہمراہ چلے
ہمہ پاک باہدیہ و با نثار | پورے عقیدت و احترام اور پیشکشوں کے ساتھ
بہ پیشِ سراپردہ شہریار | اس جہاں پناہ بادشاہزادے کے پاس
بدان شاہ شد نامدارِ بزرگ | اس سے نامور بزرگ (نوشیروان) بہت خوش ہوا
کہ از میش کہ تاہ شد چنگِ گرگ | کیوں کہ بھیڑ کو بھیڑیے کے چنگل سے نجات ملی
جہاں تا جہاں شد بلوچی نبود | کوسوں جاتے آپ کو بلوچ نظر نہیں آتا
مگر شہر ازایشاں پر ازداغ و دود | مگر شہر میں جابجا دھویں کے مرغولے تھے
ہمہ کرد گیر داندران شارسان | تمام گُرد اس شہر میں جمع کئے گئے جوان کا
کہ ہم شارسان بود و ہم کارِ شان | مسکن بھی تھا اور میدانِ کارزار بھی
اسیر ان کہ از بربر آوردہ بود | ان قیدیوں کو جو بربر سے لائے گئے تھے
زروم وز جای کہ آزردہ بود | اور وہ جو روم یا کسی اور جگہ کے باغی تھے
گردگان کہ از لوچ آوردہ بود | یا دشتِ لوچ سے جو جتھے لائے تھے
زگیلان واز ہرچہ آزردہ بود | یا گیل (بلوچ قبیلہ) وغیرہ جنہوں نے بغاوت کی تھی
وراسورسان خواند کسریٰ بنام | کسریٰ نے اس شہر کو سورسان کا نام دیا
کہ در سوریابد جہاندار کام | کیونکہ سُور ہی شہنشاہ کی کامیابی کا مظہر ہے۔

(شاہنامہ فردوسی نسخہ مسکو، ماسکو)

ہنوں کا جو گروہ یورپ پہنچا انہوں نے اٹیلا کی سربراہی میں یورپ میں ایسا قتل عام کیا کہ وہ آدم خور اور خون خوار کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ اس نے اپنے دو بیٹے بھی قتل کر کے کھائے تھے (والکاٹ 2004:32-35)۔ اور لاکھوں انسانوں کو قتل کیا جبکہ سینکڑوں گاؤں قصبے اور شہر نذر آتش کئے۔

اسی طرح ایک ہن سردار مہر گل نے ہندوستان کے بیشتر حصوں پر حملہ کر کے انھیں اپنے قبضہ و اختیار میں رکھا اور ہندوستان میں مظالم کی ایسی تاریخ رقم کی کہ جس کی ماضی میں نظیر نہیں ملتی تھی۔ اس نے کشمیر کے راجہ کے احسانات کا بدلہ یہ دیا کہ اسکا تاج و تخت اس سے چھین کر اسکے ہزاروں آدمی دریائے سندھ کے کنارے ذبح کر دیئے اور اسکے تمام خزانوں کو لوٹ لیا۔ مہر گل کی سفاکی اور بربریت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ہاتھیوں کو پہاڑ سے لڑھکا کر ان کی چیخ و چنگھاڑ سے لطف اندوز ہوتا تھا (والکاٹ 2004:37)۔

565ء کے لگ بھگ ایشیاء سے ہنوں کا خاتمہ ہوا اور ان کا سیلاب عظیم تھم گیا (سمتھ 2001:396)۔

ایک مورخ ہنوں کی بلوچستان میں موجودگی کو ثابت کرنے کے لیے خود اختراع کردہ مفروضہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :

”سفید ہن بلوچستان میں پانچویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں داخل ہو گئے تھے لیکن ایرانی حکومت کے ہاتھوں شکست کھانے کے باوجود ان کا زور بلوچستان میں نہ ٹوٹ سکا۔ یہ بلوچستان کے کوہستانی خطے میں دور دور تک پھیل گئے اور انہوں نے زیادہ تر جھالاوان کو اپنا مرکز بنالیا۔ انہی سفید ہنوں کی مناسبت سے یہ علاقہ عرب دور اقتدار میں توران کے نام سے موسوم تھا“ (دہوار 1990:225)۔

مگر موٴرخ کا یہ بیان حقائق سے ہٹ کر ہے کیونکہ توران شاہنامہ کے مطابق ہخامنشیوں کے دور میں ایرانی سلطنت کا حصہ تھا۔ جبکہ بلوچستان میں موجود گجر اور جاٹ آبادی کے بارے میں سمتھ کا خیال ہے کہ یہ ہنوں کی باقیات ہیں (سمتھ 2001:397)۔

ملک سعید دہوار، مینگل بلوچ (براہوئی) قبائل کو بھی ہنوں کی باقیات قرار دیتا ہے حالانکہ اس بارے میں کوئی تاریخی اور مستند دلیل پیش نہیں کرتے جبکہ ظاہری طور پر بھی چپٹے ناک نقشے اور

دھنسی ہوئی آنکھوں والے ہنوں سے مینگل قبیلہ سمیت دیگر تمام بلوچ قبائل یکسر مختلف ہیں۔ علاوہ ازیں ہنوں کے وہ دھڑے جو بلوچستان میں وارد ہوئے تھے وہ اپنے ہندوستان پر حملہ آور بھائیوں کی امداد کیلئے جارہے تھے۔ جسکی تصدیق سمتھ بھی کرتا ہے(سمتھ 387:2001)۔

ممکن ہے ہنوں کے کچھ قبائل کسی بناپر یہاں رہ گئے ہوں مگر بہر حال وہ مینگل قبائل نہیں ہیں۔ اسی طرح مشکے ضلع آواران کے قریب گجر نامی گاؤں اور وہاں کے گجر آبادی کے بارے میں جو قیاس کیا جاتاہے کہ وہ ہنوں کے قافلوں کے لوگ ہوں گے کیونکہ ہنوں کے ساتھ گجر نامی ایک قبیلہ تھا جس نے پنجاب میں اپنی حکومت قائم کی تھی۔ ماہرین تاریخ کا یہ خیال ہے کہ پنجاب کی گجر یا گوجر آبادی انہی ہنوں کی باقیات ہیں یا گجر قبائل کی ایک بڑی تعداد جو بلوچستان کے ضلع کچھی میں بھی رہتی ہے اور مقامی آبادی میں گھل مل گئی ہے، ہنوں سے تعلق رکھتے ہیں صرف ایک خام خیالی ہے اور غلط العام مفروضہ ہے جس میں حقیقت نام کی کوئی شئے نہیں ہے۔ بلوچستان کے گجر دراصل قاجاری یا قاچاری بلوچ ہیں جو ایران پر اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں حکمران تھے جبکہ جت یا جاٹ آبادی بلوچستان کی قدیم ترین آبادی ہے جو دراصل لفظ ہوت کی فارسی زبان میں ادائیگی ہے کیونکہ فارسی زبان والے بلوچستان کے معروف قبیلے ہوت کو جت، عرب مورخین اسے زط اور الزط جبکہ یونانی اسے یوت کے نام سے تحریر کرتے ہیں۔

البتہ کچھ قبائل ایسے ہیں جن کے بارے میں گمان ہوتا ہے کہ ان کا تعلق قدیم سفید ہنوں سے ہے۔ ہنوں کا جو لشکر بلوچستان سے گزر کر ہندوستان کی جانب عازمِ سفر تھا انہوں نے بلوچستان کو پہلے اپنے قبضے میں لیا ہو گا تاکہ ان کا سفر اور ہندوستان پر حملہ آور لشکر کا راستہ محفوظ ہو اور اُسے بآسانی کمک اور رسد پہنچایا جاسکے۔ غالب گمان یہی ہے کہ ایک عبوری وقت کے لیے ہنوں نے وسطی اور شمالی بلوچستان پر اپنا قبضہ جمایا اور اپنے راستوں کو محفوظ کرنے کے بعد

ہندوستان کارخ کیا ہو گا۔ سیستان بھی اُن کے قبضہ میں تھا جبکہ قلات پر بھی انہوں نے اپنا تسلط جمالیا تھا۔ لہٰذا ان علاقوں کو ملٹری بیس بنا کر ہندوستان پر حملے کیے گئے۔ ایران اور وسط ایشیاء سے آنے والے کمک کار دستے مختلف مقامات پر محفوظ طریقے سے قیام کرتے اور مزید آگے بڑھتے۔ ممکن ہے ان امدادی دستوں میں سے کچھ نے بلوچستان کے ان علاقوں میں قیام کیا ہو اور بعد ازاں یہیں کے ہو رہے ہوں۔ لہٰذا قلات کے مغلزئی دہواروں کے بارے میں سفید ہنوں کی باقیات ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ تحقیق اور بعض شواہد کی بناء پر مغلزئی سمیت کچھ دیگر دہوار قبائل کے بارے میں یہی گمان ہوتا ہے۔ مغلزئی قبیلہ قلات میں وسیع و عریض آبائی جائیدادوں کے مالک ہیں اور قلات کے متمول خاندانوں اور روسائیں ان کا شمار ہوتا ہے۔ کمبرانی عہد میں قلات دربار میں اس قبیلہ کا کردار انتہائی اہم تھا اور اس خاندان کے افراد اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ علاوہ ازیں مستونگ اور قلات کے علی زئی اور عالی زئی قبائل کے بارے میں بھی یہی گمان ہوتا ہے کہ ان کا تعلق پانچویں صدی عیسوی میں بلوچستان میں داخل ہونے والے سفید ہنوں سے ہے۔ علی زئی اور عالی زئی قبائل نے بھی قلات کی کمبرانی عہد کی تاریخ میں ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا ہے۔ ان ہنوں کے کچھ خاندان موجودہ جنوبی افغانستان اور سیستان میں بھی سکونت پذیر ہو گئے جو اس خطے میں ابدالی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ قارئین کرام یہ بات ذہن نشین ہو کہ سفید ہنوں کو قدیم فارسی کتب میں ہفتالی اور ہپتالی بھی تحریر کیا گیا ہے جبکہ انگریزی زبان میں انہیں (ایپتھی لائٹ) Apthelite کہا جاتا ہے۔ افغانستان میں یہی لفظ ہپتالی بعد ازاں ابدالی میں تبدیل ہوا۔ یہ فارسی زبان کے لفظ ہفت تالی سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے سات تالیاں (پلیٹ) یعنی سات گھرانے یا سات خاندان۔ لہٰذا ابدالی قبائل سات مرکزی اور بنیادی خاندانوں میں منقسم ہیں جو علیزئی، الکوزئی، علیکوزئی، اسحاق زئی، پوپل زئی، بارک زئی اور سدوزئی قبائل ہیں۔ ان خاندانوں

کے کچھ دھڑے ابتدائی ایام میں ہی موجودہ خطہ بلوچستان میں آگئے تھے جبکہ بعض خاندانوں نے افغانستان میں سکونت اختیار کرلی۔ افغانستان میں اقامت پذیر سفید ہن قبائل مقامی پشتونوں میں ضم ہوتے گئے جبکہ مستونگ، قلات، خضدار اور دیگر علاقوں میں آباد سفید ہن خاندان اپنی قوت کھودینے کے بعد مقامی آبادی کے اندر مدغم ہوگئے۔ خضدار، قلات اور مستونگ کے عالی زئی اور علی زئی قبائل کے بارے میں گمان یہی کہتا ہے کہ ان کا تعلق قدیم ہنوں سے ہے جو مقامی دہوار قبائل اور بلوچ یونین میں شامل ہوگئے بالکل اسی طرح جس طرح افغانستان میں مقیم سفید ہن پشتونوں میں شامل ہوتے گئے۔ بلوچستان کے پشتون قبائل میں درانی اور ترین قبائل سفید ہنوں کے بہترین نمائندے ہیں۔

یہ ایک مفروضہ ہے جو مختلف حقائق، شواہد اور تاریخی حالات و واقعات کی روشنی میں قائم کیا گیا ہے لیکن حتمی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بلوچستان میں آباد قبائل میں سفید ہنوں کی باقیات شامل ہیں اور اس سلسلے میں نہ ہی بلوچستان میں ہنوں کی حاکمیت کا کوئی ثبوت ملتا ہے کہ جس کی بنیاد پر کہا جاسکے کہ ہنوں نے بلوچستان میں کوئی نوآبادیات قائم کی ہو اور یہاں اپنی نسل کے لوگوں کی کوئی آبادی بسائی ہو۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ لوٹ مار اور قتل وغارت گری کے شائق ان قبائل کا اصل ہدف مشرق کی آباد، زرخیز اور گنجان شہر تھے کہ جہاں لوٹ مار کو مال بسیار جبکہ قتل وغارت گری اور لہو بہانے کو انسانوں کی بہتات تھی۔ ایک معمولی، مختصر اور عبوری دور کے لیے بلوچستان کو اپنے اختیار اور تصرف میں رکھنے کے علاوہ انہوں نے زیادہ طویل عرصہ تک یہاں قیام نہیں کیا بلکہ وہ مشرق کی سمت چلتے رہے۔ بلوچستان کے بنجر اور غیر آباد خطے میں ان بھوکے اور وحشی درندوں کی بھوک اور پیاس بجھانے کو اتنا سامان اور لہو دستیاب نہیں تھا لہٰذا

یہاں سے وہ ایک طوفانی بگولے کی طرح گزرے اور اس خطے کے دروں کو بطور گزر گاہ استعمال کیا۔ البتہ اس خطے سے گزرتے وقت جو بھی ان کے سامنے آیا بچ نہ سکا نہ فرد نہ آبادی۔

سندھ کے رائے اور برہمن خاندانوں کی حکومتیں اور بلوچستان:

ایران کی قدیم تہذیب و تمدن کا خاتمہ عرب بادیہ نشینوں کے ہاتھوں ہوا جو ایک نئے مذہب اسلام کا پیغام لے کر دنیا کے ایک وسیع و عریض خطے پر چھا گئے۔ حتیٰ کہ ایران 10 سال کے مختصر عرصہ میں ان بادیہ نشین صحرائی عربوں کے ہاتھوں فتح ہوا اور پورا ایران تا حدودِ مکران عربوں کے قبضے میں چلا گیا۔ مگر عرب حملوں سے قبل ہی ایرانی ساسانی اقتدار کے زوال کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ کیونکہ ایران اور روم عرصہ دراز سے آپس کی خونریز اور تباہ کن جنگوں میں مصروف تھے اور ایک ایسا وقت بھی آیا کہ ایرانی فوجیں قسطنطنیہ تک پہنچ گئی تھیں۔ مگر بہر حال جنگ میں جیت جس کی بھی ہو تباہی لازمی ہوتی ہے اور جنگی اخراجات کا سارا بوجھ عوام کو برداشت کرنا پڑتا ہے لہٰذا ایرانی معاشرہ ساتویں صدی عیسوی میں سخت انحطاط کا شکار تھا اور بڑی تیزی کے ساتھ روبہ زوال تھا۔

روم اور دیگر ہمسایہ ممالک کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور تصادم کی وجہ سے ایرانی حکمران اپنے مشرقی مقبوضات کی طرف سے نہ صرف لاپرواہ اور غافل ہوگئے بلکہ تقریباً وہ ان علاقوں کو بھول چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سندھیوں نے بآسانی اپنی سرحدیں کرمان تک پھیلا دیں۔ موٴرخین لکھتے ہیں۔

> ”بہرام گور (بہرام پنجم) کی وفات کے بعد سندھ کے راجپوت حکمران راجہ سیہرس اول نے پہلے ارمن بیلہ (لسبیلہ) اور اسکے بعد مکران پر حملہ کرکے بلوچستان کے وسطی اور جنوبی علاقوں کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا۔ اس میں کچھی کا علاقہ سبی سمیت شامل تھا جو بودھیہ (بدھا) کہلاتا تھا۔ اس موخر الذکر علاقہ کے جٹ باشندے بدھ مت کے پیروکار تھے اور یہی مذہب سندھ کے شاہی خاندان اور اس کے باشندوں کا تھا“ (دہوار 1990: 228)۔

جبکہ اس سلسلے میں ریورٹی بھی ایک طویل تاریخی پس منظر بیان کرتا ہے اور زیادہ تفصیل کے ساتھ ان حالات پر روشنی ڈالتا ہے جو بلوچستان میں عرب حملوں اور مسلمانوں کی آمد سے قبل تھے جن کی وجہ سے سندھ کے برہمن حکمران یہاں پر غالب آ گئے۔ ریورٹی سندھ کی اس سلطنت کا جائزہ پیش کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ:

"طلوع اسلام سے پہلے دریائے سندھ کے ساتھ ایک طویل و عریض ہندو سلطنت قائم تھی جو شمال میں اس وقت کی کشمیری سلطنت کی سرحد تک جس میں موجودہ پنجاب کا بھی کافی علاقہ شامل تھا، پھیلی ہوئی تھی۔ شمال مشرق میں اس کی سرحدیں ریاست قنوج سے ملتی تھیں۔ مغرب میں مکران یا کیچ اور مکران، اور کردان (کوہِ کاران) اور کیکانان یا کیز کانان تک اور جنوب مشرق میں دیول اور سورت کی بندر گاہوں کے ماتحت علاقوں کی سرحدوں تک نیز شمال مغرب میں سجستان یا سکستان کی سرحدوں اور بالیوس (قندھار۔ بیلوس) کے قدیم خطہ زمین کی جنوبی سرحدوں تک اور کوہِ سلیمان اور کوہِ سرخ کے بیرونی دامن تک اور جنوب میں بندر گاہ دیول (دیبل) اور سمندر کے ساحل تک پھیلی ہوئی تھی" (ریورٹی 1991: 792-93)۔

راجہ سیہرس اول (سر دیواجی) کی مقبوضات میں ایک وسیع و عریض علاقہ شامل تھا۔ اس کا دارالحکومت الور بڑا گنجان آباد شہر تھا۔ اس کی سلطنت چار صوبوں میں منقسم تھی جس میں ایک سیوستان یا وچلو تھا۔ بدھ پور اور جنگان اس کے ماتحت تھے اور وہ روجھان کے قریبی پہاڑوں سے مکران کے پہاڑوں تک پھیلا ہوا تھا۔ بہمن آباد بھی اس کا بڑا شہر تھا (ریورٹی 1991: 793)۔

مصنف مزید لکھتا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ شمال مغرب کی طرف اس کا علاقہ کوہِ سرخ تک پھیلا ہوا تھا۔ موجودہ کچھی کی سرحد یا دریائے سندھ سے ڈھاڈر تک اور ضلع سیوی کا کچھ حصہ بھی اس میں شامل تھا۔ اسکی تینوں شمالی مغربی اور جنوبی اطراف میں مذکورہ سلسلہ کوہ کی پہاڑیاں تھیں۔ یہ علاقہ غالباً سیہرس رائے کی سلطنت میں شامل تھا۔ تاہم اس قدر وسیع علاقے کی نگرانی بہت دشوار ہو گی۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق سندھ کی سرحدیں مشرق میں کشمیر، مغرب میں مکران، شمال میں پہاڑ اور جنوب میں ساحل سمندر تک (ریورٹی 1991: 793,94)۔

تاریخی واقعات کے مطالعے سے یہ بات شنید میں آتی ہے کہ سیہرس اعظم کے دور میں ولایت بیلوس (ملکِ بیلوس یا بلوچ یعنی قندھار) کے حکمران نے مکران پر حملہ کیا اور ایک ہولناک جنگ میں راجہ سیہرس مارا گیا اور بیلوس حکمران لوٹ مار کرکے واپس اپنے علاقے کو لوٹ گئے (ریورٹی 1991: 793,94)۔

کچھ عرصہ تک بلوچستان پر سندھیوں کے اثرات رہے اور یہ علاقہ اُن کی دسترس میں رہا۔ سیہرس اعظم کی موت کے بعد ان کا بیٹا راجہ ساہسی حکمران بنا۔ اس کی وفات کے بعد رائے سیہرس دوئم نے عنان حکومت سنبھالی۔ ان کے عہد تک سندھ کے حدود جوں کے توں رہے۔ جب راجہ سیہرس دوئم کا انتقال ہوا تو راجہ رائے ساہسی کو حکومت سونپ دی گئی۔

راجہ ساہسی دوئم کے دور میں سندھی معاشرہ سخت انحطاط کا شکار ہوا۔ بدھ مت کی جگہ ہندو مت نے لے لی اور حکومت پر راجہ کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ ایک چالاک برہمن چاچ (چچ) بن سلائج کو حکومت کے معاملات میں بے تحاشہ اختیارات مل گئے اور یہ سب راجہ ساہسی کی چالاک اور مکار بیوی کے توسط سے ہوا۔ راجہ کے وفات کے بعد رانی نے چچ سے باقاعدہ شادی رچا لی اور سندھ کا اقتدار چچ بن سلائج برہمن کو منتقل ہوا۔ جبکہ اس سے قبل کے حکمران بدھ مت کے پیرو تھے اور رائے خاندان سے تعلق رکھتے تھے (قدوسی 1985: 12,13)۔

چچ نے پہلے حاصل شدہ ریاست پر اپنی گرفت مضبوط کی اور بعد ازاں اسے ان علاقوں کا خیال آیا جو راجہ سیہرس کے دور میں سندھ کا حصہ تھے۔ ایران بھی اس دور میں سخت انحطاط اور اندرونی کمزوری کا شکار تھا اور کئی رومی علاقے مثلاً شام و فلسطین وغیرہ اس کے تصرف میں آچکے تھے جبکہ ایرانی فوجیں باسفورس تک پہنچ گئیں تھیں اور انہوں نے بازنطینی رومی سلطنت کے دارالحکومت کا تین اطراف سے محاصرہ کر لیا تھا۔ مگر بالآخر رومی فوجیں ہرقل کی سرکردگی میں ایک بار پھر اٹھے اور ایشیائے کوچک اور آرمینیا کو فتح کرکے ایران کے حدود میں داخل ہوگئے۔ 628ء میں خسرو پرویز قتل ہوا اور اسکے بعد کوئی ایرانی شہزادہ یا شاہی خاندان کا کوئی بھی فرد

ایرانی انحطاط اور زوال کو روک نہ سکا۔ حتیٰ کہ پوران دخت اور عارض ماہ (آذرمی دخت) نامی دو شہزادیاں بھی اقتدار کے حصول میں ماری گئیں۔

شہزادی پوران دخت کے دور میں سندھی راجہ چچ بن سلائج نے حملہ کر کے وسطی اور جنوبی بلوچستان کو دوبارہ اپنی قلمرو میں شامل کرلیا۔ مؤرخین کے بیانات کے مطابق چچ نے قلات (کیکانان)، خضدار، بیلہ، مکران اور کرمان کو اپنی قلمرو میں شامل کرلیا (قدوسی 1985 :109)۔ مؤرخین کے مطابق چچ نے کرمان کے قریب کھجور کی ایک جھنڈ کو ایران اور سندھ کی سرحد قرار دیا۔ گنداواہ کا علاقہ بھی اس کی حکومت میں شامل تھا۔ جہاں سے سو گھوڑے اور ایک لاکھ درہم خراج سالانہ کے حساب سے وصول کیا جاتا تھا۔ چچ بن سلائج نے 40 سال انتہائی کامیابی کے ساتھ حکومت کی اور سندھ کے حدود کو خوب وسعت دی۔ شمالی بلوچستان اور خراسان کے بیشتر حصہ پر شاہ کابل کا قبضہ تھا۔ جسکے متعلق مشہور تھا کہ وہ راجپوت ہے (دھوار 1990:235)۔

چچ کی وفات کے بعد اس کی وسیع و عریض ریاست اس کے دو بیٹوں راجہ دہر سینہ اور راجہ داہر کے مابین تقسیم ہوگئی۔ مگر کچھ عرصہ بعد دہر سینہ اس صدمے سے مر گیا کیونکہ راجہ داہر نے اپنی سگی بہن ماہین سے شادی کرلی تھی اور اسے اپنی ملکہ بنا لیا تھا (قدوسی 1985 :45)۔ اس طرح راجہ داہر اپنے بھائی کی وفات کے بعد اس کی سلطنت پر بھی قابض ہوا اور ایک طاقت ور حکمران کے طور پر ابھرا۔ مگر مؤرخین کے بیانات کے مطابق سندھی مقبوضات پر حملے اس سے پیشتر شروع ہوچکے تھے اور عرب فوجیں مکران پر قابض ہو کر سندھ کی سرحدات کے قریب پہنچ چکی تھیں۔

تاریخی کتب کے مطالعہ اور دیگر شواہد اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ عرب حملوں کے دوران مکران اور وسطی بلوچستان کے علاقے سندھی تسلط سے آزاد تھے کیونکہ جب مکران اور وسطی بلوچستان پر حملے شروع ہوئے تو کسی سندھی فوج نے ان علاقوں کی حفاظت نہیں کی اور نہ ہی عربوں کے سامنے انہوں نے کوئی مزاحمت پیش کی بلکہ مقامی باشندے ہی عربوں سے نبرد آزما رہے اور ان کے خلاف لڑتے رہے۔ عربوں نے بھی سندھ سے قبل بلوچستان پر قبضہ کرنا ضروری

خیال کیا۔ لہٰذا وہ بلوچستان کے مختلف علاقوں پر حملہ آور ہوئے اور دیبل کی فتح سے قبل انہوں بلوچستان کے دفاعی مورچے کو اپنے قبضہ و اختیار میں لیا۔

بلوچستان عرب (خلفائے راشدین بنو امیہ اور عباسی) دورِ اقتدار میں:

عربوں کے بلوچستان پر حملے 23 ہجری بمطابق 644ء حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ یعنی دوسرے خلیفہ راشد کے دور میں شروع ہو چکے تھے اور مکران کا وہ حصہ جو اِس وقت ایران کے زیرِ اثر ہے، پر عربوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ سیستان بھی ان کے قبضہ و اختیار میں آچکا تھا۔

عربوں نے 23 ہجری (644ء) میں سجستان (سیستان) یا نیمروز کے علاقوں اور شہروں پر ہندوستان کی سرحد تک یلغار کی۔ یعنی سیہرس رائے کے علاقوں تک اور بعد میں قندھار کے خطہ زمین پر قبضہ کرلیا۔ لیکن کافی عرصے تک سجستان کے دارالحکومت زرنج یا زرنگ کے مضبوط ترین قلعہ کا متواتر کوششوں کے باوجود وہ کچھ نہ بگاڑ سکے۔ بالآخر شدید مزاحمت کے بعد زرنگ شہر کے مزاحمت کاروں نے اسے بھی حملہ آوروں کے حوالے کر دیا۔

نیمروز کے حکمران نے زرنج کا شہر مسلمانوں کے افسر عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے کر دیا۔ بعض انتہائی مستند بیانات کے مطابق، اس وقت مکران پر ملک سعد ژند بیل کی حکومت قائم تھی۔ (ژند۔ بیل یا بھیل، بلوچوں کے دو الگ الگ قبائل کے نام ہیں جو مکران اور ایران میں آباد ہیں۔ ممکن ہے کہ عرب دور میں یہ ایک ہی بڑا اور طاقت ور قبیلہ ہو اور اسکے ساتھ دیگر اتحادی قبائل بھی ہوں۔ مگر یہ درست ہے کہ اس وقت یہ قبیلہ ژند اور بھیل یا بیل دو قبائل میں منقسم ہے مزید تحقیق سے اس کے دیگر اجزاء کا بھی پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ 18ویں صدی عیسوی میں کریم خان ژند بلوچ نے ایران کے ایک بڑے حصے پر حکومت بھی کی تھی۔ اور

یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ ژند بعد ازاں رند بنا ہو۔ جن کی شاعری میں عربوں کے ساتھ لڑائی جھگڑوں اور تصادم کا تذکرہ ملتا ہے)۔

بہر حال عرب حملوں کے دوران مکران پر ملک سعد نامی ایک شخص حکمران تھا۔ عرب مؤرخین اسے مذہباً ہندو لکھتے ہیں (ریورٹی 1991 :794)۔ ریورٹی نے بھی عرب مورخین کی تحریروں کی روشنی میں یہی لکھا ہے۔ اس نے سندھ کے حکمران سے مدد مانگی جس کے وہ ماتحت تھا وہ ایک بڑی فوج اور بے شمار ہاتھیوں کے ساتھ ملک سعد کی مدد کیلئے بذات خود روانہ ہوا۔ جب ان تیاریوں کا علم کرمان میں موجود عبداللہ بن عبیداللہ کو ہوا تو کرمان اپنے نائب کے حوالے کرکے وہ فوج کا بیشتر حصہ لے کر مکران پر پہلے سے حملہ آور افواج کی امداد کو روانہ ہوا۔ مکران میں اس نے عرب اور سندھی و مکرانی (بلوچ) افواج کے درمیان کافی فاصلہ پایا اور یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ مکران کے سپاہیوں کو ارد گرد کے علاقوں سے مسلسل امداد پہنچ رہی تھی۔ عبداللہ بن عبیداللہ نے تاخیر میں خطرہ بھانپ لیا۔ لہٰذا عرب سالاروں سے مخاطب ہو کر کہا۔ اس فاصلے پر تم کیوں خاموش بیٹھے ہو؟ اس وقت تک تاخیر کیوں کرتے ہو کہ تمام دنیا تمہارے خلاف جمع ہو جائے لہٰذا فوراً حملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ جونہی رات شروع ہوئی اس نے اپنے دستوں اور حکم بن عمرو التغلبی اور شہاب المحارب بن شہاب کے ماتحت دستوں کی کمان کرتے ہوئے حملہ کیا اور صبح تک انھیں تہہ تیغ کرتے رہے۔ بہت سے ہاتھیوں اور قیدیوں کے علاوہ بے شمار مال غنیمت ہاتھ آیا اور تمام مکران مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ یہ واقعہ سنہ 32 ھجری بمطابق اکتوبر سنہ 644ء کے آخر میں وقوع پذیر ہوا۔

خلیفہ دوئم حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مال غنیمت کا پانچواں حصہ روانہ کیا گیا۔ عبداللہ کی اس کامیابی میں حاصل ہونے والے جثیم الوزن ہاتھیوں کے بارے میں عرب مصنف نے نرالے اور سادہ اندازِ تحریر میں جو کچھ بیان کیا ہے۔ جو بڑی دلچسپ ہے۔

قاصد (صحار عبدی) نے ہاتھیوں کے بارے میں عبد اللہ بن عبید اللہ کے الفاظ یوں دھرائے کہ:

> "وہ ذبح کرنے کی صورت میں خوراک کیلئے موزوں نہیں، بار برداری کیلئے اس قدر سامان نہیں۔ ساتھ لانے کیلئے لگامیں اور گلوبند نہیں اور زندہ رکھنے کیلئے کافی مقدار میں خوراک موجود نہیں"۔

عبد اللہ کے قاصد سے جب مکران کی آب و ہوا، علاقائی ہیت اور جغرافیائی کیفیت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ:

> "اس کے ہموار زمین پہاڑ سے بدتر ہیں، وہاں پانی کی قلت ہے۔ اس کے میوے بدمزہ اور کڑوے ہیں۔ وہاں نیکی کم اور برائی زیادہ ہے۔ اگر زیادہ فوج رکھی جائے تو اس کے بھوک و افلاس سے ہلاک ہو جانے کا خطرہ ہے اور کم فوج رکھی جائے تو دشمن کے ہاتھ سے اس کے قتل ہو جانے کا امکان ہے اور اس سے آگے کا علاقہ اور زیادہ خراب ہے" (دھوار 1990: 242)۔

ان اطلاعات کے پیش نظر خلیفہ دوئم حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہاتھیوں کو کسی قریبی حکمران کو فروخت کرنے اور مزید پیش قدمی نہ کرنے کا حکم دیا (ریورٹی 1991 :796)۔ اس طرح بلوچستان عربوں اور مقامی باشندوں کے مابین تقسیم ہوا۔ یعنی سیستان اور مکران سمیت مغربی بلوچستان کا وسیع و عریض علاقہ عربوں کے قبضہ میں چلا گیا جبکہ جنوبی بلوچستان یعنی لسبیلہ پر مقامی باشندوں کا قبضہ برقرار تھا اور وسطی بلوچستان بھی مقامی باشندوں کے پاس تھا۔

چچ نامہ اس واقعے کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ راشد سوئم کے دور سے منسوب کرتا ہے۔

اس کتاب میں (کیکانان) پر حملے کی ایک اور شہادت ملتی ہے کہ 38 ہجری بمطابق 659ء میں جب حضرت علی کرم اللہ وجہ خلیفہ بنے تو اس زمانے میں اہل شہر کے درمیان نا اتفاقی پیدا ہو گئی اور مسلمان ایک دوسرے کی مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ عامر بن الحارث بن عبد القیس سے روایت ہے کہ جب قرب و جوار کے لوگ مخالف ہو گئے تو امیر المؤمنین نے ناغر بن دغو کی قیادت میں ایک فوج مرتب کر کے ہند پر فوج کشی کا حکم دے دیا اور کئی فوجی اکابر و اعیان اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ انہوں نے فہرج اور کوہِ پایہ (کوہِ سیاہ) کے راستے اپنا سفر جاری رکھا۔ 38 ہجری کے اواخر میں جن جن اضلاع سے ان کا گزر ہوا ان کو وہاں فتح ظفر اور کامیابی حاصل ہو گئی اور بہت سا سامان غنیمت ان کے ہاتھ لگا۔ آخر کار وہ کیکانان کے علاقے میں وارد ہوئے۔ اس طائفے کے لوگ لڑائی پر آمادہ تھے۔ ہذلی کا بیان ہے کہ حارث بن مرہ ایک دلیر اور بہادر شخص تھا۔ اسلحہ سے لیس ایک ہزار سپاہی اسکے ہمراہ تھے اور تین بہادر اور قوی الجثہ غلام بھی اسکے ساتھ تھے۔ ان میں ایک کو اس نے اپنا محافظ مقرر کیا تھا اور باقی دو اپنے اپنے فوجی دستوں کے اوپر سر لشکر تھے۔ ان میں سے ہر ایک پانچ سو افراد کے اوپر سپہ سالار تھا۔ جب وہ مکران میں تھے تو ان کی آمد کی خبر کیکانان پہنچ گئی تھی۔ اہل کوہ پایہ (کوہ سیاہ) اور کیکانان جمع ہو کر انتظار کر رہے تھے۔ 42 ہجری (663ء) میں جب عرب کیکانان پہنچے تو اس علاقے کے لوگ جو پہلے سے تیار بیٹھے تھے لڑائی پر آمادہ ہو گئے اور جنگ شروع ہو گئی۔ تقریباً بیس ہزار کیکانانی (بلوچ) پیادہ اکھٹے ہو گئے تھے، عرب فوج کا ان سے مقابلہ ہوا۔ جب کوئی چارہ نہ رہا تو وہ لوگ آگے بڑھے اور لڑائی میں مشغول ہو گئے۔ جب عرب غزا (جہاد) سے واپس ہوئے تو وہ لوگ کیکانان کے درے میں داخل ہو گئے اور راہ فرار اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ عرب لشکر نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور اطراف کے پہاڑوں سے بھی نعرہ تکبیر کی گونج بلند ہوئی۔ (بازگشت کی وجہ سے) کیکانان کے کافروں نے جب یہ آوازیں سنیں تو ان کے

دلوں پر ایک قسم کی ہیبت طاری ہوگئی اور وہ بہت زیادہ خوف زدہ ہوگئے۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے آگے بڑھ کر اسلام قبول کیا اور دوسروں نے شکست کھا کر راہ فرار اختیار کرلی۔ ابھی یہ لوگ کیکانان ہی میں تھے کہ ان کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کی خبر ملی تو ان مجاہدین نے فوراً واپسی کی راہ لی اور مکران پہنچ گئے (دھوار 1990:245)۔ (اس موضوع پر مزید معلومات کے لیے ملاحظہ کریں مرزا قلیچ بیگ کی مشہور تصنیف "چچ نامہ")

بعد ازاں امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں عربوں نے ایک بار پھر قلات (کیکانان) پر حملہ کر دیا اور قتال کے بعد کافی مال غنیمت اکٹھا کیا۔ قلات گھوڑوں کے بہترین نسل کے حوالے سے بے حد مشہور تھا۔ تاریخ کے کئی کتابوں میں قلات کے علاقے میں گھوڑوں کی افزائش و نسل کے بارے میں تحریریں ملتی ہیں (خلدون 2009:356) (البلاذری 2010:-79 578) (ریورٹی 1991 :791)۔ عمر بن عبداللہ نے قند ابیل (گنداوہ) پر حملہ کیا، اسی طرح ایک لشکر قیس بن ہاشم الاسلمی کے سربراہی میں اردبیل کی جانب روانہ کیا۔

تاریخی تحریری ذرائع کے مطالعہ سے یہ بات شنید میں آتی ہے کہ عرب حملوں کے دوران بلوچ قبائل جنوبی ایران کے شہر فارس اور اس سے متصل مشرقی علاقوں مثلاً مکران اور کرمان میں بھی بڑی تعداد میں آباد تھے۔ مورخین کرمان کے قریبی پہاڑوں کے باشندوں کو قفصی یا کوچ تحریر کرتے ہیں جبکہ بسا اوقات انہیں کرد بھی لکھتے ہیں۔ یہ قبائل دیگر بلوچ قبائل کے ساتھ ایرانی صحرائی اور پہاڑی علاقوں اور قریوں میں آباد تھے۔ شہرک نامی ایک مقامی شخص فارس کا گورنر تھا۔ لفظ شہرک سے ہی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ فارس کا گورنر دراصل ایک مقامی بلوچ تھا کیونکہ یہ نام اب بھی بلوچ قبائل میں معروف ہے اور اس نام کا استعمال ان قبائل میں عام ہے۔ لہٰذا وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ شہرک ایک مقامی سرکردہ بلوچ رہنما تھا جو

ساسانیوں کی جانب سے اس علاقے کا گورنر مقرر تھا۔ شہرک نے عرب حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان کے مقابلے میں مقامی بلوچ قبائل کی ایک بڑی فوج لے آیا۔ اس جنگ میں عربوں کو فتح حاصل ہوئی۔ فارس اور کرمان پر حملوں کو تمام عرب مورخین نے بیان کیا ہے۔ بلوچ علاقوں پر قبضہ ایران کی جانب سے شروع ہوا لہٰذا اسی ترتیب سے ذیل میں ان فتوحات کا حال بیان کیا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں معروف عرب مورخ محمد بن یحیٰی بن جابر الشہیر البلاذری نے بھی اپنی مشہور کتاب فتوح البلدان میں طویل بیان تحریر کیا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق:

''العلائؒ بن الحضرمی نے جو عمر بن خطاب کی جانب سے البحرین کے عامل تھے، بنی الازد کے ہرثمہ بن ہرفجنہ البارقی کو ایک مہم پر بھیجا۔ ہرثمہ نے فارس کے قریب سمندر میں ایک جزیرہ فتح کیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے العلائؒ کو لکھا کہ ہرثمہ کو عتبہ بن فرقد السلمی کی مدد پر بھیجو۔ انہوں نے ہرثمہ کو عتبہ کی کمک پر بھیج دیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عثمان بن ابی العاصی الثقفی کو البحرین اور عمان کا والی کیا۔ انہوں نے ایک سرے سے ملک کا دورہ کیا اور باشندوں کو اچھی طرح مطیع کر لیا اور اپنے بھائی الحکم بن العاصی الثقفی کو جیش عظیم کے ساتھ، جس میں بنی عبد القیس، ازد، تمیم، بنی ناجیہ اور دوسرے قبیلوں کے لوگ تھے، سمندر کے رستے فارس کی طرف بھیجا۔ حکم نے جزیرہ ابر کاوان (شاید جزیرہ ہرمز) فتح کیا اور توج پہنچے جو ارض اردشیر خرہ میں ہے۔ اردشیر خرہ کے معنی شکوہ اردشیر ہیں۔ ابو مخنف کہتا ہے: عثمان بن ابی العاصی نے سمندر عبور کر کے فارس پر حملہ کیا پھر توج پر اترے اور اس کو فتح کیا، مسجدیں بنائیں اور مسلمانوں کے لیے اس کو گھر قرار دیا اور بنی عبد القیس اور دوسرے قبیلوں کو یہاں آباد کیا، یہاں سے وہ ارجان کی طرف گئے اور اس کی سرحد توج سے متصل تھی اور اس پر حملہ کیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکم آیا اور وہ فارس سے عمان و بحرین کی طرف واپس ہو گئے اور اس ناحیہ پر اپنے بھائی الحکم کو اپنا نائب مقرر کیا۔ ابو مخنف کے سوا دوسروں کا بیان ہے کہ توج الحکم نے فتح کیا اور 19 ھجری

میں مسلمانوں میں سے بنی عبد القیس اور دوسرے قبیلوں کو آباد کیا" (البلاذری 2010 :525)۔

البلاذری فارس کے گورنر شہرک کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

"کہتے ہیں شہرک پر، جو فارس کا مرزبان اور والی تھا، عربوں کی لشکر کشی کا بہت اثر پڑا اور یہ بات اس پر گراں گزری۔ جب اس کو عربوں کی قوت اور ان کی شجاعت کا حال معلوم ہوا، اور اس نے سنا کہ جس سے ان کا مقابلہ ہوا ہے اس پر وہ فتح یاب ہوئے ہیں تو اس نے جمع عظیم فراہم کی اور ارض سابور میں راشہر پہنچا، یہ مقام توج کے قریب ہے، الحکم بن العاصی اس کی طرف نکلے، ان کے مقدمے پر سوار بن ہمام العبدی تھے۔ معرکے کا رن پڑا۔ یہاں ایک وادی تھی اس پر شہرک نے اپنے نقیبوں میں ایک کو ایک جماعت کے ساتھ متعین کر دیا اور حکم دیا کہ ہمارے لشکر میں سے جو بھاگے اور ادھر سے گزرے اسے قتل کر دینا۔ اساورہ (اساورہ دراصل سیاہ الاسوار کے لوگ تھے جو ایک بلوچ سردار تھا اور وہ اور اس کا قبیلہ بعد ازاں عربوں کے ساتھ مل گئے تھے) کے بہادروں میں سے ایک منہ موڑ کر ادھر سے نکلا۔ ان لوگوں نے اس کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے کہا: "مجھے قتل نہ کرو، ہم جس قوم سے جنگ کر رہے ہیں وہ منصور قوم ہے اور اللہ اس کے ساتھ ہے" اس نے ایک پتھر پر تیر مارا۔ پتھر شق ہو گیا، پھر ان لوگوں سے کہا: "کیا تم اس تیر کو دیکھتے ہو جس نے پتھر کو شق کر دیا۔ خدا کی قسم یہ تیر ان میں سے کسی کے مارا جائے تو اس سے ان کے خراش بھی نہ آئے گی۔" نقیب نے کہا: "تیرا قتل اب ضروری ہو گیا ہے۔" اسی اثنا میں شہرک کے قتل کی خبر آئی۔ شہرک کو سوار بن ہمام العبدی نے قتل کیا تھا۔ سوار نے اس پر حملہ کیا اور قتل کیا۔ اس نے نیزہ مارا اور مرکب سے نیچے گرا دیا، تلوار کی ایسی ضرب لگائی کہ وہ مر گیا۔ شہرک کے بیٹے نے سوار پر حملہ کیا اور قتل کر دیا۔ اللہ نے مشرکوں کو شکست دی اور راشہر بزور فتح ہو گیا" (البلاذری 2010 :525-26)۔

عرب مورخین کے بیانات کے مطابق انتہائی کم عرصے میں عرب افواج نے فارس اور اصطخر (پرسی پولس) سمیت اس ناحیہ کے تمام شہر اور قصبے فتح کر لیے۔ ان میں سے کچھ بزور طاقت فتح کیے گئے جبکہ بعض نے معمولی شرائط کی بناء پر ہتھیار ڈالے۔ فارس کی فتوحات سے عربوں کو کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا اور ارد گرد ان کی کالونیاں بس گئیں۔ اس خطے میں استحکام قائم کرنے کے ساتھ ساتھ عرب افواج ساسانی سلطنت کے صوبہ کرمان تک پہنچ گئے اور اس پر حملہ آور ہونے کے لیے پَر تولنے لگے۔ عربوں کے ہاتھوں تسخیر کرمان عرب اور فارس (ایران) کی تاریخ کے اہم ترین اور پُر اثر واقعات میں ہوتا ہے جس کے اثرات بچے کچے ایرانی علاقوں سمیت ہمسایہ ممالک اور خطوں پر بھی پڑے اور ان پر حملہ کرنے کے راستے کھُل گئے۔ کرمان کی تاریخی فتح پر تقریباً وہ تمام مورخین جو اس واقعہ کو رقم کرتے ہیں متفق بھی ہیں اور تقریباً سب کے بیانات میں بھی کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔

یہ سال 23ھ بمطابق 644ء کا زمانہ تھا جب حضرت عمرِ فاروقؓ مسلمانوں کے امیر اور خلیفہ تھے۔ یہ ان کی خلافت کا آخری سال تھا کیونکہ اسی سال انہیں ایک عجمی غلام ابولولو فیروز نے شہید کر دیا۔ اس سال بلوچ قبائل کے تین اہم اور وسیع علاقے عربوں کی تسلط میں آ گئے۔ ان میں کرمان، سیستان اور مکران شامل تھے جو سندھ کی برہمن سلطنت کے قریب واقع تھے۔ ان ممالک کی فتوحات کا تذکرہ بابائے مسلم تاریخ نویسی علامہ عبدالرحمن ابنِ خلدون ان الفاظ میں کرتا ہے:

"کرمان کی فوج کا جھنڈا سہیل بن عدیؓ کو دیا گیا تھا چنانچہ وہ 23ھ میں ایک فوج لے کر جس کا ہراول دستہ بشیر بن عمر العجلی کی افسری پر تھا کرمان پر حملہ آور ہوئے۔ پیچھے سے عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان بھی کمک لے کر پہنچ گئے۔ کرمان والوں نے قفص (کوہِ قفص کے بلوچ باشندے جنھیں بعض عرب مورخین قفصی جبکہ فارسی مورخین کوچ

تحریر کرتے ہیں) وغیرہ سے مدد طلب کر کے مقابلہ کیا۔ مسلمانوں نے چاروں طرف سے گھیر کر لڑائی چھیڑ دی۔ اس دوران کرمان کا مرزبان حضرت بشیرؓ کے ہاتھوں مارا گیا۔ فریق مخالف کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی، میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ حضرت عبداللہ بن عبداللہ اور حضرت بشیرؓ جیرفت اور سیرزاد (دونوں اب تک خالصتاً بلوچ علاقے ہیں جو ایران کے مشرق میں واقع ہیں) تک فوجیں لے کر بڑھتے چلے گئے۔ بے شمار اونٹ اور بکریاں غنیمت میں ملیں۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن بدیل بن ورقائ خزاعی نے کرمان کو فتح کیا تھا اور فتح کے بعد کرمان سے طبسین ہوتے ہوئے حضرت فاروق اعظمؓ کے پاس مدینہ آئے تھے" (ابنِ خلدون 2009:233)۔

کرمان کی جنگوں اور فتح کے بارے میں البلاذری کا بیان تھوڑا مختلف ہے اور اس کی فتح میں شامل کردار بھی ابنِ خلدون کے بیان کردہ کرداروں سے مختلف ہیں البتہ قفص کے باشندوں اور کرمان کو دی جانے والی کمک کا تذکرہ انہوں نے بھی کیا۔ لکھتا ہے کہ:

"کرمان کے مرزبان سے جزیرہ ابرکاوان (غالباً جزیرہ ہرمز) میں عثمان بن ابی العاصی الثقفی کا مقابلہ ہوا۔ اس کے ساتھ تھوڑی سی فوج تھی۔ عثمان نے اس کو قتل کر دیا۔ اس سے اہل کرمان کی ہمتیں پست ہو گئیں اور ان کے دل ٹوٹ گئے۔ ابنِ عامر نے فارس پہنچ کر مجاشع ابن مسعود السلمی کو یزدجرد (یزدگرد) کی تلاش میں کرمان بھیجا۔ وہ بیمند آئے اور یہاں ان کا لشکر ہلاک ہو گیا۔ پھر جب ابنِ عامر نے خراسان کا قصد کیا تو مجاشع کو کرمان کی مہم سپرد کی۔ وہ بیمند آئے، اس کو بزور فتح کیا، باشندوں کو برقرار رکھا اور انہیں امان دی۔ یہاں ایک قصر، قصر مجاشع کے نام سے مشہور ہے۔ مجاشع نے بردخردہ فتح کیا پھر السیرجان (الشیرجان۔ مشرقی ایران اور کرمان کے مضافات کا بلوچ آبادی پر مشتمل ایک قدیم قصبہ) آئے، یہ کرمان کا عاصمہ ہے۔ چند روز ٹھہرے، اہلِ شہر قلعہ بند ہو گئے، پھر ان کا رسالہ مقابلے پر نکلا، مجاشع نے اس کو قتل کیا، شہر بزور فتح کر لیا اور اپنے اصحاب میں سے

کسی کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ اہلِ شہر میں سے کثیر جماعت جلاوطن ہو گئی" (البلاذری 2010:531-26)۔

کرمان اور اس کے مضافاتی قصبوں کی فتوحات کا تذکرہ کرتے ہوئے البلاذری مزید لکھتا ہے کہ:

"ابو موسیٰ الاشعری نے بھی الربیع بن زیاد کو اس طرف بھیج رکھا تھا۔ اس نے السیر جان (الشیر جان) کے اطراف کا علاقہ فتح کیا۔ اہلِ بم اور اہلِ اندغار (بلوچ آبادی پر مشتمل مشرقی ایران کے دو قدیم قصبے) نے صلح کر لی، پھر باغی ہو گئے۔ مجاشع بن مسعود نے دوبارہ فتح کیا۔ پھر وہ جیرفت گیا اور اس کو بزور فتح کیا اور اندرون کرمان گشت کر کے ملک کو پامال و مطیع کیا۔ پھر القفص پہنچا۔ ہرمز پر جلاوطن عجمیوں کی ایک کثیر جماعت اس سے لڑنے کے لیے فراہم تھی۔ دست بدست جنگ ہوئی۔ مجاشع نے ان سب کو مغلوب کیا اور ان پر فتح پائی۔ اہلِ کرمان میں سے بہت سے بھاگ گئے اور سمندر عبور کر کے مختلف مقامات میں پناہ گیر ہوئے۔ ان میں بعض مکران پہنچے اور بعض سجستان آئے۔ عربوں نے ان کی منازل اور ان کی زمینوں کے حصے بخرے کر لیے، آباد کیا اور ان پر عشر دیا اور آب رسانی کے لیے نالیاں بنائیں" (البلاذری 2010:531-26)۔

البلاذری نے اموی دور تک کرمان پر مقرر ہونے والے عرب حاکموں کا تذکرہ کیا ہے اور ان سے منسوب کئی واقعات کو بھی تحریر کیا ہے۔

بابائے مسلم تاریخ نویسی علامہ عبد الرحمن ابنِ خلدون سیستان کی فتوحات کا حال ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"یہ ملک عاصم بن عمرو کے ہاتھ سے فتح ہوا۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے حضرت عبد اللہ بن عمیرؓ آ گئے۔ یہاں کے رہنے والے سیستان سے باہر نکل کر چھوٹی سی لڑائی لڑ کر بھاگے مگر عاصم برابر آگے بڑھتے چلے گئے اور زرنج پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ یہ سجستان (سیستان) کا دوسرا مقام ہے۔ چند دنوں کے محاصرے کے بعد محصورین نے صلح کی درخواست کی۔ چنانچہ ان کی درخواست کے مطابق صلح کر لی گئی۔ یہ ملک خراسان سے بڑا

تھا۔ اس کے حدود دور دور پھیلی ہوئی تھیں۔ اس ملک پر قبضہ کرنے سے قندھار، ممالک ترک اور دوسری قوموں کی کنجی ہاتھ آگئی۔ وقتاً فوقتاً ان پر حملہ ہوتا رہا" (ابنِ خلدون 233:2009)۔

جبکہ البلاذری نے سیستان کی فتوحات مختلف انداز اور کرداروں کے تحت لکھا ہے۔ اس کے مطابق:

"عبد اللہ بن عامر بن کریز بن ربیعہ بن حبیب بن عبد شمس نے 30ھ میں خراسان کے ارادے سے کوچ کیا اور کرمان کے علاقے میں شِق شیر جان (قصبہ سیر جان) پر خیمہ زن ہوا۔ یہاں سے الربیع بن زیاد بن انس بن الدیان امحاثی کو سجستان کی طرف بھیجا۔ وہ الفہرج (بلوچ آبادی پر مشتمل مشرقی ایران کا ایک قدیم قصبہ۔ جسے بلوچی میں پہرہ یا پارہ کہتے تھے اسے بہرہ بھی تحریر کیا گیا ہے عرب مورخین کی کثرت اسے فہرج لکھتے ہیں۔) آیا۔ اور مفازہ (صحرا۔ دشت لوت) عبور کر کے جو پچھتر فرسخ کا ہے، سقاق زالق (جالک۔ بلوچ آبادی پر مشتمل مشرقی ایران کا ایک قدیم قصبہ۔ یہ قصبہ اب بھی موجود ہے۔) پہنچا۔ زالق ایک قلعہ ہے۔ اس کے اور سجستان کے درمیان پانچ فرسخ کا فاصلہ ہے۔ الربیع نے مہرجان کے دن اہلِ زالق پر چھاپہ مارا، دہقان (حاکم) کو گرفتار کیا، اس نے جان بخشی کی درخواست کی اور فدیہ میں بقدر یک نیزہ مال پیش کیا، یعنی نیزہ زمین میں سپوخت کر کے اس کو سیم وزر سے ڈھانک دیا۔ الربیع نے خون معاف کر دیا اور صلح کر لی۔ ابو عبیدہ معمر بن المثنی کا بیان ہے کہ: دہقان زالق نے اس پر صلح کی کہ اس کے شہر کے ساتھ وہی معاملت ہو جو معاملت فارس و کرمان کے مفتوح شہروں کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس کے بعد وہ کرکویہ (بلوچ آبادی پر مشتمل مشرقی ایران کا ایک قدیم قصبہ) نام کے ایک قریہ پر آیا، یہ قریہ زالق سے پانچ میل پر تھا۔ باشندوں نے بغیر جنگ صلح کر لی۔ یہاں سے کوچ کر کے رستاق ہیون پہنچا، باشندوں نے اس کو اپنے پاس ٹھہرایا اور صلح کر لی۔ اس کے بعد وہ زالق واپس آیا اور رہنماؤں کو ساتھ لے کے زرنج (سیستان کا دار الخلافہ اور بلوچ قبائل کی ایک قدیم اور ابتدائی آماجگاہ) کی جانب روانہ ہوا۔ الہند مند (ہلمند یا ہیلمند۔ سیستان کا مشہور و معروف دریا) پہنچا

اور نوق نامی ایک وادی سے جو اسی نام سے منسوب ندی سے لبریز ہو کے بہتی ہے، الہند مند عبور کر کے زوشت پہنچا۔ یہ زرنج سے دو تہائی میل پر تھا، باشندے مقابلے کو نکلے، جنگ کی، معرکے کا رن پڑا، مسلمانوں میں سے کچھ لوگ کام آئے، قدم اکھڑے مگر پھر پلٹے اور ایسا حملہ کیا کہ اہل زرنج کو منہزم کر دیا، ان میں بہتوں کو قتل کیا اور شہر میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا" (البلاذری 2010:534-36)۔

البلاذری سیستان کے دارالخلافہ اور مضافات کے قصبوں اور قلعوں کی فتح کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے مزید لکھتا ہے کہ:

"(الربیع) یہاں (زرنج) سے فارغ ہو کر ناشروذ (ناشرود) پہنچا۔ یہ ایک قریہ ہے۔ باشندوں سے جنگ کی اور ان پر غالب ہوا۔ اس کے بعد قریہ شرواز پہنچا اور اس پر غالب ہوا" (البلاذری 2010:535-36)۔

زرنج کی خونریز لڑائی، جس میں ہزاروں لوگوں کو قتل کیا گیا، خون کی ندیاں بہائی گئیں، لاشوں کے انبار لگائے گئے، اور عرب حملہ آوروں نے اپنی وحشت اور درندگی کی بدترین مثالیں قائم کیں۔ جبکہ اس درندگی اور بدترین خونریزی کے بارے میں البلاذری انتہائی فخر کے ساتھ لکھتا ہے کہ:

"الربیع نے مدینہ زرنج (شہر زرنج) کے باشندوں سے جنگ کی۔ وہ پناہ گیر ہو گئے۔ زرنج کے مرزبان ابرویز نے امان اور صلح کی درخواست کی۔ الربیع نے حکم دیا کہ مقتولوں کی لاشیں لائی جائیں، لاشوں کو مسند تکیہ بنایا، اپنے اصحاب کو بھی لاشوں پر بٹھایا، پھر مرزبان (حاکم یا گورنر) کو آنے کا اذن دیا۔ الربیع قد آور تھا، مرزبان نے جو یہ شان جلوس دیکھی سہم گیا اور ایک ہزار نو عمر غلاموں پر، جن کے ہاتھوں میں سونے کے پیالے تھے، صلح کر لی، الربیع شہر میں داخل ہو گیا۔ پھر ایک وادی عبور کر کے، جس کو سناروذ کہتے ہیں، القریتین پہنچا، یہاں رستم کے گھوڑوں کا مربط تھا، جنگ کی، غالب ہوا" (البلاذری 2010: 535-26)۔

البلاذری عربوں کی لوٹ مار اور ظلم و ستم کو ان کی شان قرار دیتا ہے اور ان کی جابرانہ اقدامات کو انتہائی فخر کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ مگر وہ یہ نہیں لکھتا کہ یہاں کے باشندوں نے عربوں کا کیا بگاڑا تھا جو انہوں نے اُن کے دیہاتوں، قصبوں، شہروں اور قلعوں کو مسمار کیا، باشندوں کو قتل کیا، جو بچ گئے انہیں لونڈی اور غلام بنایا اور ان کی املاک پر قبضہ کیا۔ چونکہ البلاذری خود عرب تھا لہٰذا انہیں اپنی قوم کے مظالم اور جابرانہ رویہ مبنی بر حق نظر آیا جبکہ کرمان، سیستان اور مضافات کے باشندے ان کی نظر میں گنہگار اور جہنمی تھے لہٰذا ان کا قتل عام ان حملہ آوروں کی نظر میں جائز تھا۔ مگر جہاں انہیں مال و دولت دی جاتی اور ان کے آگے سر تسلیم خم کیے جاتے تو وہاں وہ ان لوگوں کے گنہگار اور جہنمی ہونے کو بھول جاتے اور انہیں امان دیتے۔ کاش عرب مورخ کو اپنی قوم کے مظالم اور جابرانہ اقدامات بھی نظر آتے، لوٹ مار نظر آتی اور وہ غیر جانبداری سے تاریخ نویسی کرتا۔ البلاذری سیستان میں عربوں کے جابرانہ کارنامے بیان کرتے ہوئے مزید لکھتا ہے کہ:

> ”وہ (الربیع) زرنج واپس جاکر دو سال مقیم رہا۔ اس کی مدت ولایت اڑھائی برس ہے، اس مدت میں اس نے چالیس ہزار لونڈی غلام پکڑے“ (البلاذری 2010:535-26)۔

حضرت علیؓ کے دور میں سیستان کے باشندوں نے عربوں کی غلامی کا جُوا اتار پھینکا اور عرب عمال میں سے اکثر کو مار ڈالا۔ حضرت علیؓ نے سخت جدوجہد اور قربانیوں کے بعد سیستان کو دوبارہ فتح کیا اور وہاں امن بحال کیا۔ البلاذری ان تمام حالات کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ واقعات ان کی کتاب ”فتوح البلدان“ کی صفحات 535 سے 538 پر مرقوم ہیں۔ البلاذری کی کتاب میں اموی دور میں سیستان میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی تفصیلات بھی ملتی ہیں (البلاذری 2010: 535-40)۔ جب کہ عباسی دور کی تفصیلات ابنِ کثیر، ابن خلدون اور دیگر عرب مورخین کی کتب میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

مکران کی فتح اسلامی تاریخ کی اہم ترین فتوحات میں شمار ہوتا ہے کیونکہ اس کی فتح سے ممالک سندھ اور پنجاب سمیت ہندوستان کے دروازے پر عربوں کا قبضہ ہو گیا اور مختصر عرصہ میں ہی عرب فوجیں سندھ کو فتح کرنے اور اپنی سرحدات ملتان تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ مکران کی فتح کا حال مستند مورخین بیان کرتے ہیں جن کے بیانات میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں علامہ ابنِ خلدون لکھتا ہے کہ:

عمومی لشکر کے ایک امیر حکم بن عمر تغلبی نے 23ھ (644ء) میں مکران کا ارادہ کیا۔ ان کے بعد شہاب بن مخارق، سہیل بن عدی اور عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان بھی روانہ ہوئے۔ ان سب نے دوین پہنچ کر اسلامی فوج کو مرتب کیا۔ ادھر مکران کے گورنر (راسل) نے نہر مکران کے کنارے نہایت اہتمام سے صف آرائی کی اور سندھ کی امدادی فوج لے کر مقابلہ کے لیے آیا۔ اسلامی بہادروں نے ایک بہت بڑی جنگ کے بعد راسل کو شکست دے کر مکران پر قبضہ کر لیا۔ حکم بن عمر نے صحار عبدی کی معرفت فتح کی خوشخبری اور مال غنیمت کا خمس دارالخلافہ روانہ کر دیا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے مکران کا حال معلوم کیا۔ صحار عبدی نے عرض کیا:

"ارض سھلھا جبل وماءھا وشل وثمرھا دقل وعدوھا بطل وخیرھا قلیل وشرھا طویل والکثیر بھا قلیل"

ترجمہ: یہ ایک ایسی سرزمین ہے جس کا آسان ترین حصہ پہاڑ ہیں اور اس کا پانی کم ہے اس کے پھل ردی ہیں اس کے لوگ جنگجو ہیں۔ اس کی بھلائی کم اور شر طویل ہے اور وہاں ہر زیادہ تعداد بھی کم ہی ہو گی۔ (ابنِ خلدون 2009: 233-34)

حضرت عمر فاروقؓ نے یہ بیان سن کر سالارِ لشکر سہیل اور عاصم کو لکھ بھیجا کہ فوجیں جہاں تک پہنچ چکی ہیں وہیں رُک جائیں اور جو علاقے اس وقت تک مفتوح ہو چکے ہیں صرف انہی پر اکتفا کیا جائے۔

یہی بیان ابنِ کثیر نے بھی اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے۔ وہ البدایہ والنہایہ کے جلد ہشتم میں لکھتا ہے کہ،

"ابنِ جریر نے سیف کے طریق سے اس کے شیوخ سے بیان کیا ہے کہ کرمان کو حضرت سہیل بن عدیؓ نے فتح کیا اور حضرت عبد اللہ بن عبد اللہ بن عتبانؓ نے ان کو مدد دی، اور بعض کا قول ہے کہ حضرت عبد اللہ بن بدیل بن ورقا خزاعی نے کرمان کو فتح کیا تھا پھر اس نے بیان کیا ہے کہ سجستان کو شدید جنگ کے بعد حضرت عاصم بن عمروؓ نے فتح کیا اور اس کی سرحدیں بڑی وسیع اور اس کے شہر سندھ سے لے کر دریائے بلخ تک دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور وہ اس کی سرحدوں اور دروں سے قندھار اور ترکوں سے جنگ کرتے تھے۔ اور اس نے بیان کیا ہے کہ مکران کو الحکم بن عمرو (التغلبی) نے فتح کیا اور شہاب بن مخارق بن شہاب، سہیل بن عدی اور عبد اللہ بن عبد اللہ کے ذریعے اسے مدد دی گئی اور انہوں نے سندھ کے بادشاہ کے ساتھ جنگ کی اور اللہ تعالیٰ نے سندھ کے فوجوں کو شکست دی اور مسلمانوں نے ان سے بہت سی غنیمت حاصل کی اور الحکم بن عبد اللہ نے فتح کی بشارت کا خط لکھا اور صحار العبدی کے ہاتھ اخماس بھیجے اور جب وہ حضرت عمرؓ کے پاس آئے تو آپ نے ان سے ارض مکران کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا:

یا امیر المومنین اس کی نرم ہموار زمین پہاڑ ہے اور اس کا پانی پہاڑ سے ٹپکنے والا ہے اور اس کا پھل ردی اور ادنیٰ قسم کی کھجور ہے اور اس کا دشمن دلیر ہے اور اس کی خیر قلیل اور شر طویل ہے اور وہاں کثیر بھی قلیل ہے اور قلیل وہاں ضائع ہونے والا ہے اور جو اس سے پرے ہے وہ اس سے بھی بدتر ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا، کیا تو سجاع ہے یا مخبر، اس نے کہا مخبر ہوں، پس حضرت عمرؓ نے الحکم بن عمرو کو خط لکھا کہ اس کے بعد وہ مکران کے ساتھ جنگ نہ کریں اور جو علاقہ دریا سے ورے ہے اسی پر اکتفا کریں اور الحکم بن عمرو نے اس بارے میں کہا ہے،

”بیوہ مستورات کسی فخر کے بغیر اس غنیمت سے سیر ہو گئی ہیں جو مکران سے ان کے پاس آئی ہے اور وہ بھوک اور تنگی کے بعد ان کے پاس آئی ہے جب کہ موسم سرما دھوئیں سے خالی رہا ہے اور فوج میرے فعل کی مذمت نہیں کرتی اور میری زبان اور تلوار کی مذمت کی جاتی ہے، اس صبح کو میں کمینے لوگوں کو سندھ کے وسیع و عریض اور نزدیک علاقے کی طرف دھکیل رہا تھا اور مہران (سندھ و دریائے سندھ) ہمارے ارادے کے مطابق لگام ڈھیلی کیے بغیر ہمارا مطیع تھا اور اگر میرا امیر مجھے اس سے نہ روکتا تو ہم اس سے متفرق تنگ علاقوں تک طے کر جاتے“ (ابن کثیر 2008: 178-79)۔

بلوچستان کے اہم ترین علاقے مکران کی عہد فاروقی میں فتح کے بیان سے البلاذری اختلاف رکھتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ مکران عہد عثمانی میں فتح ہوا اور یہ قاصد حضرت عمرؓ نہیں بلکہ حضرت عثمانؓ کی خدمت میں پیش ہوا تھا اور درج بالا بیان انہی کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ البلاذری کا بیان طویل ہے مگر اس اہم ترین واقع کی حقیقت اور عرب فتوحات کی تاریخ سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس تمام تر بیان کو بِلاکم وکاست یہاں نقل کیا جائے۔ لکھتا ہے کہ:

”عمر بن خطابؓ نے 15ھ میں عثمان بن العاصی الثقفی کو البحرین و عمان کی ولایت پر مقرر کیا۔ وہ خود تو عمان گئے اور اپنے بھائی الحکم کو البحرین بھیجا۔ عمان پہنچ کے انہوں نے ایک دریائی مہم تانہ (تھانہ) کی طرف بھیجی، جب یہ لوگ صحیح سلامت آگئے تو عمرؓ کو اطلاع دی، انہوں نے لکھا: ”ثقیف کے بھائی، تو نے کیڑے کو لکڑی پہ چڑھایا، قسم ہے اگر وہ لوگ ضائع جاتے تو میں تیری قوم سے اتنے ہی آدمی لے لیتا“۔ الحکم نے اپنے بھائی مغیرہ کو خلیج دیبل کی طرف روانہ کیا، اور خود بروص (بھروچ) پر حملہ کیا۔ دشمن سے مقابلہ ہوا اور اس پر غالب ہوئے۔ پھر عثمان بن عفانؓ نے اپنے زمانے میں بلادِ عراق پر عبد اللہ بن عامر بن کُریز کو مقرر کیا تو انھیں ثغر الہند کی طرف دریائی مہم پر بھیجنے کا حکم دیا، غرض یہ تھی کہ اس ملک کے حالات سے آگاہی حاصل ہو، عبد اللہ نے حکیم بن جبلہ العدوی کی سرداری میں ایک دستہ سمندر کے رستے روانہ کیا، وہ بلوچستان اور سندھ کے مشرقی علاقے کو دیکھ

کے واپس آئے، عبداللہ نے انہی کو حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیا کہ جو کچھ دیکھا ہے جا کے سنادیں، حضرت عثمانؓ نے پوچھا۔ اس ملک کا کیا حال ہے؟ کہا "امیرالمومنین! میں نے اس ملک کو چل پھر کے اچھی طرح دیکھ لیا ہے"۔ کہا "مجھ سے اس کی کیفیت بیان کرو" حکم نے کہا:

ماؤھاوشلِ وثمرھاوقل وتصھابطل ان قل الجیش فیھاضاعواوان کثرواجاعوا

(پانی کم، پھل ردی، چور بیباک، لشکر کم ہو تو ضائع ہو جائے گا، بہت ہو تو بھوکوں مرے گا۔) کہا: "خبر دے رہے ہو یا سجع کہہ رہے ہو؟" بولے "امیرالمومنین! خبر دے رہا ہوں"۔ انہوں نے لشکر کشی کا خیال ترک کر دیا۔" (البلاذری 2010: 577-78)

جبکہ ابن خلدون اور ابن کثیر کے علاوہ بعض دیگر مورخین بھی اس بیان کو حضرت عمر فاروقؓ کے عہد کا واقعہ لکھتے ہیں۔ جیسا کہ ابن قتیبہ کا بیان ہے کہ،

"ماؤھاوشلِ وثمرھاوقل وتصھابطل ان کان لبھاالکثیر جاعواوان کان لبھاالقلیل ضاعواقال عمر لایسئانی اللہ عن احدٍ بعثۃالیھاابداً۔" (ابنِ قتیبہ: 199)

یعنی، "وہاں کا پانی خراب، پھل ادنیٰ، دشمن بہادر ہے۔ اگر زیادہ لوگ ہوں تو بھوک سے مر جائیں اور اگر کم ہوں تو مارے جائیں"۔

جبکہ ابنِ قتیبہ وہ علاقہ قندابیل یعنی گنداواہ کو قرار دیتا ہے کہ جس کے بارے میں حضرت عمرؓ کو معلومات دی جا رہی تھیں۔

بلوچستان کے مختلف حصوں کی فتوحات کا سلسلہ عہد فاروقیؓ میں شروع ہوا تھا۔ جبکہ یہ سلسلہ اموی عہد تک جاری رہا اور بلوچستان کے دیگر حصوں پر بھی آہستہ آہستہ عرب اقوام قابض ہوتے گئے۔ جیسا کہ گذشتہ سطور میں بیان ہوا کہ بلوچ قبائل کے علاقوں پر حملے عہد فاروقی میں شروع ہوئے اور عرب فوجیں کرمان، مکران اور سیستان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئیں۔ کرمان اور سیستان تو مکمل طور پر فتح کر لیے گئے اور عربوں نے ان علاقوں میں خود کو خوب مستحکم

بھی کیا مگر مکران کے وسیع و عریض خطے سمیت اندرونِ بلوچستان کے اکثر علاقے عربوں کے تصرف اور دست درازی سے محفوظ و مامون نہ تھے۔ یہ علاقے بعد ازاں خلفأ راشدہ حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ کے ادوار میں بھی عربوں کی جارحیت کا نشانہ بنتے رہے۔ جبکہ عہد اموی میں عربوں کی ترکتازیوں اور حملوں میں مزید تیزی آئی اور عربوں نے اپنی خانہ جنگی پر قابو پانے کے بعد اپنی فتوحات کا دائرہ بڑھانا شروع کیا اور اپنے جغرافیائی حدود کو ہر سمت وسعت دینے لگے۔ حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کے ادوار خانہ جنگی میں گزر گئے مگر اس کے باوجود اس دوران بلوچستان کی جانب عربوں کی مکمل توجہ مبذول رہی لہٰذا فتح مکران کے بعد عرب حملہ آور طویل عرصہ تک ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہے اور اپنی برادر کشی اور خون آشامی کی نئی تاریخ رقم کرتے رہے۔ جبکہ دوسری طرف بلوچستان کے باشندے اُن کی جبر اور خون آشامی کا شکار بھی ہوتے رہے۔ بالآخر جب خلافت راشدہ کا خاتمہ ہوا اور آل مروان نے اپنی حاکمیت قائم کی اور خلافت کو صرف اموی خاندان کی میراث بنایا گیا تو ظلم جبر اور خون آشامی کی نئی داستانیں رقم ہونے لگیں۔ اموی دور میں عربوں کی فوجیں وسط ایشیاء تا حد چین، سندھ تا حدِ پنجاب، افریقہ اور سپین یورپ تک پہنچ گئیں اور ایک عظیم الشان اور وسیع و عریض سلطنت کی بنیاد رکھی گئی۔ سندھ کی جانب حملہ آور ہونے سے پہلے اور ایران کی فتح کے بعد بلوچستان عربوں کا شکار بنا۔

بلوچستان کے باقی ماندہ علاقوں کے عربوں کے ہاتھوں فتح کے متعلق ایک مورخ لکھتا ہے کہ:

> "آخر 38 سنہ ھ یا اوائل 39 سنہ ھ میں حارث بن مُرۃ العبدی نے علی بن ابی طالبؓ سے اجازت لے کر بحیثیت مطوع سرحد ہند پر حملہ کیا، فتح یاب ہوئے، کثیر غنیمت ہاتھ آئی۔ صرف لونڈی غلام ہی اتنے تھے کہ ایک دن میں ایک ہزار تقسیم کیے گئے۔ حارث اور ان کے اصحاب ارض قیقان میں کام آئے، صرف چند زندہ بچے۔ یہ 42 سنہ ھ کا واقعہ ہے" (البلاذری 2010: 578)۔

البلاذری قلات اور مکران پر بار بار حملوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ وہ آل مروان اور اموی دور میں اندرونِ بلوچستان مختلف مقامات اور قصبات میں عربوں کے بار بار حملوں، قتل وغارت گری اور لوٹ مار کا تذکرہ کچھ اس انداز میں کرتا ہے جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ عرب سندھ پر آنے والے ادوار میں بڑا حملہ کرنا چاہتے تھے اور اس زرخیز خطے کو اپنے قبضے میں لے کر مستقبل میں ہندوستان پر تصرف جمانے کے لیے راہ ہموار کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ سب کرنے سے پہلے وہ بلوچستان کے عسکری اور دفاعی اہمیت کے پیشِ نظر اس اہم ترین خطے پر قبضہ کرنا ضروری خیال کرتے تھے۔ تاکہ اس مختصر ترین راستہ پر قابض ہو کر مستقبل میں سندھ پر حملہ آور فوج کو باآسانی رسد و کمک پہنچایا جا سکے۔ لہٰذا وہ بار بار مکران اور وسطی بلوچستان پر حملہ ہو کر یہاں کی مزاحمت کو کمزور کرتے گئے اور بالآخر یہاں اپنی بالادستی قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

عربوں کی ہی حکمت عملی پر انیسویں صدی میں افغانستان پر حملہ آور برطانوی فوج نے مِن وعَن عمل کیا اور افغانستان سے پہلے بلوچستان پر قبضہ کرنا ضروری خیال کیا۔ جب جنگ میں ناکامی ہوئی تو اندرون ریاست طویل خانہ جنگی شروع کروادی اور قبائل سمیت خان آف قلات کو بھی کمزور اور بے دست و پا کر دیا تب بلوچستان پر اُس نے اجارہ داری قائم کی اور افغانستان پر حملوں کے لیے راستہ ہموار کیا۔

البلاذری قلات کو خراسان سے متصل اور سندھ کے شہروں میں لکھتا ہے حالانکہ قلات کی دفاع کے لیے ایک بھی سندھی نہیں آیا اور نہ ہی انہیں قلات سے کوئی دلچسپی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو قلات کے باشندوں کی مدد پہاڑی لوگ نہ کرتے جو موجودہ دھوار، براہوئی اور کرد قبائل تھے جو اس خطے کے قدیم اور حقیقی باشندے تھے۔ سندھیوں نے قلاتیوں کی کوئی مدد نہیں کی جبکہ قلات اور مکران پر حملہ سندھ پر عربوں کے حملہ سے پہلے وقوع پذیر ہوا تھا۔ سندھیوں کو یہ سمجھنا

چاہیے تھا کہ بلوچستان کے دفاع کی جنگ دراصل سندھ کے تحفظ کی جنگ تھی۔ انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے تھا کہ اگر بلوچستان پر عرب قابض ہو جاتے ہیں تو پھر سندھ میں داخل ہونے سے انہیں دنیا کی کوئی قوت نہیں روک سکتی۔ بعد کے حالات اور واقعات نے یہ سچ ثابت کیا جب عرب فوجیں بلوچستان کو کچل کر سندھ کے شہروں پر پل پڑے اور ہزاروں کی تعداد میں سندھیوں کا قتل عام ہوا، ان کے املاک لوٹے گئے، ان کے خواتین کی عصمت دری کی گئی، ان کے حکمران اور اس کے خاندان کو قتل یا قید کیا گیا اور ان کے ملک پر ایک اور قوم غالب آگئی اور برسوں تک وہاں اپنی حاکمیت قائم کیے رکھی۔ اگر سندھیوں نے شروع میں ہی اس طوفان کو بلوچستان کی سرحدوں پر روکا ہوتا تو شاید سندھ مکمل طور پر محفوظ ہو جاتا اور داہر کا خاندان کچھ عرصہ مزید بھی حاکم رہتا۔ لہذا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ مکران یا قلات وغیرہ سندھ میں شامل تھے البتہ کبھی سندھیوں کا غلبہ یہاں رہا تھا مگر اُس واقعہ کو برسوں گزر چکے تھے اب سندھی اتنے طاقتور نہیں رہے تھے کہ وہ بلوچستان کے دشوار پہاڑی اور ریگستانی خطے پر مزید اپنا قبضہ برقرار رکھتے۔ تاریخی واقعات کے مطالعہ اور ان پر گہری تحقیق سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بلوچستان عرب حملوں کے دوران سندھیوں کے تصرف سے آزاد تھا اور یہ وسیع و عریض خطہ زمین کئی ولایتوں میں منقسم مقامی قبائل کی زیرِ حاکمیت تھی۔ البلاذری قلات پر دوسرے حملہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

> ”43ھ میں، کہ معاویہ بن ابی سفیان کا عہد تھا۔ المہلب بن ابی صفرہ نے اس سرحد پر حملہ کیا اور بُنہ اور الاہواز تک جا پہنچے۔ یہ دونوں شہر ملتان و کابل کے درمیان ہیں، دشمن سے مقابلے ہوئے“ (البلاذری 2010: 578)۔

اس بیان میں البلاذری دو مقامات کے نام تحریر کر رہا ہے جن میں سے ایک تو ایران میں واقع ہے یعنی الاہواز، جسے عرب عہد فاروقی میں ہی فتح کر چکے تھے اور اب وہ عربوں کے قبضہ و اختیار میں تھا جبکہ دوسرے شہر کا نام بُنہ لکھا ہے، جس پر بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ علاقہ بنوں

کا نام ہو سکتا ہے، مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بنوں اور الاہواز ایک دوسرے سے ہزاروں کلومیٹر دور واقع ہیں۔ بنوں مشرق میں پاکستان کے موجودہ ضلع کے پی کے میں واقع ہے۔ جبکہ البلاذری قلات پر حملے کی بات کر رہا ہے۔ کیونکہ کتاب کے اگلے سطور میں موصوف لکھتا ہے کہ:

> ''القیقان میں اٹھارہ ترک سوار ملے، دُم بریدہ گھوڑوں پر سوار تھے، دلیری سے لڑے اور کھیت رہے۔ المہلب نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ''کس چیز نے ان عجمیوں کو ہم سے زیادہ پھُرتیلا بنا دیا ہے؟'' پھر اس نے اپنے گھوڑے کی دم کاٹ دی، وہ مسلمانوں میں پہلا شخص ہے جس نے گھوڑے کی دم کاٹی'' (البلاذری 2010: 578)۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے اگر مہلب بن ابی صفرہ نے الاہواز پر حملہ کیا تھا تو وہ بنوں کیسے پہنچا اور پھر بنوں سے قلات چلا آیا۔ ممکن ہے کہ شہروں کے یہ نام غلطی سے الاہواز وغیرہ لکھے گئے ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ شہر قلات کے آس پاس تھے اور ممکن ہے کہ ان کے نام الاہواز یا بُنہ نہ ہوں یا پھر ممکن ہے ماہرین تاریخ نے ان کی تطبیق میں غلطی کی ہو۔ ان علاقوں کو از سرِ نو تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ تاریخی بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ مہلب بن ابی صفرہ کبھی بنوں نہیں گئے تھے بلکہ اس بات کے حوالے ملتے ہیں کہ حضرت سنان بن سلمہ محبق نے کے پی کے اور بلوچستان میں لڑائیاں لڑی تھیں اور ان کا انتقال علاقہ خضدار میں ہوا تھا جہاں وہ مدفون ہوئے۔ ان کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔ البتہ مہلب کی جنگیں بلوچستان میں ہوئی تھیں جبکہ کے پی کے کی جانب ان کے مراجعت کی کوئی مستند روایت دستیاب نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ بنہ قلات اور سوراب کے مابین واقع قدیم قصبہ بینچہ ہو جسے عرب مورخ نے عربی زبان میں لفظ ''چ'' نہ ہونے کی وجہ سے اسے بینچہ کی بجائے ''چ'' کو حذف کر کے صرف بُنہ لکھا ہو۔ یہ مفروضہ زیادہ قرینِ قیاس ہے کیونکہ قصبہ بینچہ قلات کے بالکل قریب واقع ہے اور یہاں زمانہ قدیم کی مسمار شدہ اور تباہ شدہ آبادیوں کے آثار بھی کثرت سے ملتے ہیں جن کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا

ہے کہ ماضی میں یہ علاقہ دورِ حاضرہ کی نسبت زیادہ گنجان ہو گا۔ بہر حال یہ لفظ تحقیق طلب ہے اور اسے فوراً بنوں یا کسی اور قصبہ و شہر سے بغیر مستند تحقیق اور شواہد کے مطابقت دینا درست نہیں ہے۔ علاوہ ازیں یہ لفظ واشک ضلع کے مشہور قصبہ بیسیمہ سے بھی کافی مطابقت رکھتا ہے جو عین عرب حملہ آوروں کے راستے میں پڑتا تھا۔ یہاں قدیم عہد کے آثار بھی اس دعویٰ کو مزید تقویت فراہم کرتے ہیں کہ ممکن ہے قدیم بیسیمہ کے گنجان قصبے کو عربوں نے بُنہ کا نام دیا ہو۔ بہر حال بُنہ کا علاقہ قلات کے آس پاس ہی کہیں واقع تھا۔

البلاذری قلات پر عربوں کے تسلسل کے ساتھ حملوں کا بیان جاری رکھتا ہے اور قلات پر معاویہ بن ابی سفیان کے عہد میں عبد اللہ بن سوار العبدی قلات پر حملہ آور ہوا۔ قتل و غارت گری کے بعد یہاں سے کافی مالِ غنیمت اور گھوڑے ہاتھ لگے۔ لہٰذا یہاں کے گھوڑوں کے بارے میں البلاذری لکھتا ہے کہ:

"ابنِ عامر نے معاویہ بن ابی سفیان کے زمانے میں عبد اللہ بن سوار العبدی کو سرحدِ ہند کا والی کیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ عبد اللہ کو خود معاویہ ہی نے والی کیا۔ قیقان پر حملہ آور ہوئے، جو کچھ غنیمت ملی معاویہ کے پاس لے گئے قیقانی گھوڑے بطور ہدیہ پیش کیے اور چند روز ان کے پاس ٹھہر کے قیقان واپس آ گئے۔ ترکوں نے مقابلے کو لشکر جمع کیے اور ان کو قتل کر دیا۔ شاعر نے ان کے وصف میں کہا ہے کہ:

وابن سُوَارِ علی عِدّتِہٖ

مُوقدُ النّارِ وقتالُ السّغُبِ

"ابنِ سوار اپنی کمزوریوں کے باوجود نہایت ہی مہمان نواز اور فاقہ گداز تھا" (البلاذری 2010 :-57879)۔

ابنِ خلدون اس حملہ کا ذکر تو کرتا ہے اور قیقان پر حملے کو امیر معاویہؓ کے دور خلافت کا ہی واقعہ قرار دیتا ہے اور حملے کا سال بھی 43ھ لکھتا ہے مگر اس جنگ میں مارے جانے والے

عرب سالار کا نام وہ حارث بن مُرۃ العبدی یا عبد اللہ بن سوار العبدی کی بجائے عبد الرحمن بن سوار العبدی لکھتا ہے جبکہ قیقان یعنی موجودہ شہر قلات کا نام بھی تیغان (مترجم نے لکھا ہے) لکھتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ غلطی مترجم یا کمپوزر کی ہو بہرحال ابنِ خلدون اور البلاذری کے بیانات میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ابنِ خلدون کا بیان کچھ یوں ہے:

"ہند کی سرحد پر ابن عامر نے عبد الرحمن بن سوار العبدی کو مقرر کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ خود امیر معاویہؓ نے ان کو متعین فرمایا تھا۔ بہرکیف انہوں نے تیغان (قیقان) پر فوج کشی کی اور بہت سامال غنیمت ہاتھ آیا اور خود ہی وفد لے کر امیر معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ قیقانی گھوڑے (ہیرزئی نسل کے قلاتی گھوڑے برطانوی عہد تک مشہور اور بہترین گھوڑے مانے جاتے تھے، محقق) ان کی خدمت میں پیش کیے۔ پھر رخصت ہو کر قیقان کی طرف چلے گئے مگر اہلِ قیقان نے ترکوں (دیہاتوں اور نشیب میں رہنے والے دہوار باشندوں نے پہاڑی براہوئی اور کرد قبائل سے مدد طلب کی ہوگی جنہیں عربوں نے ان کے ڈھاٹوں اور پگڑی باندھنے کے انداز سے ترک سمجھا ہوگا۔ کیونکہ اولین دور کے عرب حملہ آور سیاح اور مورخین یہاں کے باشندوں سے ناواقف تھے اور پہاڑی منطقے میں ان کی بودوباش کی وجہ سے انہیں ترک سمجھتے تھے۔ محقق) سے مدد حاصل کر کے اپنی قوت دوبارہ سنبھال لی تھی۔ چنانچہ بہت سخت لڑائی ہوئی اور عبد الرحمن اس لڑائی میں شہید ہوگئے" (ابنِ خلدون 2009 :356)۔

بلوچستان پر مزید حملوں کا تذکرہ بھی عرب تواریخ میں ملتا ہے۔ ان کے مطالعہ سے یہ بات زیادہ واضح ہوتی ہے کہ عربوں کے حملوں کا مقصد سندھ پر حملوں سے قبل بلوچستان کے پُرپیچ اور دشوار علاقے کو مکمل طور پر اپنے قبضہ میں کر لینا تھا تاکہ سندھ پر حملے کے دوران انہیں کمک اور رسد کے لیے کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ان قدیم تاریخی کتب کے مطالعہ سے اس بات کی حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ عربوں نے اپنے حملوں میں تسلسل کو قائم رکھا اور

سینکڑوں بلکہ ہزاروں فوجیوں کی قربانی دینے کے باوجود ان لوگوں پر قبضہ کرنا آخر ان کے لیے کیوں اتنا ضروری تھا حالانکہ یہاں سے انہیں دی جانے والی قربانیوں کی بدولت زیادہ مالِ غنیمت اور مالیہ ملنے کی امید بھی نہیں تھی اور یہاں پر مسلسل بغاوتیں بھی جاری رہنے کے امکانات تھے مگر اس کے باوجود مکران، خضدار اور قلات پر قبضہ ان کی لیے انتہائی اہمیت اختیار کر چکا تھا۔ جس سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ عرب ابنِ قاسم کے حملوں سے قبل اور کشتی اور کسی عورت کی حجاج بن یوسف کو پکارنے والی کہانی سے بھی قبل سندھ پر حملے اور قبضہ کا ارادہ کر چکے تھے۔

مکران سمیت وسطی بلوچستان پر عرب یلغار کے ایک اور واقعہ کے بارے میں البلاذری لکھتا ہے کہ:

"ابنِ سوار کے بعد، معاویہ بن ابی سفیان ہی کے زمانے میں زیاد بن ابی سفیان نے سنان بن سلمہ بن المحبق الھذُلی کو والی کیا۔ سنان صاحبِ فضل، نیک، کثیر الاحسان، خدا ترس اور عبادت گذار تھے، وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے لشکر کو ثابت قدم رکھنے کی غرض سے طلاق کی سوگند دی، مکران بزور فتح کیا، اس میں رہے۔ شہر کی شان پیدا کی اور پورے علاقے میں نظم قائم کر دیا" (البلاذری 2010: 579)۔

البلاذری ابنِ الکلبی کے حوالے سے لکھتا ہے کہ:

"مکران حکیم بن جبلۃ العبدی نے فتح کیا" (البلاذری 2010: 579)۔

مزید لکھتا ہے کہ:

" ابنِ محبق کے بعد زیاد نے راشد بن عمرو الجدید الازدی کو مقرر کیا، وہ مکران آئے، قیقان پر حملہ کیا اور کامیاب ہوا، پھر میدوں سے جنگ کی اور اسی جنگ میں کام آئے۔ راشد کے بعد سنان بن سلمہ نے لوگوں کی سرداری کی اور زیاد نے انہی کو سرحد کا والی مقرر کر دیا۔ وہ دو برس یہاں رہے" (البلاذری 2010: 579)۔

مکران کی سرزمین تاریخی لحاظ سے زمانہ ماقبل از تاریخ سے تجارتی، سیاسی اور فوجی لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ماضی کے کسی بھی حملہ آور نے سندھ و ہند پر حملوں کے دوران خطہ مکران پر قابض ہونا ضروری خیال کیا اور عرب اقوام بھی اس خطے کی گوناگوں اہمیت سے اچھی طرح باخبر ہو چکے تھے مگر اس کے بارے میں مکمل معلومات نہیں رکھتے تھے۔ مگر جب انہیں یہاں غلبہ حاصل ہوا تو تب انہیں اندرونِ مکران کے درست حالات معلوم ہوئے۔ وگرنہ وہ اپنے اشعار اور تحریروں میں اس سے عدم واقفیت کا اظہار نہ کرتے۔ وہ مکران کی اہمیت اور اس کے مشرق و مغرب کے مابین سنگم ہونے سے غافل نہ تھے۔ وہ جان چکے تھے کہ عرب خطے کو سندھ و ہند سے ملحق کرنے کا سب سے مختصر راستہ یہی ہے لہٰذا یہاں پر قبضہ و اختیار قائم رکھنا ضروری خیال کرتے تھے۔ مکران کی سرزمین اور باشندوں کے بارے میں ان کے خیالات مثبت نہیں تھے۔ جیسا کہ شاعر الاعشیٰ ہمدانی نے مکران کے بارے میں کہا ہے کہ:

وَانت تَسیرُ الیٰ مکرانُ

فقد شحط الورد والمصدرُ

وَلم تک حاجتِی مکرانُ

ولا الغزو فیھا وَالا المُتجرُ

وحُدِّثتُ عَنھَا وَلم آتھا

فَمازِلت مِن ذِکرھا اَخرُ

بانَ الکثیرَ بھا جائع

وَانّ القَلیلَ بِھا مُعوِرُ

یعنی": تو مکران جا رہا ہے تیرے مقام سے یہ منزل کتنی دور ہے، مکران کی مجھے حاجت نہیں، وہاں تو نہ جنگ ہے نہ تجارت۔ مجھ سے اس کا ذکر کیا گیا مگر میں نہیں گیا، میں تو اس کی نسبت سننا بھی پسند نہیں کرتا۔ وہاں کی حالت تو یہ ہے کہ لوگ زیادہ ہوں تو بھوکے مریں، کم ہوں تو ضائع ہو جائیں"۔ (البلاذری 2010 :579-80)

البلاذری فتوح البلدان میں مزید لکھتا ہے کہ:

"زیاد نے ابو الاشعث المنذر بن جارود العبدی کو سرحدِ ہند کا والی کیا، اس نے (نواحِ سجستان میں) بوقان اور قیقان پر حملے کیے، جن میں مسلمان غالب ہوئے اور غنیمتیں پائیں۔ ابو الاشعث نے ان علاقوں میں سرایا پھیلا دیئے۔ قصدار (خضدار) والوں نے بغاوت کی، اس علاقے کو سنان فتح کر چکے تھے، ابو الاشعث نے ان پر لشکر کشی کی، فتح کیا اور ان کو لونڈی غلام بنایا۔ یہ قصدار کی دوسری فتح تھی۔ سنان نے یہیں وفات پائی، شاعر نے ان کے حق میں کہا ہے:

خَلَّ بقصدار فاضحیَ بھاَفی

القُبر لَم یُغفَلِ مَعَ الغاَفلِینَ

یعنی: "وہ قصدار (خضدار) گیا اور وہیں قبر میں پہنچ گیا، اس نے غفلت شعاروں کے ساتھ کبھی غفلت نہ کی۔ قصدار کیسا اچھا مقام ہے اور اس کے انگور کیسے اچھے ہیں، دین اور دنیا نے دین اور دنیا کے کیسے اچھے جوان کو چھین لیا۔" (البلاذری 2010 :581)

"ابو الاشعث کے بعد ابنِ خری الباہلی کو والی کیا، اللہ نے اس کے ہاتھ پر اس ملک کے بلاد فتح کیے۔ ابنِ خری نے شدید جنگیں کیں اور ہر جنگ میں فاتح اور غانم رہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ عبید اللہ بن زیاد نے اس ناحیہ پر سنان بن سلمہ کو والی کیا اور خری اس کے سرایا پر تھا۔ ابنِ خری کے حق میں ایک کہنے والے نے کہا ہے:

لَولاطعالی بالبُوقان مَارجَعت

مِنہ سَرایاًابنِ حرّیِّ باسلابِ

یعنی: ''اگر میں بوقان میں نیزہ بازی نہ کرتا تو ابنِ خری کے سر پہ مقتولوں کا مال نہ لاتے''۔

بوقان والے اب مسلمان ہیں۔ عمران بن موسیٰ بن یحییٰ بن خالد برمکی نے المعتصم باللہ کی خلافت میں یہاں ایک شہر بسایا اور البیضاء اس کا نام رکھا۔ الحجاج بن یوسف بن الحکم بن ابی عقیل الثقفی نے، جب وہ بلاد عراق کا والی ہوا، سعید بن اسلم بن زرعۃ الکلابی کو مکران اور اس کی سرحد کا والی کیا، حارث علافی کے بیٹوں معاویہ اور محمد نے اپنے قبیلے کو لے کر سعید پر خروج کیا اور اس کو قتل کر کے سرحد پر متغلب ہوگئے۔ الحجاج نے مجاعہ بن سعر التمیمی کو بھیجا، وہ یہاں آیا، حملے کیے، غنیمتیں پائیں اور قندابیل کے اطراف وجوانب فتح کیے۔ مجاعہ سال بھر بعد مکران میں فوت ہوگیا۔ (ایک روایت یہ ہے کہ اس کو بھی علافیوں نے قتل کر دیا) علاف کا نام ریان بن حلوان بن عمران بن الحاف بن قضاعہ تھا اور وہ ابوجرم کنیت کرتا تھا یہ سرحد پوری طرح محمد بن القاسم کے ہاتھ پر فتح ہوئی۔ شاعر نے مجاعہ کے حق میں کہا ہے:

مَا مِن مَشاھَدِکَ التِی شاھِدِ ھَا

اِلا یَزِینُکَ ذِکُرمَا مُجَاعَا

یعنی: ''اے مجاعہ تو جتنے معرکوں میں شریک ہوا، ان کی یاد کو تجھی سے زینت ہے۔''
(البلاذری 2010 :581-82)

البلاذری جنوبی بلوچستان کی فتح کو ابن قاسم کا کارنامہ قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''مجاعہ کے بعد الحجاج نے مکران پر محمد بن ہارون بن ذراع النمری کو مقرر کیا۔ اس کے زمانہ ولایت میں جزیرہ یاقوت (مالدیپ) کے راجہ نے اس غرض سے کہ والی عراق کی جناب میں تقرب حاصل کرے۔ اپنے ملک کی مسلمان عورتوں کو ایک کشتی میں سوار کر کے عراق روانہ کیا۔ یہ عورتیں اس کے ملک میں پیدا ہوئی تھیں اور ان عربوں کی اولادیں تھیں جو اس کے ملک میں تجارت کرتے تھے اور فوت ہوگئے تھے۔ دیبل کے قریب میدوں کی ایک جماعت نے کشتی میں جو کچھ تھا لوٹ لیا۔ ان عورتوں میں سے ایک

یربوعیہ نے حجاج کی دھائی دی، یہ خبر حجاج کو پہنچی۔ سنتے ہی کہا یالبیک اور سندھ کے راجہ داہر کو لکھ بھیجا کہ "ان عورتوں کی رستگاری کی سبیل کرے"۔ داہر نے جواب دیا کہ "ان قزاقوں نے پکڑا ہے جو میری دسترس سے باہر ہیں"۔ حجاج نے عبیداللہ بن بنہان کی سرداری میں دیبل پر لشکر بھیجا، عبیداللہ نے حملہ کیا، کام آئے، اور مہم ناکام رہی۔ پھر بُدیل بن طیفۃ البجلی کو حکم دیا کہ دیبل پر حملہ کریں، وہ اس وقت عمان میں تھے، حکم پاتے ہی روانہ ہوئے، عین معرکے میں گھوڑا اُکھڑا اور دشمن کی صفوں میں لے گھسا۔ بُدیل قتل ہوئے اور مہم ناکام رہی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کو بدھ مذہب (بدھ مت کے ماننے والے) جاٹوں نے قتل کیا" (البلاذری 2010 :582)۔

"بدیل کے بعد حجاج نے بزمانہ ولید بن عبدالملک محمد بن قاسم بن محمد بن الحکم بن ابی عقیل کو اس مہم کا والی کیا۔ محمد کو اس سے پہلے فارس پر مقرر کیا تھا، ابوالاسود جہم بن زَحرا لجعفی ان کے مقدمے پر تھے۔ حجاج نے محمد کو ناحیہ رے پر لشکر کشی کا حکم دیا تھا۔ جب بُدیل کا یہ قصہ ہوا تو یہ حکم منسوخ کر دیا، سندھ کی حکومت کا پروانہ بھیجا اور لکھا کہ ایک لشکر (خشکی کی راہ سے روانہ کیا جارہا ہے) اس کے پہنچنے تک شیراز میں ٹھہرو۔ محمد کے زیرِ علم جنگ کرنے کیلئے چھ ہزار مردانِ کار شامی لشکر سے اور بکثرت دوسرے لشکروں سے انتخاب کیے۔ اس اہتمام سے لشکر کا سروسامان کیا کہ اہلِ لشکر کو جن جن چیزوں کی احتیاج ہو سکتی تھی، سب مہیا کر دیں، سوئی دھاگہ بھی ان کی نظر سے نہ چھوٹا۔ دھنکی ہوئی روئی سرکہ میں بھگو کے سائے میں خشک کی، لشکر والوں سے کہا۔ "سندھ میں تمہیں سرکہ نہیں ملے گا۔ اس کو پانی میں بھگو کے جوش دینا اور چھان کر استعمال کرنا"۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ترکیب اس وقت کی جب محمد نے سرکہ نہ ملنے کی شکایت لکھی۔ کمک جب آگئی تو شیراز سے کوچ کیا، مکران پہنچے، جہم بن زحر ساتھ تھے، مکران میں چند روز اور بقول یعقوبی مہینہ بھر ٹھہرے۔ پھر قنزبور (پنجگُور) آئے، یہ پہلا مقام ہے جو اس علاقے میں فتح کیا، دوسرا مقام ارمائیل (ارمابیل) ہے جو اس لشکر کشی کی ذیل میں فتح ہوا۔ ارمائیل سے دیبل جارہے تھے کہ محمد بن ہارون بن ذراع نے وفات پائی، یہ

ان لوگوں میں تھے جو محمد کے زیرِ علم ضم کیے گئے تھے۔ قنبیل (قنبیلی) میں ان کو دفن کیا اور جمعہ کو دیبل پر چھاؤنی کی" (البلاذری 2010: 582-83)۔

بعد ازاں عربوں نے مختصر عرصے میں لمبی مدت کیلئے بلوچستان اور سندھ پر قبضہ مکمل کر لیا اور لگ بھگ پانچ سو سالوں تک یہاں قابض رہے۔ گو کہ درمیانی مدت میں وسط ایشیائی ترکوں کو خطہ سندھ، بلوچستان و سیستان اور افغانستان پر غلبہ حاصل ہوا تو بھی ان کی حیثیت ایک سلطان کی سی تھی اور انھیں حکومت کرنے کیلئے خلیفہ بغداد سے پروانہ حاصل کرنا ہوتا تھا۔ مگر یہ ذہن نشین ہو کہ عربوں کو ایک دن بھی سکھ کا نہیں دیکھنا پڑا اور جب خلافت میں کمزوری آئی اور مسلمان حاکم جب دنیا داری کی جانب مائل ہوئے اور صرف مقامی باشندوں سے مالیہ کی وصولی تک اُن کی سرگرمیاں محدود ہو گئے تو مقامی باشندوں نے خود اپنے اپنے علاقوں کی حاکمیت سنبھالی اور اپنی اپنی ولایتوں میں حاکم بن گئے۔ اس کی مثال مکران کے ہوت اور مید قبائل تھے جو عرب دور میں ہی دوبارہ اپنے اپنے علاقوں کے حاکم بن گئے۔ اسی طرح سیستان میں بھی حاکمیت کے مسئلے پر صدیوں تک مقامی باشندوں اور عربوں کے مابین مسلح تصادم اور جھڑپیں جاری رہیں۔ علاوہ ازیں خضدار پر بھی مقامی باشندوں نے اپنی حاکمیت قائم کی۔ جب محمود غزنوی کا عہد آیا تو خضدار کا حاکم مقامی تھا نہ کہ کوئی عرب۔ خضدار کے باشندوں کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہاں کے باشندے کرد تھے۔ جبکہ دہوار اور نسبتاً سیاہ فام باشندے بھی یہاں کے قدیم باشندوں میں شمار ہوتے ہیں۔

بلاذری اپنی کتاب میں مزید کئی جگہوں پر بلوچستان کے باشندوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"موسیٰ کے بعد اس کا بیٹا عمران لوگوں کی سرداری پر کھڑا ہوا، امیر المومنین المعتصم باللہ نے اس کے حق میں امضا کر دیا، عمران نے قیقان کے علاقے پر حملہ کیا، یہ جاٹوں کا شہر

ہے، جنگ کی اور مغلوب کیا اور یہاں البیضا نام کا شہر بسایا، اور اس ناحیہ کے نظم و ضبط کیلئے اپنے شہر میں لشکر متعین کیا۔ جاٹوں کو مغلوب کر کے عمران المنصورہ پہنچا، خبر آئی کہ قندابیل پر محمد بن خلیل حکمران ہو بیٹھا ہے، فوراً روانہ ہوا، یہ شہر ایک پہاڑ پر تھا، جنگ کی، شہر فتح کیا اور تمام سربر آوردہ لوگوں کو گرفتار کر کے قصدار بھیج دیا۔ اس کے بعد سندھ کی بحری قوم میدوں پر لشکر کشی کی اور ان میں سے تین ہزار کو قتل کیا۔ مہران کے پانی کو روکنے کیلئے ایک زبردست بند بنوایا، اسی بند آب کو ''سکر المید'' کہتے ہیں۔ میدوں کا زور توڑ کے الرور (روہڑی) پہنچا۔ یہ بھی جاٹوں کا شہر تھا، حکم دیا کہ تمام جاٹ حاضر ہوں اور جو اس کے سامنے پیش کیا جائے اس کے ساتھ ایک کتا بھی ہو۔ جب وہ آئے تو ان کے ہاتھوں پر مہریں لگائیں اور ان سے جزیہ لیا، ان دنوں میں ایک ایک کتے کی قیمت پچاس درہم ہو گئی تھی۔ یہاں سے فارغ ہو کے پھر میدوں پر حملہ آور ہوا، اب اس کے ساتھ جاٹوں کے سردار بھی تھے، سمندر سے ایک نہر نکالی اور اس کو ان کے بطیہ میں ملا دیا جس کی وجہ سے پانی شور ہو گیا، اس کے بعد پیہم یورشیں کیں'' (البلاذری 2010: 594-95)۔

''بنی سامہ کے آزاد غلام فضل بن ماہان نے سندان نامی ایک شہر فتح کیا، اور عبد اللہ المامونؒ کو خبر دی اور ایک ہاتھی نذر بھیجا۔ اس نے یہاں ایک جامع مسجد بنوائی جس میں جمعہ ہوتا اور خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھایا۔ فضل کے بعد اس کا بیٹا محمد حکمران ہوا، اس نے ستّر بوارج کا بیڑا لے کر میدوں پر حملہ کیا، کشتوں کے پشتے لگائے اور ان کا شہر مالی (یقیناً ملتان شہر۔ کہ جو سندھ کے حقیقی باشندوں یعنی ملاہ قبیلے کی وجہ سے ملتان کہلاتا تھا اور اس کی قوم ملی کہلاتی تھی کہ جو دور جدید میں بھی سندھ اور جنوبی پنجاب میں بالترتیب ملاہ یا ملاح اور ملی قوم کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان خطوں کے جدید باسی ان حقیقی باشندوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور معاشرتی طور پر ان کا درجہ کم تصور کیا جاتا ہے حالانکہ یہی سندھ کے حقیقی اور قدیم باشندے ہیں جو موہنجودڑو یعنی ملوہا تہذیب کے بنیاد گزار تھے) فتح کر لیا۔

اس اثناء میں کہ وہ میدوں پر حملہ آور تھا۔ اس کے بھائی ماہان نے ریاست پر قبضہ کر لیا اور امیر المومنین المعتصم باللہ سے اپنے حق میں درخواست کی اور ایک ساج کہ (ایسا طویل و عظیم ساج دیکھنے میں نہیں آیا) ہدیہ بھیجا۔ آپس کی نزاع کے سبب حکومت میں ضعف آگیا، ہندیوں (میدوں) کی جرأتیں بڑھیں، لوگوں کو قتل کرنے اور سولیاں دینے لگے اور سندان پر غالب ہوگئے لیکن مسجد مسلمانوں کیلئے چھوڑ دی ہے جس میں وہ جمعہ پڑھتے اور خلیفہ کیلئے دعا کرتے ہیں" (البلاذری 2010: 595-96)۔

الغرض بلاذری تفصیل کے ساتھ اپنے زمانے تک عرب یلغار اور بلوچستان کے مختلف خطوں کے حالات بیان کرتا ہے۔ جن کے مطالعہ سے عرب دور میں بلوچستان کی سیاسی اور جغرافیائی حیثیت پر خوب روشنی پڑتی ہے اور بلوچ قبائل کے لسانی و قومی سرحدات کا درست ادراک ہوتا ہے۔ عرب مورخین کے بیانات سے اس بات کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ بلوچستان میں اب بھی وہی قدیم باشندوں کی اولادیں اقامت پذیر ہیں جو عرب حملوں کے وقت یہاں آباد تھے اور جنہوں نے ان حملہ آوروں کا بھرپور انداز میں مقابلہ کیا تھا۔ عرب مورخین کے بیانات سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ وہ شروع میں بلوچستان کے باشندوں کے اجتماعی قومی نام سے آگاہ نہیں تھے اور نہ ہی ان کے قبائلی ناموں سے متعلق زیادہ معلومات رکھتے تھے۔ مید اور ہوت قبیلہ کے علاوہ اندرون بلوچستان کے کسی اور قبیلہ سے واقف نہیں تھے۔ مید اور ہوت قبیلہ سے واقفیت کی وجہ شاید یہ تھی کہ ہوت قدیم حاکم قبائل میں شمار ہوتا تھا اور وہ ایک قدیم تاریخی پس منظر کا حامل تھا۔ جبکہ مید قبیلہ بھی اولین اور قدیم قبائل میں شمار ہوتا تھا مگر عربوں کا ان سے واسطہ اُس وقت پڑا جب عربوں نے ساحلِ بلوچستان اور سندھ پر حملے شروع کیے۔ لہٰذا میدوں نے انہیں کئی بار کھلے سمندر اور ساحلی مقامات پر دندان شکن جواب دیے تھے جن کی وجہ سے عرب میدوں کو جانتے تھے اور انہیں انہی ناموں سے تحریر کرتے ہیں۔ ہوت قبیلہ کے لیے عرب مورخین ہوت اور

الھوت کے علاوہ زط اور الزط کے الفاظ بھی زیرِ تحریر لاتے ہیں اور بعض اوقات ہوت اور مید باشندوں کو جاٹ یا جت بھی تحریر کرتے ہیں۔ اندرون بلوچستان کے علاقوں خضدار اور قلات سے چونکہ عربوں کا واسطہ پہلی بار پڑا تھا لہذا یہاں کے باشندوں کے بارے میں وہ مختلف الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ صرف البلاذری اپنی ایک ہی کتاب میں انہیں کئی ناموں سے تحریر کرتا ہے۔ وہ انہیں ترک بھی لکھتا ہے، مید بھی لکھتا ہے اور بسا اوقات جاٹ یعنی ہوت بھی تحریر کرتا ہے۔

بلوچستان کے مختلف علاقوں پر عرب حاکمیت قائم ہونے کے بیانات معروف مسلم عالم سید سلیمان ندوی بھی اپنی کتاب عرب اور ہند کے تعلقات میں بیان کرتا ہے۔

سید سلیمان ندوی کے بیانات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب دور میں عرب سرداروں نے بلوچستان کو تقسیم کر رکھا تھا اور ایک دوسرے سے قریب قریب کئی ریاستیں قائم کی تھیں کہ جن پر حکومت تو وہ کرتے تھے مگر آبادی بلوچ قبائل پر مشتمل تھی۔ سید سلیمان ندوی بلوچستان کے طول و عرض میں قائم کئی عرب ریاستوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

> "مکران سندھ کی سرحد پر واقع ہے۔ ابنِ حوقل کے زمانے میں یہاں کا عرب حاکم عیسیٰ بن معدان تھا۔ اس کی دارالامارہ کا نام کیز یا کیچ تھا جس کی وسعت ملتان سے آدھی تھی۔ اس کے قریب ایک اور عرب ریاست تھی جس کا نام مشکی (موجودہ مشکے۔ ضلع آواران) تھا اور جہاں کے حاکم کا ابنِ حوقل کے زمانے میں مظاہر بن رجاء نام تھا۔ یہ ریاست اتنی بڑی تھی کہ تین دن میں اس کی مسافت طے ہوتی تھی اور یہاں خطبہ میں خلیفہ بغداد کا نام لیا جاتا تھا" (ندوی سال اشاعت ندارد :253-54)۔

علاقہ خضدار (جھلاوان) کے بارے میں سید سلیمان ندوی عرب مورخین کے حوالوں سے لکھتا ہے کہ:

> "بعض لوگوں نے اس کا نام قزدار بھی لکھا ہے سبکتگین غزنوی کی فتوحات میں اس شہر کا نام ملتان (یقیناً غلطی سے ملتان لکھا گیا ہے وگرنہ غزنوی کی فتوحات کے دوران یہ شہر قصدار کہلاتا تھا) تھا۔ یہ ہندوستانی افغانی سرحد کے پاس واقع تھا۔ یہاں خارجی مسلمانوں کی آبادی

تھی اور انہی کی ریاست بھی تھی۔ شاید چوتھی صدی ہجری کے وسط میں ایک معتزلی متکلم مناظر ابوالحسن علی بن لطیف جب یہاں پہنچے تو اس کو خارجیوں کی آبادی اور ریاست پایا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ یہاں اس قدر امن و امان ہے کہ چوری کا نام و نشان بھی نہیں، لوگ گھروں میں قفل بھی نہیں لگاتے، مسجد میں کوئی مسافر یوں بھی اپنا اسباب چھوڑ دے تو کوئی اس کو چھونے والا نہیں۔ یہاں ان کی ملاقات ایک مسلمان درزی سے ہوئی۔ شہر میں مسجد بھی تھی۔ بشاری نے اس کا موقع یہ بتایا ہے کہ وہ بلوچستان کی بندرگاہ تیز کے ساحل پر مکران کی لمبائی میں 12 منزل پر واقع ہے۔ ایک اور عرب جغرافیہ نویس کہتا ہے کہ وہ ملتان سے تقریباً 20 منزل ہے" (ندوی سال اشاعت ندارد: 249-50)۔

ابنِ حوقل کے حوالے سے موصوف لکھتا ہے کہ:

"قزدار ایک شہر ہے جس کے ساتھ چند قصبے اور دیہات ہیں اور یہاں کے حاکم کا نام معین بن احمد ہے لیکن خطبہ خلیفہ بغداد کے نام کا پڑھا جاتا ہے اور اس کا محل باکزنان میں واقع تھا" (ندوی سال اشاعت ندارد: 250)۔

مذکورہ مصنف مسعودی کے حوالے سے لکھتا ہے کہ:

"قزدار طوران کا پایہ تخت ہے۔ یہ ایک صحرا میں واقع ہے۔ اس کے دو حصّے ہیں۔ دونوں کے بیچ میں ایک ترائی ہے جس میں کوئی پل نہیں۔ ایک میں سلطان کا محل ہے اور اسی میں قلعہ ہے۔ دوسرے حصّے کا نام بودین ہے۔ اس میں سوداگروں کے مکانات ہیں اور یہ حصّہ نہایت صاف سھُترا ہے۔ شہر چھوٹا ہے مگر فائدہ مند ہے۔ خراسان، فارس، کرمان اور ادھر سے ہندوستان کے شہروں سے لوگ یہاں آتے ہیں لیکن یہاں کا پانی اچھا نہیں ہے۔ پانی نہر سے پیا جاتا ہے۔" (ندوی سال اشاعت ندارد: 250-51)

"غرض یہ ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست تھی۔ سلطان محمود کے باپ امیر سبکتگین نے ہندوستان سے پہلے سرحدی ریاستوں کو مٹانا ضروری سمجھا۔ چنانچہ 375 ہجری اور 387

ہجری (جو سبکتگین کی تاریخ وفات ہے) کے بیچ کے کسی سنہ میں اس شہر پر قبضہ کیا اور وہاں کے مسلمان حاکم کو اپنا باجگزار بنایا" (ندوی سال اشاعت ندارد : 251)۔

سید سلیمان ندوی عرب مورخین کے حوالوں سے مزید لکھتا ہے کہ:

"ابنِ حوقل کے زمانے میں یہ (طوران) ایک مستقل ریاست تھی چنانچہ وہ کہتا ہے کہ مغربی سندھ میں طوران ہے۔ جس پر بصرہ کا ایک باشندہ ابو القاسم حکمران ہے جو خود ہی حاکم، قاضی، سپہ سالار سب کچھ ہے حالانکہ وہ تین اور دس میں فرق نہیں جانتا" (ندوی سال اشاعت ندارد : 251)۔

سید سلیمان ندوی بلوچستان کے حدود میں بعض دیگر مقامات کا تذکرہ بھی کرتا ہے۔ مگر شاید سیاسی و قومی جغرافیائی حدود سے عدم واقفیت کی بناء پر انہیں سندھ کے شہروں میں شمار کرتا ہے۔ ان مقامات، شہروں اور قصبوں میں ایک مقام کا نام وہ تنبلی لکھتا ہے (ندوی، سال اشاعت ندارد: 249) جو یقیناً کتابت کی غلطی ہے کیونکہ یہ مقام تنبلی نہیں بلکہ قنبیلی ہے جو لسبیلہ کا قدیم نام تھا۔ یہیں پر محمد بن ہارون نے وفات پائی تھی اور یہیں پر مدفون ہوئے تھے۔ ان کا مقبرہ آج بھی لسبیلہ شہر میں ہے اور مرجع خلائق ہے۔ اسی طرح بوقان نامی (ندوی (سال اشاعت ندارد): 249) مقام کو بھی سندھ کے شہروں میں شمار کرتا ہے حالانکہ عرب مورخین اس قصبہ کو قلات کے آس پاس بیان کرتے ہیں جو وسطی بلوچستان میں شمار ہوتا ہے۔

حتیٰ کہ پانچ سو سالوں تک جب عباسی اقتدار قائم تھا بلوچستان گو کہ عربوں کے زیر قبضہ تھا مگر انہوں نے شاید ہی کوئی دن سکون کا یہاں گزارا ہو۔ حتیٰ کہ 712ء میں محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا اور عرب فوجیں اسلامی سرحد کو ملتان تک لے گئے۔ عباسیوں کا اقتدار منگولوں نے 1258ء میں ہلاکو خان کی سرکردگی میں ختم کر کے خلافت اسلامیہ کا چراغ گل کر دیا۔ اور ایران پر منگول حکومت قائم ہوگئی۔ مگر عرب دور حکومت کے دوران بھی بعض طاقتور ترک مسلمان سلاطین

عربوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بلوچستان پر حملہ آور ہوتے رہے۔ ان ترک خاندانوں اور بلوچ قبائل کے درمیان طویل جنگیں بھی ہوئیں جن کے تذکروں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ ضروری ہے کہ عباسی دور خلافت میں اسلامی جغرافیائی حدود کے اندر قائم ہونے والی ان خود مختار ریاستوں اور سلطنتوں کا مختصراً تذکرہ کیا جائے جن کا واسطہ بلوچستان کے جغرافیائی حدود اور یہاں کے باشندوں کے ساتھ پڑا تھا۔ مگر ان ترک خاندانوں کے تذکرے سے قبل بلوچستان پر عرب حملوں اور ان کے یہاں طویل قیام کے پڑنے والے اثرت پر تھوڑی سی روشنی ڈالی جائے۔

بلوچستان پر عرب حملوں کے اثرات:

عرب دور کے آثار بلوچستان کے مختلف علاقوں خصوصاً جھالاوان، قلات، بیلہ، خاران اور کچھی گنداواہ میں اکثر مقامات پر نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ وادی ساسول خضدار کے موضع سراپ میں واقع ایک قدیم مسجد کے آثار، خضدار میں حضرت سلمہ بن محبق کا مزار، علاقہ زہری اور قلات میں لاتعداد صحابہ اور تابعین کی قبریں، کوسٹل ہائی وے اور لسبیلہ سے کراچی تک سڑک کے کنارے مدفون لاتعداد عرب حملہ آوروں کی قبریں، لسبیلہ ڈسٹرکٹ کے حدود میں کوسٹل ہائی وے پر اگور پوسٹ ہنگلاج کے قریب عرب حملہ آوروں کی لاتعداد قبریں، خاران میں جھالوار اور لوس کے مقامات پر عرب دور کی تحریریں اور ان کے قائم کردہ مورچے، چاغی میں اکثر مقامات پر قدیم قبرستان اور واچ ٹاور وغیرہ عرب دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ یقیناً بلوچستان کے طول و عرض میں عربوں سے متعلق کئی دیگر اقسام کے مقامات اور آثار قدیمہ بھی ہیں جنہیں تلاش کرنے اور اتہاس کے قرطاس پر تحریر کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

اسلامی تاریخ لکھنے والے دیگر مورخین بھی بلوچستان اور عربوں کے تعلقات پر تفصیل یا اختصار کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں مگر یہ بات واضح ہو کہ ان مورخین کو بلوچستان اور یہاں کے

باشندوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں جس کی وجہ سے وہ یہاں کی جغرافیائی کیفیت، شہروں کے نام اور قبائل وغیرہ کا تذکرہ کرتے وقت انتہائی غیر ذمہ داری سے کام لیتے ہیں اور انہیں بسا اوقات سندھ میں شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بیانات تاریخی واقعات اور حقائق کے لحاظ سے بالکل بھی درست نہیں ہیں۔

دوسری صدی ہجری میں خارجی سرگرمیوں کی وجہ سے مفتوحہ علاقوں پر عربوں کا انتظامِ حکومت اس حد تک کمزور ہو گیا تھا کہ اب خلفائے بغداد کیلئے مشرقی ایران کے علاقوں میں کوئی جاذبیت اور کشش باقی نہیں رہی تھی۔ اب یہ علاقے دارالخلافہ کیلئے بیرونی چوکیوں یا فوجی چھاؤنیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے لہٰذا ژندبیل قبیلہ مشرقی ایران اور اس سے مزید مشرق کے کئی علاقوں پر برسوں تک قابض رہا۔ گو کہ وہ کابل کے ترک حکمران کو ایک معمولی سا خراج دیتا تھا مگر عملاً وہ آزاد اور خود مختار تھا (دھوار 1990:245)۔

علاوہ ازیں آل مروان یعنی بنو امیہ کے عہد میں سیستان میں پیش آنے والے واقعات کی تفصیلات بھی البلاذری کی کتاب میں تحریر ہیں جن کے مطالعہ سے اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ عربوں کو سیستان سمیت اس پورے خطے میں مال و دولت کی تلاش تھی اور ان کا مقصد بھی جہانگیری اور ہوس دولت کے سوا کچھ نہ تھا۔ انہیں ہندوستان کی جانب جانے والے تجارتی راستوں کی ضرورت تھی تاکہ وہ اپنی دولت میں اضافہ کر کے دنیا میں سیاسی طور پر اپنا لوہا منوا سکیں۔ اموی اور عباسی دور میں خلفاء عرب کی ہوس ملک گیری اور دولت کی لالچ کے کئی واقعات پیش آئے اور تاریخ کا حصہ بن گئے۔ ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ عرب حملہ آوروں کو اپنے دین سے پہلی والی محبت باقی نہیں رہی تھی بلکہ دنیا کے دیگر طاقتور اور سامراجی اقوام کی طرح عربوں کی زندگی کا مقصد و منشا بھی صرف اور صرف دولت کا حصول بن چکا تھا۔ عرب خلفاء

سرِ عام شراب نوشی کرتے اور اپنے حرم سرا کو بھانت بھانت کی خوبصورت عورتوں سے سجاتے اور آباد کرتے۔ ان کی عیاشی اور عیش جوئی کا تمام تر سامان دستیاب تھا۔ سینکڑوں غلام اور لونڈیاں ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ ان کے لیے مفتوحہ علاقوں سے سیم وزر کی بے شمار دولت آ رہی تھی لہٰذا اب انہیں دینِ اسلام کی سادگی میں کوئی کشش نظر نہیں آتی تھی۔ ان کی زندگیاں شاہانہ تھیں اور وہ بڑے بڑے عالیشان قلعہ نما محلوں میں اقامت رکھتے تھے۔ اگر خلیفہ یا اس کے خاندان کے کسی فرد کو کہیں جانا ہوتا تو اس کا جلوس قابلِ دید ہوتا جو ہزاروں مصاحبین، سپاہیوں، محافظوں، غلاموں اور لونڈیوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ تاریخی واقعات کے مطالعہ سے اس بات کا بخوبی ادراک ہوتا ہے کہ عرب خلفا کی نااہلی کی وجہ سے اکثر مفتوحہ علاقے آمادہ بغاوت رہتے تھے اور عربوں کی غلامی سے نجات کے ذرائع تلاش کرتے رہتے تھے۔ عباسی عہد میں دربار خلافت پر ایرانی اور ترک امرا کی اجارہ داری قائم ہوئی اور انہوں نے خلفائے بنو عباس کو کٹھ پتلی بنائے رکھا۔ یہ ترک اور ایرانی نژاد خاندان کچھ علاقوں پر سبقت حاصل کر کے رائلٹی کی بنیاد پر مرکزی حکومت سے حکمرانی کے اسناد حاصل کرتے اور اپنے مقبوضہ اور مفتوحہ علاقوں پر حاکمیت اختیار کرتے۔ ان خاندانوں میں طاہری، سامانی، آلِ بویہ، صفاری، غزنوی وغیرہ زیادہ قابلِ ذکر ہیں جنہوں نے عباسی عہد میں ایشیاء میں زبردست سیاسی و عسکری کردار ادا کیا۔

عربوں کے حملوں اور بعد ازاں اُن کی قائم ہونے والی حکومتوں نے بلوچ خطے کے معاشرتی اداروں کو بہت متاثر کیا۔ بلوچ قبائل اسلام کی آمد سے قبل اپنے معاشرتی نظام کے تحت زندگی گزارتے تھے جو فارسیوں اور قریبی سندھی اور افغانوں سے مختلف تھی۔ بلوچوں کی نظام زندگی کے بارے میں ماضی کی کتابوں میں موہوم سی تحریریں ملتی ہیں جن کے مطابق بلوچ معاشرہ آزاد خیال اور مذہبی اعتقادات سے مبراء تھا۔ فارسیوں کے قریب رہنے والے بلوچ

قبائل کسی حد تک آتش پرستی کی طرف مائل تھے مگر ان کے بھی مذہبی اعتقادات کے بارے میں زیادہ شواہد دستیاب نہیں ہیں۔ اسی طرح وسطی اور مشرقی بلوچستان سمیت لسبیلہ کے حدود میں ہندومت کے آثار کی بہتات ہے۔ لسبیلہ میں ہنگلاج مندر، لسبیلہ میں کالی ماتا کا مندر، مستونگ میں بھیم دیو کا مندر، کچھی کے موضع جلال میں واقع قدیم منادر اور ہندومت کے دیگر آثار کے علاوہ علاقہ کولپور میں واقع قدیم مندر اور آشرم وغیرہ۔ کوئٹہ میں بھی ہندومت کے آثار اور منادر کی بہتات تھی۔ ان قدیم اور قبل از اسلام عہد کے منادر کی کثرت سے موجودگی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ اسلام سے قبل بلوچستان کے وہ علاقے جو ہندوستان اور سندھ کے قریب تھے ہندوازم سے شدید متاثر تھے۔ اس بات کی کوئی شہادت تو نہیں ملتی کہ زمانہ قدیم اور اسلام سے قبل کے بلوچ باشندے بھی ہندومت کے پجاری تھے کیونکہ تاریخی بیانات یہ ثابت کرتے ہیں کہ کوچ و بلوچ قبائل کے لوگ زیادہ تر صحرائی نخلستانوں اور پہاڑی وادیوں میں آباد تھے۔ مگر یقیناً نسبتاً بڑے قصبات اور شہروں میں بھی ان ہی کے لوگ آباد ہوں گے جیسا کہ دورِ حاضرہ میں ہے کہ بلوچ جہاں بھی کسی بڑے شہر میں رہتے ہوں ان کی جڑیں اپنے کسی نہ کسی دیہی علاقے کے ساتھ ہی جڑی ہوتی ہیں۔ یقیناً ماضی میں بھی انہی صحرائی اور پہاڑی باشندوں کے ہی قبائل کے لوگ شہروں میں بھی آباد ہوتے تھے اور خطے پر حاکمیت بھی یقیناً یہی لوگ کرتے تھے تو یقیناً ان کا مذہب بھی وہی ہوگا جو اُس زمانے کا مروجہ مذہب ہوگا۔ اگر شہروں اور قصبات کے باشندوں اور حاکموں کا جو مذہب ہوگا تو یقیناً وہی مذہب اُن کے دیگر اعزاء و اقرباء اور اہلِ قبائل کا ہوگا۔ اکثر عرب مورخین بھی عرب حملوں کے دوران وسطی اور مشرقی بلوچستان کے باشندوں کو ہندو اور بدھ مت لکھتے ہیں۔ مگر اسلام آنے کے بعد خطے کے باشندوں نے بھی اسے قبول کیا اور تب سے لے کر اب تک وہ اسی دین پر قائم ہیں۔ مگر بلوچ قبائل میں مذہبی رواداری پائی جاتی ہے گو کہ

انہوں نے اسلام قبول کیا مگر علاقے کے دیگر غیر مسلم باشندوں کے ساتھ انتہائی روادارانہ سلوک کیا۔ کبھی کسی غیر مسلم کو تکلیف نہیں پہنچائی اور نہ ہی اس کے حقوق (مذہبی و معاشرتی) غصب کیے۔ بلوچ حاکمیت کے دوران بلوچستان میں مذہبی فرقہ واریت یا دنگا فساد کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ احمد زئی حکمران میر نصیر خان نوری نے غیر مسلموں کے حقوق مسلمانوں سے بھی زیادہ مقرر کیے تھے۔ ایک غیر مسلم ہندو باشندے کا خونِ ناحق ناقابل معافی تھا۔ ہندوؤں کے مذہبی اور انسانی حقوق کا مکمل خیال رکھا گیا تاکہ کوئی بھی مسلمان باشندہ کسی غیر مسلم کو نقصان نہ پہنچائے۔ انہوں نے ہندو پنڈتوں کے لیے وظائف اور مندروں کی تعمیر و مرمت کے لیے فنڈ مخصوص کیے تھے (بلوچ 2012:181)۔ تقسیم ہند کے بعد پورے برصغیر اور سندھ و پنجاب میں ہندو مسلم فسادات ہوئے مگر بلوچستان میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا بلکہ قلات میں خان آف قلات کے فرزندوں نے ہندو آبادی والے محلوں کی حفاظت اور پہرہ داری کی۔ تاکہ کوئی جنونی ہندوؤں کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔

لہٰذا وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا کہ ماضی قدیم یعنی اسلام کی آمد سے قبل اور بعد از قبولیت اسلام بلوچوں کی مذہبی رواداری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلاشبہ بلوچ اپنے ہمسائے افغان اور ایرانی فارسی کی نسبت مذہبی معاملت میں زیادہ رودار اور آزاد خیال ہے۔

بلوچ سماج میں قبل از اسلام بعض ایسے سماجی رسوم بھی یقیناً مروج ہوں گے جو اُس دور کے نظامِ حیات کے مطابق ہوں گے۔ بلوچ قوم میں اب بھی ایسے رسومات اور عقائد پائے جاتے ہیں جن کا اسلامی احکامات اور اعتقادات سے دور دور تک کا واسطہ نہیں ہے۔ ان رسومات اور عقائد کی نوعیت ایسی ہے جن کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ عقائد اب بھی زرتشتی یا ہندی معاشرے میں پائے جاتے ہیں یا اُن کے عقائد سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر بلوچ قبائل میں

آگ کا بے حد احترام کیا جاتا ہے۔ اسے نہ تو پانی سے بجھایا جاتا ہے اور نہ ہی اسے پھلانگا جاتا ہے۔ اسے پھونک مار کر بھی نہیں بجھایا جاتا اور نہ اس پر تھوکا جاتا ہے۔ اس میں پیشاب کرنا یا کوئی گندگی ڈالنا انتہائی معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ بلوچ قبائل رات کو میدانوں میں جہاں اُن کا قیام ہوتا ہے آگ کا بڑا سا الاؤ جلاتے ہیں اور اس کے ارد گرد بیٹھ کر گپ شپ اور موسیقی کی محفل جماتے ہیں۔ شادی بیاہ کے دوران آگ کے ایک بڑے الاؤ کے ارد گرد نوجوان لڑکے ڈھول کی تھاپ پر ناچتے ہیں۔ مکران کے میدوں میں آگ کا رقص انتہائی مشہور ہے جس کا رقاص مالد کہلاتا ہے۔ مختصراً یہ کہ آگ کو بلوچ سماج میں زندگی کا مظہر مانا جاتا ہے اور حد درجہ احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ جذبات اور عقائد ان کے زرتشتی اعتقادات کی پیروی کی عکاسی کرتے ہیں۔ اسی طرح وسطی بلوچستان کے خواتین میں ایسی رسومات پائی جاتی ہیں جو ہندو معاشرے کی عکاس ہیں۔ مثلاً خواتین منگل کے دن سر کے بال نہیں دھوتیں، جمعہ کے دن کپڑے نہیں دھوتے، دوپہر کے بعد جھاڑو نہیں دیتے، دوپہر کے بعد ناخن نہیں کاٹتے، چاند گرہن اور سورج گرہن پر ڈھول بجاتے ہیں اور کوئی جانور ذبح کرتے ہیں تاکہ بلا ٹل جائے، گھر کے چوکٹ میں نہیں بیٹھتے، جوتے کے الٹا ہو جانے پر اسے بدشگونی سمجھتے ہیں، مغرب کے بعد کسی ہمسائے کو نمک نہیں دیتے وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسی رسومات اور عقائد ہیں جن کا اسلام کے ساتھ دور دور تک کوئی واسطہ نہیں ہے مگر بلوچ قبائل میں راسخ حد تک موجود ہیں۔ اسلام کی آمد نے ان قبائل کی مذہبی عقائد تو تبدیل کر دیے مگر ان کے سماج کے بعض اداروں پر اسلامی عقائد بھی اثرانداز نہ ہو سکے۔ نہ ان کا رہن سہن تبدیل ہوا اور نہ ہی ان کی رسوم و رواجات پر عرب سماج کے اثرات مرتب ہوئے۔ بلوچ سماج کے ادارے اپنے ہی روایات اور دساتیر پر گامزن رہے حتیٰ کہ اب تک اُن کے وہی قدیم اور قبل از اسلام عہد کی رسوم و رواجات قائم اور رائج ہیں۔

ایک غلط العام مفروضہ کے تحت کہا جاتا ہے کہ بلوچوں کا تعلق عربوں سے ہے مگر لکھنے اور ایسا ہی سمجھنے والا یہ نہیں دیکھتا کہ جب عربوں نے بلوچ خطے پر یورشیں کیں تو بلوچ باشندوں اور ان حملہ آوروں کے مابین خونریز جنگیں ہوئیں اور عرب دور کے اختتام تک عرب اور بلوچ چپقلش میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بلوچوں نے اسلام قبول کیا اور اسلامی شعائر اور قوانین کو خود پر لاگو کیا مگر انھوں نے عربوں کی حاکمیت کو کبھی بھی قبول نہیں کیا اور آخری وقت تک وہ اپنے خطے پر اپنی حقِ حاکمیت کے حصول کے لیے عربوں کے خلاف مبارزت کرتے رہے۔ اگر بلوچ عرب ہوتے تو وہ عرب حملہ آوروں کو اپنے خطے میں خوش آمدید کہتے نہ کہ اُن کے خلاف اتنی لمبی مسلح جدوجہد کرتے اور ان کی حاکمیت کے خلاف ہتھیار اٹھاتے۔

المختصر یہ کہ مذہب کی تبدیلی کے سوا عرب حملوں کا بلوچ سماج پر زیادہ اثر نہ پڑا اور بلوچ سماج اپنے قدیم ضابطہ اخلاق اور رسوم و رواجات پر عمل پیرا رہا۔

بلوچستان پر ترک خاندانوں کی یورشیں :

عرب دور خلفائے راشدین، خاندان بنو امیہ اور خاندان بنو عباس کے ادوار میں تاریخی واقعات کے پڑھنے سے یہی بات شنید میں آتی ہے کہ پورے عرب دور میں بلوچستان میں طویل اور غیر منظم بغاوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ حتیٰ کہ عباسی خلفاء کے دور میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ خلیفہ وقت کی حیثیت ایک شاہی مہرے کی سی رہ گئی تھی اور وہ تاج شاہی سر پر پہنے، شاہی عصاء ہاتھ میں لئے صرف تخت شاہی پر براجمان ہوتا تھا جبکہ دربار خلافت پر ایرانی اور ترک امراء چھائے ہوئے تھے۔ خصوصاً سیستان، خراسان، وسط ایشیاء اور افغانستان میں ترکوں کو زبردست قوت ملی۔ ان علاقوں میں مختلف ترک خاندانوں میں رسی کشی شروع ہوگئی۔ ان میں سے جو خاندان بھی کچھ علاقے فتح کرلیتا تو وہ وہاں کا حاکم بن بیٹھتا اور دربار خلافت سے اپنے لیے حاکمیت کا

پروانہ حاصل کرلیتا۔ لہٰذا ان ترک خاندانوں نے بیشتر علاقوں پر قبضہ کر کے دربار خلافت سے سند سلطانی حاصل کرلی اور ان علاقوں پر خود مختارانہ اور آزادانہ اقتدار قائم کیا۔ ان ترک خاندانوں میں سامانی شہزادے، صفراوی (صفاری) خاندان، آل بویہ، غزنوی اور غوری شامل تھے۔ ان خاندانوں میں سے بعض کے ساتھ بلوچ قبائل کا بھی واسطہ پڑا اور ان کے مابین خونی تصادم ہوتے رہے۔ ذیل میں ان خاندانوں کا مختصر تذکرہ کیا جارہا ہے جو کسی نہ کسی طرح بلوچ قبائل اور ان کے سیاسی وجغرافیائی حدود سے متصادم ہوتے رہے۔

خاندان صفراوی (صفاری):

861ء میں امیر یعقوب بن لیث سیستان کی امارت پر فائز ہوا اور خلیفہ عباسیہ موفق باللہ نے اسے امیر سیستان کی سند عطا کردی (دہوار 1990: 269)۔ وہ ایک لائق و قابل جرنیل تھا اور بقول مؤرخین اس نے ایک بھی دن آرام سے نہیں گزارا۔ تمام عمر جنگوں میں مصروف رہا اور قریباً 18 سال حکومت کی۔

دراصل خلفائے عباسیہ اس دور میں ایسے کمزور ہوچکے تھے کے ان کیلئے دور دراز کے مقبوضات اور غیر عرب علاقوں پر قابو رکھنا مشکل ہوگیا تھا۔ لہٰذا اب ان آزاد ریاستوں پر قدیم ایرانی نسلوں اور ترک خاندان کے بااثر افراد قابض ہوکر دربار خلافت سے عہد وفاداری کے بدلے میں سلطانی کی سند حاصل کررہے تھے۔ خاندان صفراوی یا صفاری یا مقارن (عسکری 1995: 17) کے پہلے امیر یعقوب بن لیث سیستان کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتداء میں اس کا تعلق مسگری (تانبے کا کام کرنے والا) کے پیشہ سے تھا۔ اس کے بعد وہ لوٹ مار کرنے والے ڈاکوؤں اور قزاقوں کے گروہ میں شامل ہوگیا۔ اس دوران اس کی سپاہیانہ صلاحیتیں اجاگر ہوئیں۔ اس نے قزاقی کے پیشے کو ترک کر کے صالح بن النصر امیر سیستان کے ہاں ملازمت اختیار

کرلی۔ جو خارجیوں کے خلاف کئی مہمات میں حصہ لینے کی وجہ سے خلفائے عباسیہ کی نظروں میں بڑا مقبول ہو گیا تھا۔ اس ملازمت کے دوران امیر یعقوب کے جوہر بھی خوب آشکار ہو گئے وہ ترقی کر کے امیر سیستان النصر کی فوجوں کا سپہ سالار بن گیا۔ النصر کی وفات کے بعد اس کا بھائی امیر یعقوب کے حق میں امارت سے دستبردار ہو گیا۔ اس نے چھ سال تک النصر کی فوج میں زبردست خدمات سر انجام دیں اور خصوصاً خارجیوں کے خلاف اس کے کارناموں کی وجہ سے اس کو خلفائے عباسیہ کی تائید و حمایت حاصل ہو گئی تھی (ٹیٹ 1979:20)۔ 265-66ھ میں یعقوب فوت ہوا تو اس کی سلطنت عراق سے ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھی جس میں سیستان، ایران، خراسان، کرمان، مکران، اصفہان اور سندھ شامل تھے۔ اتنی بڑی اور عظیم سلطنت کو ان کا بھائی عمرو بن لیث الصفراوی (صفاری) سنبھال نہ سکا۔ لہٰذا کابل سندھ، رخج (خراسان) مکران اور توران (جھلاوان) آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ سے نکلنے لگے۔ اسی دوران عمرو بن لیث کی ایک جھڑپ والئی خراسان رافع بن ہرثمہ سے ہوئی جو عمرو کے ہاتھوں مارا گیا اور خراسان پر اس کا تسلط قائم ہوا۔ مگر اسے خلیفہ کی خوشنودی حاصل کرنے میں ناکامی ہوئی کیونکہ اتنی بڑی سلطنت کا وارث ہونے کی وجہ سے اس کا غرور حد سے بڑھ چکا تھا لہٰذا اسکے مقابلے میں خلیفہ وقت سامانی شہزادوں کو پسند کرتے تھے۔ 899-900ء میں بالآخر کوہ ہندوکش کے قریب ایک معرکے میں اسماعیل سامانی نے عمرو بن لیث کو شکست دی اور اسے پابجولاں خلیفہ کے پاس بغداد بجھوایا۔ جہاں وہ قید کی حالت میں مر گیا اور صفاری یا صفراوی خاندان کے اقتدار کا خاتمہ ہوا۔

صفاری خاندان کے عہد میں بلوچوں کے اکثر علاقے ان کے زیرِ اثر تھے جہاں انہوں نے طاقت کے بل بوتے پر اپنا تسلط قائم کیا ہوا تھا۔ صحرا لوت، کرمان، مکران اور سیستان کے بلوچوں پر تسلط جمانے کے بعد انہی کی مدد سے اپنے حاکمیت کو صفاریوں نے قائم رکھنے کی کوشش

کی۔ مگر ظلم و بربریت پر قائم یہ سلطنت طویل عرصہ تک قائم نہ رہ سکی اور بالآخر خلفائے بنو عباس سمیت عوامی حمایت بھی کھو بیٹھی اور سامانی (طاہری) حاکموں نے اس خاندان کی حاکمیت کا خاتمہ کر دیا۔ اس خاندان کی حاکمیت کے بلوچستان کی سیاست پر اثرات ضرور پڑے مگر بلوچ سماج کو زیادہ متاثر نہ کر سکا۔ علاوہ ازیں صحرالوت اور سیستان کے بلوچ باشندوں کی ساتھ اس کی کچھ مخاصمت رہی مگران کے باقی ماندہ بلوچوں کے ساتھ تعلقات پر زیادہ مواد دستیاب نہیں ہیں۔ البتہ ایک زبانی روایت کے مطابق یعقوب بن لیث کی والدہ سیستان کے کسی بلوچ خاندان سے تھی۔ اگر یہ درست ہے تو پھر یقیناً سیستان کے بلوچ قبائل سمیت دیگر علاقوں کے بلوچوں نے بھی اس کی حمایت کی ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دور میں بلوچ اور صفاری حاکموں کے مابین کسی جھڑپ اور تصادم کے بارے میں کوئی بیان دستیاب نہیں ہے۔

سامانی شہزادے:

خلیفہ بغداد نے بظاہر عمرو بن لیث کی فارس، سیستان، خراسان، اصفہان، کرمان، رخج، مکران اور سندھ پر قبضہ و اختیار کو تسلیم کر لیا تھا اور اس نے عمرو بن لیث کو ایک امتیازی پرچم بھی عطا کیا تھا۔ عمرو اس پرچم کو تین دن تک زرنج (سیستان کا دارالخلافہ) کے قلعے پر لہراتا رہا تاکہ سب کو اس کی خلیفہ بغداد کے دربار میں مقبولیت کا علم ہو سکے۔ مگر عمرو بن لیث کا غرور و گھمنڈ پرچم کے ملنے سے اور زیادہ بڑھ گیا اور اس نے کوہِ ہندوکش پر چڑھائی کر دی جو سامانی خاندان کے زیر اثر تھا۔ اسماعیل سامانی نے عمرو کو بلخ میں ذلت آمیز شکست دے کر گرفتار کر لیا اور پابجولاں خلیفہ بغداد کے سامنے پیش کر دیا۔ اسے قید کر لیا گیا اور وہ قید کی حالت میں ہی مر گیا اور اس کے علاقے پر سامانی خاندان نے قبضہ کر لیا۔ انہوں نے غزنی کو مرکز بنا کر صفاریوں سے حاصل کردہ

سلطنت پر حکومت شروع کی۔ اس خاندان کا خاتمہ 395 ہجری بمطابق 1004-05ء میں ہو گیا جب ان کا آخری حکمران ابو ابراہیم ترکوں کے ہاتھوں قتل ہوا (ٹیٹ 1979: 20-21)۔

اس خاندان کا واسطہ بلوچ قبائل کے ساتھ نہیں پڑا اور نہ ہی ان کی حکومت زیادہ عرصہ تک چل سکی۔ وہ علاقے جو ان کے زیرِ اثر آئے اُن پر ان کا کنٹرول نہ ہونے کے برابر تھا۔ لہٰذا اکثر علاقے ان کی دسترس سے نکلنے لگے۔ کرمان، صحرالوت، مکران اور دیگر وہ علاقے جو بلوچ آبادی پر مشتمل تھے سامانیوں کے قبضہ سے آزاد ہو چکے تھے۔ پہلی ہزارویں صدی عیسوی میں وسط ایشیائی ترک خاندان اقتدار کے حصول کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ نبرد آزما تھے۔ کبھی ایک خاندان اقتدار میں آتا تو دوسرا خاندان اس کا خاتمہ کر کے اس کی جگہ لے لیتا مگر جلد ہی کوئی اور خاندان اقتدار میں آجاتا اور سابقہ خاندان کا نام و نشان مٹ جاتا۔ لہٰذا ترکوں کی اس خانہ جنگی کے دوران اکثر علاقے اُن کے تصرف سے آزاد ہو چکے تھے اور مقامی قبائل کے زیرِ اثر تھے۔ بلوچ قبائل کے علاقوں کی صورتحال بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ سامانی شہزادوں کی حاکمیت کو سیستان کے ایک مضبوط خاندان آل بویہ نے ختم کر کے ایک وسیع و عریض سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

آل بویہ:

نویں سے گیارہویں صدی عیسوی کے دوران بہت سے غیر ملکی خصوصاً عرب سیاحوں نے بلوچستان و سیستان کی سیاحت کی۔ وہ وسطی بلوچستان سے بھی گزرے جو اپنی تحریروں میں ان مذکورہ علاقوں، ان کے باشندوں اور ان کی طرزِ معاشرت کا مسلسل تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔ ابن حوقل جو دسویں صدی عیسوی کا ایک مشہور عرب جغرافیہ دان اور سیاح تھا لکھتا ہے، مکران کا والی معاون تھا جو ایک عرب خاندان سے تعلق رکھتا تھا جبکہ خضدار میں معین بن احمد حاکم تھا جو کیزکان (کیکانان) میں سکونت پذیر تھا۔ ابن حوقل کے بیان کے مطابق خضدار ایک بڑا شہر تھا

جس کے ارد گرد کئی بستیاں آباد تھیں۔ شہر کے بیچ میں ایک قلعہ تھا اور شہر کے گرد زمینیں مسطح اور زرخیز تھیں۔ ان میں انگور، انار اور وہ میوے جو سرد ملکوں میں مخصوص ہیں، پیدا ہوتے تھے۔ مقدسی نے بیان کیا ہے کہ یہ شہر دریا کے دونوں کناروں پر دو حصوں میں آباد تھا اور دریا خشک تھا۔ ایک حصے میں سلطان کا محل اور قلعہ تھا اور دوسرے حصے میں جو بودین کہلاتا تھا تاجر رہتے تھے۔ ان تاجروں کی دکانوں سے، جو بازار میں تھیں خراسان کے لوگ بہت لین دین رکھتے تھے۔ مقدسی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہاں کے مکانات کچے بنے ہوئے تھے (سٹرینج 1986 :499)۔ (مزید ملاحظہ کریں: ابن حوقل: صورۃ الارض و المقدسی: احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم)

عرب جغرافیہ دان اور سیاح گنداواہ (قندابیل) کو علاقہ قصدار (خضدار، توران) کا ایک حصہ لکھتے ہیں۔ اس کا نام بدھا تحریر کرتے ہیں اور قندابیل کو اس کا صدر مقام بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح قلات (کیکانان) اور مستنج (مستونگ) کے اذکار کے علاوہ کوئٹہ سے قندھار تک کے علاقے کو بالس، والش یا والشتان تحریر کرتے ہیں۔ جبکہ سبی و مستونگ کو والشتان کے ہی شہر لکھتے ہیں۔ اسی طرح مکران اور ایرانی بلوچستان کے کئی شہروں اور وہاں پر سکونت پذیر بلوچ قبائل کا بھی تمام عرب جغرافیہ نویس، سیاح، روزنامچہ نویس اور مؤرخین مسلسل ذکر کرتے رہتے ہیں اور یہاں کے باشندوں کو کوچ و بلوچ تحریر کرتے ہیں (سٹرینج 1986 :483,502)۔

بلوچستان ماضی قدیم میں آرین یلغار کے بعد مسلسل بیرونی تاخت کا نشانہ بنتی رہی ہے۔ ان یلغاروں اور حملوں کے نتیجے میں سابقہ اور قدیم تہذیب اور اس کے باشندوں کو زبردست نقصان پہنچا اور وہ سابقہ قبل از تاریخ دور کا عروج حاصل نہ کر سکے۔ ترک امراء کے دور اقتدار کے دوران ایک خاندان، جسے تاریخ آل بویہ یا دیلمی لکھتے ہیں نے بھی بلوچستان سمیت وسط ایشیاء، ایران،

سیستان اور سندھ پر حکومت کی۔ اس خاندان کے حکمران عضد الدولہ سے بلوچ قبائل کی طویل جنگوں کا تذکرہ تاریخ کی مستند کتابوں میں بھی موجود ہے (سٹر ینج 1986 :485,86)۔ ابن خلدون کی تاریخ یعنی مقدمہ ابن خلدون کے جلد ششم میں بھی آل بویہ اور بلوچ قبائل کے مابین خون ریز جھڑپوں اور قتل وغارت گری کے واقعات تحریر ہیں (ابنِ خلدون 1984:226)۔

المختصر یہ کہ، علی بن بویہ دیلمی ایک ایرانی ماہی گیر تھا۔ غالباً 932ء میں اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر طبرستان کے حکمران مردوج بن زیاد کی نظروں میں آگیا جس نے اسے قراج کا گورنر بنادیا جو صوبہ ہمدان کا ایک ضلع تھا۔ اس نے اپنے بھائی احمد کے ساتھ ملکر فارس کی جانب پیش قدمی شروع کی۔ احمد نے سیر جان فتح کرتے ہوئے کرمان پر حملہ کر دیا۔ جس پر ابو علی نامی ایک مقامی شخص محمد بن الیاس کی جانب سے گورنر مقرر تھا۔ مقدمہ ابنِ خلدون اور بعض دیگر تاریخی کتابوں کی چھان بین اور کرمان اور اسکے مضافات میں اُس دوران کی آبادی کے پیش نظر وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابو علی ایک مقامی بااثر بلوچ سردار تھا جو مقامی قبائل سے تعلق رکھتا تھا۔ قزوینی اسے ایک ڈاکو لکھتا ہے (دہوار 1990 :274)۔ مگر موصوف یہ نہیں سوچتا کہ ایک ڈاکو ایران کے ایک اہم ترین صوبے کرمان کا گورنر کیسے ہو سکتا تھا؟ عرب مؤرخین اور وقائع نگاروں کے بیانات کے مطابق وہ تمام قبائل جو کرمان اور اس سے متصل علاقے میں آباد تھے، بلوچ تھے۔ ایرانی اور عرب مؤرخین اکثر بلوچوں سے شاکی اور بدگمان رہتے تھے اور انھیں، کوچ (پہاڑی باشندہ) بلوچ (صحرائی باشندہ) ڈاکو، صحرائی لٹیرے وغیرہ لکھتے تھے کیونکہ ان آزاد منش قبائل کی ان بیرونی حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت ہمیشہ جاری رہتی تھی۔ لہٰذا حملہ آور اقوام بھی ان کی تعریف وتوصیف کرنے اور ان کی اصل معاشرتی طرزِ زندگی آزادی پسندانہ خیالات اور مکمل جغرافیہ بیان کرنے کی بجائے انھیں درج بالا الٹے سیدھے خطابات دیتے ہیں۔

انھوں نے طاقت کے زور پر انھیں دبانے اور ان کی اصل تاریخی حیثیت و حقیقت کو مٹانے کی کوشش کی، مگر ناکام رہے لہٰذا قلم کے ذریعے اپنا سارا غصہ ان آزاد منش قبائل پر نکالا اور انہیں انتہائی نامناسب اور غیر حقیقت پسندانہ انداز میں زیرِ تحریر لائے۔

آل بویہ کے ساتھ بلوچوں کی کشمکش جاری وساری رہی۔ علی نامی گورنر کرمان دن بھر آل بویہ کی فوج ظفر موج کے ساتھ لڑائی جاری رکھتا اور رات کو قاصد بھیج کر صلح کرنے کی کوشش بھی کرتا رہا (دھوار 1990: 274)۔ آخر خراج عائد کر کے احمد نے کرمان کا محاصرہ ختم کر دیا۔ 934ء میں دونوں بھائی مکران پر بھی قابض ہو گئے مگر باقی ماندہ بلوچستان ان کی لوٹ مار اور دستبرد سے محفوظ رہا۔ البتہ ان کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ خلیفہ بغداد ان کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔

950ء تک وسط ایشاء، سیستان، بلوچستان (کرمان، مکران، توران تا حدودِ سندھ) اور سندھ وغیرہ پر مختلف ترک خاندانوں جو قدیم وسط ایشیائی وحشی اقوام میں سے تھے، نے حکومت کی۔ مگر اس دوران ان تمام علاقوں اور خصوصاً مکران اور صحرائے لوت میں آل بویہ کے قبضہ و اقتدار کے خلاف مسلح مزاحمت ہوتی رہی۔ آل بویہ کے ساتھ جنگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ابنِ مسکویہ لکھتا ہے کہ:

> "دسویں صدی کے وسط میں تین شیعہ برادران احمد، علی اور الحسن نے ایران اور عراق کے بہت بڑے حصے پر قبضہ کر لیا اور بغداد کے خلیفہ کو صرف نام کا خلیفۃ المسلمین رہنے دیا۔ سب سے بڑے بھائی علی نے مرداوج کے قتل کے بعد فارس اور اصفہان پر قبضہ کر لیا۔ الحسن جبل (الجبال) کے صوبہ پر قابض ہو گیا اور سب سے چھوٹا بھائی احمد کرمان اور خراسان کو اپنے زیرِ اقتدار لے آیا۔ 943ء میں احمد بغداد میں داخل ہوا۔ بعاویہ خاندان (آلِ بویہ) نے تقریباً ایک صدی تک حکومت کی۔ 1055ء میں خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر طغرل بیگ سلجوق بغداد میں داخل ہوا۔ اس نے بعاویہ خاندان کے

آخری حکمران الملک الرحیم کو قید کر لیا اور اس طرح بعاویہ خاندان کا خاتمہ ہوا۔ بعاویہ اپنے دورِ اقتدار میں جسے چاہتے اور جب چاہتے، بغداد میں خلیفہ بنا دیتے اور جسے چاہتے اور جب چاہتے معزول کر دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ بغداد کو ان تینوں بھائیوں احمد، علی اور الحسن کو بالترتیب مُعزالدولہ، عمادالدولہ اور رکن الدولہ کے خطابات سے نوازنا پڑا تھا" (جسٹس مری 140:1989)۔

آلِ بویہ کے ساتھ بلوچوں کی مسلح تصادم اور طویل جنگوں کا تذکرہ کتب تواریخ میں ان الفاظ میں مرقوم ہے:

"آلِ بعاویہ کے دورِ حکومت میں بلوچ ان سے متواتر لڑتے رہے۔ اس کی وجہ بھی بالکل معقول تھی۔ بغداد کے مورخین اور بعاویہ دور کے واقعہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ دسویں صدی میں بلوچ قبائل، کرمان جس کا دارالخلافہ جیرفت تھا مکران اور صوبہ سیستان کے جنوبی ساحلی علاقے پر حکمران تھے۔ یہ علاقے بلوچوں کے مختلف قبائل میں آپس میں بٹے ہوئے تھے۔ وہ قدرتی طور پر بعاویہ برادران کی برتری کے خلاف تھے اور وہ سب آلِ بعاویہ کی بڑھتی ہوئی طاقت کے خلاف آپس میں متحد و متفق ہو گئے تھے۔ بلوچوں کے اس منظم اتحاد اور قوت مدافعت سے آلِ بعاویہ کا مضطرب اور سراسیمہ ہو جانا قدرتی بات تھی۔ انہوں نے ردِ عمل کے طور پر بلوچ علاقوں پر متعدد حملے کیئے۔ ان حملوں کا کوئی فیصلہ کن نتیجہ نہ نکل سکا، کیونکہ کبھی ایک فریق کو فتح حاصل ہو جاتی تھی اور کبھی دوسرے کو۔ علاوہ ازیں آلِ بعاویہ کو شمال میں جانباز کردوں سے بھی مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا" (جسٹس مری 140:1989)۔

مری صاحب کے مطابق ابنِ مسکویہ ایک روشن خیال اور غیر جانب دار مورخ تھا لہٰذا وہ کھل کر اور پوری واقعیت کے ساتھ ان واقعات کو بیان کرتا ہے جو آلِ بویہ کے سلاطین اور

بلوچوں کے مابین دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی کے دوران پیش آئے تھے۔ آلِ بویہ دور کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"یہ 324 ہجری بمطابق 936ء کا واقعہ ہے۔ جب علی بن بعاویہ اور ابوالحسن احمد بن بعاویہ بھائیوں، جو کسی زمانے میں ماکان بن کاکی کے ملازمین اور افواج کے سالار تھے، کسی طرح فارس اور اصفہان کے حکمران بننے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی ابوالحسن احمد بن بعاویہ کو ایک جرار لشکر دے کر صوبہ کرمان کی فتح کیلئے روانہ کیا۔ جب وہ کرمان کے دارالخلافہ جیرفت پہنچا تو اس کی ملاقات قفص اور بلوچ قبیلوں کے امیر علی بن زنجی (زنگی) کے سفیر سے ہوئی۔ یہ علی بن زنجی، ابنِ کلاوی کے نام سے بھی مشہور تھا۔ اس کے آباؤاجداد نے ان تمام علاقوں کی حکمرانی حاصل کرلی تھی جن پر بعد میں وہ اپنے دستِ بازو سے قابض رہا۔ ابنِ کلاوی اور اسکی قوم کے افراد وہ لوگ تھے جو ہر آئے دن کے مرکزی سلطانوں کے ساتھ جبکہ وہ ان کے علاقوں پر حملہ آور ہوتے تھے، نہایت ملائمت سے پیش آتے تھے اور ایک مقررہ خراج بھی ادا کرتے تھے مگر اس نے یا اس کی قوم نے کبھی بھی کسی سلطان کے دربار میں جاکر حاضری نہیں دی۔ احمد بن بعاویہ نے بلوچوں کے دارالخلافہ جیرفت میں داخل ہونے کی اجازت اور روپیہ بطور رسمی نذرانہ طلب کیا۔ معاملہ گفت وشنید کے ذریعے طے ہوگیا اور احمد کو ایک لاکھ درہم کی خطیر رقم بطور نذرانہ وصول ہوئی ساتھ ہی ابنِ کلاوی نے دس لاکھ درہم سالانہ خراج دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے علاوہ احمد بن بعاویہ کا نام اپنے نام کے ساتھ خطبوں میں شامل کیا اور احمد کے ساتھ نہایت ملائمت اور راستبازی سے پیش آیا۔ لیکن احمد کو اس کے منشی جو بھینگا ہونے کی وجہ سے "کوریادبیر" کے نام سے مشہور تھا، نے مشورہ دیا کہ وہ بلوچ امیر کے ساتھ اپنے کئے ہوئے وعدے سے منحرف ہوکر بلوچوں پر شب خون مار کر وہ کارنامہ کر دکھائے جو آج تک کوئی نہ کرسکا ہے یعنی بلوچوں کو شکست دے۔ احمد نے یہ مشورہ قبول کرلیا اور ایران کے آئے دن کے سلطانوں کی طرح اپنے وعدے سے منحرف ہوکر بلوچوں پر شب خون مارا لیکن حملہ آوروں

کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ بلوچ اپنی حفاظت کیلئے پوری طرح چوکنّا ہیں۔ طرفین میں لرزہ خیز جنگ ہوئی اور حملہ آوروں میں سے صرف چند اشخاص اپنی جان بچا سکے۔ جیرفت کے لوگ (یعنی بلوچ قبائل) حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑے اور کشتوں کے پشتے لگادیئے۔ بچے کھچے فوجیوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ احمد خود بھی شدید طور پر زخمی ہوا اور اس کا دایاں ہاتھ کٹ گیا اور بائیں ہاتھ کی چار انگلیاں قلم ہوگئیں۔ سر اور جسم کے دوسرے حصوں پر کاری ضربات آئیں۔ بُری طرح مجروح ہو کر وہ لاشوں کے ساتھ ڈھیر ہوگیا علی الصبح ابنِ کلاوی نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ لاشوں میں احمد کی لاش تلاش کریں اتفاق سے وہ لاشوں کے ڈھیر میں زندہ پایا گیا۔ ابن کلاوی نے خود اس کی تیمارداری کی اس کے علاوہ اس نے دوسرے لوگوں کا بھی علاج معالجہ کرایا۔ صحتیاب ہوجانے کے بعد احمد اور اس کے بچے کھچے ساتھیوں کو قیمتی خلعتوں اور زادِ سفر کے تمام ضروری سامانِ آسائش سے سرفراز کیا اور انھیں علی بن بعاویہ کی جانب اصفہان روانہ کیا۔ بجائے اس کے کہ احمد بن بعاویہ، ابنِ کلاوی کا شکر گزار ہوتا، کہ اس کی جان اس نے بچائی تھی اور اس کو خلعتوں سے سرفراز کر کے عزت کے ساتھ واپس روانہ کردیا اور اپنی وعدہ خلافی پر شرمسار اور نادم ہونے کے بجائے احمد بن بعاویہ نے 937ء میں ابنِ کلاوی کے خلاف اپنی شکست فاش کا بدلہ لینے کیلئے دوسرا حملہ کیا۔ مگر اس مرتبہ پھر اس کی فوجوں کو بلوچوں نے شکست دے کر نیست و نابود کردیا۔ احمد کا جوشِ انتقام اور تیز ہوگیا اور اس نے تیسری بار ابنِ کلاوی پر حملہ کردیا اور اس مرتبہ بلوچوں کو شکست دی" (جسٹس مری۔ ازمنہ بلوچ، مزید ملاحظہ کریں: مری 1989 :141-143)۔

ابنِ خلدون کا بیان بھی اسی نوعیت کا ہے اور وہ بلوچوں کو پہاڑی جرگہ، بادیہ نشین، حروسکیہ اور جاسکیہ تحریر کرتا ہے اور یہ بھی لکھتا ہے کہ آلِ بویہ کے حکمران عضد الدولہ نے اس گروہ کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاتمہ کردیا۔ حالانکہ تاریخ اس کے برعکس حقیقت بیان کرتی ہے۔ یعنی

اس صحرا میں کہ جسے صحرا ایران یا صحرا الوت کہا جاتا ہے آج بھی بلوچ قبائل آباد ہیں جبکہ آلِ بویہ اور اس کے کرایے کے سپاہیوں کا نام و نشان تک مٹ چکا ہے۔

یہی واقعہ مورخ جی۔ لی۔ سٹر ینج نے اپنی جمع کردہ تالیف ''جغرافیہ خلافت مشرقی'' میں رقم کی ہے۔ اور جسٹس میر خدا بخش بجارانی بھی اس واقعے کا ذکر اپنی مشہور انگریزی کتاب ''سرچ لائیٹس آن بلوچ اینڈ بلوچستان'' میں کرتا ہے۔ علاوہ ازیں احمد خان قیصرانی نے بھی اس کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔

جسٹس مری کے مطابق ابنِ کلاوی نے شکست کھانے کے بعد پسپا ہو کر اپنی فوجوں کو جمع کیا اور واپس جاتے ہوئے احمد بن بعاویہ کے لشکر پر صحرا میں شب خون مارا اور ان کا خوب قتلِ عام کر کے ان کا تمام تر مال و اسباب لوٹ کر واپس اپنے قلعوں کی طرف چلے گئے۔

جسٹس مری ابنِ مسکویہ کے حوالے سے بلوچوں اور آلِ بویہ کی جنگوں کی تفصیلات دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''357 ہجری بمطابق 968 عیسوی خلیفہ مطی کے عہد میں جبکہ بختیار کی بغاوت کا زمانہ تھا اور اعادالدولہ (عضد الدولہ) بعاویہ نے ابو علی بن الیاس کو شکست دے کر کرمان کے شہر بروسیر پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس زمانے میں کوچ و بلوچ ایران کے وسطی ریگستان پر قابض تھے۔ ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ چاروں اطراف سے حملے کرتے ہیں اور قافلوں کو لوٹتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی بلوچوں کو علی بن الیاس جو عرب نژاد حاکم تھا کی حمایت حاصل تھی۔ 359 ہجری بمطابق 970 عیسوی میں اعادالدولہ نے قرقیر بن جُستر کی سرکردگی میں سلیمان بن الیاس کے خلاف فوج کشی کی۔ سلیمان اپنی مدد کیلئے حاکمِ خراسان کی فوجوں کو لے آیا جو کرمان کی فتح کیلئے آیا تھا۔ کوچ و بلوچ قبائل اس دفعہ بھی سلیمان بن الیاس کی طرف سے لڑے۔ جیرفت اور بم کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں سلیمان مارا گیا اور اسکی فوجیں تاراج ہو گئیں۔ سلیمان بن الیاس کی شکست کے بعد بعاویہ

فوجوں کا بلوچ فوجوں کے ساتھ جو ابو سعید البلوصی (البلوچی) کے زیرِ کمان تھیں مقابلہ ہوا۔ قبیلہ منوجان اور دیگر کوچ و بلوچ (ابن مسکویہ نے قفص و بلوص تحریر کیا ہے یعنی عربی میں لفظ "چ" نہ ہونے کی وجہ سے لفظ "ص" استعمال ہوا ہے) جن کے ساتھ ابو سعید (بعض روایات کے مطابق ابو سعید بلوچوں کے بلیدی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا) اپنے اہل و عیال اور سرداروں کے ساتھ شامل تھا، انہوں نے جمع ہو کر عہد کیا کہ وہ اپنے دشمن کے خلاف متحد و مستحکم ہو کر تا دمِ آخر جنگ کریں گے۔ یہ دیکھ کر اعادالدولہ نے قرقیر بن جُستر کی کمک کیلئے مزید فوج عابد بن علی کے زیرِ کمان بھیجی۔ دونوں فوجوں نے جیرفت پر مختلف اطراف سے حملہ کر دیا، یہ معرکہ بروز بدھ دس ماہ صفر 360 ہجری بمطابق 13 دسمبر 970 عیسوی کو جیرفت کے نواح میں پیش آیا جس میں بلوچوں کو بُری طرح شکست ہوئی۔ اس جنگ میں ابو سعید کے دو بیٹوں کے علاوہ 5000 بلوچ مارے گئے اور اس کے علاوہ بہت سے دیگر امیر اور معتبرین جن میں ابو فوارس منوجانی اور اس کا بھتیجا شامل تھے، گرفتار ہوئے۔ عابد بن علی نے پھر بلوچوں کے اندرونی علاقوں کا رُخ کیا تا کہ ان کے باقی ماندہ مال و متاع کو پائمال کیا جائے۔ اس نے بلوچوں کو پے در پے شکستیں دیں اور قتلِ عام کا بازار گرم کیا۔ اس نے ہُرمز (رام ہرمز) پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد اس نے تیز سے مکران تک کا تمام علاقہ اپنے قبضے میں کر لیا۔ عابد نے اس کے بعد قرب و جوار کے دوسرے سرکش قبائل کی طرف توجہ دی۔ یہ قبائل خرمی اور خاشکی (بلوچ قبائل کے علاقائی نام) وغیرہ تھے۔ یہ قبائل نہ صرف خشکی بلکہ سمندری راستوں پر بھی مستقل لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ عابد نے ان کو شکست فاش دی۔ بہت سے جنگ میں مارے گئے اور ان کے امیر ابو علی ابنِ خلیل کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا" (مری۔ از منہ بلوچ)۔

ابنِ مسکویہ مزید تفصیلات دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"باوجود پے در پے شکست و ریخت کے بلوچ جو بے حد بہادر، خونخوار اور ملحد ہیں زیادہ دیر تک خاموش نہ رہ سکے اور جلد ہی اپنی عادت کے مطابق روایتی لوٹ مار اور بے گناہوں کا

خون بہانے پر آمادہ نظر آنے لگے۔ عادالدولہ نے طے کر لیا کہ وہ بلوچوں کو کسی قیمت پر نہ چھوڑے گا۔ لہٰذا اس نے ان کے علاقہ کرمان پر خود حملے کی ٹھانی اور 26 اگست 971 عیسوی کو بمعہ فوجوں کے روانہ ہوا۔ سیر جان پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ بلوچ مختلف اضلاع میں پھیل گئے ہیں اور علی بن باریزی (باریزی یا بریزی یا البرزی ایران میں آباد کرد بلوچوں کی ایک مشہور شاخ ہے کہ جو حسنویہ کرد کی اولاد میں سے تھا۔ البرز کے حقیقی باشندے ہونے کی وجہ سے برزی اور بریزی کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوا۔ ایرانی بلوچستان میں ان کے نام سے ایک پہاڑی سلسلہ جبل البارز بھی موسوم ہے۔ مصنف) کو اپنا امیر مقرر کر کے ہر طرف فتنہ وفساد برپا کر رہے ہیں اور سیستان، خراسان اور کرمان کو جانے والے تمام راستوں پر لوگوں کو ان کی وجہ سے سخت دشواریاں اٹھانی پڑ رہی ہیں اور یہ تمام راستے مسدود ہو گئے ہیں اس نے عابد کو ایک بڑی فوج کے ساتھ بلوچوں پر حملہ کرنے کی غرض سے بھیجا۔ یہ عظیم فوج، دیلمی، گیلانی، ترک، عرب، کرد، جاٹ اور سیف الدولہ کے پُرانے سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ جوں ہی یہ فوجیں آگے بڑھیں بلوچ قاعدے کے مطابق کوہِ باریزی یا بریزی کے محفوظ ٹھکانوں اور کمین گاہوں میں پہنچ گئے جہاں وہ دشمن کی دسترس سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ دشمن نے باریزی پہاڑیوں پر سخت حملہ کیا۔ مجبور ہو کر محمد بن باریزی نے ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ اور اس کا داماد ابو الدریم گرفتار کر لئے گئے۔ مخالف فوج نے اندرونِ علاقہ پیش قدمی جاری رکھی۔ جب بلوچوں نے دیکھا کہ وہ چاروں اطراف سے دشمن میں گھر گئے ہیں اور راہ فرار باقی نہیں رہی تو انہوں نے جان توڑ کر مرتے دم تک مقابلہ کرنے کا عہد کیا۔ 11 ربیع الاوّل 361ھ ہجری بمطابق 8 جنوری 971ء عیسوی بروز سوموار طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک بلوچوں نے نہایت بے جگری اور جوانمردی سے دشمن کی فوجوں کا مقابلہ کیا اور شام تک جب جنگ ختم ہوئی تو تمام قابلِ جنگ بلوچ افراد محدودے چند میدان جنگ میں کام آئے اور ان کے اہلِ وعیال اور مال ومتاع دشمن کے قبضہ میں آگئے۔ بلوچوں کا امیر ابنِ ابی الرجل البلوصی

> گرفتار ہوگئے اور اپنے ساتھیوں سمیت تہہ تیغ ہوا۔ چند افراد جو زندہ بچ رہے تھے گرفتار کرلئے گئے۔ انھیں پناہ دینے کا وعدہ کیا گیا جنھیں عادالدولہ نے باریزی کی پہاڑیوں سے نکال دیا" (مری۔ ازمنہ بلوچ)۔
>
> عابد نے اب دوبارہ خاشکی اور اس قسم کے دوسرے لوٹ مار کرنے والے قبیلوں کی طرف توجہ کی۔ یہ قبائل قفص کی پہاڑیوں (موجودہ بشگرد) کے اسِ پار تیز، مکران اور اومان کے ساحلی علاقوں میں آباد تھے۔ عابد نے ترکی اور دیلمی وغیرہ سپاہیوں پر مشتمل فوج کے مضبوط اور چُنے ہوئے دستے اپنے بھائی کے زیرِ کمان سمندری اور خشکی کے راستوں سے بمعہ فوجی رسد سیراف سے روانہ کئے۔ یہ فوجیں کرمان کے ساحل ہرمز پر لنگر انداز ہوئیں اور کچھ خشکی کے راستے سے پہنچیں۔ راستے میں انہوں نے بہت سے سرکش قبائل کو زیر کیا اور عین اس وقت بلوچوں کے سر پر پہنچیں جب وہ اپنی دفاع سے بالکل بے خبر تھے اور انھیں یقین تھا کہ ان کے محفوظ پہاڑی علاقوں میں دشمن نہ پہنچ سکے گا، ان پر حملہ آور ہو کر ان کی بیخ کنی کی گئی۔ اکثر کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا، بہتوں کو گرفتار کیا گیا اور ان کا سارا مال و متاع لوٹ لیا گیا" (مری۔ ازمنہ بلوچ)۔

ان واقعات کے بعد 366 سنہ ہجری میں عادالدولہ نے ابو الوفا طاہر بن محمد بن ابراہیم کو خلیفہ اللطی للہ کے وزیر بختیار اور اس کے لڑکے کے خلاف بھاری فوج دے کر بھیجا۔ اس فوج کے ساتھ بہت سے نامی گرامی سپہ سالار بھیجے گئے جن میں اکری اہواز بھی قفصیوں کے ساتھ شامل تھا۔ 936 سنہ-37 عیسوی میں جبکہ بدقسمت احمد بن بعاویہ جو بعد میں معزالدولہ کے لقب سے مشہور ہوا، بلوچوں سے لڑتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ اور بائیں ہاتھ کی انگلیاں کھو کر تاریخ میں "الاقطع" کے نام سے مشہور ہوا، سے بہت قبل بلوچ مرکزی خلافتِ بغداد کے خلاف مصروفِ جنگ تھے۔ یہ واقعہ خلیفہ مقتدی کے زمانے کا ہے جبکہ مرکزی وزارت کے عہدے پر خاسبی معمور تھا۔ (313 سنہ ہجری بمطابق 924 سنہ-25 عیسوی) اُس زمانے میں ابراہیم مسامی المعروف

ابراہیم المسامی صوبہ کرمان اور فارس کے مالیہ کی وصولی کا ذمہ دار تھا۔ اس نے قفصیوں یعنی بلوچوں کے علاقے کو فتح کر لیا اور 5000 قیدی بنا کر فارس لے آیا" (مری۔ ازمنہ بلوچ، مزید مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: مری 1989:138-49)۔

کرمان کی پہلی اور دوسری لڑائی کا تذکرہ جسٹس مری کی کتاب ازمنہ بلوچ: تاریخ و روایات کے حوالے سے درج بالا سطور میں ہو چکا ہے۔ اُن کی تصنیف سرچ لائیٹس آن بلوچ اینڈ بلوچستان (انگریزی) میں بھی بالکل وہی تفصیلات ملتی ہیں۔ ان ہی کے حوالے سے آلِ بویہ دور کے چند واقعات کا ذیل میں تذکرہ کیا جارہا ہے کہ جن میں آلِ بویہ نے تمام جنگی اور انسانی قوانین کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انتہائی مذموم، مکارانہ اور وحشیانہ انداز میں بلوچ آبادیوں کو تباہ وبرباد کیا اور بڑی تعداد میں انسانوں کا قتلِ عام کیا۔

جسٹس مری ابنِ مسکویہ کے حوالے سے لکھتا ہے کہ بلوچوں کو آلِ بویہ نے کئی بار دھوکہ دیا اور ایک بار تو ظلم، جبر اور تعدی کی حد کر دی کہ جب پالتو کتوں کے ذریعے بلوچوں کی آبادیوں کو آتش گیر مادوں کے ذریعے جلا کر خاکستر کر دیا گیا اور ایک بار زہریلے سیبوں یا مٹھائیوں کے کاروان کو پہلے سے طے کئے گئے منصوبے کے مطابق لٹوا کر انھیں نیست و نابود کرنے کی کوشش کی۔

اس واقعہ کے بارے میں جسٹس مری عرب تحریروں کے حوالوں رقمطراز ہے کہ:

"اس کی ایک چال بہت مشہور ہے۔ اس چال سے اس نے قفص اور بلوچوں کے ایک حصہ پر قابو پا لیا تھا۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جبکہ وہ کرمان کو ان سے صاف کرنے کیلئے اس کے اندرونی علاقے تک جا پہنچا تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ ان میں سے کچھ لوگ ایک پہاڑ جبل القفص کے پیچھے چلے گئے ہیں، ان تک پہنچنے کا صرف ایک راستہ ہے جو ایک ایسے درے میں سے گذرتا ہے جس پر ایک چھوٹی سی جماعت ایک بڑی فوج کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ طاقت کے

بل بوتے پر وہ ان پر فتح حاصل نہ کر سکتا تھا۔ اس نے ایک چال سوچی۔ اس نے ان کے پاس ایک قاصد بھیجا اور پیغام بھجوایا کہ وہ ان سے خراج وصول کیئے بغیر ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ انہوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ ہمارے پاس تمہیں دینے کیلیئے رقم نہیں ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ تم شکاری ہو اور میں ایک کتّا فی خیمہ کے حساب سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے اس مطالبے کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ لہٰذا اس نے ایک قاصد کو ان کے خیمے گننے اور اتنے ہی کتے وصول کرنے کیلیئے بھیجا۔ کتے کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے مالک کا وفادار ہوتا ہے، اس کے آگے پیچھے دُم ہلاتا پھرتا ہے، اسے چمٹتا ہے۔ اپنے مالک کے گھر کا اتنا رسیہ ہوتا ہے کہ وہ میلوں دور سے بھی وہاں پہنچ جاتا ہے۔ کتّے حاصل کرنے کے بعد اس نے حکم دیا کہ کتوں کے گلے میں سفید آتش گیر مادہ باندھ دیا جائے اور انہیں درے کے پاس لاکر اس آتش گیر مادہ کو آگ لگادی جائے۔ کتوں کو ایک ساتھ چھوڑا جائے اور فوج ان کے پیچھے چلے۔ اس تجویز پر عمل کیا گیا۔ بلوچ یہ سمجھے کہ دشمن کی فوج ان پر حملہ کرنے کیلیئے آرہی ہے، وہ دشمن کا مقابلہ کرنے کیلیئے درہ کی طرف بڑھے۔ کتوں نے جونہی انھیں دیکھا وہ آگ سے بچنے کی خاطر اپنے مالکوں سے آکر چمٹ گئے۔ اور اس طرح اُن کے کپڑوں کو بھی آگ لگ گئی یہ لوگ آگ سے بچنے کیلیئے وہاں سے بھاگے۔ کتے اور آگ اُن کا پیچھا کر رہی تھیں۔ کچھ آدمی جل بھن گئے۔ کتے خیموں میں گھس گئے اور وہاں بھی آگ لگ گئی دشمن کی فوج ان لوگوں کے پیچھے تھی اس طرح تمام لوگ وہیں ختم کر دیئے گئے" (مری 1989:147-48)۔

اسی طرح کے ایک اور پُر فریب چال کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

"عادالدولہ نے ایک مرتبہ زہر آلود مٹھائی (یا پھل) ایک قافلے کے ساتھ مکہ بھیجی۔ حالانکہ اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ راستے میں بدُو قافلے کو لوٹ لیں گے۔ انہوں نے توقع کے مطابق قافلے کو لوٹا، مٹھائی یا پھل کھائے اور نتیجتاً اپنی موت آپ مر گئے" (مری 1989 :148)۔

ان حوالوں کے لیے ابتدائی یعنی پرائمری مواد سے استفادہ نہیں کیا جا سکا بلکہ ان کو جسٹس مری کی کتاب سے نقل کیا گیا ہے ان میں کہاں تک صداقت ہے یہ صرف اصل مواد کو دیکھ کر ہی کہا جا سکتا ہے۔ البتہ بعض دیگر بیانات کی تصدیق دیگر عرب مورخین کی تحریروں سے بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ عضد الدولہ آل بویہ کے دور میں ہونے والے واقعات کہ جن کی تفصیلات ابنِ مسکویہ کے حوالے سے جسٹس مری کی کتاب سے گذشتہ اوراق میں دی گئی ہیں، ان ہی واقعات کی تفصیلات ابنِ خلدون یوں بیان کرتا ہے:

"جس وقت عضد الدولہ نے کرمان پر قبضہ کر لیا تو قفص (کوچ) اور بلوچ قبائل نے جمع ہو کر عضد الدولہ کی مخالفت اور بغاوت پر کمریں باندھ لیں ان میں ابو سعید اور ان کے لڑکے تھے۔ عضد الدولہ نے کور تکین بن خشتان حاکم کرمان کی مدد پر عابد بن علی کو مامور کیا عابد بن علی فوجیں لے کر جیرفت کی طرف بڑھا اور ان باغیوں سے معرکہ آراء ہوا اور انھیں شکست دے کر نہایت بے رحمی سے پامال کیا۔ نامی نامی سرداروں کو گرفتار کر کے مار ڈالا انہی مقتولوں میں ابو سعید کا لڑکا بھی تھا۔ اس کے بعد عابد بن علی نے ان کا تعاقب کیا اور چند بار ان پر حملہ آور ہوا اور خوب خوب پامال کیا لوٹ مار کرتا ہوا ہرمز تک پہنچا اور اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ تبریز اور مکران پر بھی قابض ہو گیا ان میں سے ایک ہزار کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا مجبور ہو کر سب نے اطاعت قبول کر لی اور صدور اسلام قائم رکھنے پر راضی ہو گئے۔ اس کے بعد عابد بن علی نے ایک دوسرے گروہ کی سرکوبی کی غرض سے لشکر آرائی کی جو حروسکیہ اور جاسکیہ (بلوچ قبائل کے شہریتی یا علاقائی نام) کے نام سے مشہور تھے۔ یہ خشکی اور دریا میں راہزنی کرتے تھے دن دہاڑے مسافروں کے قافلے لوٹ لیتے تھے۔ سلیمان بن ابو علی بن الیاس ان کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ جب عابد بن علی نے ان پر حملہ کیا اور بزور تیغ پامال کرنے لگا تو انہوں نے بھی علم حکومت کی اطاعت قبول کر لی۔ جس سے ایک مدت تک ان ممالک میں امن و امان قائم رہا کچھ عرصہ بعد بلوائی پھر

جمع ہوگئے اور رہزنی شروع کردی۔ ذیقعدہ 360ھ میں عضد الدولہ نے ان لوگوں کی گوشمالی کی غرض سے کرمان کی طرف کوچ کیا عابد بن علی کو ان پر حملہ کرنے کی غرض سے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ عابد بن علی نے نہایت تیزی سے جنگ کا آغاز کیا۔ بلوائی ایک تنگ و تاریک درہ میں اس خیال سے کہ یہ انھیں حملہ آوروں کے حملے سے بچالے گا داخل ہوگئے لیکن عضد الدولہ کی فوج نے انھیں وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ ماہ ربیع الاول 361ھ میں پوری طاقت سے حملہ کیا باغی ایک شب و روز تک استقلال سے مقابلہ کرتے رہے، بالآخر شام ہوتے ہوتے شکست کھا کر بھاگ نکلے بڑے بڑے سورما مارے گئے لڑکے عورتیں لونڈی اور غلام بنالئے گئے صرف چند افراد کی جانیں بچیں امن کے خواستگار ہوئے امن دیا گیا اور ان کو پہاڑوں سے جلاوطن کرکے دوسرے مقام پر بھیج دیا گیا۔ عضد الدولہ نے ان مقامات میں کاشتکاروں کو آباد کیا جنھوں نے اپنے زور بازو سے زمین کو آباد کیا۔ عابد بن علی برابر ان بلوائیوں پر حملے کرتا چلا آیا تھا یہاں تک کہ ان کی جمیعت ختم ہوگئی اور ان کا نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹ گیا اور فتنہ و فساد کا خاتمہ ہوگیا" (ابنِ خلدون (638:1984)۔

ابن خلدون بلوچ قبائل کی جدوجہد اور جہاں گیری کی تاریخ زیادہ تفصیل کے ساتھ دیتا ہے صرف درج بالا بیان ہی نہیں بلکہ ان کی کتاب کے کئی ابواب عرب ادوار میں بلوچ قوم اور ان کے مختلف قبائل کی تاریخ ساز جدوجہد رزم آرائیوں اور قومی و وطنی دفاع کی تاریخ پر مشتمل ہیں۔ ان کی کتاب کے وہ ابواب یا حصے جو کرمان، سیستان، خراسان، مکران، اندرونِ بلوچستان یعنی خضدار، قلات وغیرہ کے متعلق ہیں، بلوچ قبائل کی تاریخ پر مشتمل ہیں۔ ابن خلدون بھی دیگر عرب مورخین کی طرح انھیں قُفص و بلوس تحریر کرتا ہے اور بعض اوقات انھیں بادیہ نشین، جاسکی، حروسکی، خاشکی اور دیگر علاقائی ناموں سے بھی تحریر کرتا ہے۔ موصوف نے انھیں جن علاقوں میں پایا اسی علاقے کے نام سے انھیں منسوب کیا۔ یہی طریقہ کار دیگر عرب، فارسی اور

ان سے بھی قبل یونانی مورخین نے اختیار کیا تھا۔ البتہ عرب اور ایرانی ان قبائل کو علاقائی ناموں کے علاوہ اجتماعی طور پر بلوچ یا پھر کوچ و بلوچ تحریر کرتے ہیں۔ ابن خلدون نہ صرف ابن مسکویہ کے بیانات کی تصدیق کرتا ہے بلکہ موصوف ان واقعات کی تفصیلات دیتے ہوئے مزید لکھتا ہے کہ:

”عمادالدولہ بن بویہ نے بلادِ فارس پر قبضہ کرنے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی معزالدولہ کو کرمان کی طرف روانہ کیا چنانچہ معزالدولہ ایک جرار فوج لے کر 324ھ میں کرمان کی طرف بڑھا اور سیر جان پر قابض ہو گیا۔ ابراہیم بن سیمجور ابن سامان کا سپہ سالار محمد بن الیاس کا ایک قلعہ میں محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ معزالدولہ کے آنے کی خبر پا کر محاصرہ اٹھا کر کرمان سے خراسان کی جانب روانہ ہو گیا۔ محمد بن الیاس نے قلعہ سے نکل کر کرمان و سجستان کے درے کے راستے سے قم کا راستہ لیا، اس اثنا میں معزالدولہ جیرفت کے قریب گیا۔ جیرفت کرمان کا ایک قصبہ تھا، علی بن الزنجی (علی زنگی) معروف بہ علی کلونہ (الکلوہی) امیر قُفص اور بلوس کا ایلچی معزالدولہ کی خدمت میں حاضر ہوا، علی بن کلونہ اور اس کے اسلاف اس اطراف کے حکمران تھے، ایک مدت سے ان کے قبضے میں چلا آتا تھا۔ امراء اور خلفاء بغداد کی اطاعت کا اظہار کرتے تھے اور سالانہ خراج دیا کرتے تھے، غرض ایلچی نے حاضر ہو کر علی بن کلونہ کا پیام عرض کیا اور اس کا مرُسلہ روپیہ پیش کیا، معزالدولہ نے جواب دیا کہ میں اسے اسی وقت قبول کروں گا جب جیرفت میں داخل ہوں گا، جب جیرفت میں داخل ہوا تو علی بن کلونہ سے مصالحت کر لی اور اپنے نام کا خطبہ پڑھنے کی ضمانت لی۔ علی بن کلونہ (الکلاوی) اس وقت جیرفت سے دس کوس کے فاصلے پر ایک دشوار گذار مقام پر ٹھہرا ہوا تھا۔ معزالدولہ کے ہمراہیوں نے رائے دی کہ علی بن کلونہ کو کسی حیلہ سے طلب کر کے گرفتار کر لینا چاہیے، معزالدولہ اس پر آمادہ ہو گیا۔ علی بن کلونہ کے جاسوس نے اس کی خبر کر دی۔ علی بن کلونہ نے چند لوگوں کو ایک کمین گاہ میں بٹھا دیا۔ جس وقت معزالدولہ اس راستہ سے ہو کر نکلا۔ ان لوگوں نے کمین گاہ سے

نکل کر حملہ کر دیا، چند ہمراہی مارے گئے اور کچھ گرفتار کر لیے گئے۔ معزالدولہ کے کاری زخم لگے، بایاں ہاتھ کہنی سے کٹ گیا، دائیں ہاتھ کی انگلیاں بھی کٹ گئیں۔ مقتولین میں دب کر رہ گیا۔ یہ خبر جیرفت پہنچی۔ سارے ہمراہی اور فوجی بھاگ گئے۔ علی بن کلونہ مقتولین کو دیکھنے کیلئے آیا، معزالدولہ کو مقتولین میں سے اُٹھا لیا گیا۔ طبیبوں کو اس کے علاج پر مقرر کیا۔ اس کے بھائی عمادالدولہ کو یہ واقعات لکھ بھیجے، معذرت کی، اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار و اقرار کیا۔ عمادالدولہ نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔ باہم مصالحت ہو گئی" (ابنِ خلدون 1984: 639)۔

یہ وہی واقعہ ہے کہ جس کی تفصیلات گذشتہ اوراق میں ابن مسکویہ کی تحریر کی روشنی میں بیان ہو چکی ہیں۔ ابن خلدون نے اس کی تفصیلات دے کر گویا اس کی سچائی کی تصدیق کر دی۔ کرمان پر آلِ بویہ کے دوسرے حملے کے بارے میں موصوف لکھتا ہے کہ:

"محمد بن الیاس نے محاصرہ سے نکل کر کرمان و سجستان کے درہ کی راہ سے قم کا راستہ لیا تھا، قم پہنچ کر کچھ روز قیام کیا پھر وہاں سے سجستان واپس آیا اور سجستان سے شہر جنابہ کی طرف روانہ ہوا۔ معزالدولہ اس کی طرف متوجہ ہوا اور فتحیاب ہو کر علی بن کلونہ پر چڑھائی کر دی، دونوں میں خوب جنگ ہوئی۔ آخر کار علی بن کلونہ کو شکست ہوئی۔ اس کے ہمراہی سختی سے پامال کیے گئے۔ معزالدولہ نے اپنے بھائی عمادالدولہ کو محمد بن الیاس اور علی بن کلونہ کی لڑائیوں اور شکست کے واقعات لکھ بھیجے" (ابنِ خلدون 1984: 639)۔

ابن خلدون آلِ بویہ کے باب میں ایک شخص ابو عبداللہ بریدی کا تذکرہ اور الاہواز سمیت کئی صوبوں پر اس کی حاکمیت کی تفصیلات دیتا ہے اور عباسی دورِ خلافت میں ان کے اہم سیاسی کردار کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کرتا ہے ممکن ہے کہ یہ شخص بلوچوں کے جری قبیلے بلیدی سے تعلق رکھتا ہو اور ابن خلدون نے اسے البریدی تحریر کیا ہو۔ یہ نام اور شخصیت یقیناً تحقیق طلب ہے بہر حال ابن خلدون اپنی کتاب کے جلد چہارم اور حصہ ششم میں صفحات 639 سے

648 تک ابن بریدی کا تذکرہ کرتا ہے۔ اسی طرح انہی صفحات پر ایک اور نام ابو قاسم بریدی کا بھی آتا ہے اور ایک کرد سردار امیر شوک کا بھی تذکرہ کرتا ہے کہ جسے معزالدولہ نے ترکوں کی گوشمالی پر مامور کیا تھا(ابنِ خلدون 1984:639-648)۔

بلاشبہ آل بویہ کے ساتھ بلوچوں کی مخاصمت اور جنگوں کا سلسلہ کافی طویل رہا۔ جب تک آل بویہ خاندان برسرِ اقتدار رہا، بلوچوں اور ان کے مابین شدید تصادم کا سلسلہ بھی اسی طرح جاری و ساری رہا۔ ابنِ خلدون اور دیگر عرب مورخین کا یہ کہنا کہ بلوچوں کا فتنہ آل بویہ کے حکمران عضدالدولہ نے ختم کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ :

اول تو فتنہ بلوچ نہیں بلکہ وہ حملہ آور تھے جو بلوچ خطے پر مسلح حملہ کر چکے تھے اور بلوچ قبائل اپنے علاقے کی دفاع میں سربکف ہو گئے تھے۔ جنگ کی طرح آل بویہ نے ڈالی تھی بلوچوں نے نہیں۔ ابنِ خلدون خود لکھتا ہے کہ بلوچوں نے جنگ سے بچنے کی بھرپور کوشش کی اور مال و زر بھی حملہ آوروں کو پیش کیا مگر حملہ آور جنگ پر تُلے ہوئے تھے لہٰذا فتنہ پرور بھی حملہ آور تھے نہ کہ پُرامن بلوچ قبائل جو اپنے ہی علاقوں میں امن کے ساتھ رہ رہے تھے۔

دوسری بات جو ابنِ خلدون نے لکھا ہے وہ یہ کہ ان شرپسندوں کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ تو اس دعویٰ میں بھی کوئی صداقت نہیں ہے کیونکہ اُس صحرا میں آج بھی بلوچ قبائل ہی آباد ہیں جبکہ آلِ بویہ کے کرایے کے سپاہی اور ان کے خاندانوں کا اُس صحرا میں نام و نشان نہیں ملتا۔

عرب اور فارسی مورخین کی ذہنی کمزوری تھی کہ اپنی قوم کے مذہب کے نام پر کیے جانے والے مظالم میں بھی اُسے رحم و ہمدردی نظر آتی تھی جبکہ مقہور، مظلوم اور عربوں اور ترکوں کی جارحیت کا شکار اقوام عرب اور فارسی مورخین کی نظر میں گنہگار ہوتے تھے حالانکہ

عرب اُن کے ممالک اور علاقوں پر بلا کسی وجہ کے حملہ آور ہوئے تھے اور اُن کا بُری طرح قتلِ عام کر رہے تھے، اُن کے املاک لوٹے جا رہے تھے اور اُن کی زمینوں پر قبضہ کر کے انہیں اُن سے بے دخل کیا جا رہا تھا۔ بلوچ قبائل علاقے کے دیگر اقوام و قبائل کی طرح عربوں اور ترکوں کے سامنے سینہ سپر ہو گئے تھے اور اسلام قبول کرنے کے باوجود ان حملہ آوروں کی زیادتیوں سے بچنے کے لیے قابلِ توصیف جدوجہد کر رہے تھے۔ بالآخر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہ عرب اور ترک حملہ آور یہاں سے فرار ہو گئے اور خطے کے باشندے دوبارہ اپنے اپنے اجداد و املاک کے مالک بن گئے۔ آل بویہ کے بعد خطے پر ایک نئ اور زیادہ طاقتور ترک خاندان نے قبضہ کیا جو تاریخ میں آل غزنہ کے نام سے معروف ہوا۔

آل غزنہ:

محمود غزنوی کے نام سے صرف تاریخ کے طلباء ہی نہیں تقریباً ہر باعلم شخص واقف ہے کہ جس نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے۔ انہی حملوں نے انھیں بین الاقوامی شہرت عطا کی۔ محمود اسی غزنوی خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس نے ایشیاء میں ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی۔ اس کا لقب یعنی غزنوی، افغانستان کے علاقے غزنہ کو صدر مقام بنانے کی وجہ سے پڑا۔ ورنہ بنیادی طور پر وہ ترک تھا جن کا عباسی دور میں بڑا شہرہ تھا۔ اصل میں یہ ترک غلام تھے کہ جنہیں مملوک کہتے تھے۔ صفاری خاندان کے اقتدار کے خاتمے کے بعد سامانی خاندان بر سر اقتدار آیا تو اس نے اپنا صدر مقام غزنہ کو بنایا۔ غزنہ کی بنیاد امیر یعقوب صفاری نے رکھی تھی جو بذات خود مملوک (کسی کی ملکیت ہونا۔ یعنی غلام) تھا اور مملوک ترک غزنہ میں قیام کر کے سلطنت کے امور کی نگرانی کرتے تھے۔ یہ مملوک جنگی قیدی تھے جن کو کھلی منڈیوں میں سے خریدا گیا تھا۔ بلحاظ نسل وہ ترک تھے۔ سامانی شہزادوں نے ان کی اعلیٰ فوجی اور انتظامی قابلیت کے پیشِ نظر ان کو آزاد کر کے فوجی اور

انتظامی خدمات سر انجام دینے کیلیئے صوبوں میں تعینات کیا ہوا تھا۔ لہٰذا 950-51ء کے لگ بھگ صوبہ غزنہ اور اس سے متصل علاقوں پر یہی ترک مملوک، سامانی شہزادوں کی طرف سے تعینات تھے۔ یہاں الپتگین، پلتگین اور پیرائے یکے بعد دیگر گورنر مقرر ہوئے۔ موخر الذکر ایک کمزور شخص تھا اور جس بہادری اور قوت فیصلہ کی کمی تھی۔ اس سے کئی غلطیاں سرزد ہوئیں جن کی وجہ سے غزنی اور اس سے متعلقہ علاقے سخت متاثر ہوئے۔ اس زمانے میں سبکتگین نامی ایک غلام نے (جو الپتگین کا غلام اور اس کا داماد تھا) بڑی مقبولیت اور شہرت حاصل کی وہ جلد ہی سامانی شہزادوں کی حمایت حاصل کر کے غزنی کی ولایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ اور اس نے آہستہ آہستہ خود مختاری بھی حاصل کرلی۔ سامانی شہزادے اپنی کمزوری کی وجہ سے لاچار تھے لہٰذا کچھ نہ کرسکے۔

سبکتگین ایک اعلیٰ پائے کے فوجی اور انتظامی صلاحیتوں کا مالک شخص تھا اس کی فوج ترک تاجک اور افغانوں پر مشتمل تھی۔ اس نے چن چن کر سپاہی اور فوجی منصب دار تعینات کئے تھے۔ اس نے پشاور، کابل اور اس کے مضافات پر قابض راجپوت حکمران راجہ جے پال (راجہ راجیہ پال) کو علاقے سے نکالنے کا عزم کر لیا اور اسے ننگر ہار اور لغمان کے درمیان زبردست شکست دے کر مذکورہ علاقوں پر قبضہ کیا۔ راجہ جے پال کے ساتھ لڑائیوں میں اسے کثیر مال غنیمت، سینکڑوں ہاتھی، فوجی ہتھیار اور مال و دولت ہاتھ لگا اور ان فتوحات سے نہ صرف اس کی فوجی طاقت میں اضافہ ہوا بلکہ اس کے حوصلے بھی بڑھ گئے (کیرو 1996:52)۔

”976-77ء میں امیر ناصر الدین سبکتگین نے بُست پر قبضہ کرلیا اور خضدار کا خود مختار حاکم بھی اس کا باجگزار بن گیا۔ ریورٹی سبکتگین کے رویہ اور آئندہ کی حکمت عملی کے بارے میں لکھتا ہے کہ ”سبکتگین کے مہاراجہ جے پال سے رویہ کو مد نظر رکھتے ہوئے بھی

کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے اور سندھ میں مسلمان حکومت کے درمیان طاقت ور ہندو سلطنت کو قائم رہنے کی اجازت نہیں دیتا تھا" (ریورٹی 1991 :798,99)۔

سبکتگین نے 997-98ء میں وفات پائی تو ان کی جگہ ان کے چھوٹے اور ہونہار بیٹے محمود نے لے لی۔ جس نے اپنے بڑے بھائی اسماعیل کو معزول کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔

محمود ایک جہاندیدہ جرنیل، ہوشیار سیاستدان اور قابل منتظم تھا۔ اس نے نہ صرف وادی کابل اور وادی پشاور سے راجپوتوں کے بچے کچے اقتدار کا خاتمہ کر دیا بلکہ شمالی ہندوستان پر بھی کئی حملے کئے اور وہاں کے راجپوت حکمران کو شکست فاش دی۔ اس کو ہندوستان سے مال غنیمت سونا چاندی اور جواہرات وغیرہ کی صورت میں بہت زیادہ مقدار میں ہاتھ آیا جس سے غزنی میں دولت کے انبار لگ گئے۔ بعد ازاں اس نے مغرب میں ایران، بلخ و بخارا، مشرق میں پنجاب، وادی پشاور اور سندھ پر کئی حملے کئے۔ ریورٹی کے مطابق اس نے سندھ اور دریائے سندھ کے تمام مغربی علاقے اپنی قلمرو میں شامل کئے اور خلیفہ قادر باللہ کے برائے نام قبضہ کرنے والے افسروں کو بھی نو دو گیارہ کر دیا۔ بیہقی اور جامع التواریخ میں بھی آیا ہے کہ سلطان محمود نے ایلک خان اور ترکوں کے معالات نمٹانے کے بعد خضدار کے حکمران کی سرکوبی کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس نے منحرف ہو کر خراج دینا بند کر دیا تھا۔ غزنی سے روانہ ہو کر پہلے ہرات جاتے ہوئے بُست پہنچا۔ وہاں سے پر زور پیش قدمی کرتے ہوئے اچانک خضدار پہنچ گیا۔ خضدار کا حکمران محمود کے اس اچانک حملے پر حیران و ششدر رہ گیا اور ہار مان کر پانچ گنا خراج ادا کیا اور ایک لاکھ دینار کے علاوہ پندرہ ہاتھی بھی اسکی نذر کئے لہٰذا اسے پہلے کی طرح باجگزار رہنے دیا گیا (ریورٹی 1991 :798,99)۔

سر اولف کیرو دی پٹھان میں لکھتا ہے کہ:

"اسکی فوجی مہارت کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے 999ء سے 1026ء تک شمالی ہندوستان پر سترہ دفعہ فوج کشی کی اور ہر بار کامیابی نے اسکے پاؤں چومے" (کیرو 63:1996)۔

صفاری خاندان کے اقتدار کا اگرچہ سامانیوں کے ہاتھوں سیستان میں خاتمہ ہو چکا تھا مگر امیر ابوالحسن نے لیث کے پڑپوتے احمد بن محمد کو سیستان کی حکومت پر دوبارہ تعینات کر دیا تھا۔ احمد کے بعد اس کا بیٹا خلف سیستان کی امارت پر فائز ہوا۔ 1000ء کے قریب اس نے اپنی حکومت کو وسعت دینے کی کوشش کی جس کی وجہ سے اس کی ٹکر محمود سے ہو گئی مگر محمود نے اسے طاق کے قلعے میں محصور کر دیا۔ بالآخر اس نے محمود کی اطاعت قبول کی۔ 1023ء میں خلف نے عنانِ اقتدار اپنے بڑے بیٹے طاہر کو دے دی مگر بہت جلد پشیمان ہو کر اقتدار دوبارہ اس سے چھین لیا اور اس نے اپنے دو بیٹوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیا جس کی وجہ سے اہلِ سیستان اور بالخصوص اس کے عزیز و اقرباء اس کے خلاف ہو گئے۔ اس موقع پر محمود نے سیستان پر چڑھائی کی اور خلف نے اپنے آپ کو دوبارہ طاق کے قلعے میں محصور کر لیا۔ ایک طویل محاصرے کے بعد اس نے اپنے آپ کو محمود کے حوالے کر دیا۔ جب وہ محمود کے سامنے پیش ہوا تو سلطان کہہ کر اس سے مخاطب ہوا۔ اس خطاب سے محمود اس قدر خوش ہوا کہ اس نے خلف کے جان بخشی کر دی۔ اسی خطاب کی وجہ سے سلطان محمود غزنوی نے اس نام سے شہرت پائی (ٹیٹ 1979: 23)۔

مکران کا حاکم بھی غزنویوں کو مالیہ دیتا تھا۔ سبی بھی گیارہویں صدی کے اوائل میں محمود کے زیرِ اثر آ گیا۔ ملتان کا سارا علاقہ 1004ء میں فتح کر لیا گیا۔ 1021ء میں والئی مکران فوت ہو گیا۔ اس کے دونوں بیٹوں عیسیٰ اور ابو عسکر کے درمیان اپنے باپ کی وراثت پر جھگڑا پیدا ہو گیا۔ اہلِ زراعت اور جنگی صلاحیت رکھنے والے طبقے عیسیٰ کے حق میں تھے لہٰذا ابو عسکر سیستان

چلا گیا جہاں سلطان محمود کے مفادات کے نگران اعلیٰ خواجہ ابو نصیر خافی نے اس کو اپنے پاس ٹھہرایا۔ اس موقع پر سلطان محمود غزنوی سومنات کے مہم میں مصروف تھا۔ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ابو عسکر کو سیستان بلا کر اپنے دربار میں رکھا۔ اس سے عیسیٰ کو بڑی تشویش لاحق ہوئی۔ اس نے ایک وفد مکران کے قاضی کی قیادت میں سلطان کے دربار میں غزنی بھیجا۔ اس وفد میں اہل زراعت کے نمائندوں کے علاوہ کئی رؤسا، مذہبی زعماء اور دوسرے شرفاء شامل تھے۔ اس نے سلطان کی خدمت میں ایک عرضداشت بھی بھیجی اور اس میں لکھا کہ میں اپنے باپ کا قانونی اور شرعی وارث ہوں۔ اگر میرا بھائی غدار اور میرا دشمن نہ ہوتا تو میں اس کو کسی صورت میں اپنے باپ کی وراثت سے محروم نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر سلطان مجھ کو مکران کا حاکم تسلیم کر لے تو میں اتنا خراج دینے کے لئے تیار ہوں جتنا کہ سلطان مناسب خیال کر کے مقرر کرے۔ سلطان نے اس کی درخواست منظور کر لی اور اسکو والئی مکران تسلیم کر لیا اور مکران کا وفد جو ہر طبقہ کے معززین پر مشتمل تھا کامیابی کے ساتھ مکران لوٹ گیا۔ ابو عسکر بدستور غزنی میں ٹھہرا رہا (دہوار 1990:281)۔

سلطان محمود غزنوی کی وفات 1030-31ء تک اس کی سلطنت وسعت اختیار کر گئی تھی۔ مغرب میں ایران کا علاقہ عراقی حدود تک اس کے قبضہ و اختیار میں تھے۔ مشرق میں سیستان، پنجاب، سندھ، ملتان، بلوچستان، رخج و گرد و نواح، کابل، غزنی اور وادی پشاور اس کے تسلط میں تھے۔ شمال میں بلخ و بخارا کا علاقہ اس کے زیر فرمان تھا اور جنوب میں مکران کے ساحل تک اس کا ہی پرچم لہراتا تھا (دہوار 1990:282)۔ محمود غزنوی علوم و فنون، ضرب و حرب، تعمیرات کا بڑا رسیا تھا۔ اس نے غزنی کو شہروں کی دلہن (عروس البلاد) بنا دیا تھا مگر یہ بھی یاد رہے

کہ یہ تمام تر دولت لوٹ مار کر کے غزنی لائی گئی تھی اور خصوصاً ہند کی سرزمین کو ایسا لوٹا گیا کہ ان سترہ حملوں کے بعد غزنی میں سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کے انبار لگ گئے تھے۔

سلطان محمود نے 34 سال تک کامیابی سے حکومت کی اور ایک کامیاب سلطنت قائم کی مگر اس کے ورثاء اس سلطنت کو دس سال تک بھی متحد نہ رکھ سکے۔ سلطان مسعود کے پاس وسیع و عریض مملکت تھی مگر اس میں انتظامی اور فوجی صلاحیتوں کا فقدان تھا، لہٰذا مختلف علاقوں کے مقامی حکمران خود مختاری کے لئے سر اٹھانے لگے تھے جن میں والئ مکران پیش پیش تھا۔ سلطان مسعود غزنوی نے اس کو ہٹا کر اس کے بھائی ابو عسکر کو مکران کا والی مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن بعض ضروری امور در پیش آنے کی وجہ سے یہ معاملہ التوا میں پڑ گیا۔ بعد ازاں والئ مکران عیسیٰ غزنوی فوج کی ایک خونریز یورش کے دوران مار دیئے گئے۔ بے شمار مقامی باشندے (بلوچ) بھی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے اور عیسیٰ کے بھائی عسکر (ابو عسکر) کو مکران کا نیا حاکم بنا دیا گیا (دھوار 1990: 285,86)۔

1047ء میں سلطان مسعود قتل کر دیئے گئے اور ان کی جگہ ان کا بیٹا مودود غزنوی حکمران بن گئے۔ مگر تب تک دور دراز اور غیر ترک علاقوں میں علیحدگی اور آزادی کی تحریکیں زور پکڑ چکی تھی۔ لہٰذا خضدار نے پہل کی اور خراج (ٹیکس) دینا بند کر دیا۔ ریورٹی کے بیان کے مطابق 1047-48ء میں خضدار میں بغاوت ہو گئی اور امیر کبیر کو افواج کی کمان دے کر وہاں بھیجا گیا جس نے باغیوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے خراج کے بقایاجات ادا کر دیئے اور آئندہ خراج دینے لگا۔ سندھ پر بھی چڑھائی کی گئی اور غزنوی جرنیل ابو الحسن متھیلو اور تھانہ تک پہنچ گئے (ریورٹی 1991: 794)۔

1049ء میں سلطان مودود غزنوی کی وفات کے بعد اس کا چچا اور سلطان محمود غزنوی کے بھائی عبدالرشید حکمران بنے۔ وہ ایک نرم مزاج اور ملنسار انسان تھے مگر حکمرانی کے لئے غیر موزوں تھے۔ لہٰذا اس کے دور میں سلجوقی ترک اس کے حکومتی حدود میں داخل ہونا شروع ہوگئے۔ سلجوقیوں نے اس کی سلطنت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ لہٰذا طغرل بیگ کے مشہور و معروف بیٹے الپ ارسلان نے ترکستان کی طرف سے اس پر حملہ کر دیا جبکہ اسکے چچاؤں داؤد اور بغو نے سیستان سے بست کی طرف پیش قدمی کی۔ سلطان عبدالرشید نے قابل ترین اور جنگی حکمت عملی کے ماہر مملوک طغرل کو سلجوقیوں کے مقابلے کے لئے روانہ کیا۔ اس نے الپ ارسلان کو ایک اچھی مار دینے کے بعد دوسروں کی طرف رخ کیا۔ بغو کو شکست دیکر سیستان کے علاقے میں تعاقب کیا۔ واپسی پر اس نے عبدالرشید کے کمزوری کے پیش نظر اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا لیکن اسے صرف چالیس دن کی مہلت ملی کیونکہ اس زمانے میں سندھ کے سمرا خاندان کو طاقت حاصل ہوئی اور اس نے خود مختاری اختیار کی۔ سمرا خاندان کے حکمرانوں نے کچھی پر بھی تصرف جمالیا۔ یہ خاندان 300 برسوں تک سندھ پر حکمران رہا اور سلاطین دہلی کے برائے نام خراج گزار تھے لیکن اندرونی طور پر یہ خود مختار اور آزاد تھے۔

سلطنت مادان اور غزنویوں کے مابین شروع شروع میں حالات معمول کے مطابق رہے مگر محمود غزنوی کے انتقال اور مسعود غزنوی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد حالات سخت کشیدہ ہوگئے اور نوبت جنگ تک آ پہنچی۔ ان تعلقات اور خونریز جھڑپوں کے بارے میں اگلے صفحات پر مزید تفصیلات بیان کیے گئے ہیں۔

مید اور بلوچستان:

مید بلوچوں کا ایک قدیم قبیلہ ہے کہ جس نے موجودہ ایرانی خطہ میں 854 قبل مسیح کے لگ بھگ اپنی حکومت قائم کی جو پہلی ہزارویں قبل مسیح کی سب سے بڑی اور پہلی عظیم الشان تہذیب کے طور پر ابھر کر سامنے آئی۔ میدی دور اقتدار میں ان کی سلطنت کو سلطنت مادستان اور میڈیا بھی کہتے تھے۔ 550 قبل مسیح میں جب فارسی ہخامنشیوں نے ان سے اقتدار چھین لیا اور مملکت مادستان کا نام تبدیل کر کے فارس رکھا تو میدیوں کے اثرات آہستہ آہستہ ختم ہوتے گئے اور میدیوں کی ایک بڑی اکثریت یا تو ایرانیوں میں ضم ہوگئی یا پھر بلوچ خطے کی وسعتوں میں کھو گئی۔ یونانی اقتدار کے وقت سے یہ قبیلہ دیگر بلوچ قبائل کے ساتھ مل کر مکران میں سرگرم تھی اور جب سکندر یونانی نے مکران کو مشرق سے مغرب جاتے ہوئے عبور کرنا چاہا تو ہوت (اور ریتائی) اور مید قبائل نے خطہ کے دیگر قبائل کے ساتھ مل کر یونانیوں کے سامنے مزاحمت پیش کی اور انہیں بیلہ و مکران عبور کرتے وقت سخت تنگ و پریشان کیا۔ یونانیوں نے میدوں کے لیے اچھیتا فیگوئی یعنی ماہی خور کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ بعد ازاں بھی یہ قبائل خطہ کی سیاست میں سرگرم رہے۔ سندھی قبضہ و اقتدار کے وقت بھی مکران کے وسطی و ساحلی علاقوں میں انہی قبائل کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ اس حوالے سے عرب حملوں کے وقت مکران میں ان قبائل کی زبردست نقل و حمل اور عسکری سرگرمیوں کے بارے میں مستند تاریخی کتب میں کافی تفصیلات ملتی ہیں۔ حتیٰ کہ جن جہازوں کے ساحل مکران پر اموی عرب دور حکومت میں لٹنے کا واقعہ پیش آیا تھا، مؤرخین اس کا ذمہ دار بھی مید قبائل کو ٹھہراتے ہیں کہ جن کے بارے میں راجہ داہر نے کہا کہ وہ اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں۔ عرب ادوار میں تاریخی تحریروں میں جہاں بھی بلوچ اور سندھی خطوں کا تذکرہ آتا ہے تو ان قبائل کا تذکرہ ان میں ضرور شامل ہوتا ہے۔

عربوں کے ابتدائی حملوں سے لے کر مکمل فتح بلوچستان تک اکثر معرکوں اور دیگر واقعات میں ہوت اور مید قبائل کا تذکرہ ضرور آتا ہے۔ تاریخ خلیفہ، فتوح البلدان اور دیگر کئی مستند کتب تواریخ میں مکران اور بلوچستان کے کئی دیگر علاقوں میں عربوں اور میدوں کی شدید لڑائیوں کے تذکرے ملتے ہیں کہ جن میں میدوں نے عربوں کے خلاف شدید مزاحمت پیش کی تھی اور کئی بار انہیں شکست فاش دی تھی۔ معروف موٴرخ قاضی مبارک اطہر پوری مختلف عرب موٴرخین کے بیانات کی روشنی میں لکھتا ہے کہ:

"حضرت حارث بن مرہ العبدی عہد علوی سے سندھ و مکران میں مصروف غزوات و فتوحات تھے، اور ان علاقوں کے تقریباً تمام اہم مرکزوں پر قابض و دخیل ہو گئے تھے، مگر سنہ 42 ھجری میں مقامی لوگوں نے اطراف و جوانب سے زبردست فوجی طاقت جمع کر کے اسلامی فوج پر نہایت شدید اور منظم حملہ کیا، جس سے نہ صرف چار سالہ مجاہدانہ سرگرمیاں بند ہو گئیں بلکہ حضرت حارث بن مرہ اور ان کی فوج کا بیشتر حصہ شہید ہو گیا، ڈیڑھ ہزار سے زائد فرزندانِ اسلام اپنے امیر کے ساتھ قندابیل (گنداواہ) میں کام آئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس سرزمین پر اس قدر شہدائے اسلام کا اپنے امیر کے ساتھ مقدس خون گرا اور اس ملک میں اسلامی فتوحات کا سیلاب یکبارگی رک گیا۔ جب اس حادثۂ فاجعہ کی خبر حضرت معاویہ کو ہوئی تو بے حد رنجیدہ ہوئے اور یہاں کے دشمنوں اور باغیوں سے انتقام کا یوں انتظام کیا کہ اسی سال یعنی سنہ 42ھ میں حضرت راشد بن عمرو جدیدی ازدی کی سرکردگی میں ایک زبردست فوج قیقان (موجودہ قلات) کی طرف روانہ کی، حضرت راشد بن عمرو نے عراق سے سیدھے مکران آکر فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور قیقان تک کا تمام علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا اور نہ صرف مکران و سندھ کے درمیانی مقامات ہی فتح ہوئے بلکہ علاقہ مید بھی پہلی بار فتح ہوا" (اطہر پوری 1986:56)۔

اس بیان سے کئی اہم باتوں کا انکشاف ہوتا ہے یعنی اولاً یہ کہ مصنف نے بلوچستان کے وسیع و عریض رقبے کا تذکرہ کیا ہے یعنی مکران سے گنداواہ تا حدودِ سندھ مید قبائل کی حاکمیت قائم تھی جو سندھی حاکمیت کے اثرات سے بالکل آزاد اور خود مختار تھے۔ اسی لیے تو سندھ کے حکمران راجہ داہر نے حجاج بن یوسف کے خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ عربوں کے جہاز میدوں نے لوٹے ہیں جو سندھ کے دائرہ اختیار سے باہر تھے۔ اس درج بالا بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ راجہ داہر کا جواب بالکل سچ تھا جسے حجاج بن یوسف نے ماننے سے انکار کیا اور سندھ پر حملہ کر دیا۔ علاوہ ازیں اس بات کی بھی حقیقت سامنے آتی ہے کہ مکران کی طرح قلات، لسبیلہ اور گنداواہ بھی سندھیوں کے اثرات سے آزاد تھے اور مقامی قبائل ہی تمام کردار ادا کر رہے تھے جبکہ مرکزی حاکمیت میدوں کو حاصل تھی۔ بعض بیانات یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ سندھیوں کی آخری حد کیرتھر کی پہاڑیوں کے مشرقی ڈھلوانوں تک ہی رہ گئی تھی۔ مکران تو ابتدائی عرب حملوں سے پہلے ہی سندھی حکومت کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا جبکہ معاویہ کے دور میں وسطی بلوچستان تک عرب فوجیں پہنچ چکی تھیں اور یہ زمانہ ابنِ قاسم سے کافی پہلے کا ہے۔

مکران میں عرب حملوں کے دوران یہ خطہ بغیر کسی مربوط سیاسی نظام کے صرف ایک قبائلی اتحادیے کے طور پر بعض تحفظات کے تحت چل رہا تھا اور جب عرب حملوں میں اموی دور میں تیزی آگئی تو ان کی فوجوں کا آمنا سامنا مقامی مید اور ہوت سمیت دیگر بلوچ قبائل سے ہوا۔ سندھی قبائل سے لڑائی بلوچستان کے حدود سے باہر لڑی گئی تھی۔ گو کہ اس دور میں ان قبائل کی زیادہ تفصیلات دستیاب نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے نظام سیاست و ریاست کے بارے میں مستند بیانات ملتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کی مزاحمتی و مدافعتی تحریک کو دیکھ کر بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ مید اور ہوت قبائل عرب حملوں کے دوران اور بعد ازاں مکران پر قابض تھے اور ان کا یہ

اتحادیہ (کنفیڈریشن) قبائلی تحفظات کے تحت قائم ہوا تھا جبکہ اس اتحادیے میں میدوں کو مرکزی حاکمیت حاصل تھی۔ بلوچستان کے دیگر علاقوں میں بھی مختلف اوقات میں ایسے اتحادیوں کے قائم ہونے کے شواہد کتب تواریخ میں ملتے ہیں۔ جیسا کہ سیستان کے قبائل کا اتحادیہ تھا کہ جو میدی دور سے چلا آرہا تھا۔ یہ نیم خود مختار ریاست سیستانی قبائل کے آپس کے اتحاد اور صلاح مشوروں سے وجود میں آئی تھی۔ اسی طرح کرمان، شمالی ایران میں کوہِ البرز سے متصل علاقوں مازندران، گیلان، ایلان اور دیگر قریبی علاقوں کے اتحادیے وغیرہ۔ بعض اوقات بڑی اور طاقتور سلطنتیں اور بادشاہتیں ان پر قبضہ کر کے ان کی خود مختار حیثیت کا خاتمہ کر دیتیں اور بعض اوقات انہیں نیم خود مختاری حاصل ہو جاتی۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ کمزور حکمرانوں کے ادوار میں یہ اتحادیے مکمل طور پر بھی خود مختار ہوئے ہیں۔

یقیناً یہی ہوت اور مید قبائل ہی تھے کہ جو عرب حملوں کے دوران طویل مزاحمت کے بعد مشرق کی جانب پسپا ہوتے گئے۔ عرب مورخین ان کے لیے اکثر اوقات المید یا المیذ اور الزطّ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ماہرین تاریخ الزطّ قبائل کو ہوت کی بجائے جت قرار دیتے ہیں۔ دراصل یہ لفظ جت بھی موٴرخین کی خود اختراع کردہ ہے جیسا کہ یونانی ان کے لیے یوت یا یوتی اور اور یتائی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

عرب دور میں مید قبائل اس خطے کی سیاست میں سرگرم رہے اور اپنا بھرپور کردار ادا کرتے رہے۔ لہٰذا جب عباسی عربوں کی مرکزیت کمزور ہوگئی اور ترک خاندانوں کو عروج حاصل ہونے لگا تو مکران میں بھی سیاسی ہلچل ہونے لگی اور مقامی قبیلہ مید نے ایک بار پھر خطے کی سیاسی میدان میں سرگرمیاں تیز کیں اور بالآخر مکران میں بنو مادان کے نام سے اپنی حکومت قائم کی۔ انہیں تاریخ میں بنو مادان اور بنو معدان کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

ایک مصنف نے مکران کے خاندان معدان کی حکومت کو خوارج کی حکومت قرار دیا ہے اور اس کے قیام کا عرصہ دسویں صدی عیسوی لکھا ہے۔ اس کے مطابق:

> ”مکران میں دولت معدانیہ (مادانیہ) کی حکومت تھی۔ اس کے حکمران خارجی تھے۔ اس سے قبل یہ علاقے صفاریوں کے ماتحت تھے۔ جونہی صفاریوں کی گرفت کمزور پڑ گئی عیسیٰ بن معدان نامی ایک خارجی نے چوتھی صدی ہجری کے وسط میں غلبہ و اقتدار حاصل کر کے اپنی مستقل حکومت کا اعلان کر دیا۔ اسے مقامی زبان میں لوگ ”مہاراج“ (شہنشاہ) کے لقب سے یاد کرتے تھے، یہی دولت معدانیہ، مکران کا مورث اعلیٰ تھا۔ یہ حکومت اس نے 340ھ ھجری بمطابق 951ء کے لگ بھگ قائم کی“ (یاقوت (جلد پنجم، 1979:180)۔

ان کے نام کی وجہ سے قاضی مبارک اطہر پوری انہیں عرب قرار دیتے ہیں کہ جو تیرہویں صدی عیسوی میں مکران میں پناہ گزین ہوئے اور بعد ازاں یہاں کی حکومت پر قبضہ کر لیا اور ہندوستان سے قریب ہونے اور ہندوستانی حکمرانوں سے تعلقات جوڑنے کی وجہ سے اس نے مہراج کا لقب اختیار کیا (اطہر پوری 1986 :259)۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ عیسیٰ بن معدان مکران کا پہلا متغلب اور شخصی حکمران تھا جس نے اپنے غلبہ اور اقتدار سے اپنی حکومت قائم کی۔ وہ خلفائے عباسیہ کے نام کا خطبہ تک نہیں پڑھتا تھا نہ ہی سندھ کے دیگر متغلبین کی طرح یہ کسی کی اطاعت و امان میں تھا۔ وہ کسی مشہور و معروف خاندان یا قبیلہ سے بھی تعلق نہیں رکھتا تھا، اس کے باوجود اس نے اپنی ذاتی قابلیت سے مکران میں کامیاب اور مضبوط حکومت قائم کی۔ جس کی وجہ سے اسے اپنی زبان میں ”مہراج“ (مہاراج) کا لقب دیا، یا اس نے خود یہ لقب اپنے لیے رواج دیا (اطہر پوری 1986 :258)۔

عیسیٰ بن معدان کا دارالحکومت کیز تھا۔ یہ حکومت 471ھ بمطابق 1078ء تک یعنی تقریباً ایک سو گیارہ سال تک قائم رہی پھر یہاں غوریوں کا تسلط ہوگیا۔ اس حکومت میں چار حکمران آئے۔ عیسیٰ بن معدان کے بعد دوسرا حکمران معدان بن عیسیٰ بن معدان تھا۔ اس کا زمانہ پانچویں صدی ھجری کا ربع اول ہے، اس کے زمانے میں ''تیز'' دارالحکومت تھا۔ اس کا انتقال 422ھ بمطابق 1031ء کے لگ بھگ ہوا (اطہر پوری 1986: 265)۔

اس خاندان کے تذکرے اکثر عرب مؤرخین کی کتب میں ملتے ہیں۔ جیسا کہ سید سلیمان ندوی مختلف عرب مورخین کے حوالوں سے لکھتا ہے کہ:

> ''یہ (مکران) سندھ کی سرحد پر واقع ہے۔ ابنِ حوقل کے زمانے میں یہاں کا حاکم عیسیٰ بن معدان تھا۔ اس کی دارالامارۃ کا نام کیز تھا جس کی وسعت ملتان سے آدھی تھی۔ اسی کے قریب ایک اور ریاست تھی جس کا نام مشکی (مشکے) تھا اور جہاں کا حاکم ابنِ حوقل کے زمانے میں مظاہر بن رجاء نام کا تھا۔ یہ ریاست اتنی بڑی تھی کہ تین دن میں اس کی مسافت طے ہوتی تھی اور یہاں خطبہ میں خلیفہ بغداد کا نام لیا جاتا تھا'' (ندوی سال اشاعت ندارد: 253-254)۔

بعض مورخین ایک دوسرے کی تقلید میں ان علاقوں کے حکمرانوں کو ان کے اسلامی اور عربی ناموں کی وجہ سے عرب قرار دیتے ہیں حالانکہ اس وقت تک ان مذکورہ علاقوں سے عرب اثرات کافی حد تک زائل ہو چکے تھے اور مقامی قبائل خلیفہ اسلام کے نمائندے نہیں رہے تھے اور نہ ہی مرکز کو خراج ادا کرتے تھے یہ مقامی باشندے ہی تھے اور عربوں کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ البتہ مسلمان ہونے کی وجہ سے اب اُن کے نام بھی اسلامی ہو چکے تھے۔ لہٰذا اس دوران اکثر بلوچ زعمأ اور حکمرانوں کے نام عربی اور اسلامی ہوں گے۔ عرب تاریخ دان ان کے نام عربی طرز تحریر اور تکلم کے انداز میں والد کے نام کے اضافے کے ساتھ تحریر کرتے ہیں جس کی وجہ سے

اکثر ان حکمرانوں کی قومی اصلیت سمجھنے میں غلطی ہو جاتی ہے اور انہیں عرب لکھا جاتا ہے۔ لہٰذا اس غلطی کی اصلاح ہونی چاہیے کہ بغیر گہری اور باریک بین تحقیق کے ان قدیم حکمرانوں اور ان کی قومیت کے بارے میں رائے زنی ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ اکثر بلوچ مورخ بھی ان حکمرانوں کو عرب مورخین کی تقلید میں اہلِ عرب میں شمار کرتے ہیں (قیصرانی 1994:283)۔

یہ خاندان (بنو معدان) محمود غزنوی کے دور میں مکران پر حکمران تھا جس کے بارے میں مشہور و معروف مسلمان مورخ ابنِ خلدون لکھتا ہے کہ:

> ”والئی مکران نے اپنی وفات پر ابوالعساکر اور عیسیٰ دو بیٹے وارث چھوڑے۔ عیسیٰ نے اپنے باپ کے مرتے ہی سارے ملک اور خدم و حشم پر قبضہ کر لیا۔ ابوالعساکر اپنے بھائی عیسیٰ کا مقابلہ نہ کر سکا روتا پیٹتا سلطان مسعود کے پاس غزنی پہنچا اور سارے حالات عرض کیے، امداد کی درخواست کی۔ سلطان نے ایک جرار فوج ابوالعساکر کے ساتھ عیسیٰ کو ہوش میں لانے کی غرض سے روانہ کی۔ لشکر نے کرمان کے قریب پہنچ کر عیسیٰ کو شاہی فرمان بھیجا۔ عیسیٰ نے کچھ سماعت نہ کی چنانچہ جنگ چھڑ گئی۔ جنگ کے دوران عیسیٰ کے بہت سے ساتھیوں نے ہتھیار ڈال دیے، اس سے عیسیٰ کو شکست ہو گئی اور وہ جنگ میں مارا گیا، اور ابوالعساکر مملکت مکران پر قابض ہو گیا“ (ابنِ خلدون 1984 جلد چہارم :541)۔

حمید بلوچ ایک فارسی کتاب کے حوالے سے لکھتا ہے کہ، مکران پر معدان خاندان ہی حکمران تھا۔ سبکتگین نے قصدار کے بعد مکران پر بھی حملہ کیا تھا۔ مکران کے سیاسی حالات قصدار سے مختلف تھے۔ یہاں کے حاکم عیسیٰ بن معدان جو کہ 416ھ (1025-1026ء) میں وفات پا گیا تو اس کے بیٹوں عیسیٰ (ثانی) اور ابو عسکر کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ عوام اور سپاہ نے عیسیٰ کا ساتھ دیا اس لیے اس نے حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اس کے نتیجے میں ابو عسکر کو سیستان بھاگنا پڑا۔ اس نے سیستان کے غزنوی گورنر خواجہ بونصر خافی سے مدد طلب کی۔

جبکہ سیستان نامی کتاب میں لکھا ہے کہ عیسیٰ بن معدان مکران کا حکمران تھا جسے لیث بن علی نے مطیع کیا اور اس سے کافی مال و اسباب حاصل کیا (بہار 1366ھ :280)۔ حمید بلوچ ایک مغربی مورخ کے حوالے سے کچھ مختلف بیان بھی تحریر کرتا ہے۔ جیسا کہ لکھتا ہے:

"سلطان محمود نے ابو عسکر کو غزنی طلب کر لیا اور اسے اپنے دربار میں جگہ دی۔ وہ جانتا تھا کہ مستقبل قریب میں وہ ابو عسکر کو مکران کے حوالے سے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ لہٰذا مناسب موقع کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس نے ابو عسکر کو پناہ دی۔ مکران کے معدان (مصنف نے مادن تحریر کیا ہے) حاکم عیسیٰ نے دیکھا کہ اس کا بھائی محمود کی پناہ میں ہے تو اس نے حالات کو بھانپ کر مکران کے رئیس خاندان کے سربراہوں، مذہبی رہنماؤں اور معززین پر مشتمل ایک وفد اپنے ایک اقرار نامے کے ساتھ سلطان محمود غزنوی کے دربار میں بھیجا۔ اس خط کے مندرجات درج ذیل ہیں:

وہ (یعنی عیسیٰ) اپنے باپ کا حقیقی والی وارث ہے۔ اگر اس کا بھائی اس کے خلاف بغاوت نہیں کرتا اور باپ کا حکم بجالاتا جس طرح وہ بجالائے ہیں، تو وہ ایک پر سکون اور آرام دہ زندگی کے مالک ہوتے۔ اب اگر سلطان محمود کی نظر میں غلام (یعنی عیسیٰ) مکران کا قانونی وارث ہے جیسا کہ عظیم امیر سبکتگین کے زمانے میں میرے والد اس ملک کے حاکم تھے، تو غلام آپ کے ہر حکم کی بجا آوری لاتا ہے اور جشن نوروز اور مہرگان میں قیمتی تحائف حضور کی نظر کی جائے گی۔ میرے بھائی کا جو حق ہے اور اس ضمن میں جو بھی حضور ارشاد فرمائیں گے، میں اس پر لبیک کہوں گا جس کے نتیجے میں کوئی نامناسب واقعہ کا شبہ تک نہیں رہے گا۔ اس کے ساتھ غلام کی طرف سے بھیجا گیا یہ وفد آپ کے حضور ایک اقرار نامہ بھی پیش کرے گا جس میں تمام شرائط موجود ہیں اور اگر اس میں کوئی کمی بیشی ہے تو آپ اس میں اضافہ کر سکتے ہیں اور بندہ اس کی بجا آوری کرے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنے دربار سے کسی کو مقرر کر کے اس کے ہاتھ خلعت فاخرہ بھجوا دیں۔ غلام آپ کا نام جمعہ کے خطبہ میں شامل کر دے گا۔ اس کے نتیجہ میں غلام جو کہ مکران کے

حکمران ہیں، آپ کی سرپرستی میں اس ملک میں امن وامان سے حکومت کرسکے گا اور آپ کا نام گرامی جمعہ کے خطبہ میں پڑھا جائے گا" (بلوچ 2009: 171,172)۔

محمود غزنوی کا یہ عمل کسی بھی طرح خیر خواہی کے لیے نہیں تھا اور نہ ہی اُس کا مقصد بھائیوں کا حقِ حکمرانی کے لیے ہونے والے جھگڑے کا تصفیہ کرنا تھا بلکہ ان دو بھائیوں کے آپس کے جھگڑوں سے فائدہ اُٹھا کر مکران پر قبضہ جمانا تھا کہ جس کے جغرافیہ اور سمندر پر اس کی للچائی ہوئی نظریں لگی تھیں اور ساتھ ہی یہاں سے مال و دولت بٹورنا تھا۔ اس ضمن میں ایک مصنف لکھتا ہے کہ:

"سلطان محمود غزنوی نے والئی مکران عیسیٰ کی عرضداشت قبول کی اور اپنا ایک گماشتہ مکران بھیجا تاکہ وہ خراج کے حصول کی نگرانی کرے۔ یہ گماشتہ مکران اور قصدار دونوں علاقوں سے خراج کے امور کا نگران تھا۔ اس کے نتیجے میں عیسیٰ نے اپنے لشکر کے بہترین سپاہ کو ہیرے جواہرات کے ساتھ محمود کے دربار میں بھجوایا تاکہ غزنی سلطنت کے ساتھ اس کی وفاداری مسلم رہے۔ اس کے علاوہ اقرار نامہ میں سلطان کی طرف سے یہ شق بھی ڈال دی گئی تھی کہ عیسیٰ اپنے بھائی ابو عسکر کے لیے سالانہ وظیفہ مقرر کردے وہ اگرچہ سلطان محمود کے دربار میں رہیں گے۔ یہ وظیفہ انہیں سلطان کے دربار میں ملتا رہے گا جس کا خرچہ عیسیٰ برداشت کرے گا اور اس کے علاوہ ابو عسکر کے لیے دو خلعت فاخرہ بھی تجویز کیے گئے۔ محمود غزنوی کی ابو عسکر کی طرف اس قدر مائل ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے سلطان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے بھائی کو معزول کرکے مکران کو کلیتاً غزنوی حکمرانوں کے حوالے کرے گا۔ محمود غزنوی بڑے عرصہ سے مکران کی دولت کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ابو عسکر کی شکل میں اسے ایک ایسا گماشتہ نظر آیا جو اس کے مذموم مقاصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں اس کی مدد کرے گا" (بلوچ 2009: 172)۔

مسعود غزنوی کے برسرِ اقتدار آنے اور مکران پر حملہ آور ہونے کے بارے میں تفصیلات دیتے ہوئے مصنف موصوف لکھتا ہے کہ:

"جب مسعود غزنوی اپنے بھائی کی آنکھیں نکالنے کے بعد تخت نشین ہوا تو مکران کے حکمران عیسیٰ کی اپنے معاصر قصدار کے حاکم کی طرح خراج دینے سے انکار کے حوالے سے کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ اگرچہ خراج ادا نہ کرنے کی معقول وجہ نظر آئی۔ چونکہ مسعود اور محمد کے درمیان چپقلش کے نتیجے میں مالیہ کا سارا انتظام گڑبڑ ہو گیا تھا لہٰذا یہ ممکن ہے کہ عیسیٰ نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خراج کی ادائیگی بند کی ہو۔ کیونکہ بعد میں پیش آنے والے واقعات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب مسعود نے اپنے چچا (عبدالرشید) کی معیت میں قصدار پر حملہ کیا تھا تو انھوں نے ایک بہت بڑے لشکر جرار جس میں عراقی اور ترکمان سپاہی شامل تھے، انہیں اپنے جمعدار یاروق تو غمش کی سربراہی میں نومبر 1030ء (ذوالقعد 421ھ ہجری) میں مکران پر حملہ آور ہونے کے لیے بھیجا۔ جب عیسیٰ کو مسعود غزنوی کے حملے کی خبر ملی تو انہوں نے مکران کے مقامی لوگوں کو اکھٹا کر کے ایک بڑا لشکر تشکیل دیا۔ اس میں تقریباً بیس ہزار کیچی (تربتی) اور ریکی پیادے اور چھ ہزار سوار شامل تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہاتھیوں کا ایک جتہ بھی اس جنگ میں شامل کیا۔ غزنوی لشکر اور مکرانیوں کے مابین ایک بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ عیسیٰ اس جنگ میں مارا گیا جس کے نتیجے میں مکران کے باسی غزنوی فوج کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہوئے۔ وادیِ کیچ اور اس کے اطراف میں مسعود کے سپاہی کئی دن تک لوٹ مار کرتے رہے اور انہوں نے مکران کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس لوٹ مار سے تھک ہار کر رک گئے۔ ابنِ اطہر کے مطابق غزنی کے سپاہیوں نے مکران کا ساحلی علاقہ بھی فتح کر لیا تھا اور تیز کا ساحلی علاقہ بھی ان کی دست برد سے محفوظ نہیں رہا" (بلوچ 2009: 172,173)۔

جی پی ٹیٹ اس جنگ کی تفصیلات دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"غزنوی فوج کے جمعدار نے دو ہزار سوار نزدیک ہی کھجوروں کے جھنڈ میں چھپا کر مکرانیوں کے گھات میں بٹھا دیے۔ عیسیٰ اپنے لشکر کو لے کر غزنوی فوج پر ہلہ بول دینے کے خیال سے آگے بڑھا۔ وہ خود ہاتھی پر سوار تھا اور دس دوسرے ہاتھی اس کے پیچھے جھوم جھوم کر آگے بڑھنے لگے، جن کو لڑائی کی خوب تربیت دی گئی تھی۔ لڑائی کے دوران مکرانیوں کا پلہ بھاری رہا اور قریب تھا کہ غزنوی فوج شکست کھا جائے، مکرانی لشکر کو کامیابی ہونے لگی تھی کہ جمعدار نے بڑی ہمت سے کام لے کر اپنے منتشر فوجیوں کو دوبارہ اکھٹا کر لیا۔ اسی دوران گھات میں بیٹھے ہوئے سوار بھی کھجوروں کی جھنڈ سے باہر نکل آئے اور مکرانیوں پر پل پڑے۔ مکرانی لشکر کو شکست ہوگئی۔ عیسیٰ کو ایک پہاڑی درے کے اندر گھیر کر گرفتار کیا گیا اس کے بعد اسے قتل کر کے غزنوی فوج اس کا سر اپنے ساتھ غزنی لے گئی۔ انہوں نے سینکڑوں دوسرے لوگوں کو بھی جو لڑائی میں شامل تھے گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ غزنوی فوجیوں نے دس دن تک شہر اور اس کے مضافات کو لوٹا اور بہت سامالِ غنیمت اور مویشی جمع کر کے اپنے ساتھ لے گئے" (بلوچ 2009 :173)۔

اس طرح شدید قتل عام اور خونریزی کے بعد ابو عسکر غزنوی حکمران کی آشیر باد سے مکران کے تخت پر ایک باجگزار کی طرح متمکن ہوا۔ بیہقی بھی ابو عسکر کی مکران پر حکمرانی کا تذکرہ کرتا ہے اور کئی دیگر تاریخی کتب بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ابو عسکر طویل عرصہ تک مکران پر قابض رہا۔ اس کے دور حکومت کے بارے میں ایک مورخ لکھتا ہے کہ:

"مکران کا والی ابو عسکر تھا جس نے جشن مہرگان (ستمبر 1036ء) کے موقع پر مکران سے قیمتی تحائف غزنی کے دربار میں بھیجے۔ ابو عسکر کافی عرصے تک مکران پر حکمرانی کرتے رہے۔ اس کی موت غزنوی سلطان فرخ زاد کے دور حکمرانی کے دوران ہوئی۔ ابو عسکر 1030ء سے 1059ء تک مکران کے حکمران رہے۔ اس طرح وہ تقریباً تیس سال تک مکران کے حکمران رہے۔ اس کی موت کی وجوہات کی تفصیل علی بن رضوان نے 1061ء

میں تحریر کی تھیں کہ وہ دل کے دورے کے سبب انتقال کر گئے۔ کیونکہ انتقال سے پہلے اس کے جسم کا بایاں حصہ شدید مفلوج ہو گیا تھا۔ بائیں حصہ کی درد کی شدت کو برداشت نہ کرتے ہوئے وہ انتقال کر گئے" (بلوچ 2009: 173-174)۔

ابو العساکر پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر (طبیب) تھا اور اپنے زمانے کے مشہور اطبأ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ جیسا کہ ایک معروف مؤرخ ان کے فن کے بارے میں تفصیلات دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ، ابو العساکر علم طب کا ماہر تھا چنانچہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء میں مشہور مصری طبیب ابوالحسن علی بن رضوان (453 ھجری بمطابق 1061ء) کے ذکر میں ابو العساکر کی تصنیفات و رسائل کے بارے میں لکھا ہے۔ اس سے ابو العساکر کی علم دوستی اور غیر ممالک کے اہلِ علم سے علمی مباحث و مسائل میں خط و کتابت کا بھی پتہ چلتا ہے (اطہر پوری 1986 :264)۔ مزید بر آں ایک عرب مؤرخ ان کے فن طب میں دلچسپی کے بارے میں لکھتا ہے کہ ابوالحسن علی بن رضوان نے ابو العساکر کی فرمائش پر "علۃ الفالج" کے عنوان سے ایک رسالہ تحریر کر کے بھجوایا تھا۔ (ابی اصیبعہ 1299 ھجری :104) بنو معدان کے بارے میں ایک مصنفہ لکھتی ہے کہ:

"ابو العساکر حسین بن معدان کے زمانے میں 471 ھجری بمطابق 1078ء میں غوری سلطنت نے مکران پر قبضہ کر لیا اور دولت معدانیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ مکران کی دولت معدانیہ موروثی اور خاندانی تھی۔ وہ اپنے علاقے کے بالکل آزاد حکمران تھے۔ یہ ایسی خود مختار حکومت تھی جس نے خلافت بغداد سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ چونکہ وہ خارجی (عرب مورخین مکران اور گرد و نواح کے اکثر آزاد باشندوں کو کہ جو بلوچ قبائل پر مشتمل تھے خارجی قرار دیتے تھے حتیٰ کہ مکران کو دارالخوارج قرار دیتے تھے) تھے لہٰذا عباسی خلفأ کے نام کا خطبہ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ البتہ ابو العساکر نے سلطان مسعود غزنوی کے نام

سے خطبہ پڑھا مگر یہ حکومتی پالیسی کی وجہ سے نہیں بلکہ جذبہ احسان مندی کی وجہ سے تھا“
(سجاد ظہیر 2012: 284)۔

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحبہ بنو معدان کے حکمرانوں کے بارے میں مزید لکھتی ہے کہ:

”بنو معدان مکران کے خوارج میں سے تھے جو ان اطراف میں رہ کر خلافت عباسیہ کے خلاف خروج و بغاوت کو اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ دولت معدانیہ کے عام حکمران عادل و منصف اور شریف تھے، ان کی خارجیت نے ان کو ان معاملات میں متشدد بنا رکھا تھا، ان کے یہاں کبائر گناہ کا ارتکاب کفر تھا، اس لیے انہوں نے حکومت و طاقت پا کر عدل و انصاف کا معاملہ عام کیا۔ یہ بات اسی صورت میں ممکن ہے کہ ان کا تعلق خوارج کے متشدد فرقوں سے نہیں رہا ہو گا۔ وہ یقیناً خوارج کے اعتدال پسند گروہوں میں سے ہوں گے“
(ظہیر 2012: 284,285)۔

دیگر حملہ آور اقوام کی طرح غزنوی حکمرانوں کا بھی مکران پر قبضہ کرنے کا مقصد لوٹ مار اور خراج وصولی کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ ان دور دراز اور نسبتاً کم آبادی والے خطوں پر حکمرانی کے بھی قائل نہ تھے بلکہ انہیں ہمیشہ غیر مہذب حملہ آوروں کی طرح دولت کی تلاش رہتی تھی۔ لہٰذا یہی وجہ تھی کہ وہ ایک ہی خطے پر بار بار حملہ کر کے اسے لوٹ کر تباہ و برباد کرتے تھے مگر انہیں اپنے قبضہ و اختیار میں نہیں لاتے تھے۔ اس کی مثال محمود کے ہندوستان اور وسط ایشیاء پر بار بار حملوں سے بھی دی جاسکتی ہے۔ اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کر کے اسے تباہ و برباد کر دیا مگر وہاں اپنی حکومت قائم کر کے اس کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ بھی نہ کیا۔ البتہ پنجاب کی زرخیزی دیکھ کر اسے مستقلاً اپنے قبضہ میں رکھا۔ اسی طرح محمود کے جانشینوں نے بھی اسی روایت کو جاری رکھا اور آزاد و خود مختار ریاستوں پر حملے کر کے انہیں تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ انہوں نے مکران، کرمان اور خضدار پر بار بار حملے کیے اور ہر بار بھاری رقومات اور مال و اسباب لوٹ کر چلتے بنے۔ انہوں نے یہاں ٹِک کر یہاں کے وسائل کو یہاں کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کرنے کا کبھی بھی نہ سوچا۔ ان

کی اس بار بار کی لوٹ مار اور بھاری رقومات کی طلب نے مقامی باشندوں کو ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا۔ وگرنہ یہ حقیقت تو مسلم ہے کہ ان پہاڑی اور ریگستانی قبائل کے پاس نہ تو ایسی کوئی منظم فوجی طاقت تھی اور نہ ہی اتنے وسائل کہ وہ ان ہمیشہ اورازل کے جنگجو اور وحشی حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے مگر تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ان قبائل نے بھی ان حملہ آوروں کے سامنے سینہ تان لیا۔ مکران کے لوگ پیشہ ور سپاہی نہ تھے بلکہ زیادہ تر گلہ بان، آزاد مزارع اور ماہی گیر تھے۔ ان کے اکھٹے ہونے کی کئی وجوہات تھیں یعنی اولاً وہ آئے دن کے بدیسی حملوں سے تنگ آچکے تھے کہ جو وحشیانہ طریقے سے ان کا نہ صرف قتل عام کرتے تھے بلکہ ان کی آبادیاں اجاڑ کر ان کے مال واملاک لوٹ لیے جاتے تھے۔ دوم یہ کہ وہ اپنے گھروں میں پُر امن زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے نہ تو دمشق کو لوٹا تھا اور نہ ہی بغداد کو تاراج کیا تھا اور نہ ہی غزنی پر حملہ آور ہوئے تھے۔ مگر جب بار بار اور بلا کسی وجہ کے ان پر حملے ہوتے رہے، ان کا مال واسباب لوٹا جانے لگا اور انہیں غلام بنایا جانے لگا تو مجبوراًان پُر امن اور نہتے لوگوں نے بھی تیر وسنان سنبھالے اور غیر ملکی حملہ آوروں سے اپنا اور اپنے وطن کا دفاع کرنے کے لیے سر بکف ہو گئے۔

مکران کے معدانی بلوچ حکمرانوں کی شکست کی وجہ یہ تھی کہ ان کا آس پاس کے دیگر بلوچ حکمرانوں سے کوئی ربط و میل نہ تھا۔ جیسا کہ خضدار کے حکمران تھے۔ اگر ان دونوں خطوں کے حکمرانوں اور ساتھ ہی کرمان و سیستان کے بلوچ آپس میں مل جاتے تو یقیناً وہ ایک عظیم سلطنت کے بنیاد گزار بن جاتے۔ مگر ان خطوں کے آپس کے فاصلوں اور دوریوں نے انہیں جدا جدا مگر ایک ہی مشترکہ دشمن کے ہاتھوں زیر کیا۔ حتیٰ کہ یہ خود مختار قومی ریاستیں غزنویوں کی طفیلی ریاستیں بن گئیں۔ تاریخ بیہقی کا مصنف لکھتا ہے کہ مکران اور قصدار محمود اور اس کے بیٹے مسعود کے دور میں طفیلی ریاستیں تھیں۔ جب نئے عباسی خلیفہ القادر (1033ء) میں بغداد کی

تخت پر بیٹھا تو انہوں نے قصدار، مکران، بالشتان، (شمالی بلوچستان بشمول قندھار، کوئٹہ اور سبی) کو ایک ریاست قرار دیا۔ علاوہ ازیں بیہقی مکران اور وہاں کے باشندوں کے حالات اپنی کتاب میں تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے اور وہاں کے باشندوں کو مکرانی تحریر کرتا ہے (بیہقی 1383 ھجری، سیکنڈ ایڈیشن :85,86,93,94,248-52,57,58,79,95,406-08,472)۔

غزنویوں کے اثرات اس خطے پر اُن کے زوال تک رہے۔ حتیٰ کہ سلجوقی حملوں کے وقت یہ دور دراز خطہ ان کی زد سے محفوظ رہا اور منگول حملے بھی جس طرح دیگر خطوں پر اثر انداز ہوئے مکران ان سے کسی حد تک محفوظ رہا۔ جلال الدین خوارزم شاہ کا پیچھا کرتے ہوئے منگول مکران کے علاقہ پنجگور پر حملہ آور ہوئے مگر یہاں رکے بغیر آگے نکل گئے۔ غزنویوں، سلجوقی ترکوں اور منگول حملوں کی وجہ سے یہ خطہ بہر حال مرکزیت قائم نہ رکھ سکا اور منتشر حالت میں رہا۔ یہاں کے باشندے ان حملوں سے شدید متاثر ہوئے۔ ان ادوار کے زیادہ تفصیلی تذکرے کتب تواریخ میں نہیں ملتے۔ لہٰذا وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس خطہ میں معدانیوں کے بعد کس خاندان نے اپنی حکومت قائم کی۔ البتہ بعض تاریخی ذرائع اس دوران خطہ مکران پر ہوت قبیلہ کی بالادستی کی شہادت دیتے ہیں (بلوچ Vol:1 .2014 :83-93)۔

بہر حال یہ تین سو سالہ دور مکران کے مقامی قبائل کی سیاست کا دور کہلاتا ہے کہ جس کے بارے میں کچھ عرصہ قبل تک کتب اور مواد منظر عام پر نہیں آئے تھے مگر تلاش بسیار کے بعد اور مشاہداتی تحقیق سے کئی ایسے راز افشا ہوئے اور ایسے نقاط سامنے آئے کہ جن پر مؤرخین کی اس سے پہلے توجہ مرکوز نہیں ہوئی تھی۔ بہر حال عرب خلافت (عباسیہ) اور ترک سلاطین کے ادوار میں گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی کے دوران مکران پر ہوت قبیلے کی حکمرانی کے

ٹھوس شواہد ملتے ہیں۔ غوریوں نے غزنوی اقتدار کا خاتمہ کر کے اس خطہ کو ان کے مظالم سے نجات دلادی۔ غوریوں کے اقتدار کے دوران مکران پر ہوت قبیلہ کی حکومت قائم ہو گئی۔ بعض شواہد اس خطہ کی مکمل خود مختاری کی بھی تصدیق کرتے ہیں۔

حالاتِ خضدار در عہد غزنویان:

غزنویوں کے برسرِ اقتدار آنے سے قبل مکران کے ساتھ ساتھ خضدار بھی ایک آزاد و خود مختار ریاست ہوا کرتی تھی۔ بعض باوثوق ذرائع کے مطابق بلوچوں کا مشہور و معروف قبیلہ کُرد کی یہاں حاکمیت قائم تھی۔ ویسے بھی اس حقیقت سے انحراف نہیں کیا جاسکتا کہ کُرد، دہوار اور نقیب قبیلہ خضدار کے قدیم اور حقیقی باشندے کہلاتے ہیں۔ عرب مورخین مسلمان حکمرانوں کے نام اپنے انداز میں تحریر کرتے ہیں یعنی کسی فرد کے ساتھ اس کے والد کا نام بھی لکھتے ہیں یعنی جیسا کہ وہ خالد بن ولید لکھتے ہیں جس سے فوراً اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ خالد بن ولید ایک عرب تھا اسی طرح محمد بن قاسم وغیرہ۔ بالکل اسی انداز میں وہ دیگر غیر عرب مسلمان حکمرانوں کے نام بھی تحریر کرتے ہیں جس کی وجہ سے قارئین اور محققین انہیں بھی عرب سمجھتے ہیں۔ علاوہ ازیں عرب مورخین کو جہاں والد کا نام نہیں ملتا اور انہیں اس بارے میں کوئی بھی معلومات لینے میں جب ناکامی ہوتی ہے تو وہ خاندان یا قبیلہ کو ہی ”بن“ یعنی باپ کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح عیسیٰ اور عسکر کے ساتھ ہوا کہ جب ان کے والد کے نام کے ساتھ ”مادان“ کا لفظ لکھا گیا جو ان کا قبیلہ تھا اور عربوں نے اسے جمع کے صیغے میں استعمال کیا۔ لہٰذا بلوچستان کے مختلف علاقوں پر حاکم مقامی حکمرانوں کے نام بھی انہوں نے کچھ اسی انداز میں تحریر کیے ہیں جس کی وجہ سے اکثر قارئین کرام انہیں فوراً عرب خاندانوں کے افراد سمجھتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایرانی مورخین کی طرح عرب مورخین بھی تمام حاکم خاندانوں کو

اکثر عرب تحریر کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے بھی اکثر مغالطہ ہو جاتا ہے اور عام قاری یہی سمجھتا ہے کہ یہاں ابتدائی عرب حملوں سے لے کر بنو عباس کے زوال تک شاید عرب حکام ہی تعینات ہوتے رہے ہیں اور یہ علاقہ شاید اُن کی غلامی میں رہا ہے۔ جبکہ تاریخی حقائق اور واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ عرب دور میں خلفائے دمشق اور خلفائے بغداد کے کمزور حکمرانوں کے عہد میں بلوچستان سمیت تمام غیر عرب ممالک اور ریاستیں عربوں کے دسترس سے آزاد ہو جاتے اور اکثر مقامی قبائل اپنی حاکمیت قائم کرتے۔ ایسے بیانات بھی کتب تواریخ میں ملتے ہیں کہ علاقائی گورنروں اور نائبوں کی تعیناتی پر عرب حکام اور مقامی قبائل اور اقوام کے مابین شدید اختلافات پیدا ہوتے جو شدید خونریزی پر منتج ہو جاتے۔ سیستان، وسط ایشیائی ریاستوں، مکران، وسطی بلوچستان، سندھ، ایشیائے کوچک، افریقی ممالک حتیٰ کہ ہر وہ مقام جہاں غیر عرب اقوام آباد تھے وہاں ایسی صورتحال اکثر پیدا ہو جاتی جو عرب حکام طاقت کے بل بوتے پر یا گفت وشنید کے ذریعے حل کرتے۔ اکثر طاقت کا ہی سہارا لیا جاتا کیونکہ مقامی باشندے عرب حکام کے اس فیصلے کے اکثر مخالف ہوتے کہ جب وہ اپنا گورنر مقرر کرنے کے مطالبے پر اڑ جاتے۔ لہٰذا تمام عرب ادوار (خلفائے راشدین، بنو امیہ، بنو عباس) میں غیر عرب مقبوضات میں اکثر حالات کشیدہ اور مخالفانہ رہے۔ یہی تو وجہ تھی کہ ان باغی ممالک اور خطوں کے باشندوں کو عرب مورخین ان کی مرکز مخالف رویوں کی وجہ سے خوارج قرار دیتے تھے۔

لہٰذا خضدار کے مقامی باشندے جو اسلام قبول کر چکے تھے آہستہ آہستہ اپنے خطے پر خود حاکمیت کا حق حاصل کرتے گئے اور عرب حکام کو آہستہ آہستہ اپنے علاقوں سے نکالتے رہے۔ بلوچستان میں شاید ہی کسی عرب خاندان نے سکونت اختیار کی ہو۔ تاریخی طور پر اس بات کی کوئی شہادت بھی دستیاب نہیں کہ جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ عربوں نے کبھی بلوچستان میں کوئی نو

آبادیات قائم کی ہو اور عرب خاندانوں کو یہاں بسایا ہو۔ کیونکہ عرب خلفاً اور حکام بلوچستان کو ایک گزر گاہ کے طور پر ہی استعمال کرتے تھے اور اسے صرف ایک فوجی نوعیت کا علاقہ سمجھتے تھے۔ لہٰذا یہاں انہوں نے کبھی بھی آباد ہونے کی کوشش نہیں کی۔ جبکہ اس کے برعکس ایران اور سندھ کے پُررونق اور گنجان علاقوں میں انہوں نے اپنی نوآبادیات قائم کیں اور عرب خاندانوں کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت یہاں بسایا گیا۔ بلوچستان میں زیادہ سے زیادہ عرب فوجی دستے تعینات ہوتے تھے جو مالیہ اور امن عامہ کے معاملات نمٹاتے تھے جبکہ دیگر معاملات میں وہ تعرض نہیں رکھتے تھے۔ ایسے لاتعداد تاریخی بیانات ملتے ہیں جن کے مطالعہ سے یہ بات شنید میں آتی ہے کہ وسطی بلوچستان، مکران اور سیستان کے مقامی باشندے اکثر و بیشتر مرکز خلافت کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے۔ وسطی عباسی عہد میں ان علاقوں کے حکمران عربوں کی مرکزیت کو نہیں مانتے تھے اور نہ تو انہیں خراج دیتے تھے اور نہ ہی خلفا کا نام جمعہ کے خطبات میں شامل کرتے تھے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقامی باشندے غیر عرب اور مقامی بلوچ قبائل ہی تھے۔ اگر وہ عرب ہوتے تو کم از کم عرب مخالف یا مرکز مخالف رویہ ہرگز اختیار نہ کرتے اور کم از کم جمعہ کے خطبات میں خلیفہ اسلام کا نام ضرور شامل کرتے۔ لہٰذا وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ بلوچ خطہ پر عرب دور میں ہی مقامی قبائل برسرِ اقتدار آگئے تھے اور وہ اپنے خطوں میں آزاد اور خودمختار تھے۔ ان خودمختار بلوچ ریاستوں میں خضدار کی ریاست بھی شامل تھی جہاں بلاشبہ قبیلہ گُرد علاقہ کے دیگر قبائل کی مدد و کمک سے حاکمیت کرتا تھا۔ جب غزنویوں کو خطے میں حاکمیت ملی اور انہوں نے ایک وسیع و عریض علاقہ اپنی قلمرو میں شامل کیا تو مرکز میں اُس وقت بھی عباسیوں کی خلافت قائم تھی۔ مگر خضدار کے حکمران نہ تو مرکز خلافت کو مانتے اور خراج ادا کرتے تھے اور نہ ہی غزنوی اقتدار اور تسلط کے زیرِ اثر تھے۔ عباسیوں میں تو اب وہ

طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ ان خطوں کے خلاف فوج کشی کرتے یا کسی بھی قسم کی جارحانہ مہم جوئی کرتے مگر غزنوی اُس وقت طاقتور اور وسیع و عریض خطہ زمین پر حاکم تھے اور محمود جیسا عظیم فاتح اُن کا حاکم تھا۔ لہٰذا ترکوں نے فوج کشیاں کر کے مکران اور خضدار کے حاکموں کو مطیع کیا اور اُن سے خراج وصول کیا۔ محمود کے مرنے کے بعد ان علاقوں نے دوبارہ خراج کی ادئیگی بند کر دی۔ لہٰذا مسعود غزنوی اور خضدار کے حاکم کے مابین خونریز تصادم شروع ہوئی۔ یہی صورتحال مکران اور سیستان کی تھی۔ لہٰذا بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ بلوچستان کے جن حاکموں کا تذکرہ ابن حوقل سمیت دیگر عرب مصنفین نے کیا ہے وہ دراصل مقامی قبائلی میر و معتبرین تھے جو علاقے کے دیگر بلوچ قبائل کی مدد سے برسرِ اقتدار آگئے تھے اور آزاد و خود مختار تھے۔ البتہ بعض اوقات کوئی طاقت ور حاکم اُن کی آزادی سلب کرتا مگر یہ ایک عبوری دور کے لیے ہوتا۔ لہٰذا قابض حاکموں کی کسی بھی کمزوری سے ان علاقوں کے مقامی باشندے فائدہ اٹھاتے اور فوری طور پر آزاد ہو کر دوبارہ اپنی حاکمیت قائم کرتے۔ مکران میں تو اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ جب مقامی قبائل کی اس خطے پر حاکمیت قائم ہوئی اور انہوں نے عرب خلافت کی غلامی کا جوا اُتار پھینکا اور اپنے علاقوں پر اپنی حاکمیت قائم کی۔ مکران کے مید، ہوت، بلیدی، کلوہی اور دیگر قبائل یکے بعد دیگر مکران سمیت وسیع و عریض بلوچ خطے پر حاکم رہے جبکہ وہ دور عباسی خلافت کا تھا۔ مکران کی تاریخ کے کئی بند دریچے کُھلے ہیں اور محققین نے اس خطے کی سابقہ تاریخ کے کئی اہم اور خفیہ گوشے آشکار کیے ہیں مگر خضدار اور قلات کے بارے میں ابھی بہت کام باقی ہے۔ اس سلسلے میں تحقیق کا سلسلہ جاری ہے مگر اس تحقیقی کام کی رفتار ایسی نہیں کہ جسے حوصلہ افزا کہا جاسکے۔ تحقیق کے دائرہ کو اگر بڑھایا جائے تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ خضدار کی تاریخ کے بند دریچے بھی کھل جائیں گے اور اس علاقے کی سابقہ تاریخ بھی حقائق کے ساتھ منظر پر آئے گی۔

امید یہی ہے کہ اس سلسلے میں جو بھی تحقیق ہو گی اُس سے علاقے کے مقامی قبائل کی بہتر تاریخ سامنے آئے گی جو بلوچستان کی تاریخ کے گم شدہ تاریخ کی کڑیاں ملانے میں مدد گار ثابت ہو گی۔

خاندان غوری اور بلوچستان:

غزنوی اقتدار کا خاتمہ ایک اور ترک خاندان سلجوق کے حکمران الپ ارسلان نے کیا۔ مگر الپ کی فتوحات اور غزنوی خاندان کے اقتدار کے خاتمہ کا فائدہ تاجکوں نے اٹھایا جو تاریخ میں شنسبانی کہلاتے ہیں اور اپنے آپ کو مشہور افسانوی پیشدادی بادشاہ ضحاک کی اولاد بتاتے ہیں (کیرو 1996:72)۔

اس میں شک نہیں کہ ترک خاندانوں کے ادوار میں بلوچستان کے کونے کونے میں بیرونی اقتدار و قبضے کے خلاف صدیوں تک مسلسل آواز اور ہتھیار ایک ساتھ اٹھتے رہے اور ترکوں اور بلوچ قبائل کے درمیان خونریز جھڑپیں تاریخ کا حصہ بنتی رہیں۔ فاتح اقوام کے مؤرخین نے بلوچستان کے حقیقی باشندوں کو باغی اور بیرونی حملہ آوروں کو مجاہدین اسلام کہا اور لکھا۔ مفتوح اقوام کے حالات اور مشکلات کو نظر انداز کرتے ہوئے فاتح اقوام نے اپنی شان میں قصیدے اور شاہنامے رقم کروائے۔ یہ شاہنامے اگر ایک طرف کسی بادشاہ کی شان میں قصیدے ہیں تو مظلوم، مقہور، محکوم اور مفتوح اقوام کے لئے ہجو اور مرثیے ہیں۔ ان متعصب کتب میں ستم ظریفی یہ ہے کہ کسی بھی مفتوح سرزمین کے حقیقی باشندوں کو شیطان اور شیطانی قوتوں سے تشبیہہ دی گئی اور فاتح حملہ آوروں اور بیرونی اقوام کو خدا کے فرستادہ، محبوب اور منظور نظر اقوام یا اولاد تک کہا اور لکھا گیا۔ قدیم ادب میں اس کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔

غزنوی خاندان کے دور اقتدار میں بھی پورا بلوچستان یورشوں کی زد میں رہا۔ بذات خود محمود غزنوی جیسے باجبروت حکمران کے دور میں خضدار، مکران اور صحرائے لوط (دشت ایرانی

بلوچستان)(ابنِ خلدون 226,27:1984) میں مسلسل بلوچ قبائل اور غزنوی باہم بر سر پیکار رہے۔ مگر دوسری طرف غزنوی افواج میں بلوچوں کا ایک مضبوط گروہ بھی شامل تھااور ہندوستان پر حملوں کے دوران محمود کے ہمرکاب تھا(قدوسی 1985 :326)۔ مگر محمود کے مرنے کے بعد نہ صرف اس کے ورثاء اس کی قائم کردہ شاندار سلطنت کا دفاع نہ کرسکے بلکہ پوری سلطنت مختلف حصوں میں اور خود مختارانہ حیثیت میں بٹتی چلی گئی۔

سندھ میں سمرا خود مختار ہوگئے، معزالدین محمد بن سام شنسبانی تاجک سلطان غزنی دغو یعنی سبکتگین کے جانشینوں کے ماتحت تمام سابقہ علاقوں کا حکمران تھا۔ 1190ء-91ء میں اس نے اوچ اور ملتان سے دیبل کے ساحل تک قبضہ کرلیا۔ سلجوقی ترک کرمان اور مکران پر قابض تھے۔اس دوران غوری (تاجک) خاندان طاقتور ہوتا گیا۔ سر اولف کیرو لکھتا ہے کہ خاندان غزنی کے آخری حکمران بہرام شاہ کے دور حکومت میں غور کے حکمران ملک سیف الدین سور نے جس کے ایک بھائی کو بہرام شاہ نے قتل کیا تھا۔ بہرام شاہ کے خلاف بغاوت کی اور غزنوی سلطان کو ملک سے باہر ہندوستان کی طرف بھگادیا اور خود غزنی پر قابض ہوگیا۔ لیکن تھوڑے عرصہ بعد بہرام شاہ خفیہ طور پر واپس غزنی چلا آیا اور رات کے وقت غزنی پر حملہ کرکے اس پر قابض ہوگیا۔ اور ملک سیف الدین سور کو گرفتار کرکے قتل کردیا۔ اس واقعہ کا ملک سیف الدین کے بھائی ملک علاؤالدین کو سخت رنج ہوا۔ چنانچہ جمع آوری لشکر کے بعد اس نے غزنی پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور شہر میں قتل عام کرتا ہوا اسے نذر آتش کرنے کا حکم دے دیا۔ ماسوائے سلطان محمود غزنوی کی قبر کے، باقی تمام غزنوی حاکموں اور امرا ئی کی قبریں کھدوا کر ان کی ہڈیاں تک جلادیں اور بعد ازاں بست پر حملہ کر کے وہاں بھی یہی عمل دہرایا۔ حتیٰ کہ کچھ بھی نہ چھوڑا۔ انسان، عمارتیں، کتب، لائبریریاں، دواخانے، قلمی نسخے سب کچھ جلا دیا۔ اسی وجہ

سے ملک علاؤالدین تاریخ میں جہانسوز کے لقب سے مشہور ہے۔ اس کے بعد بست کبھی بڑا شہر نہ بن سکا اور اسکی جگہ قندھار نے لے لی۔ بعد ازاں علاؤالدین کو سلطان سنجر سلجوق نے خراج نہ دینے کی پاداش میں گرفتار کرلیا اور قید میں رکھا۔ مگر تھوڑے عرصے بعد سلطان سنجر کو ایک ترک قبیلے غز کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا غز ترکمانوں نے سلجوقی سلطنت پر ایک کاری ضرب لگائی، وسط ایشیاء میں لاکھوں انسانوں کو ان وحشیوں نے قتل کر دیا اور آگے بڑھتے ہوئے سیستان، خراسان اور بلوچستان کے کئی شمالی اور شمال مغربی علاقوں تک مار دھاڑ کی۔ یہی وہ حملہ تھا کہ جس نے غور کے تاجکوں کیلئے راستہ ہموار کیا۔ ان غز ترکمانوں کے حملوں اور بعد ازاں کرمان میں داخلے سے مقامی بلوچ قبائل کو شدید نقصان پہنچا اور ان کے بیشتر میدانی قبائل پہاڑوں کی طرف رخ کر گئے۔ 1210ء میں کہیں جاکر غز ترکمانوں کا طوفان رک گیا (کیر و 1996:85)۔ ان کے بیشتر قبائل یا تو یہاں سے نکل گئے یا پھر مقامی آبادی میں ضم ہو گئے۔

تاجک خاندان اس دوران عروج پاتا گیا۔ ملک سیف الدین کے دو بیٹے تھے۔ جن کے نام غیاث الدین اور معزالدین تھے۔ معزالدین کو شہاب الدین کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں اس نے محمد غوری (شہاب الدین محمد غوری) کے نام سے شہرت حاصل کی۔ 1173ء میں دونوں بھائیوں نے مل کر غز ترکمانوں کو شکست دی اور غزنی پر قبضہ کر لیا۔ غیاث الدین نے غزنی کا علاقہ معزالدین کے حوالے کر دیا اور خود غور پر حکمرانی کرنے لگا۔ اس نے فیروز کوہ میں اپنا دارالحکومت بنایا، آہستہ آہستہ غز ترکمانوں کی قوت کا خاتمہ کرتے ہوئے 1190-91ء تک اوچ اور ملتان تک قابض ہوتا گیا۔ بعد ازاں شہاب الدین غوری نے ہندوستان کے راجہ پرتھوی راج (رائے پھتورا راجپوت) کو ترائن کی دوسری لڑائی میں شکست دے کر ہندوستان کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کر لیا اور دہلی میں اپنا حاکم مقرر کر کے اسے اپنے قبضہ و

اقتدار میں رکھا۔ اس نے خوارزم پر حملہ کیا، مگر خوارزم کے ترک حکمران سلطان علاؤالدین خوارزم شاہ اور اس کے بہادر بیٹے سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کھائی اور پنجاب کی طرف پسپا ہوا۔ پنجاب میں اسے اس کے خیمے میں کسی نے قتل کر دیا۔ 1206 میں اسکی وفات پر قطب الدین ایبک اس کے ہندوستانی علاقوں کا وارث بنا، اس کا ایک اور چہیتا غلام (ترک) تاج الدین یلدوز غزنی کی سلطنت کا وارث بنا، ناصر الدین قباچہ جو شہاب الدین غوری کا ایک غلام اور تاج الدین یلدوز کا داماد تھا، اوچ، ملتان، سندھ، کہڑام، سرسوتی اور سرہند کا حکمران بن گیا (ریورٹی 1991:801)۔

یہ دور چونکہ ترک قبائل کے مابین بدترین سیاسی اور فوجی کشمکش کا دور تھا اور ان سب کا رجحان دولت، شہرت، لوٹ مار اور مال غنیمت کا حصول تھا۔ وہ جہاں گیری کے دلدادہ تھے۔ خون بہانا، اپنا یا دوسروں کا ان کے لئے ایک مشغلہ تھا۔ لہٰذا اس پورے دور میں بلوچستان بھی کئی بار ان کی تاخت و تاراج کا شکار بنا۔

بلوچستان میں چونکہ ان وحشیوں کی لوٹ مار اور قتل عام کیلئے وافر وسائل دستیاب نہیں تھے لہٰذا ان کا زیادہ رخ سندھ، پنجاب، شمالی ہندوستان وغیرہ کی طرف رہا۔ اگر بغور دیکھا جائے تو یہ بھی ایک بہت بڑی یلغار تھی جو ایک طوفانی ریلے کی طرح وسط ایشیاء سے نکلا اور دہلی میں جاکر ایک عظیم الشان تہذیب کا بنیاد گزار بنا۔ مگر اس تہذیب کی بنیادوں میں ان وحشی خانہ بدوشوں نے لاکھوں انسانوں کا لہو شامل کیا۔

منگول اور بلوچستان:

منگول طوفان 13 ویں اور 14 ویں صدی عیسوی کے دوران، چائنا، وسط ایشیاء، ایران، افغانستان، مشرقی وسطیٰ، روس (یورپ) اور بلوچستان کیلئے تباہی، بربادی، آتشزنی، قتل و غارت گری خاک اور خون کا بھیانک پیغام لیکر آیا۔

اس زمانے میں خوارزم (وسط ایشیاء) میں ترکوں کا قبضہ تھا اور علاؤالدین خوازم شاہ یہاں کا تاجدار تھا۔ جبکہ بغداد میں عباسی خلافت قائم تھی۔ خوارزم شاہ کی سلطنت ایک طرف کوہ یورال سے خلیج فارس تک اور دوسری طرف دریائے سندھ سے لیکر دریائے فرات تک پھیلی ہوئی تھی۔

چنگیز خان جس کا اصل نام تموچن تھا منگولیا کے صحرا سے اٹھا اور اولاً صحرا گوبی کے مختلف اور آپس میں برسرِ پیکار تاتار قبائل کو شکست دے کر اپنے ماتحت کر دیا اور بعد ازاں اپنے بیٹوں، سالاروں اور وحشی منگول لشکر کے ساتھ چین کی عظیم الشان سلطنت کو تہہ و بالا کر ڈالا ایک اندازے کے مطابق ایک کروڑ اسی لاکھ سے زائد انسانوں کا صرف چین پر حملوں کے دوران قتل عام کیا (والکاٹ 2004: 24-27)۔ بعد ازاں چنگیز خان نے خوارزم شاہ سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ علاؤالدین خوارزم شاہ بھی چنگیز خان سے نفرت کرتا تھا اور منگولوں کا اس کے ملک میں آنا جانا اسے بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ لہٰذا نفرت کے یہ جذبات بہت جلد خونریز اور تباہ کن جنگوں میں تبدیل ہوگئے۔ 1219ء کے قریب چنگیز خان نے خوارزمی لشکر کو عبرت ناک شکست دی اور پھر مختلف مقامات پر شکست دیتا ہوا منگول سردار پورے خوارزم (وسط ایشیاء) پر قابض ہوا۔ علاؤالدین خوارزم شاہ گمنامی میں مر گیا اور جلال الدین بھی منگول فوج سے ایک جھڑپ میں مارا گیا۔ چنگیز خان کے لشکر نے خوارزم کے سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور لاکھوں انسانوں کو قتل کر کے ان کے سروں کے مینار بنوائے اور ظلم و ستم کی ایسی مثالیں قائم کیں جو اس سے پہلے کسی دور میں نہیں ملتی ہیں۔ بلوچستان کا بیشتر حصہ جو خوراز میوں کے زیر اثر تھا منگولوں کے ماتحت ہو گیا۔ ایک مؤرخ لکھتا ہے:

> قصدار (خضدار) سے بالیوس (بیلوس یعنی قندھار) صوبہ کے درمیان کے علاقے بشمول قلات نیچاری، شال (کوئٹہ، مصنف نے شال تحریر کیا ہے) اور مستونگ، کوہِ کاران (غالباً

خاران) کرمان اور اس سے ملحقہ علاقے چنگیز خان کے ماتحت آ گئے اور قرہ خطائے کے ہاتھ آئے (ریورٹی 1991 :802)۔

خوارزم شاہ کا بیٹا جلال الدین جو منگول فوج کے آگے آگے بھاگ رہا تھا نے سندھ کے حکمران ناصر الدین قباچہ کو شکست دے کر اسکی سلطنت اس سے چھین لی مگر منگول فوج بدستور اس کے پیچھے تھی۔ مؤرخین کے مطابق جلال الدین سندھ سے مکران کے راستے ایران چلا گیا اور چغتائی خان (چنگیز خان کا بیٹا) اپنے مسلح سواروں کے ساتھ اس کے پیچھے مکران سے ہوتا ہوا ایران جا پہنچا۔ 1221ء میں ہرات کو منگولوں نے پامال کیا۔ 1222ء میں منگولوں نے ہرات کو دوبارہ فتح کرکے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور ایک لاکھ ساٹھ ہزار سے زائد افراد کو قتل کر دیا۔ شہر کی تمام عمارتیں گرا کر اسے زمین کے برابر کر دیا۔ منگولوں نے سیستان، خراسان، وسط ایشیاء، ایران حتیٰ کہ جہاں بھی پہنچے کچھ بھی سلامت نہ چھوڑا اور سب کچھ تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ 1224ء میں منگولوں کا ایک گروہ مکران (پنجگور) میں داخل ہوا اور گرمیوں کا موسم پنجگور میں گزارا۔ ان کے ساتھ جتنے بھی قیدی تھے ان سب کو قتل کر دیا اور جب پنجگور میں وباء پھوٹ پڑی تو یہ لوگ یہاں سے نکل گئے۔ کرمان کے حکمران براق حاجب نے بھی منگولوں کی اطاعت قبول کی اور خراج ادا کرنے لگا۔ حتیٰ کے اس پورے خطے پر منگولوں نے قبضہ کیا۔ بلوچستان کا اہم اور قدیم علاقہ کیکانان (قلات) سمیت تمام وسطی بلوچستان بھی اس طوفان کی لپیٹ میں تھا۔ 1227ء میں چنگیز خان فوت ہوا اور اس کی جگہ فروری 1228ء میں اس کے بیٹے اوگدائی (اوغتائی) خان نے لے لی۔ ان کے دور میں منگول طوفان کسی حد تک تھم چکا تھا مگر مفتوحہ علاقوں پر ان کا قبضہ بر قرار تھا۔ یہ مفتوحہ علاقے آہستہ آہستہ انھی منگولوں میں تقسیم ہوتے گئے اور مختلف علاقوں پر ان کے اپنے ہی خاندانوں نے قبضہ کر کے اپنی آزاد اور خود مختار ریاستیں قائم

کرلیں۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ پھر ان میں کبھی بھی اتحاد قائم نہ ہوسکا اور وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے۔

1258ء میں ہلاکو خان نے مسلمانوں کے مرکز خلافت بغداد کو فتح کرکے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ لاکھوں انسانوں کو قتل کیا اور خلیفہ متعصم باللہ کو بھی قالین میں لپیٹ کر اس کا دم گھونٹ کر اسے قتل کر دیا (لینگر 1968: 52)۔ بعد ازاں ہلاکو خان نے مصر پر حملہ کیا مگر مصر کے سپہ سالار رکن الدین بیبرس نے مصری لشکر کے ساتھ مل کر اسے عبرت ناک شکست دی اور اس وحشی کو مصر سے بھگا دیا۔ اس کے بعد منگولوں نے ایران میں ایل خانی کے نام سے ایک ریاست کی بنیاد رکھی۔ انھیں ایل خانی اس لئے کہا جاتا تھا کیونکہ ہلاکو خان کو تاریخ میں ایل خان یا چھوٹا خان کہا گیا ہے اور یہ لقب اسے تاتاریوں نے دیا تھا۔

منگو خان نے خان مقرر ہونے کے بعد وسط ایشیاء، افغانستان اور شمالی بلوچستان کے بیشتر علاقے ملک شمس الدین کرت کے حوالے کئے۔ جس نے 1254-55ء میں ہرات پہنچ کر بلوچستان کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس طرح بلوچستان کا ایک حصہ اہل کرت کے ماتحت آیا جو منگولوں کے نامزد کردہ حکمران تھے۔ مگر بلوچستان کے بقایا حصے پر مختلف خاندانوں کی اجارہ داری قائم رہی جو تمام منگولوں کے باجگزار تھے۔ اہل کرت خاندان کے حکمرانوں نے مستونگ اور اس سے متصل علاقوں میں خون کی ہولیاں کھیلیں اور ہزاروں بے گناہوں کو قتل کیا، انھیں لوٹا اور ان کی املاک پر قبضہ کیا۔ وہ بار بار مستونگ پر حملہ کرکے اسے تہہ و بالا کرتے رہے۔ اہل کرت کی مستونگ اور باشندگان مستونگ پر کی جانے والی مظالم کی تفصیلات تاریخ نامہ ہرات سمیت مختلف تاریخی کتب میں ملتی ہیں۔ اسی طرح قلات، قندھار اور سبی پر بھی مختلف منگول خاندان بطور حاکم قابض رہے اور مقامی باشندوں کے ساتھ ان کی مخاصمت جاری رہی۔ آل کرت

خاندان کے دور میں سیستان سے بلوچ قبائل کی ایک بڑی مہاجرت ہوئی کیونکہ آل کرت کے ایک حاکم ملک شمس الدین سے بلوچ قبائل کے شدید اختلافات پیدا ہو گئے جس کی وجہ سے بلوچ قبائل نے بڑی تعداد میں ایران کے صحرائی علاقوں اور مکران کے پیچیدہ پہاڑی بھول بھلیوں میں پناہ لی۔ انہی قبائل کی یونین (اتحادیے) کو بعد ازاں رند ولاشار کے نام سے شہرت ملی۔

آل کرت خاندان بھی منگولوں سے تھے جن کے ایک حاکم ملک شمس الدین افغانستان اور وسطی بلوچستان پر حاکم بنایا پھر بعض علاقے بزور طاقت فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کیے۔ ملک شمس الدین کرت نے اہلیان، بلوچستان پر ظلم و جبر اور تشدد کا ایسا سلسلہ شروع کیا جس کی وجہ سے کئی برسوں تک یہ علاقے خاک وخون میں لوٹتے رہے اور یہاں کے باشندے یا تو منگولوں کے ہاتھوں مرتے رہے یا علاقہ چھوڑ کر دور دراز ممالک کی جانب فرار ہونے لگے۔ تاریخ نامہ ہرات کے مطابق بلوچوں کے کرد قبیلہ کے بعض زعمأ تو ملک شمس الدین کے ساتھ مل گئے مگر اکثر اُن کے خلاف لڑتے رہے۔ ملک تاج الدین کرد اور اس کے ہزاروں جنگجو ملک شمس الدین کرت کے ساتھ مل گئے جبکہ کردوں کا ایک اور دھڑا ان حملہ آوروں کے خلاف برسوں تک نبرد آزما رہا۔ ملک شمس الدین کرت کا خاص نشانہ بلوچستان کے درج ذیل علاقے تھے ۔ یعنی: مستونگ، تیری (مستونگ کا نواحی علاقہ جو اب بھی اسی نام سے معروف ہے) دُکی (علاقہ جات لورالائی و مضافات)، نوشکی اور اس کے مضافات جنہیں تاریخ نامہ ہرات کا مصنف قلعہ سنگی اور خیسار کے نام سے تحریر کرتا ہے اور بلوچستان کے وہ علاقے جو اب ضلع چاغی کے ساتھ متصل اور علاقہ افغانستان میں شامل ہیں۔ تاریخ نامہ ہرات کا مصنف یا ممکن ہے کہ مترجم نے ایک بنیادی غلطی یہ کی ہے کہ اکثر بلوچ زعمأ اور کرد اکابرین کو بھی افغان کا نام دیا ہے جبکہ علاقہ مستونگ کے باشندوں کو بھی افغان تحریر کیا ہے جو یقینا خطہ کی تاریخ اور یہاں کے باشندوں کی اصلیت سے

عدم واقفیت کا ثبوت ہے۔ دراصل علاقہ مستونگ ساتویں صدی ہجری میں دہوار قبائل اور کرد خاندانوں کے زیرِ اثر تھا۔ کردوں کے بارے میں ایک مستند رائے یہ ہے کہ وہ بلوچستان اور افغانستان سمیت ایک وسیع و عریض خطہ زمین پر اُس دوران حاکم تھے۔ کردوں کی مختلف خطوں پر حاکمیت کے بارے میں شواہد اور ثبوت عرب مورخین کی تحریروں میں بھی ملتے ہیں۔ ممکن ہے کہ تاریخ نامہ ہرات کا مصنف بلوچوں کے بارے میں ناواقف ہو جس کی وجہ سے انہوں نے بلوچ قبائل کو افغان تحریر کیا وگرنہ ان علاقوں میں جن قبائل کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ اب بھی بلوچ قوم میں موجود ہیں اور بعینیہ اسی نام سے جانے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مصنف کردوں کو افغان لکھتا ہے، سنجری (سنجرانی) قبیلہ کو بھی افغان تحریر کرتا ہے جو سیستان کے قدیم باشندے اور کسی وقت اس خطے کے حکمران بھی رہے تھے۔ اب بھی یہ قبیلہ سیستان کی زمین پر آباد ہے اور بلوچستان کے ضلع چاغی اور افغانستان کے صوبہ نیمروز میں آبائی زمینوں کا وارث ہے۔ چاغی میں اب بھی کئی قدیم قلعے اور واچ ٹاور ہیں جو افغانستان کی سرحد کے قریب اور اندرونِ افغانستان میں واقع ہیں جو سنجرانیوں کی ملکیت ہیں۔ نوشکی اور چاغی میں بھی کئی قلعے سنجرانی قبیلہ کے نام سے منسوب ہیں۔ یہ قبیلہ بلوچ قوم کا اہم ترین جُز شمار ہوتا ہے جو معتبر اور سابقہ حاکم خاندانوں میں شامل ہے۔ ملک شمس الدین کرت کی ان سے جنگیں ہوئیں اور انہوں نے علی مسعود سنجرانی (سنجری) کو دھوکہ سے ایک قلعہ میں بُلا کر قتل کر دیا (الھراوی 2009: 231)۔

المختصر یہ کہ جب ہلاکو خان نے بغداد کو برباد کرنے کے بعد مصر کا رخ کیا تو اسے شکست فاش ہوئی اور وہ پسپا ہو کر ایران آیا اور ایل خانی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اس کی حکومت میں دیگر علاقوں کے علاوہ موجودہ بلوچستان بھی شامل تھا۔ منگولوں کے ایک خاندان آل کرت کو افغانستان کے علاوہ بلوچ خطے کی حاکمیت دی گئی۔ انہوں نے بزورِ طاقت افغانستان، سیستان، بلوچستان اور

سندھ کو فتح کیا اور ایک عظیم الشان منگول مملکت کی بنیاد رکھی۔ ملک شمس الدین کرت مسلمان تھا مگر اس نے ظلم و جبر کی ایسی داستانیں رقم کیں کہ جن کی اس خطے میں نظیر نہیں ملتی۔ اس نے بار بار علاقہ مستونگ، تیری، خیسار و زنگی قلات (نوشکی و حدودِ نوشکی) علاقہ چاغی و نیمروز، سیستان اور بلوچستان کے کئی دیگر مقامات پر حملے کیے، خوب تباہی اور لوٹ مار مچائی۔ اس نے مزاحمت کرنے والوں کے علاوہ اُن لوگوں کو بھی مار ڈالا جو ہتھیار اٹھانے کے قابل بھی نہ تھے۔ وہ ان علاقوں کے شرفأاور زعمأ کو بلاامتیاز قتل کرتا اور ان کا مال و اسباب لوٹ لیتا تھا۔ تاریخ نامہ ہرات کے مطالعہ سے اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ بلوچ خطے کے اکثر باشندگان شمس الدین کرت کے ظلم و جبر اور تشدد و لوٹ مار سے خائف ہو کر اُس کے ساتھ مل گئے اور اُس کی اطاعت قبول کر لی۔ کیونکہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اُن کی موت یقینی تھی۔ اُس نے بغیر کسی وجہ کے سنجرانی سردار علی مسعود سنجری (سنجرانی) کو اس کے کئی زعمأاور رفقأسمیت قتل کر دیا اور سیستان کے تمام باشندوں کو غیر مسلح کر دیا۔ اس نے ان علاقوں کے امرأ اور غربأ کو بلاامتیاز لوٹا اور انہیں اپنا مطیع و منقاد بنایا۔ اس کی فوج میں منگول اور غوری تاجکوں کی تعداد کم تھی جبکہ بلوچوں اور بالخصوص قبیلہ کرد کے شمشیر زنوں اور جنگجوؤں کی تعداد زیادہ تھی۔ مگر اس کے کے باوجود بلوچ قبائل منگولوں کے زیرِ اثر تھے۔ اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ اگر ایک بار وہ ملک شمس الدین کو شکست بھی دے دیتے تو اُسے فوراً منگولوں کی جانب سے بھاری کمک مل سکتی تھی جب کہ مقامی باشندوں کو اضافی نفری یا کسی امداد و کمک کی کوئی امید نہ تھی لہٰذا وہ شمس الدین کی اطاعت پر مجبور تھے۔

چند کرد بلوچ امرأ ایسے بھی تھے جو شمس الدین سے سخت نفرت کرتے تھے اور اس کی حاکمیت کے نہ صرف خلاف تھے بلکہ اُس سے برسرِ پیکار بھی تھے۔ ان میں سے ایک میراں شاہ کرد اور دوسرا سالار کرد تھا جو ملک شمس الدین کے ایک اہم امیر ملک تاج الدین کرد کے

عزیزوں میں سے تھے۔ ملک شمس الدین خود کہتا تھا کہ اس وقت اس کے دشمنوں میں سالار سے زیادہ اہم اور طاقت ور آدمی کوئی نہیں (الھراوی 2009:249)۔

سالار انتہائی بہادر اور دلیر شخص تھا۔ اس نے قندھار سمیت افغانستان کے کئی قلعے فتح کیے تھے، ہندوستان پر حملے کیے۔ بقول سیف الدین الہراوی: وہ دوسو آدمیوں سے زیادہ طاقت ور تھا (الھراوی 2009:248) لہٰذا ملک شمس الدین اگر کسی سے خائف تھا تو وہ صرف اور صرف دو جنگجو ملک میراں شاہ کُرد (میر میریں کُرد) اور دوسرا ملک سالار کُرد (میر سالار کُرد) تھے۔ چنانچہ جب یہ دونوں بہادر اپنے اہل خانہ کے ہمراہ سیستان سے نکل کر مستونگ آئے جہاں سے اُن کا ارادہ مکران جاکر سمندر کے راستے مصر جانے کا تھا۔ جیسا کہ تاریخ نامہ ہرات کا مصنف لکھتا ہے۔ مستونگ میں ایک مقامی شخص ملک شمس الدین کی جانب سے اُس کا نائب مقرر تھا جس کا نام تاریخ نامہ ہرات میں پہلوان محمد نہی تحریر ہے ممکن ہے کہ یہ لفظ غلطی سے محمد نہی لکھا گیا ہو اور اصل لفظ محمد شہی ہو جو ایک قدیم مقامی قبیلہ ہے اور مستونگ ہی اُن کا قدیم آبائی علاقہ ہے۔ مصنف چونکہ بلوچستان سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ ہرات افغانستان کا باشندہ ہے لہٰذا یہ امکان ہے کہ انہوں نے غلطی سے یا محمد شہی کو نہ سمجھتے ہوئے محمد نہی تحریر کیا ہو۔ بہر حال اِن کے کہنے پر میراں شاہ اور سالار مستونگ میں رُک گئے اور اپنے مصر جانے کے فیصلے پر نظر ثانی کرنے لگے۔ پہلوان محمد نہی (پہلوان محمد شہی) نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں بحفاظت ملک شمس الدین کے پاس پہنچائے گا امید تھی کہ ملک شمس الدین انہیں خوش آمدید کہے گا مگر جب ملک شمس الدین کو اس کے نائب نے میراں شاہ کرد اور سالار کرد کی مستونگ میں اپنے ہاں موجودگی کی اطلاع دی تو اُس نے فوراً اُسے حکم دیا کہ دونوں کو فوری طور پر قتل کردو اس سے اچھا موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آسکتا۔ پہلوان محمد نہی حیران پریشان ہوا کیونکہ اُس نے ان کرد امیروں سے جان

بخشی اور ملک شمس الدین سے ان کو ملانے کا وعدہ کیا تھا اور اب ملک شمس الدین اُسے اُن کے قتل کا حکم دے رہا تھا۔ ڈر، خوف اور ملک شمس الدین کی ہیبت نے پہلوان محمد نہی کو غداری اور وعدہ خلافی پر مجبور کیا اور اس نے اپنے پانچ سو آدمیوں کے ساتھ مٹھی بھر کردوں پر حملہ کیا اور اپنے بیسیوؤں ساتھیوں کی قربانی کی بدولت ملک میراں شاہ کو قتل اور ملک سالار کو زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب ہوا جبکہ ان کے اہل خانہ اور خدام کو گرفتار کر کے غور ملک شمس الدین کے ہاں بھیج دیا (الھراوی 248:2009)۔ تاریخ نامہ ہرات کا ہر صفحہ منگول عہد بالخصوص ایل خانی دور میں بلوچوں کے خونِ ناحق سے تربتر ہے۔

مستونگ، کوئٹہ (شال) مشرقی بلوچستان، شمالی اور شمال مغربی بلوچستان کے علاوہ وسطی بلوچستان کا علاقہ بھی منگولوں کے زیر اثر تھا۔ جب تک منگول ایران سمیت اپنے دیگر مقبوضات پر قابض رہے اور دشتِ تاتار میں ان کا خاقان اور لومڑی کے نو دُموں والا پرچم ایک تھا تو منگول بھی متحد تھے۔ بالآخر وہ بھی قدرت کی ستم ظریفی اور قانونِ زوال کی زد میں آگئے۔ ان کا اتحاد و اتفاق بھی پارہ پارہ ہوا بالآخر انہیں زوال آگیا۔ پندرہویں صدی عیسوی میں جب انہیں زوال آیا تو وسطی بلوچستان سمیت بلوچ آبادی والے اکثر علاقوں میں بلوچ قبائل متحد و منظم ہونے لگے۔ لہٰذا مغربی بلوچستان، شمالی بلوچستان اور وسطی بلوچستان میں بلوچوں کے قبائلی اتحادیے وجود میں آتے گئے اور درج بالا علاقوں میں قبائلی تحفظات کے تحت مقامی قبائل نے اپنی حاکمیت قائم کی۔ اس طرح وسطی بلوچستان کے علاقہ سوراب میں کمبرانی قبیلہ نے اپنی حاکمیت کی داغ بیل ڈالی، مکران میں رند اور لاشار قبائل نے ایک مضبوط اور بڑی یونین قائم کی اور ایک منظم حکومت کی بنیاد ڈالی۔ مگر ان قبائل کی حاکمیت سے قبل قبیلہ ہوت کی دوسری اور تیسری حاکمیت کے بارے میں

مختصر طور پر بیان کرنا ضروری ہے جو منگول حملوں کے وقت اور بعد ازاں بھی مکران اور بلوچستان کے دیگر حصوں پر حاکم تھے۔

مکران کے ہوت قبیلہ کی دوسری اور تیسری حاکمیت:

ہوت بلوچوں کا ایک قدیم قبیلہ ہے کہ جن کی ابتداء ہی سے مکران میں اقامت کے آثار و شواہد ملتے ہیں۔ اس قبیلہ نے ابتدائی تاریخی ادوار سے ہی تاریخ میں بڑا نام پیدا کیا۔ یہی وہ قبیلہ ہے کہ جسے یونانی مورخین یوت یا یوتی، اور یتائی عرب مورخین زط، الزط، ہوت الہوت، فارسی مورخین جت جبکہ مقامی براہوئی زبان بولنے والے بلوچ باشندے انہیں جتگال اور سندھ کے باشندے انہیں جاموٹ وغیرہ تحریر کرتے ہیں۔ ابتدائے تاریخ سے ہی اس قبیلہ کا تذکرہ مکران کی سرزمین پر ملتا ہے۔ اس قبیلے کے جنگجوؤں نے خطہ کے دیگر قبائل کے ساتھ مل کر قدیم ایرانی، یونانی اور عرب یلغاروں کا مقابلہ کیا اور برسوں تک بیرونی حملہ آوروں کے خلاف دادِ شجاعت دیتے رہے۔

ہوت قبیلہ جو دورِ جدید میں مکران و بیلہ سمیت سندھ، پنجاب اور ہندوستان کے کئی شہروں اور علاقوں میں آباد ہے حتیٰ کہ سندھ، پنجاب اور خیبر پختونخواہ میں یہ کئی ذیلی قبائل میں منقسم ہے۔ ہوت اور مید قبائل کو مکران میں گو کہ وسیع اختیارات حاصل تھے مگر ان کے دور کے سیاسی نظام اور امور ریاست کی تفصیلات کتب میں مذکور نہیں ہیں البتہ مؤرخین ان کی آزاد روی اور جنگجویانہ فطرت کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کرتے ہیں۔ خصوصاً عرب دور میں ان قبائل نے مکران کی عسکری تاریخ میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔

گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں مکران پر ہوت قبیلہ کی حکمرانی کی تصدیق مشہور رومانوی داستان سسی پنوں سے بھی ہوتی ہے۔ شہزادہ پنوں مکران کے حکمران میر (جام)

عالی ہوت کا بیٹا تھا اور یہ واقعہ مستند شواہد کے مطابق 1167ء میں پیش آیا تھا (بلوچ 2014: 93-83) جبکہ یہ عباسی خاندان کی خلافت کا زمانہ تھا۔ اس اہم ثبوت کے بعد بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب عربوں نے مید قبائل کی زیرِ حاکمیت علاقوں پر مسلسل حملے کر کے ان کی طاقت کمزور کی تو مختصر عرصہ میں ہی ہوت قبیلہ طاقت پکڑنے لگا اور مکران سمیت بلوچستان پر اپنی حاکمیت قائم کی۔ میر عالی خان اور اس کے خاندان کے بارے میں تحقیق جاری ہے۔ امید کہ اس حاکم خاندان کے دیگر حکمرانوں کے نام اور ان کے پورے دورِ حکومت کی تفصیلات تلاش کرنے میں کامیابی ہو گی۔

گیارہویں اور بارہویں صدی کے دوران مکران کے وسطی علاقوں یعنی کیچ مکران میں ہوت قبیلہ کی حکمرانی کی ٹھوس اور ناقابلِ تردید شہادت اور گواہی عشق و محبت اور اخلاص و وفا کی وہ عظیم داستان ہے کہ جسے ہر خاص و عام داستانِ ''سسی و پنوں'' کے نام سے جانتا ہے۔ اس داستان کے بارے میں سب سے پہلے منظوم انداز میں معلومات مشہور صوفی شاعر ہاشم شاہ نے پنجابی زبان میں فراہم کیں۔ ہاشم شاہ اس طویل منظوم داستان میں سسی کو بھنبور یعنی سندھ جبکہ پنوں کو کیچ مکران کا شہزادہ کہتا ہے اور اسے کیچ کے حکمران میر عالی ہوت (ہاشم شاہ انہیں جام عالی ہوت لکھتا ہے) کا بیٹا لکھتا ہے۔ ہاشم شاہ کی یہ منظوم داستان بہت جلد شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگی اور زبانِ زدِ عام ہو گئی۔ ہاشم شاہ نے اس اہم واقعہ کا عرصہ یا سال و سنہ بیان نہیں کیا۔ بعد ازاں سندھ بلکہ برصغیر کے مشہور صوفی بزرگ اور قافیہ گو شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی نے بھی اپنی شاعری میں اس داستان کو جگہ دی کہ جس کی وجہ سے ہر خاص و عام اس واقعہ سے آشنا ہو گئی۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی بھی سسی کو بھمبور جبکہ پنوں کو کیچ مکران کا باسی تحریر کرتا ہے۔ اسی طرح میر عالی ہوت کو جام کا لقب دیتا ہے۔ اس میں کوئی اچھنبے یا حیرت و پریشانی کی بات نہیں ہے کیونکہ

سندھ میں حاکم یا سردار کے لیے عام طور پر لفظ ''جام'' استعمال ہوتا ہے۔ اسلامی عہد میں سندھ کے حکمرانوں کا لقب بھی جام ہوتا تھا جیسا کہ بلوچستان کے حکمران یا سربراہ میر کہلاتے تھے۔ لہٰذا شاہ عبداللطیف بھٹائی اور ہاشم شاہ نے اگر میر عالی ہوت کو جام کا لقب دیا ہے تو اس کا مطلب حکمران ہے۔ پنوں بلاشبہ کیچ کے حکمران میر عالی ہوت کا بیٹا تھا مگر شاہ نے بھی اس واقعہ کا سال و سنہ نہیں دیا۔ ہاشم شاہ کے کلام کی تشریح اور اس تمام داستان پر تحقیق عقیل ہاشمی نے کی ہے اور وہ بھی بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اس داستان کے ہیرو کا تعلق مکران کے حاکم خاندان ہوت سے تھا اور وہ میر عالی ہوت (مصنف نے سلطان علی خان تحریر کیا ہے) کا سب سے کمسن اور لاڈلا بیٹا تھا (عقیل 23:2002)۔ اسی طرح اس داستان پر سندھ کے مشہور محقق، تاریخ دان پروفیسر ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے بھی کافی تفصیلی کام کیا ہے کہ جو اس لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ انہوں نے اس واقعہ کا سال و سنہ بھی تحریر کیا ہے کہ جو ان کے مطابق بارہویں صدی عیسوی کا زمانہ تھا اور یہ مشہور واقعہ کہ جس میں سسی اور پنوں کی جان چلی گئی تھی 1167ء میں پیش آیا تھا (بلوچ 2014:83-93)۔

بعض عرب مؤرخین بھی منگول حملوں کے دوران مکران پر بلوچ قبیلہ ہوت کی حکمرانی کا تذکرہ کرتے ہیں کہ جنہیں وہ ہوت یا الہوت بھی تحریر کرتے ہیں اور بعض اوقات انہیں زط یا الزط لکھتے ہیں کہ جو یقیناً مقامی لفظ ہوت کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

یہ دور نہ صرف بلوچستان کے حدود میں بلکہ تمام ایشیا میں انتشار اور نفسا نفسی کا دور تھا کیونکہ صحرا گوبی کے وحشی انسانوں کے ایسے لشکروں نے مہذب دنیا پر حملہ کر دیا تھا کہ جو تہذیب و تمدن سے مکمل طور پر ناآشنا تھے کہ جنہوں نے شاہی قصر و محلات اور عظیم الشان عبادت گاہوں کو گھوڑوں کے اصطبل میں تبدیل کر دیا کہ وہ ایسے لوگ تھے کہ جو گھوڑوں کی ننگی

پیٹھ پر خود ایک لنگوٹ باندھ کر بغیر کسی زادِ راہ کے طویل مسافتیں مختصر وقت میں طے کرتے تھے۔ جن کی خوراک گھوڑی کا دودھ اور گھوڑوں کا خون ہوتا تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے گھوڑوں کی پیٹھ میں چھوٹا سا زخم لگا کر اس سے گھوڑے کا خون چوستے تھے اور اپنی بھوک مٹاتے تھے۔ وہ ایسے لوگ تھے کہ جو محلات اور آبادیوں کو جلانے اور مقتولین کے کٹے ہوئے سروں کے مینار بنا کر بے پناہ خوشی محسوس کرتے تھے اور یہ منگول تھے تاریخ ہی نہیں بلکہ ہر وہ شخص کہ جو سوجھ بوجھ رکھتا ہے یا کسی حد تک تعلیم یافتہ ہے وہ منگولوں کے ظلم و ستم، چنگیز خان اور ہلاکو خان کی ہلاکت خیزیوں سے ضرور آشنا ہوگا۔ حتیٰ کہ یہ قوم اور اس کے وحشی سردار چنگیز خان اور ہلاکو خان ظلم و جبر کی علامت اور ضرب المثل بن گئے۔

منگول طوفان کے دوران دنیا بھر کی سیاست، جغرافیہ، معاشرت، ثقافت، تہذیب، تمدن، ادب حتیٰ کہ سب کچھ تباہ و برباد ہوا۔ لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کا لہو بہایا گیا اور سینکڑوں شہروں کو جلا کر خاکستر بنا دیا گیا۔ منگول لائبریریوں کے سب سے بڑے دشمن تھے لہٰذا ہلاکو خان نے بغداد میں کروڑوں کتابوں کو جلا کر مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ اُس زمانے کے ادب کو بدترین اور ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اسلامی خلافتِ عباسیہ کا خاتمہ ہوا اور دنیا بھر میں سیاسی و جغرافیائی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔ لہٰذا مکران بھی ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ جہاں اسلامی خلافت اور خوارزم و چائنا کی عظیم سلطنتیں منگول طوفان کا مقابلہ نہ کر سکیں تو پھر مکران کے علاقائی حکمران اس طوفان کا کیا مقابلہ کرتے۔ لہٰذا اس طوفان کے دوران مکران سیستان اور کرمان سے آنے والے لوگوں کا دارالہجرت بن گیا۔ چونکہ یہ دور ایک طوفانی اور تباہ کن دور تھا جس نے سابقہ تمام ادبی و تاریخی سمیت ہر طرح کی دستاویزات کو جلا کر مٹا دیا۔ اگر ہوت قبائل کی مکران میں اس طوفانی دور میں موجودگی اور سیاسی قوت کے طور پر کچھ تذکرے ملتے بھی ہیں تو

وہ تاتاری طوفان سے بچ جانے والا ریکارڈ ہے یا پھر منگولوں کے گزر جانے کے بعد تحریر کی گئی کتب وغیرہ ہیں کہ جن میں اختصار کے ساتھ مکران کے باشندوں کے لیے ہوت یا الہوت، زط یا الزط مید یا المید کے الفاظ تحریر ملتے ہیں وگرنہ اس دور کی زیادہ تر تاریخ اور حکمرانوں کی تفصیل پردہ اخفا میں ہے۔

بعض شواہد یہ بات آشکار کرتے ہیں کہ ہوت قبیلہ منگول حملوں کے دوران مکران سمیت بلوچستان کے وسیع و عریض خطے پر حاکم تھا۔ جب مید یعنی بنو مادان کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو ہوت قبائل نے گیارہویں صدی عیسوی میں ہی طاقت پکڑ لی اور مکران سمیت ایک وسیع و عریض خطے کو فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کیا۔ یہ بات بھی ذہن نشین ہو کہ ہوت قبائل کی قلمرو میں صرف بلوچ آبادی والے علاقے تھے یعنی وہ ایک قومی حکومت تھی جس میں بلوچ قبائل شامل تھے۔ منگول حملوں کے بعد ہی ان قبائل کی ایک بڑی تعداد مشرق کی جانب مہاجرت کر گئی اور سندھ و پنجاب کے خطوں پر آہستہ آہستہ اپنی اجارہ داری قائم کی۔

بلوچستان سے مشرق کی جانب ابتدائی مہاجرت یعنی تقریباً تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی کے دوران ان قبائل نے سندھ میں ڈیرے ڈالے جبکہ بعد ازاں یہ پنجاب کی جانب پھیلتے چلے گئے۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات شنید میں آتی ہے کہ ہوت قبائل کی بعض شاخوں مثلاً ٹالبر یا تالپور اور دودائی نے سندھ اور جنوبی پنجاب سمیت خیبر پختونخواہ میں شامل بعض علاقوں پر بھی اپنی سیادت قائم کی اور ایک وسیع و عریض خطہ اپنے تصرف میں لے آئے (قادری سال اشاعت ندارد :163)۔

جہاں پنجاب، سندھ اور خیبر پختونخواہ میں ہوت قبائل کی حکومتوں اور سیاسی و عسکری سرگرمیوں کے تذکرے کتب تواریخ میں تسلسل کے ساتھ ملتے ہیں تو ایسے ہی اندرونِ بلوچستان بھی ہوت قبائل کی کئی نشانیاں اور ازبر داستانیں ملتی ہیں۔ کوئٹہ کے مغرب میں واقع مشہور شہر نوشکی میں ریت کا ایک بڑا ٹیلہ ہے کہ جسے ہوتان (ہوتوں کا ٹیلہ) کہتے ہیں۔ ریت کے اس عظیم

انبار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے نیچے ایک بڑا شہر یا قصبہ دفن ہے۔ اس شہر یا قصبہ کی ایک دیوار یا کسی برج کے آثار بھی اس ٹیلے پر پائے جاتے ہیں۔ اس کا تحریری تذکرہ کہیں نہیں ملتا مگر عام لوگوں کا مکمل عقیدہ ہے کہ اس ٹیلے کے نیچے ایک بڑا قصبہ دفن ہے کہ جو کسی زمانے میں کوئی قلعہ بند شہر ہوتا تھا۔ اس ٹیلے کے بارے میں بلوچستان سٹڈی سنٹر کے 2013ء کے جرنل میں ایک آرٹیکل بھی چھپ چکا ہے کہ جس میں پہلی بار اس ٹیلہ، اس کے نام اور اس میں دفن شہر یا قصبہ کے بارے میں انکشاف ہوا تھا (بلوچ 2013. Vol:1 :59-76)۔ اس ٹیلہ کے نام سے ہی اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ یہ خطہ بھی کبھی ہوت قبائل کے قبضہ و اختیار میں رہا ہے۔ بلوچی رندی شاعری میں بھی ہوت قبیلہ کو اہم مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ جیسا کہ بلوچ شاعر کہتا ہے کہ:

"ہوت نندیں مکران ءَ کھوسغ ما کیچ ءَ ھا
ہوت و کورائی اواراں اے ماں لاشارِ گھڑئنت
دریشک و ہوت و مزاری اے گوں رندءِ یک سرئنت"
(بلوچ 1977: 463,464)

ترجمہ:

ہوت مکران میں آباد ہیں کھوسہ (قبیلہ) کیچ (تربت میں)
ہوت اور کورائی یکجا ہیں یہ لاشار کے گھرانے (شاخ) سے ہیں
دریشک و ہوت اور مزاری یہ رند کے ساتھ ہیں

اس طرح کے سینکڑوں اشعار ہیں کہ جو بلوچوں کے اس اہم اور قدیم ترین قبیلہ کی تعریف و ثنائ کے ساتھ ساتھ ان کی تاریخ بھی بیان کرتے ہیں۔ ہوت و مید قبائل کی قدیم تاریخ پر مزید کام کی ضرورت ہے ممکن ہے کہ اس تلاش میں ان کی حقیقی تاریخ کے آشکار ہونے کے ساتھ ساتھ کئی دیگر غلط العام مفروضوں کی بھی تردید ہوسکے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ مکران پر پرتگیزیوں کے حملوں اور ان کے خلاف مکران کے شہزادے حمل جیئند کی جانثاری کی داستان اور ساحلی علاقوں پر اس کی حاکمیت کے بارے میں اختصار کے ساتھ کچھ بیان کیا جائے کیونکہ یہ دراصل ہوت قبیلہ کی تیسری حاکمیت کا دور تھا جس میں اس قبیلہ نے دیگر قبائلی جنگجوؤں کے ساتھ مل کر اپنے نیلے پانیوں کی حفاظت کی اور حملہ آور پرتگیزیوں کو اپنے خطے پر قبضہ کرنے سے روکے رکھا۔

سلطنت عثمانیہ کے دوران یعنی چودھویں اور پندرہویں صدی عیسوی میں بھی مکران کے بیشتر حصوں پر ہوت اور کلمتی قبیلہ (بندرگاہ کلمت کی وجہ سے یہ قدیم باشندے کلمتی کہلائے اور اب تک اسی نام سے موسوم ہیں۔ یونانیوں نے ساحلِ مکران پر ایک بندرگاہ کا نام کلما تحریر کیا ہے اصل میں یہ قدیم ہوت قبائل ہی ہیں اپنے مرزبوم کی وجہ سے کلمتی کہلاتے ہیں) کی حکومت قائم تھی کہ جنہوں نے ساحلِ مکران پر حملہ آور پرتگیزیوں کے طاقت ور بحری بیڑے کا مقابلہ کیا تھا۔ ان خونریز اور تباہ کن جنگوں میں مشہور بلوچ مزاحمتی کردار حمل جیئند تاریخ کے صفحات کی زینت بنا، جو کہ کلمتی ہوت قبیلہ کا حکمران یا ولی عہد تھا (نصیر 1976 :228)۔ ان کے ساتھ مشہور کردار الن ہوت کا تھا کہ جسے پرتگیزی النوتی کے نام سے یاد کرتے ہیں (صابر:153-169)۔

پرتگیزی جہازراں سولہویں صدی میں اپنی نوآبادیات کو وسعت دینے کی خاطر ہندوستان کے ساحلوں کی جانب روانہ ہوئے۔ یہ ملاح اور جہازراں اس مقصد کی خاطر ہندوستان اور اس سے ملحق کئی دیگر ساحلی علاقوں پر حملہ آور ہوئے۔ دراصل اولین پرتگیزی جہازراں واسکوڈے گاما ایک مسلمان عرب جہازراں احمد بن ماجد نجدی کی سربراہی میں ساحل مکران کی مشہور بندرگاہ پسنی پر لنگرانداز ہوا اور سامانِ خورد و نوش اور تازہ پانی حاصل کیا۔ یہ پرتگیزیوں کی مکران کے ساحلوں پر پہلی آمد تھی۔ اس واقعہ کے بعد کئی دیگر پرتگیزی ملاح ان ساحلوں کی

جانب آنے لگے۔ مؤرخین کے مطابق 1515ء سے لے کر 1581ء تک پرتگیزیوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا (میکا نگی 1996: 686)۔ یہی وہ حملہ آور تھے کہ جن کے خلاف بلوچی شاعری کا ہیرو حمل جیئند کلمتی لڑتا ہوا شہید ہوا تھا۔ جن کی بہادری اور سرفروشی کی داستانیں بلوچی زبان و ادب کا اہم ترین سرمایہ ہیں۔ بعض تاریخی ذرائع کے مطابق جب پرتگیزی ہندوستان کے ساحلوں پر جم گئے تو 1506ء میں پرتگال کے بادشاہ عمانوئیل نے ڈان فرانسکو ڈی المیڈا (Don Francisco De Almeida) (لینگر 1968 تھرڈ ایڈیشن :129) کو ہندوستانی ساحلی مقبوضات کا وائسرائے مقرر کیا تو انہوں نے بقول مؤرخین:

> "خلیج فارس سے لے کر ہندوستان تک کے جنوبی ساحلی علاقوں کو تین وحدتوں میں تقسیم کر دیا تاکہ ان پر حکومت کرنے میں آسانی ہو۔ پہلا حصہ بحیرہ احمر سے لے کر خلیج فارس تک کے علاقوں پر مشتمل تھا۔ دوسرے میں راس جاکس (Cape Jacques) سے لے کر دریائے سندھ کے دھانے تک کے علاقے شامل تھے جو کہ ساحل مکران کے تمام شہروں گوادر، کلمت اور دیبل پر مشتمل تھا۔ تیسرا اور آخری حصہ دیبل سے لے کر گجرات تک پھیلا ہوا تھا" (بلوچ 2009: 211-212)۔

انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم کا مصنف لکھتا ہے کہ:

> "پرتگیزیوں نے فرانسکو ڈی المیڈا کے زیرِ سرکردگی ہندوستان اور مصری بیڑے کو دیو کے مقام پر تباہ کر ڈالا، جس نے ایک سال قبل (1509ء) چاؤں کے مقام پر پرتگیزی جہازوں کے ایک حصے کو شکست دی تھی۔ انہوں نے گوا لے لیا اور کوچین کی بجائے (1510ء) میں گوا کو صدر مقام بنا لیا" (لینگر، 1968، تھرڈ ایڈیشن: 129)۔

پرتگیزی حملہ آور پیشے کے لحاظ سے قزاق تھے اور وہ سمندروں میں مال بردار جہازوں کو اور ساحلی علاقوں میں آبادیوں کو اپنی ترکتازیوں اور لوٹ مار کا نشانہ بناتے تھے۔ انہیں جب بھی کبھی خوراک، مال و اسباب یا پانی کی ضرورت پڑتی تھی تو چھوٹے ساحلی قصبوں اور شہروں پر حملہ

آور ہوتے اور انہیں بری طرح پامال کرتے تھے۔ اگر بفرض محال انہیں ساحلوں پر تازہ پانی نہ ملتا تو وہ کنویں کھدوا کر پانی حاصل کرتے تھے۔ یہ چھوٹی ساحلی بستیوں پر اچانک حملہ آور ہوتے اور لمحوں میں کشت و خون کا بازار گرم کرتے۔ چونکہ وہ پیشہ ور ملاح اور جنگجو تھے اور انہیں قتل عام کرنے کا ایک وسیع تجربہ تھا لہٰذا وہ اپنے اچانک اور وحشیانہ حملوں کی وجہ سے بدترین ہنگامہ خیزی برپا کرتے۔ مقامی باشندے ان حملہ آور اقوام سے خوفزدہ ہو کر اندرونِ ملک فرار ہو جاتے اور یہ بحری قزاق زیادہ آزادی کے ساتھ آبادیوں کو لوٹ لیتے اور انہیں پامال کر کے واپس ہو جاتے اور کچھ عرصہ بعد دوبارہ اپنی تمام تر خونریزیوں کے ساتھ لوٹ آتے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب سلطنت عثمانیہ کا عروج تھا اور ان کی فوجیں اندرونِ یورپ پہنچ چکی تھیں۔ عثمانی ترک افواج سمندروں کو عبور کر کے یورپ کے اندر دور دور تک پہنچ چکی تھیں اور مشرقی و وسطی یورپ کے وسیع حصے پر قابض ہو چکے تھے۔ یورپ کے جہاز ان سمندروں میں دندناتے پھرتے تھے اور نیلے پانیوں پر راج کرتے تھے۔ ان کی زد میں آنے والا کوئی بھی مال بردار یا مسافر جہاز یا کشتی محفوظ نہیں تھی۔ وہ اپنے لاتعداد جہازوں اور کشتیوں کے ساتھ بحرہ روم اور بحرِہند میں مٹر گشت کرتے رہتے تھے اور بلاامتیاز جس بھی چھوٹے قصبہ یا شہر پر ان کی نظر پڑتی تو ابتدائی معلومات کے بعد اس پر حملہ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کیا جاتا۔ اسی طرح اندرونِ سمندر بھی ان کا دیگر جہازوں کے بارے میں یہی فیصلہ ہوتا تھا۔ اکثر و بیشتر وہ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں حملہ آور ہو جاتے اور بے تحاشہ خونریزی اور لوٹ مار کرتے۔ حتیٰ کہ مسلمان حجاج کے سمندری قافلے بھی ان کی ترکتازیوں سے محفوظ نہ تھے۔ مسلمان حجاج کے بری و بحری قافلے مکران اور ساحل مکران سے ہو کر گزرتے تھے۔ سندھ و ہند اور سری لنکا سمیت مشرقِ بعید کے مسلمان حجاج کے یہ قافلے سمندروں میں اکثر و بیشتر ان پرتگیزی قزاقوں کی لوٹ مار کی زد میں آجاتے۔ ان

قزاقوں کی آئے دن کی لوٹ مار اور خون ریزیوں سے خلافت عثمانیہ کی پریشانی بڑھ گئی اور انہیں مجبوراًان قزاقوں کی گوشمالی کے لیے مہم جوئی کرنی پڑی کیونکہ حجاج کے قافلوں کے نگرانی کی ذمہ داری خلافت کے سر تھی کہ جو اس زمانے میں عثمانی ترکوں کے پاس تھی۔ ہندوستان کے اکثر ساحلوں پر پرتگیزی قابض تھے اور ہندوستان کے مغل حکمران کے پاس نہ تو وہ بحری قوت تھی کہ جس کی مدد سے پرتگیزیوں کا مقابلہ کیا جاتا اور نہ ہی ان میں اتنی قابلیت تھی کہ وہ ان حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے۔ ہندوستان کے اندرونی کشیدہ حالات نے بھی ان یورپی حملہ آوروں کو ان ساحلوں پر قدم جمانے کا موقع فراہم کیا۔ ان حالات میں عثمانیوں کے لیے ضروری ہوگیا تھا کہ ان لٹیروں کا سدِباب کیا جائے۔ لہٰذا 1538ء میں پہلی بار عثمانی ترکوں نے ہندوستانی گجرات کی افواج کے ساتھ مل کر دیو کے قلعہ پر حملہ کیا کہ جس پر 1535ء میں پرتگیزی قابض ہوگئے تھے مگر پرتگیزیوں نے اس حملے کو ناکام بنایا اور آٹھ سال کی جنگوں یعنی 1546ء تک ان مشترکہ افواج کا مقابلہ کرتے رہے اور ان کے حملے کو بالآخر ناکام بنایا (لینگر 1968، تھرڈ ایڈیشن: 131)۔ اس حملے میں ناکامی کے بعد خلافت عثمانیہ نے حجاج کرام کے جہازوں کی حفاظت کے لیے اپنے امیر البحر کو مقرر کیا اور انہیں ساحلِ مکران کی جانب بھیجا۔ اس حوالے سے ایک مصنف لکھتا ہے کہ:

> ”سلطنت عثمانیہ کے خلیفہ سلیمان قانونی نے ان جہازوں کی حفاظت کے لیے اپنے امیر البحر سدی علی رئیس کو ساحل مکران بھیجا تاکہ وہ ان پرتگیزیوں کو قرار واقعی سزا دے سکیں جو کہ آئے دن ان حجاج کرام کے جہازوں کو لوٹتے رہتے تھے۔ انہوں نے امیر البحر کو حکم دیا کہ وہ مکران کے حاکم ملک جلال کے پاس جائے تاکہ وہ اس ضمن میں خلیفہ کے جہازوں کی حفاظت کے حوالے سے ان کی مدد کرسکے۔ اس کے علاوہ ان جہازوں کی مرمت کے حوالے سے انہیں مکران کے حاکم کی مدد بھی درکار تھی“ (بلوچ 2009: 211-212)۔

سلطنت عثمانیہ اور پرتگیزیوں کے مابین ایک خونریز بحری جنگ کے واقعات اور اس میں مکران کے کردار کے بارے میں حمید بلوچ، بدل خان صابر کے حوالے سے لکھتا ہے کہ:

”ساحل مکران کی طرح بحر ہند بھی اس زمانے میں ان دو بڑی طاقتوں کا رزم گاہ بنا رہا جو آئے دن ایک دوسرے سے مد مقابل ہوتے تھے۔ سلطان سلیمان کے لیے بحر ہند پر اپنی بالادستی کو برقرار رکھنا ضروری تھا کیونکہ وہ مسلمانانِ عالم کا خلیفہ تھا جس کے قلمرو میں حجاز مقدس بھی شامل تھا۔ دنیا کے مختلف ممالک سے حجاج کرام ان مقدس زیارتوں سے باریابی کے لیے ہر سال جاتے تھے اور دوسری جانب پرتگیزی جن کی بحری قوت سلطنت عثمانیہ سے زیادہ مضبوط تھی اور وہ ہر قیمت پر ان علاقوں میں اپنی بالادستی قائم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ان دونوں طاقتوں کا ٹکراؤ مسقط کے ساحل کے قریب ہوا۔ اس زمانے میں خلافت عثمانیہ کے بحری بیڑے کی سربراہی امیر البحر سدی علی رئیس کر رہے تھے اور دوسری جانب پرتگیزی بیڑے کی رہنمائی وائسرائے افانسو دے نورونا (Afonso De Noronha) کے بیٹے فرنانڈو (Fernando) کر رہے تھے۔ ترکی جنگی سنگار (بحری بیڑہ) میں پندرہ جنگی جہاز تھے۔ اگست 1554ء میں ان دونوں بڑی طاقتوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور اس جنگ میں ترکی کے بحری بیڑے کو شدید نقصان پہنچا اور انہیں جنگ میں شکست ہوئی۔ سدی علی رئیس کے بیڑے میں شامل چھ جہاز سمندر برد ہو گئے۔ اور وہ اپنے باقی ماندہ نو جہازوں کو لے کر مکران کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ چونکہ وہ ساحلی علاقوں سے اچھی طرح واقف نہ تھا لہٰذا انہوں نے مکران کے ساحلی باشندوں سے مدد چاہی۔ مکران کے ساحلی باشندوں نے سدی علی کی مدد کی اور وہ ساحلی باشندوں کی مدد سے گوادر پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ گوادر کے مقامی حکمران نے خلیفہ سے اپنی وفاداری کا اعادہ کیا اور ترکی کے امیر البحر کی ہر طرح سے مدد کی“ (بلوچ 2009: 213)۔

ایک مغربی وقائع نویس بھی ان واقعات کی تفصیلات بیان کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ:

”26 رمضان 961ھ بمطابق 25 اگست 1553ء میں گوا کے رئیس البحر جو کہ اس علاقہ کے پرتگیزی گورنر کا بیٹا تھا اپنے جنگی جہازوں جو کہ رنگ برنگے پرچموں سے مزین تھے، کے ساتھ مسقط کی بندرگاہ میں مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے نکلا۔ عثمانی خلافت کے مسلمان جہازی خدا کے بھروسہ پر مسقط کے ساحل کے قریب لنگر انداز ہو کر ان کا انتظار کر رہے تھے۔ دشمن کی کشتیوں نے عثمانی خلافت کے بحری بیڑے پر حملہ کی شروعات کیں اس کے بعد دونوں اطراف سے آگ کے گولے برسائے جانے لگے۔ جب رات ہونے لگی تو ان حملوں میں تندہی آگئی اگرچہ پرتگیزیوں کی کشتیاں لنگر انداز تھیں لیکن وہ اس جنگ سے کافی تھک چکے تھے لہٰذا عثمانی خلافت کا بحری عملہ اپنی کشتیوں کو دھکیلتے ہوئے ساحلِ مکران کی طرف روانہ ہوئے۔ اس طرح وہ راس جاسک (جاشک) تک پہنچے اس کے بعد جاسک سے آگے چاہبار تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ یہاں انہیں پانی بھی ملا اور وہ مقامی ناخدا کی مدد سے گوادر بندر جا پہنچے۔ گوادر کا گورنر ملک دینار اوغلی جلال الدین تھا وہ آگے بڑھا اور انہوں نے کشتیوں کی نقصانات کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد انہوں نے سلطان کے جہازرانوں کو تمام سہولتیں بہم پہنچائیں اور ان کے ساتھ ساٹھ یا ستر کے قریب سامان سے لدی ہوئے کشتیاں ہمراہ کیں اور انہیں ہرمز تک پہنچایا“ (بلوچ 2009:213-214)۔

اس واقعہ اور ترکی امیر البحر کی مدد نے بلوچوں اور پرتگیزیوں کے مابین دشمنی پیدا کی اور انہوں نے مکران کے ساحل کی اہمیت کے پیش نظر اس پر قبضہ کرنا ضروری خیال کیا۔ وہ مکران کے ساحل کی جنگی اور تجارتی اہمیت جانتے تھے۔ خصوصاً جنگی نقطہ نگاہ سے اس طویل ساحلِ سمندر پر واقع لاتعداد جزیرہ نما اور سمندری ٹاپو بڑی اہمیت کے حامل تھے کہ جہاں نہ صرف جنگوں میں نقصان خوردہ جہازوں کی مرمت باآسانی کی جاسکتی تھی بلکہ ان ٹاپوؤں کو بطور نگران چوکیوں کے بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ یہ بطور بحری اڈے کے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں جب ساحلی بلوچوں نے سلطنت عثمانیہ کے شکست خوردہ بیڑے کی کھل کر مدد کی اور اسے اپنی

نگرانی میں محفوظ مقام تک پہنچایا جس سے بلوچوں اور خلافت عثمانیہ کے ترکوں کے مابین انتہائی خوشگوار تعلقات قائم ہوئے، تو یہ بات پرتگیزی حملہ آوروں کو سخت ناگوار گزری اور انہوں نے فی الفور ساحلِ مکران پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس دوران ایران میں صفوی بھی ایک بڑی طاقت بن چکے تھے مگر سلطنت عثمانیہ کے سامنے ان کا بس نہیں چل سکتا تھا۔ وہ بھی ساحل مکران پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے اور خصوصاً گوادر بندرگاہ کو اپنے قبضہ میں لانے کے خواہاں تھے۔ پرتگیزی اور صفوی الگ الگ قوت کے طور پر سلطنت عثمانیہ کے سامنے ٹک نہیں سکتے تھے۔ دونوں اپنے لیے حلیفوں کی تلاش میں تھے۔ لہٰذا اس واقعہ نے ان دونوں طاقتوں میں قربت پیدا کی جو سفارت کاری کا موجب بنی۔ خلیج فارس اور اومان گزیٹئیر میں ان بظاہر سفارتی تعلقات کی تفصیلات موجود ہیں۔ جن کے مطابق 1515ء میں جب پرتگیزیوں نے ہرمز پر قبضہ کر لیا تو ایران کے صفوی حاکم شاہ اسماعیل نے ہندوستان کے پرتگیزی حاکم کے پاس پیغام بھیجا اور اسے آپس میں اتحاد کرنے کی پیشکش کی اور مکران کے حکمران کے خلاف فوج کشی اور گوادر کی بندرگاہ پر قبضہ کرنے کے لیے مدد مانگی۔ اس کے بدلے ایران نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف اسے مدد دینے کی پیشکش کی۔

انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم میں ہرمز پر پرتگیزیوں کے قبضہ کی تاریخ 1507ء تحریر ہے۔ (لینگر 1968، تھرڈ ایڈیشن: 120)

حمید بلوچ، بدل خان صابر کے حوالے سے لکھتا ہے کہ:

”1581ء کو کارڈینل شاہ ہنری کی وفات کے بعد فرڈینیڈ ننیلازدے منیرسز پرتگال کے گورنر مقرر ہوئے۔ جب انہیں مسقط کے قرب وجوار میں عثمانی بیڑے کی خبر ملی تو انہوں نے ہرمز کے گورنر ڈوم گونزیلس دے مینزیز کو لکھا کہ وہ اس کی خبر گیری کرے۔ اس کے جواب میں گورنر ہرمز نے لوئیز دلمیدا کی سربراہی میں ایک بحری دستہ جس میں جنگی

جہاز اور کشتیاں شامل تھیں ترکوں کی سرکوبی کے لیے مسقط روانہ کیا۔ لوئیز دلمیدا نے عثمانی بحری بیڑہ جس کی قیادت علی بیگ کر رہے تھے، کی تلاش میں خلیج کے چپے چپے کو چھان مارا لیکن انہیں بحری بیڑہ کہیں بھی نظر نہیں آیا اور وہ ناکام اور تھک ہار کر تازہ دم ہونے کے لیے مکران کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ انہوں نے اپنی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے ساحلی شہروں اور دیہاتوں میں لوٹ مار کی۔ انہیں سب سے زیادہ غصہ اس بات کا تھا کہ پرتگیزیوں اور ترکوں کی لڑائی میں مکران کے لوگوں نے ترکوں کا ساتھ کیوں دیا تھا اور ان کی مدد کیوں کی تھی۔ اگرچہ انہیں احکامات صرف عثمانی بحری بیڑہ کی سرکوبی کرنے کے ملے تھے لیکن انہوں نے تمام اخلاقی ضابطوں و اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر پرتگیزیوں کو لوٹ مار کرنے کی اجازت دی اور نوتکیوں (مقامی ہوت قبائل) پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے۔ جب وہ لوٹ مار سے تھک گئے تو انہوں نے پسنی شہر کو آگ لگا دی اور اس کے بعد وہ گوادر کی طرف روانہ ہوئے۔ اس کو تباہ کرنے کے بعد وہ بریس و تیس کی طرف روانہ ہوئے۔ اس طرح تمام ساحل مکران ان کی مظالم کی زد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ خاص طور پر دریائے کالامان (بسول کور) سے لے کر تیز (تیس) تک بسنے والے نوتکی بلوچ (ہوت بلوچ) ان کے مظالم کا نشانہ بنتے رہے" (بلوچ 2009:215)۔

ایرانی بھی بہت جلد ان وحشی بحری قزاقوں سے نالاں ہو گئے اور ان سے چھٹکارا پانے کی سعی کرنے لگے، مگر اس کے باوجود وہ 1620ء تک ہرمز پر قابض رہے۔ ممکن ہے کہ اس دوران ان کا ساحل مکران پر بھی قبضہ رہا ہو مگر اس کے کوئی تحریری اور مستند حوالے نہیں ملتے۔ البتہ تحریری طور پر ان کے ساحلِ مکران سے نالاں رہنے اور ان پر حملوں کے تذکرے کثرت سے کتب تواریخ میں مرقوم ہیں۔ جیسا کہ ایک پرتگیزی وقائع نویس پرتگیزیوں کے مظالم اور قتل عام کو اپنے فاتح ہونے کا احساس دلاتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"جلد ہی ہم نے دیکھا کہ مقامی لوگ اپنے گھروں سے باہر نکل آئے اور ان لوگوں کو دیکھنے لگے جو ان کو تباہ کرنے آرہے تھے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ دہشت زدہ نظر آرہے تھے اس لمحے انہیں زندگی سے اس قدر بے زاریت محسوس ہو رہی تھی کہ نہ تو فاتح کو کوئی خوشی ہو رہی تھی اور نہ ہی مفتوح کو اپنی شکست کا غم تھا۔ جب انہیں کوئی اور راہ نہ سوجھی تو انہوں نے اپنے تمام مال و اسباب کو آگ کے شعلوں کی نظر کرنا شروع کیا تاکہ وہ ان کے دشمنوں کے ہاتھ نہ لگ سکیں اور دشمنوں کو سوائے آگ کے بلند ہوتے شعلوں کے کچھ نہ ملا۔ ہمیں ان کی اس حرکت سے ان کی بے بسی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے کچے اینٹوں کے بنے ہوئے قلعے گرانے شروع کیے جو کہ اگرچہ اتنے مضبوط نہ تھے کہ انہیں قلعہ کہا جاسکے انہیں بیڑیوں سے باندھ کر گرایا گیا۔ ان میں بہت سے اعلیٰ خانوادوں کے شہزادے بھی تھے لیکن سب کے سب مفتوح شکست خوردہ اور زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے اور ان کی زنجیروں کو فاتح (پرتگیز) تھامے ہوئے تھے" (بلوچ 2009:217)۔

بالآخر ان وحشی بحری قزاقوں سے 1620ء میں برطانیہ اور ایران کے ایک معاہدے کی وجہ سے نجات مل گئی۔ اس معاہدے اور پرتگیزیوں کے خاتمے کے بارے میں انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم کا بیان کافی اہم ہے لکھتا ہے کہ:

"1616ء میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے سورت سے ایران کے ساتھ تجارت شروع کی۔ پرتگیزیوں کو یہ بات پسند نہ آئی۔ انہوں نے انگریزوں پر حملہ کر دیا، لیکن 1620ء جنگِ جسک (جاسک) میں شکست کھائی۔ انگریز تاجروں نے ایرانی فوج سے تعاون کر کے ہرمز پرتگیزیوں سے چھین لیا اور اپنے لیے خاص حقوق حاصل کر لئے" (لینگر 1968، تھرڈ ایڈیشن:122)۔

مکران کی تاریخ میں پرتگیزی دور کی جہاں عسکری حوالے سے بڑی اہمیت ہے تو بلوچی رومانی کرداروں اور زبان و ادب کے لحاظ سے بھی یہ دور بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس دور میں بلوچی زبان و ادب کے اہم ترین رومانی و عسکری کردار حمل جیئند نے جنم لیا کہ جنھوں نے ایک طرف پرتگیزی حملہ آوروں کے طوفان کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا تو دوسری طرف اپنی محبوبہ ماہ گنج کے عشق میں گرفتار ہو کر بلوچی رومانی کرداروں میں ایک اہم اضافہ کیا۔ اس دوران بلوچی زبان و ادب کی رومانوی تاریخ میں ایک اہم باب کا اضافہ ہوا اور بلوچی کلیات کی شاعری کو کئی ابواب اور نئے اصناف ملے۔ حمل جیئند صرف سپاہی ہی نہ تھا بلکہ بلوچی زبان کا ایک بہت بڑا شاعر بھی تھا کہ جنھوں نے رزمیہ و بزمیہ ہر دو طرح کی شاعری کی ہے۔ علاوہ ازیں ان کی ہمشیرہ بھی ایک شاعرہ تھی کہ جنھوں نے حمل کے لیے کئی نظمیں کہی تھیں۔

دراصل یہ وہ زمانہ تھا جب رند اقتدار کہ جو کبھی پنجاب سے مکران تک قائم تھا، بلوچوں کی آپس کی خانہ جنگی، پنجاب و سندھ میں ان قبائل کی آبادکاری اور مکران سے دوری کی وجہ سے اب مکران سیاسی طور پر ان کی دسترس سے نکل چکا تھا بلکہ یوں کہنا درست ہوگا کہ رندوں نے مکران کے بعد سبی اور اس کے بعد ملتان کو مرکز بنا دیا تھا اور ہر بار نئے مرکز میں منتقل ہونے کے بعد پرانا مرکز ان کے ماتحت نہ رہتا بلکہ وہاں اکثر و بیشتر انارکیت قائم ہو جاتی۔ جیسا کہ سبی پر ان کے بعد ارغون منگولوں اور بعد ازاں احمد زئی کمبرانیوں کا قبضہ۔ اسی طرح مکران سے جب رند و لاشار قبائل کی ایک بڑی تعداد مشرق کی طرف منتقل ہوگئی تو آہستہ آہستہ مکران پر سے ان کی توجہ کم ہوتی گئی جس کی وجہ سے مکران کے مختلف حصوں پر مختلف قبائل نے اپنی سیادت قائم کی۔ جیسا کہ کولواہ پر چاکر کہدائی (یہ رند سردار تھا مگر اسے میر چاکر ولد شہک رند نہیں سمجھنا چاہیے) کا قبضہ تھا اور ساحلی علاقے قدیم ہوت و کلمت بلوچ قبائل کے پاس تھے۔ رند و لاشار قبائل مکران

پر 1650ء تک قابض رہے مگر مکران پر ان کی مرکزیت اس وقت تقریباً ختم ہوگئی تھی کہ جب انہوں نے مشرقی میدانوں میں سکونت اختیار کرلی تھی اور بعد ازاں ایک بدترین اور طویل خانہ جنگی میں اپنی بیشتر قوت زائل کردی تھی۔ لہٰذا مکران طوائف الملوکی کا شکار تھا اور اس کے مختلف حصوں پر مختلف طاقتور قبائل اپنے حلیف قبائل کی مدد سے قابض تھے۔ لہٰذا حمل جیئند کے دور میں ساحلی مکران کا بیشتر علاقہ ان کے قبضہ میں آگیا تھا اور یہیں پر انہوں نے پرتگیزی قزاقوں کے خلاف مزاحمت پیش کی تھی۔ اس دعویٰ کی تصدیق میر گل خان نصیر کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ:

''حمل جیئند ساحلِ مکران کے بلوچوں کا سب سے بڑا سردار تھا۔ اس کا پیشہ سمندری راستوں کے ذریعے تجارت تھا اور اس کی تجارتی کشتیاں مال و اسباب سے لدے ساحل مکران سے زنجبار، عدن اور بصرہ وغیرہ تک جاتی تھیں۔ اس زمانے میں سمندری راستوں پر پرتگیزیوں کی اجارہ داری تھی جنہیں بلوچ فرنگی کہتے تھے۔ چونکہ پرتگیزی ان تجارتی راستوں پر کسی مقامی حکمران کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے تھے اور خاص طور پر وہ حکمران جن کی دوستیاں ان کے دشمن یعنی خلافت عثمانیہ سے ہوں۔ پرتگیز سلطنت عثمانیہ کے کسی بھی حامی کو ان سمندروں میں کسی بھی صورت میں برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ لہٰذا حمل اور پرتگیزیوں کے مابین جھڑپیں ہونا قرینِ قیاس ہے۔ ان جنگوں میں پرتگیزیوں کو کئی بار حمل کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانی پڑی مگر آخر میں ان کا پلڑا بھاری رہا اور انہوں نے حمل کو دھوکے سے گرفتار کر کے اسے بحر ہند میں واقع اپنے ایک نوآبادی میں لے گئے۔ ان کی بہادری سے متاثر ہو کر انہوں نے حمل کو ہر طرح کی لالچ دینے کی کوشش کی لیکن اگرچہ حمل عشقیہ مزاج رکھنے والا شخص تھا لیکن وہ پرتگیزیوں کے بچھائے ہوئے دام میں نہ پھنسا۔ یہاں پر حمل کی شخصیت کے نئے پرتو کھلتے ہیں۔ پرتگیزیوں کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد حمل اچھی طرح جانتا تھا کہ اب وہ ایک شخص نہ رہا بلکہ اب وہ بلوچی ننگ و ناموس

کی علامت بن چکا ہے اگر وہ ان مراعات کو قبول کرے تو ہو سکتا ہے اس کی زندگی بچ جائے لیکن وہ بلوچ قوم کے سامنے پھر سر اٹھانے کی ہمت نہ کر سکے گا اور خود فروشی کے عوض اس کا نام تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو گا۔ اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا یعنی پر تعیش زندگی اور مراعات کو ٹھکرا کر موت کو گلے لگا لیا اور اپنی ذاتی غرض کو قومی غرض پر ترجیح دی۔ جس کے نتیجے میں آج بھی حمل کا نام بلوچی لوک داستانوں میں زندہ و تابندہ ہے"(نصیر 1976:252,253)۔

بلوچی ادب میں حمل جیئند کی داستان موجود ہے کہ جس کے ذریعے اُن کے بارے میں کافی معلومات ملتی ہیں۔ بلوچستان اور بلوچستان سے باہر کے کئی مؤرخین اور ماہرینِ زبان و ادب نے اس سلسلے میں گرانقدر کتب اور مضامین تحریر کیے ہیں۔ ان ماہرین اور کتب میں میر گل خان نصیر، غوث بخش صابر، بدل خان صابر، ڈاکٹر حمید بلوچ، بلوچستان ضلعی گزیٹیئر مکران وغیرہ کے علاوہ کئی دیگر نام و کتب بھی شامل ہیں۔ قدیم لوک داستانوں میں حمل کے عسکری اور رومانوی کردار کو بلوچ تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ کہ جس کے مطابق حمل نے پرتگیزی حملہ آوروں کے خلاف طویل مزاحمت کی تھی اور کئی بار انہیں شکست بھی دی تھی۔ وہ ایک بار پرتگیزیوں کے ہاتھوں گرفتار بھی ہوا اور بالآخر مردانہ وار اپنی جان دے دی مگر کسی بھی قسم کی سودا بازی نہیں کی۔ بعض محققین ان کی شہادت کو 1584ء کا واقعہ لکھتے ہیں (صابر 1996 :35)۔

حمل جیئند کی شہادت کے بعد بھی پرتگیزیوں اور بلوچوں کی جنگیں جاری رہیں حتیٰ کہ 1620ء کے دوران ان بحری قزاقوں کے مظالم اور آئے دن کی لوٹ مار سے ساحل مکران کے باشندوں کو نجات مل گئی۔ یقیناً پرتگال کی سولہویں اور سترہویں صدی کی تاریخ میں اس عظیم بلوچ قومی ہیرو کا تذکرہ موجود ہو گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس چھپی ہوئی تاریخ سے حمل کی

داستان سرفروشی اور مہر و وفا کو تلاش کر کے قرطاس کی زینت بنائی جائے کہ جو رزم و بزم ہر دو حوالوں سے بلوچ قوم اور بلوچستان کے تاریخ کی پہچان ہے۔

مکران پر ملک خاندان کا اقتدار:

ملک خاندان کے بارے میں زیادہ مواد دستیاب نہیں ہے اور مختصر تاریخی شواہد یہ معلومات فراہم کرتے ہیں کہ یہ خاندان خاندانِ ہوت کی حکمرانی کے دوران ہی مکران کے کچھ حصوں پر حاکمیت رکھتا تھا۔ ان کے مشہور حکمرانوں کے بارے میں ڈاکٹر عنایت اللہ بلوچ رقمطراز ہے کہ، ملک سعید، ملک تاج الدین، ملک بدر، ملک زاہد، ملک دینار، ملک جلال الدین، ملک مظفر اور ملک کیچ کو اس خاندان کے حکمرانوں میں شامل تھے (بلوچ 1987:98)۔ ملک خاندان کے حکمرانوں نے مکران کے حدود موجودہ ایرانی بلوچستان میں ملکی چیدگ تک پھیلا دی تھیں جبکہ مکران نے اس خاندان کے دورِ حکومت میں ترقی کی بلندیوں کو چھو لیا تھا۔ مکران زیادہ ثمر آور ملک بنا اور دور دراز سے لوگ تلاشِ معاش کی خاطر اس طرف کا رخ کرنے لگے۔ کیپٹن ای۔ سی۔ راس (E.C.Ross) کے مطابق ملک خاندان کے دور میں مکران کی آبادی خوب بڑھ گئی تھی اور معاشی سرگرمیوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ دور مکران کا پر امن دور تھا (راس 41-321987)۔

اس خاندان کی حکمرانی کا معمولی تذکرہ مشہور امیر البحر اور سیاح مارکو پولو نے اپنے سفر نامہ میں بھی کیا ہے کہ جس کے مطابق مکران ایک آزاد ریاست تھی جس کے حکمران کا نام ملک تھا۔ اس کے مطابق کیچ مکران (Kesmacoran) ایک علیحدہ ریاست تھی کہ جس کا بادشاہ خود مختار تھا اور ان کی اپنی مخصوص زبان تھی (بلوچ 1987:98)۔

مکران پر رند قبائل کی حکومت کا آغاز:

منگول حملوں نے سیستان اور کرمان کے بلوچ قبائل کو شدید متاثر کیا اور ان کی ایک بہت بڑی تعداد نے اپنے قدیم مرزبوم کو خیرباد کہہ کر مکران کی وسعتوں میں اپنے لیے جاہِ پناہ ڈھونڈ لی اور یہاں پر پہلے سے آباد دیگر بلوچ قبائل کے اندر گھل مل گئے۔ محمد سردار خان بلوچ ان قبائل کی ہجرت کا زمانہ 1450ء تحریر کرتا ہے (بلوچ 1977 :70)۔ جبکہ اپنی ایک اور تصنیف 'چاکرِ اعظم' میں اس ہجرت کا زمانہ دسویں صدی عیسوی تحریر کرتا ہے۔ (بلوچ سال اشاعت ندارد:44) ایک مؤرخ اس مہاجرت کی بعض دیگر وجوہات بھی بیان کرتا ہے اور مکران میں وارد ہونے والے ان قبائل کو کرمان، سیستان اور دشت لوط کے بلوچ باشندے قرار دیتا ہے۔ لکھتا ہے کہ:

"ایسا ہرگز نہیں ہے کہ عرب اور ترک حملہ آوروں نے ان قبائل کو نقل مکانی پر مجبور کیا تھا بلکہ مؤرخین اس مہاجرت کی مزید کئی وجوہات بیان کرتے ہیں۔ یعنی اوّل یہ کہ سیستان میں ایک بدترین قحط سالی نے مقامی باشندوں کو بڑی تعداد میں مہاجرت پر مجبور کیا اور دوئم اسی دوران منگول ایک مضبوط قوت بن چکے تھے اور بہت جلد انہوں نے پورے ایشیاء کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ یہ بات کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ منگول طوفان نے پرانی مہذب دنیا کا پورا نقشہ بگاڑ دیا اور محلات جلا کر انسانی کھوپڑیوں کے مینار بنائے کہ جو منگول یلغار کی پہچان بن گئے۔ تاریخی حقائق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جوں ہی وسط ایشیائی خطوں میں منگول تباہی پہنچ گئی تو وہاں کے لٹے پٹے قافلے دیگر علاقوں میں پہنچ کر منگولوں کے جبر و ستم اور انسانیت سوز سلوک کے تذکرے کرنے لگے کہ جس سے دیگر علاقوں میں بھی خوف و ہراس پیدا ہوا اور لوگ بڑی تعداد میں دوسری سمتوں اور محفوظ مقامات کی جانب مہاجرت کرنے لگے اور خصوصاً سیستان اور کرمان پر منگول خاندان آل کرت اور ایران میں ایل خانی چنگیزیوں نے ان قبائل کی مہاجرت میں اہم کردار ادا کیا کیونکہ شمس الدین کرت گو کہ بلوچ قبائل کے ساتھ خندہ جبیں تھا مگر یہ وہی حکمران ہے

کہ جس نے بلوچ قبائل پر بدترین یلغار بھی کی تھی اور اس کی فوجیں سراوان کے علاقہ مستونگ تک پہنچ چکی تھیں اور تاریخ نامہ ہرات کے مطابق لاتعداد کرُد زعماؑ اور میر و معتبر شمس الدین اور بعدازاں ان کے جانشینوں کے ہاتھوں مارے گئے اور اسی طرح دشت لوط، سیستان اور کئی دیگر علاقوں کے بلوچ باشندے بھی ان کے زیرِ عتاب آئے اور یہ وہ وقت تھا کہ جب الشاری (لاشاری) اور سیستان کے کئی دیگر بلوچ قبائل کرمان اور مکران کی جانب مہاجرت کر گئے" (بلوچ 2013:150-51)۔

اور یہی درست ہے کیونکہ تاریخی حقائق یہ ثابت کرتے ہیں کہ سیستان زمانہ قدیم سے بلوچ خطہ رہاہے اور عرب دور میں تقریباً تمام موٴرخین اس خطہ کا مضبوط ترین قبیلہ الشاری کو قرار دیتے ہیں کہ جو بلاشبہ بلوچ قبیلہ لاشاری ہی تھا کہ جنہوں نے ایرانی خطہ میں واقع علاقہ مکران میں سیستان سے ہجرت کے بعد لاشار نام کا قصبہ بسایا۔ آج بھی اس قصبہ کے باشندے لاشاری کہلاتے ہیں کہ جو بلوچوں میں کئی ذیلی قبائل پر مشتمل ایک مضبوط قبیلہ ہے۔ چونکہ منگولوں کے طوفان نے تمام ایشیاء کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا لہٰذا کرمان بھی ان کے حملوں سے محفوظ نہ رہا اور وہاں کے بھی بے شمار بلوچ قبائل مہاجرت کر کے مکران پہنچے۔ اتفاق سے مکران ابتدائی منگول حملوں سے محفوظ رہا اور ان بلوچ قبائل کو عافیت مل گئی۔ ان نئے آنے والے بلوچ قبائل نے مکران کے مختلف علاقوں میں سکونت اختیار کی اور یہاں کے قدیم بلوچوں کے اندر ضم ہوتے گئے۔ مکران میں پہلے سے آباد بلوچ قبائل کی موجودگی کی تصدیق بھی عرب موٴرخین کی تحریری ذرائع سے ہوتی ہے۔ جیسا کہ مشہور زمانہ عرب جغرافیہ دان المقدسی لکھتا ہے کہ:

"بنجبور میں ایک کچا قلعہ تھا جس کے گرد خندق تھی۔ شہر کے چاروں طرف نخلستان تھا۔ شہر کے دو دروازے تھے۔ ان میں سے ایک باب تیز تھا جس کا رُخ جنوب مغرب تھا اور اس میں سے وہ سڑک گذرتی تھی جو خلیج فارس کی بندرگاہ تیز کو جاتی تھی۔ دوسرا دروازہ بابِ طوران تھا۔ اس کا رخ شمال مشرق تھا اور اس میں سے وہ سڑک نکلتی تھی جو علاقہ طوران کو

جاتی تھی۔ علاقہ طوران کا صدر مقام قصدار تھا۔ شہر میں پانی ایک ندی سے پہنچتا تھا۔ یہاں ایک جامع مسجد بھی تھی جو بازار میں واقع تھی۔ یہاں کے لوگ جو وحشی بلوص (بلوچ) تھے صرف نام کے مسلمان تھے اور ان کی زبان ایک بے معنی اور کرخت بولی معلوم ہوتی تھی" (سٹر ینج 1986:495)۔

لہٰذا ان لٹے پٹے بلوچ قبائل کو یہاں بسنے میں کوئی تکلیف نہ ہوئی اور نہ کسی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ قبائل بڑھتے بڑھتے پنجگور اور کولواہ تک پہنچ گئے۔ یہ دور مکران پر ہوت قبیلہ کی حکمرانی کا دور تھا۔ کم و بیش ایک صدی تک ان نوارد بلوچ قبائل نے اپنی جمعیت خوب بڑھالی اور آہستہ آہستہ خطے کے سیاہ و سفید کے مالک بنتے گئے۔ یہاں تک پہنچ کر ان قبائل نے کہ جو تاریخ میں رند و لاشار کے نام سے موسوم ہوئے مکران پر اپنی سیادت قائم کی۔ بلوچ مؤرخین میں سے اکثر مکران پر رند اقتدار کو منگولوں کے زوال کے بعد کا زمانہ تحریر کرتے ہیں اور ان کے مطابق یہ لگ بھگ 1450ء کا زمانہ تھا (بلوچ 1977:70)۔

رند و لاشار قبائل اپنی شاعری میں میر جلال خان کو اپنا سردار اور میر حمزہ نامی کسی شخص کو اپنا جدِ اعلیٰ بتاتے ہیں۔ میر حمزہ دراصل ایک سیستانی بلوچ سردار تھا کہ جس نے ہارون الرشید کے زمانے میں سیستان، کرمان، خراسان، دشت لوط اور مکران کے بلوچوں کی قیادت کی تھی اور انہیں عربوں اور ترکوں کے مظالم و استحصال کے خلاف متحد کیا تھا۔ میر حمزہ کے بارے میں بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ کے چچا تھے یا پھر انہیں کسی اور عرب قبیلے سے متعلق بتایا جاتا ہے (بلوچ 2009 : 21-24) مگر دراصل یہ بلوچ سردار سیستان کا باشندہ تھا اور عرب و فارسی مؤرخین انہیں "حمزہ السیستانی، الشاری اور الخارجی" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور انہیں اصلاً جنوبی خراسان اور سیستان کا باشندہ تحریر کرتے ہیں (بہار 1366:156-57) بابا میر حمزہ بلوچ نامی کتاب میں ان کی شخصیت کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے کہ جس میں ان کی رحلت کے

بعد سیستان سے اس کی جمعیت کی ایک بڑی تعداد کا سیستان سے مکران کی جانب ہجرت کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ اس کتاب میں یہ بھی مذکور ہے کہ سیستان کی طرح مکران کے لوگ بھی ان کے جانثاروں میں شامل تھے اور بابا میر حمزہ بلوچ بھی اکثر و بیشتر مکران میں نظر آتے تھے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ بلوچ مکران سمیت سیستان، طوران، قیقانان، دشت لوط، دشت کویر، کرمان، البرز (ماژندران، گیلان اور ایلان) سمیت عرب دور کے صوبہ کوہستان میں بھی آباد تھے (بلوچ 2013: 132-34) لہٰذا جب سیستان کے چند لٹے پٹے بلوچ قبائل مکران میں وارد ہوئے تو وہ اہلِ مکران کے لیے اجنبی نہ تھے۔ مکران میں ان قبائل کی خوب نشو و نما ہوئی اور ان کی آبادی بہت بڑھ گئی۔ بلوچ مؤرخین کے مطابق مکران میں جب میر جلال خان نامی شخص ان کا میر (سردار) بنا تو ان کی حکومت کو مکران میں زبردست استحکام حاصل ہوا۔ مولانا نور احمد فریدی کے مطابق یہ منگولوں کے عروج کا زمانہ تھا اور جب منگول جلال الدین خوارزم شاہ کا پیچھا کرتے کرتے مکران پہنچے اور بعد ازاں اپنا ایک گورنر تعینات کر کے چلے گئے تو اس زمانے میں میر جلال خان کی شخصیت ابھر کر سامنے آئی اور انہوں نے اپنے قبائل کی قیادت سنبھالی اور بہت جلد انہیں ایک قوت بنا کر مکران کو منگول قبضہ سے آزاد کیا مگر منگولوں کے ساتھ رواداراانہ سلوک کیا (فریدی سال اشاعت ندارد: 180,181)۔

رندی بلوچی شاعری میں میر جلال خان کے حالات زندگی مختصراً ملتی ہیں اور ان کی شخصیت، کردار اور کارناموں پر الگ سے کوئی تحریر بھی دستیاب نہیں کہ جس سے ان حقائق کے بارے میں جانا جا سکے جو ان کی ذاتِ گرامی سے منسوب ہیں۔ کیونکہ بلوچ مؤرخین کے مطابق میر جلال خان کے چار بیٹے تھے کہ جن کے نام: ۱۔ میر رند، ۲۔ میر لاشار، ۳۔ میر کُرّا، اور ۴۔ میر

ہوت تھے جبکہ فریدی صاحب ان کے ایک بیٹے کا نام میر جاتن تحریر کرتا ہے اور جتو نامی بیٹی کا بھی تذکرہ کرتا ہے (فریدی سال اشاعت ندارد :188,189)۔

مؤرخین کے مطابق میر جلال نے اپنے قبائل کو متحد کیا کہ جن کی تعداد چوالیس بتائی جاتی ہے جیسا کہ بلوچ شاعر کہتا ہے کہ:

"مئے	سر	میریں	جلال	ہاں
ہمارا	سردار	میر	جلال خان	ہے
گوں	چھل	و	چھار	بولک ئنت
جس کی	کمان	میں	چوالیس	قبائل ہیں"

(ڈیمز 1977:1-2)

اسی بلوچی شاعری کے مطابق میر جلال خان نے ان قبائل کو مکران میں بھرپور طریقہ سے آباد کیا اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے لاتعداد کام کرتے ہوئے عرصہ دراز تک ان پر حکمرانی کرنے کے بعد داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ ان کے بعد قبائل نے تھوڑے سے اختلافات کے بعد میر رند کو سردار منتخب کیا۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان تمام قبائل کا سردار میر شہک تھا کہ جو اپنے جد اعلیٰ میر رند کی وجہ سے میر شہک رند کہلاتا تھا مگر یہ یاد رہے کہ وہ تمام چوالیس قبائل کا مشترکہ سردار تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رند و لاشار دراصل بہت سے دیگر بلوچ قبائل کی ایک یونین تھی کہ جو ایک ہی مشترکہ میر کی سربراہی میں زندگی گزارتے تھے۔ ایک ہی مشترکہ سردار کی وجہ سے ہی اس خیال کو اور زیادہ تقویت ملتی ہے کہ یہ قبائل دراصل ایک یونین (اتحادیہ) کی صورت میں رہتے تھے کہ جو جمہوری طریقہ سے ایک ہی شخص کو اپنی کونسل کا سربراہ چنتے تھے۔ ممکن ہے کہ میر رند کسی فرد واحد کا نام ہو اور وہ میر جلال خان کا بیٹا ہو مگر جہاں تک لاشار قبائل کا تعلق ہے تو تاریخی حقائق یہ ثابت کرتے ہیں کہ جب سیستان کے قبائل نے

بجانبِ مکران مہاجرت کی تھی تو انہیں مؤرخین الشاری تحریر کرتے ہیں (بہار 1366ھ:156-57)۔ یہ قبائل کرمان کے مضافات میں آباد ہوگئے اور قصبہ لاشار کی بنیاد رکھی۔ بعد ازاں یہی قبائل پروم سے ہوتے ہوئے پنجگور کی وادی میں پھیل گئے اور پھر آہستہ آہستہ مشرق کی جانب کولواہ (موجودہ مشکے۔ آواران) اور جنوب کی جانب مند، کیچ و ساحلی علاقوں تک پھیلتے چلے گئے۔ انہی قبائل نے کچھ عرصہ اپنی قوت مجتمع کی اور بالآخر منگولوں کو مکران سے نکال باہر کیا مکران کی سیادت سنبھالی اور تقریباً دو صدیوں تک مکران پر قابض رہے۔ محمد سردار خان بلوچ اور بعض دیگر مؤرخین کے مطابق ان قبائل نے 1450ء سے 1650ء تک مکران پر حکمرانی کی۔ اسی دوران ان قبائل کی ایک اور مہاجرت مکران سے قلات و کچھی کی جانب ہوئی جبکہ قلات میں اس زمانے میں قمبرانی بلوچوں کی حکومت قائم تھی۔ غالباً پندرہویں صدی کے اواخر یا سولہویں صدی کے آغاز میں یہ حملہ مکران سے قلات پر ہوا کہ جس میں قلات کا میروانی کمبرانی حکمران میر عمر کمبرانی مارا گیا اور قلات پر رند و لاشار کا قبضہ ہوگیا۔ کتب تواریخ میں مکران قلات جنگوں کے تذکرے تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں جیسا کہ ایک مؤرخ لکھتا ہے کہ:

> "پندرہویں صدی کے وسط میں قلات اور مکران کے مابین تعلقات میں سرد مہری آئی جس کے نتیجے میں قلات اور مکران کے درمیان ایک خوفناک جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ کی بنیادی وجہ قلات کے کمبرانی (براہوئی بلوچ خانوادہ) اور مکران کے رندوں کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی تھی۔ اس باہمی چپقلش کی وجہ سے بلوچوں کی طاقت ریزہ ریزہ ہوگئی۔ مکران میں رندوں کی حکومت کافی پھیل گئی تھی اور انہوں نے کچ گنداواہ کے سرسبز خطے کو اپنے تصرف میں لانے کا منصوبہ بنایا جبکہ یہ علاقے قلات کی بلوچی حکومت کے پاس تھے لہٰذا ان علاقوں کے حصول کی خاطر قلات اور مکران کے مابین خونریز جنگ ہوئی کہ جس میں کمبرانی حکمران میر عمر مارا گیا اور قلات پر مکرانی لشکر نے قبضہ کرلیا۔ رفتہ رفتہ خاران

اور لسبیلہ پر بھی مکران کے رند و لاشار جنگجوؤں نے قبضہ کر کے انہیں اپنی قلمرو میں شامل کیا" (بلوچ 1987:96)۔

چند سال بعد یہ قبائل دو حصوں میں بٹ کر کچھی، گنداواہ اور سبی کے علاقوں پر حملہ آور ہوئے اور تا حدودِ سندھ اس پورے خطے کو بزورِ شمشیر فتح کر لیا۔ اس طرح رند بلوچ قبائل کی حکومت سندھ کی سرحدوں سے لے کر مکران تک پھیل گئی۔ بلوچ تاریخ کا یہ دور سنہرا دور بھی کہلاتا ہے مگر اس دور میں ایک پُر آشوب تاریخ نے بھی جنم لیا۔ گو کہ اس دور میں بلوچ تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب کی خوب نشو و نما ہوئی اور خصوصاً بلوچی شاعری نے بامِ عروج حاصل کیا اور شاعری و ادب کے کئی نئے اصناف کا بلوچی زبان و ادب میں اضافہ ہوا مگر رند و لاشار قبائل کی آپس کی چپقلش نے ان دونوں قبائل کے سابقہ اتحاد کا خاتمہ کر دیا جس سے صدیوں پرانے اتحاد کے پرخچے اڑ گئے۔ ان دونوں قبائل نے اپنے اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر کچھی اور سبی کے میدانوں میں ایک دوسرے کا اتنا خون بہایا کہ جس سے نہ صرف بلوچ سرزمین خون رنگ ہو گئی بلکہ بلوچی تاریخ کے کئی اوراق لہو میں ڈوب گئے اور جس متحدہ بلوچستان کی جانب ان قبائل نے پیش رفت کی تھی اس کی تکمیل ہوتے ہوتے رہ گئی۔

جس زمانے میں بلوچوں کی عظیم خانہ جنگی نے جنم لیا، بلوچ قبائل کا سردار میر شہک کا بیٹا میر چاکر تھا جسے لاشاریوں نے قبول نہ کیا جس کی وجہ سے ان دونوں قبائل کے مابین تقریباً ستائیس سالوں تک جنگ ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ یہ طاقتور بلوچ یونین اس قابل ہی نہ رہی کہ وہ خطہ سبی و کچھ گنداواہ کی حفاظت کرتی۔ لہٰذا جب ہمایوں کو شیر شاہ سوری کے خلاف ہندوستان میں لشکر کشی کرنی پڑی تو انہوں نے رند قبائل سے مدد مانگی۔ اس طرح سردار چاکر رند اپنے قبائل کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ ہمایوں کی مدد کو روانہ ہوا اور جنگی خدمات کے صلے میں انہیں موجودہ جنوبی پنجاب اور ساہیوال کے علاقے میں وسیع زمینیں اور جاگیریں ملیں کہ جہاں آج بھی رند قبائل آباد ہیں

اور ان کی آبادی خوب پھیلی ہوئی ہے۔ پنجاب میں بلوچوں کے قدم جم جانے کے بعد مکران سے لاتعداد بلوچ خاندان اٹھ کر ملتان اور جنوبی پنجاب کے دیگر شہروں میں آباد ہونے لگے اور مقامی حکمرانوں کو اپنی خدمات پیش کیں۔ جنھوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جیسا کہ تاریخ فرشتہ کا مصنف لکھتا ہے کہ:

”انہی دنوں ملک سہراب بلوچ جو اسمٰعیل خان اور فتح خان کا باپ تھا، اپنی قوم روہید (اصل میں 'ہوت') کے ساتھ کچ (کیچ) اور مکران کے نواح سے حسین شاہ لنگاہ کے پاس آیا۔ حسین لنگاہ نے اس کی بہت آؤ بھگت کی اور اسے قلعہ کوٹ کروڑ سے قلعہ دھنکوٹ تک کا تمام علاقہ جاگیر میں دے دیا۔ اس کے بعد بے شمار بلوچی (یعنی بلوچ) ملتان میں آئے اور اس طرح حسین لنگاہ کے لشکر میں بہت اضافہ ہوا۔ اس نے دریائے سندھ کے کنارے کا بقیہ علاقہ بھی بلوچیوں (بلوچوں) کو جاگیر میں دے دیا۔ اس طرح رفتہ رفتہ سنیت پور سے دھنکوٹ تک کا علاقہ بلوچیوں (بلوچوں) کے قبضے میں آگیا“ (فرشتہ 2008 :678)۔

تاریخ و تمدن ملتان نامی کتاب کا مصنف بھی یہی بیان تحریر کرتا ہے۔ (قادری سال اشاعت ندارد:159) جبکہ میر چاکر خان رند کی ملتان آمد اور سہراب خان دودائی کی جانب سے اس کی مخالفت کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

”اسی زمانے میں یعنی محمود شاہ لنگاہ کے عہد میں ملتان میں ایک اور عظیم شخصیت سبی بلوچستان سے ملتان آیا۔ یہ شخصیت تھی میر چاکر رند کی، جو سبی کا حکمران اور بلوچ قبائل کو متحد کرنے والا عظیم بلوچی (بلوچ) رہنما تھا۔ اس نے بلوچ قبائل میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے کئی جنگیں لڑیں۔ بلوچی زبان کا ادب اس کی تعریف و توصیف سے بھرا پڑا ہے۔ میر چاکر کی بلوچ اتحاد کے لیے جدوجہد کے نتیجے میں لاشاری اور رند قبائل میں تیس سال تک خانہ جنگی جاری رہی تھی اور اس دوران تقریباً پچیس لڑائیاں لڑی گئیں، لاشاریوں کی

قیادت گواہرام لاشاری کے ہاتھ میں تھی۔ ان لڑائیوں میں پندرہ بار رند کامیاب رہا اور دس بار لاشاری، ان جنگوں کے بعد میر چاکر رند کو بلوچستان کی خونین سرزمین سے نفرت ہو گئی اور وہ اپنے لشکر سمیت پنجاب میں ایک نیا وطن آباد کرنے کے لیے آیا۔ سب سے پہلے وہ اُچ میں داخل ہوا اور اس نے بخاری اور گیلانی سادات بزرگوں کے مزارات پر حاضری دی اور مخدوم سید عبدالقادر ثانی سے شرف ملاقات حاصل کی۔ اُچ پر ان دنوں جام ابراہیم کی حکومت تھی۔ اس کے میر چاکر رند سے خوشگوار تعلقات تھے۔ میر چاکر نے اپنا لشکر اسی جام کے پاس چھوڑا اور خود اپنے دو بیٹوں میر اللہ داد اور میر شہداد کے ہمراہ ملتان چلا آیا۔ میر چاکر نے محمود شاہ لنگاہ کو پیشکش کی کہ اگر اسے سپہ سالار کے عہدے پر فائز کیا جائے تو وہ ملتان کی ریاست کو دہلی تک وسیع کر لے گا۔ مگر سلطان محمود کے وزیر ملک سہراب (ہوت بلوچ) نے جس کو اپنا مستقبل مخدوش ہوتا ہوا نظر آنے لگا تھا سلطان کو میر چاکر کی خون آشامی سے ڈرایا اور کہا جو شخص اپنے بھائیوں میں سے تیس ہزار افراد کو قتل کر سکتا ہے وہ ہمارا وفادار کب ہو گا۔ اس پر سلطان نے میر کو بذات خود دہلی پر حملہ کر کے قسمت آزمائی کا مشورہ دے کر چلتا کیا۔ میر چاکر رند ملتان سے قلعہ شور کی طرف چلا گیا جہاں اس نے لاہور اور ملتان کے درمیان ست گھرہ کی بنیاد رکھی اور یہاں محلات اور قلعہ تعمیر کرایا۔ میر چاکر نے پنجاب ہی میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوا" (قادری سال اشاعت ندارد: 162,163)۔

کچھی و سبی کے چھوٹ جانے کے باوجود مکران میں رند قبائل کی حکومت جاری رہی مگر اس میں اب وہ ماضی والا دم خم نہ تھا جبکہ پنجاب کی جانب مہاجرت کر جانے والے قبائل نے وہاں ایک مضبوط قوت کی شکل اختیار کر لی اور آئے روز اپنی جمعیت میں اضافہ کرتے رہے حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب جنوبی پنجاب سمیت ایک وسیع و عریض خطہ پر انہوں نے اپنی مستحکم حکومت قائم کر لی۔ جیسا کہ اخلاق احمد قادری لکھتا ہے کہ کامران مرزا کے عہد میں جب ملتان

ان کے تصرف میں آیا تو بلوچوں نے میر چاکر رند کی سربراہی میں ملتان پر قبضہ کر لیا۔ ہیبت خان نیازی کی فوجوں کو عبرت ناک شکست دے کر مار بھگایا اور ہیبت خان کو قتل کر دیا۔ اس طرح ملتان پر بلوچوں کا قبضہ ہوا جبکہ میر چاکر رند کی افواج نے دہلی تک کے علاقوں پر حملے کیے مگر ملتان کو مرکز بنا کر حکومت کرنے لگا (قادری سال اشاعت ندارد: 163)۔

جس زمانے میں مکران پر رند غلبہ قائم ہوا تھا اور حدودِ سندھ و پنجاب تک یہ قبائل پھیل چکے تھے اور ایک عظیم قوت بن چکے تھے تو اسی زمانے میں ایک اور بیرونی حملہ آور قوم پرتگیز نے بلوچستان کے ساحلوں پر حملہ کر دیا۔ جبکہ اُس زمانے میں ساحلی بلوچستان پر کلمتی ہوت قبیلہ کو دسترس حاصل تھی جنہوں نے اپنے سمندروں کی حفاظت کرتے ہوئے کئی میدانوں اور خوفناک بحری جنگوں میں پرتگیزی حملہ آوروں کے دانت کھٹے کر دیے۔

دوسری طرف قلات پر کچھ عرصہ بعد میروانیوں نے دوبارہ قبضہ کر کے رند گورنر کو قتل کر دیا اور قلات پر میر عمر کے بیٹے میر بجار کمبرانی میروانی نے قبضہ کر لیا۔ کمبرانی خاندان کی اس شاخ نے قلات اور گردونواح پر 1410ء سے لے کر 1666ء تک حکومت کی (بلوچ 2012 :66-68) جبکہ ان کے بعد کمبرانیوں کی ایک اور شاخ احمد زئی نے قلات پر قبضہ کر کے ایک مستحکم بلوچ حکومت کی بنیاد ڈالی جس نے آہستہ آہستہ مکران سمیت تمام بلوچ خطہ کو اپنی قلمرو میں شامل کر کے بلوچ خطہ کو ایک ہی لڑی میں پرونے کا مشکل کام پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

درج بالا اوراق میں بلوچستان کے تاریخی دور کی ایک مختصر روداد پیش کی گئی۔ قبل از تاریخ بلوچستان کی ثقافت و تہذیب چار سو پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف، ہر وادی اور ہر علاقے میں قدیم تہذیب کی بستیاں آباد تھیں اور دن بدن اس تہذیب میں جدت آ رہی تھی۔ قدیم تہذیب کی صنعتی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی و معاشرتی ترقی نے آس پاس کی وادیوں اور آبادیوں پر بھی گہرے

اثرات مرتب کئے اور ایشیاء میں تاریخ سے قبل ایک عظیم تہذیب کی بنیاد پڑی جس میں بیک وقت کئی ثقافتیں پل رہی تھیں۔ بلوچستان کی تہذیب نے سندھ و عراق میں موجود قبل از تاریخ وحشیانہ دور کا خاتمہ کرنے میں اور مذکورہ خطوں میں انسانی تہذیب کو پنپنے میں اہم کردار ادا کیا۔

قبل از تاریخ دور میں بھی بلوچستان طویل قحط سالی کا شکار ہوتا رہا ہے اور ساتھ ہی آرین یلغار سے قبل کے اقوام کی مسلسل آمد بھی اسی راہ سے ہوتی رہی ہے اور خصوصاً شمال اور شمال مغرب سے وحشی خانہ بدوش چرواہے ایک تسلسل کے ساتھ آتے رہے اور یہاں سے سندھ وہند میں داخل ہوتے رہے ہیں۔ ممکن ہے بلکہ اغلب خیال ہے کہ ان گڈریوں میں بعض یہاں کی مقامی آبادی اور قدیم باشندوں میں گڈ مڈ ہوگئے ہوں گے اور ان کا قدیم باشندوں کے ساتھ نسلی اختلاط بھی ہوا ہوگا اور یہ قیاس خارج از امکان بالکل نہیں ہے۔

بعض اوقات قحط سالیوں نے بلوچستان کی قدیم اور قبل از تاریخ دور کے باشندوں کو متاثر کیا تو ان میں سے بھی بعض خاندان سرسبز وشاداب علاقوں اور خصوصاً سندھ کی طرف مہاجرت کر گئے۔ یہ بھی خارج از امکان نہیں کہ بلوچستان کے قدیم باشندوں نے چوتھی ہزارویں قبل مسیح میں وادیءِ سندھ کی تہذیب کی بنیاد رکھی ہو۔ کیونکہ قدیم وجدید تاریخ کی روشنی میں اگر بغور دیکھا جائے تو سندھ اور بلوچستان کے مابین ایک تاریخی رابطہ تسلسل کے ساتھ جاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی قدیم تہذیب و ثقافت میں ناقابل یقین حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ماہرینِ بشریات اور ماہرینِ آثار قدیمہ کے مطابق سندھ و ہند میں انسانی آبادی کا دخول بلوچستان کی جانب سے ہوا ہے اور صدیوں تک اسی راستے سے لوگوں کے جمِ غفیر مشرق کی سرزمینوں میں داخل ہوتے رہے۔

مگر ایسا بھی نہیں کہ ان خشک سالیوں کے نتیجے میں بلوچستان کی تہذیب یہاں سے ختم ہو گئی بلکہ اولاً یہ کہ خشک سالی ضروری نہیں کہ پورے خطے میں بیک وقت آئے اور پورے خطے میں کہیں بھی پانی سمیت دیگر وسائل بیک وقت عدم دستیاب ہوں اور دوئم یہ کہ کسی بھی خشک سالی کے نتیجے میں کبھی بھی پورا ملک ہجرت کر کے نہیں جاتا بلکہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد پھر بھی حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے موجود رہتا ہے اور یہی اونچ نیچ کا عمل یہاں بھی جاری رہا ہے۔

مطالعے اور مشاہدے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ دوسری اور تیسری ہزارویں صدی قبل مسیح کے دوران بلوچستان کی تہذیب اپنی سابقہ حیثیت برقرار نہ رکھ سکی۔ کیونکہ یہ وہ دور تھا کہ جب مشرقِ وسطیٰ، سندھ اور افغانستان و وسط ایشیاء میں طاقت ور اور ترقی یافتہ تہذیبیں جنم لے چکی تھیں اور ان کی صنعت و حرفت نے اتنی ترقی کی تھی کہ جس کے سامنے بلوچستان کی قدیم سائنس ماند پڑ گئی تھی۔ بلاشبہ بلوچستان میں انسانوں نے اپنے اولین مسکن تعمیر کیے مگر مشرق و مغرب کی ابھرتی ہوئی طاقتوں کے سامنے ان کی ترقی کی رفتار سست رہی اور بلوچستان کی ثقافت قدیم نقوش پر گامزن رہی۔ بلوچستانی تہذیب اپنے زوال کے دور میں کوئی ترقی نہ کر سکی اور آہستہ آہستہ یہ تہذیب سندھ میں ابھرنے والی نئی تہذیب کے سامنے سرنگوں ہو گئی اور پھر یہ تہذیب کبھی نمبر ون کی حیثیت حاصل نہ کر سکی اور تب سے اب تک بیرونی یلغاروں کا سامنا کرتی آ رہی ہے۔

اس میں افسوس یا اچھنبے کی بات نہیں کہ بلوچستان ہمیشہ سے حملہ آور اور وحشی اقوام کے جوتوں اور گھوڑوں کے ٹاپوں تلے روندا گیا ہے۔ ہر ملک اور ہر خطے کی تاریخ ایسی خونی یلغاروں اور خونین واقعات سے بھری پڑی ہے جنہیں ایسے ہی حملہ آوروں نے روند ڈالا، قتلِ عام کیا اور سب کچھ غارت کر دیا۔ مگر بعض مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں کہ ان حملہ آور اور وحشی اقوام

نے بعض خطوں میں موجود تہذیبوں کو مزید ترقی دی اور بعض مقامات پر نئی اور عظیم الشان ترقی یافتہ اور بڑی بڑی تہذیبوں کی بنیاد ڈالی۔

آرین ہی کو لے لیں کہ جنہوں نے اپنے راستے میں آنے والی ہر شئے اور ہر رکاوٹ کو تباہ و برباد اور نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔ ان کی بربادی سے نہ تو عمارتیں بچیں اور نہ قلعے، نہ فصلیں سر سبز رہ سکیں اور نہ صنعتوں کی کٹ کٹ باقی رہی۔ نہ عبادت گاہوں کا تقدس ان کے سامنے رہا اور نہ انسانی خون کی کوئی قیمت باقی رہی، جو ان کے سامنے آیا تباہ و برباد ہوا۔ مگر جب ان وحشیوں نے میدانی اور دریائی زمینوں کی سیر ابی، وسائل کی فراوانی، آرام و سکون، دولت و حکومت پائی تو یہ آرین مہذب دنیا کے بانی بن گئے۔ قدیم ہندوستان، قدیم ایران اور قدیم روما ایسے ہی وحشی اور ظالم اقوام کی قائم کردہ تہذیبیں تھیں جن کی عظمت کا ڈنکا آج بھی بجتا ہے۔ مگر لکھنے والے یہ نہیں دیکھتے کہ ان سے قبل بھی یہاں انسان رہتے تھے اور زیادہ پر سکون اور پر امن رہتے تھے۔ گو کہ وہ بڑی بڑی عمارتوں میں نہیں رہتے تھے اور نہ ہی ان کے پاس لاکھوں گھڑ سواروں کا طوفانی لشکر ہوتا تھا۔ لیکن ان میں ایک خوبی ضرور تھی کہ وہ انسانوں کا خون بہانے کی بجائے وہ انھیں اپنی صناعی اور اپنے ہاتھوں سے بنی ہوئی اشیاء سے مستفید کر رہے تھے۔ بلوچستان اور سندھ کی قدیم تہذیبوں میں صرف چند ایک مقامات پر چند حملوں کی نشاندہی ہوتی ہے وگرنہ وہ قدیم معاشرہ انتہائی پر امن اور پر سکون تھا۔ اور اسکا سماجی پھیلاؤ اگرچہ عراق کے سمیریوں تک تھا مگر یہ پھیلاؤ کسی تشدد یا حملے کے نتیجے میں عمل میں نہیں آیا تھا بلکہ دیگر اقوام کو اپنی صنعتی اشیاء سے مستفید کر کے بہتر اور متمدن زندگی کی طرف لانا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ امن اور سکون کا پیغام دینے والا یہ معاشرہ جو طاقت اور ظلم کے بل بوتے پر قائم نہیں ہوا تھا آج بھی قائم و سلامت ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بیشتر وحشی، خانہ بدوش اقوام اور بعض مہذب حملہ آوروں کا گزر بلوچستان سے ہوا انہوں نے حتیٰ الوسع یہاں کی بڑھتی ہوئی ترقی کو روکنے کی دانستہ یا غیر دانستہ کوشش کی۔ بعض حملہ آوروں کے ساتھ یہاں کے مقامی باشندوں کا مقابلہ بھی ہوا اور جانبین کا جانی نقصان بھی ہوا مگر زیادہ نقصان یہاں کے مقامی باشندوں کو ہوا۔ ان کی قدیم تہذیب جو پہلے ہی سخت ترین زوال کا شکار تھا کو مزید دھچکا لگا۔ اور ہر بار اور ہر حملہ آور نے سابقہ حملہ آوروں کی تاریخ دھرائی۔ اس بات کی سچائی میں ذرہ برابر شک نہیں کہ کوئی بھی حملہ آور قوم بلوچستان کے طول و عرض میں ٹک نہیں سکا اور زیادہ وسائل کی تلاش میں آگے نکل گیا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ بلوچستان میں ان وحشیوں کا بھوک مٹانے، پیاس بجھانے اور جیبیں بھرنے کیلئے انسانی گوشت، خون اور مال و دولت کی کثرت نہیں تھی جبکہ سندھ وہند میں پچھلے ہزاروں سالوں سے آباد انسانوں نے اپنی دن رات کی محنت سے اپنے لئے وسائل پیدا کئے تھے اور وحشت سے سکون کی طرف لوٹ آئے تھے۔ لہٰذا ان وحشیوں نے زیادہ تر ان ہی سرسبز وشاداب زمینوں کا رخ کیا اور وہاں بڑی بڑی تہذیبوں کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح ایران، مشرق وسطیٰ اور یورپ کی طرف پھیلنے والے اقوام بھی وحشی ہونے کے باوجود بڑی بڑی تہذیبوں کے بنیاد گزار بنے۔ مگر چونکہ ان تہذیبوں کی بنیاد ظلم، جبر، زیادتی اور ناانصافی پر رکھی گئی تھی اور ان سرزمینوں کے حقیقی باشندوں کو حقوق واختیارات سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ انھیں ملیچھ، کمتر، داسیو، بھیل اور نجانے کیا کیا القابات دیئے گئے تھے۔ لہٰذا ان تہذیبوں کی مکمل تاریخ اگر اٹھا کر دیکھی جائے تو ان کا ہر صفحہ انسانی خون سے رنگین نظر آئے گا۔ وہ جتنا عروج پاتے ان کا جبر بڑھتا جاتا حتیٰ کہ خدائی تک کے دعویدار ان میں پیدا ہوئے۔ اور آخر کار ان کا بدترین زوال ہوا جس کے نتیجے میں صرف خاندان ہی نہیں قوموں کے بھی نام ونشان مٹ گئے۔ یہی تو وجہ ہے کہ آج وہ قدیم اقوام تاریخ

عالم پر ایک نقطے کی حیثیت بھی نہیں رکھتے حالانکہ یہی اقوام کبھی پوری عالم پر اختیار و اقتدار رکھتے تھے۔ مگر وہ چھوٹی قومیں جو فطرت کے قائم کردہ حدود و اختیارات کے اندر رہے، کبھی اس سے تجاوز کرنے کے کوشش نہیں کی اور نہ ہی اپنے نظام کی بنیاد ظلم، جبر اور ناانصافی پر رکھی اور امن و آشتی کو ہمیشہ اپنا منشور بنائے رکھا، وہ آج بھی قائم و دائم ہیں۔ گو کہ ان کا ارتقائی عمل شدید سست روی کا شکار رہا مگر ان کی ثقافت اور تہذیب زوال سے محفوظ رہی۔

بلوچستان میں ہی اگر دیکھا جائے تو خود بلوچ قوم اسکی سب سے بڑی مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے کہ اس کی قدیم تہذیب و تمدن چند بنیادی اصولوں پر رکھی گئی ہے جنھیں بلوچی ضابطہ اخلاق کہا جاتا ہے۔ اسی ضابطہ اخلاق کی بنیاد پر یہ قدیم قوم اپنی تہذیب و ثقافت کے ساتھ اپنے قدیم مسکن میں موجود ہے۔

بلوچستان میں سے گزرنے والی قدیم حملہ آور اور خانہ بدوش اقوام کی کثیر تعداد میں یہاں آبادکاری ہوتی تو یقینا یہاں بھی کسی طاقت ور تہذیب کے آثار ضرور ملتے یا کم از کم بابل و عراق، سندھ و ہند وغیرہ کی طرح کے بڑے اور پختہ تعمیرات ضرور نظر آتے۔ مگر یقینا وسائل کی عدم دستیابی نے کسی بھی حملہ آور کو یہاں زیادہ دیر ٹکنے نہیں دیا اور وہ یہاں سے فوراً نکل گئے۔ یہی وجہ ہے کہ مؤرخین بلوچستان کو ایک قدیم گزرگاہ تحریر کرتے ہیں جو مشرق و مغرب کے مابین واقع ہے۔ کسی غالب بیرونی تہذیب نے بلوچستان کو ترقی دینے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ گزرگاہ کے علاوہ جب مشرق و مغرب میں عظیم سلطنتیں وجود میں آئیں تو اس خطے کی حیثیت ایک دور دراز فوجی چوکی کی سی ہو کر رہ گئی کہ جس کی ترقی کے بارے میں حکمران نہیں سوچتے تھے اور نہ ہی کبھی اس میں انہوں نے بسنے کی کوشش کی۔

جدید دور کے وسائل اور لوازمات کو اگر مد نظر رکھا جائے، بلوچستان کی جغرافیائی، سیاسی، معاشی، ثقافتی اور تہذیبی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے اور اس پورے دور کو دو حصوں میں بانٹ دیا جائے یعنی قدیم تہذیب کا دور اور یلغاروں کا دور، تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ یہاں جتنی بھی سماجی ترقی ہوئی ہے وہ یہاں کے قدیم باشندوں کی مرہون منت ہے۔ جن کے زوال کے بعد تو حاکموں اور حملہ آوروں نے یہاں کے مسائل کے پیشِ نظر اور لوگوں کے مفادات میں اپنے وسائل سے ایک کاریز تک کھودنے کی زحمت نہیں کی۔ کچھ ترقی کے آثار اگر نظر آ بھی جاتے ہیں، مثال کے طور پر برطانوی ریلوے لائن اور فوجی چھاؤنیاں تو وہ بھی حملہ آوروں کے توسیع پسندانہ مفادات کی خاطر تھے، اور آج۔۔۔۔! یقیناً آج بھی صورت حال کچھ مختلف نہیں بلا شبہ بلوچستان آج بھی معدنی، تہذیبی، ثقافتی، سماجی اور جغرافیائی لحاظ سے دنیا کا انمول ترین خطہ ہے اور بلوچ قوم اس خطے میں ہزاروں سالوں سے دفاعی جنگ لڑتے ہوئے اپنا بھرپور کردار ادا کر رہی ہے مگر حکمرانوں کی جانب سے ظلم و جبر اور معاشرتی و انسانی ناانصافی اور حقوق کی پامالی کا سلسلہ بھی جاری و ساری ہے۔

باب پنجم:

بلوچستان کے ساتھ قدیم باشندوں اور حملہ آور اقوام کا سلوک

یہ اعتراف کیا جاچکا ہے کہ بلوچستان کی ثقافت دنیا کی قدیم اور اولین ثقافتوں میں سے ایک ہے۔ یہ وہ خطہ ارضی ہے کہ جہاں حضرتِ انسان نے پہلی بار پہاڑی غاروں اور درختوں کی شاخوں وغیرہ پر اقامت اختیار کرنے اور در در خانہ بدوشانہ طرز پر بھٹکنے کی بجائے مسطح زمین پر محفوظ چار دیواری اور گھر بنا کر رہنا سیکھا۔ اسی خطہ ارضی پر رہتے ہوئے انسان نے علم و ہنر مندی سیکھی اور شعوری طور پر اپنا سکہ منوایا۔ اس نے کیمیا گری میں مہارت حاصل کی اور کیمیائی مرکبات اور رنگ سازی کی صنعت کو ایجاد کیا، اس نے اپنی ضروریات زندگی کو حاصل کرنے کی خاطر ہر طرح کی سہولتوں کا انتظام کیا۔ عمدہ ترین برتن بنائے اور اپنی اس صنعت کو بین الاقوامی درجے پر لے گیا۔ حتیٰ کہ مشرق و مغرب میں بعد ازاں جنم لینے والی ثقافتیں ان کے بڑے گاہک ہوتے تھے۔ بلوچستان کے قدیم باشندوں نے کھیتی باڑی اور دیگر ضروریات کے اوزار بنائے اور زمین سے اپنی ضروریات حاصل کرنے لگے۔ مہر گڑھ کے باسیوں نے کئی اقسام کی اجناس، سبزیاں اور پھل وغیرہ اگانا سیکھا اور زمین سے بڑی مقدار میں پیداوار حاصل کرنا شروع کیا۔ ان کی زرعی پیداوار ان کی ضروریات سے بھی زیادہ ہوتی تھی لہٰذا وہ زائد پیداوار کو گودام میں مخصوص برتنوں میں محفوظ کرتے تھے۔ ایسے کئی گودام اور اناج محفوظ کرنے کے بڑے جار نما برتن (کُولی) مہر گڑھ سمیت بلوچستان کے کئی دیگر ٹیلوں سے برآمد ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ بلوچستان

کے اولین باشندوں نے دیگر صناعی و ہنرمندی کے علاوہ میڈیکل سائنس اور جراحی میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا۔ چنانچہ مہرگڑھ سے دنیا کا اولین ڈینٹل سرجری ہسپتال یعنی دانتوں کی جراحت کا ہسپتال برآمد ہوا جہاں سے آپریشن شدہ دانت اور آلات جراحی کی کثیر تعداد دریافت ہوئی ہیں۔ جو اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ بلوچستان کے اولین باشندے ترقی کی معراج تک پہنچ چکے تھے اور دنیا کے دیگر حصوں میں رہنے والے انسانوں کی بڑی تعداد اُن کی صنعتوں اور ہنرمندیوں سے مستفید ہو رہی تھی۔

بلوچستان کے اکثر ٹیلوں سے ایسی اشیاء اور اس سائز کے برتن برآمد ہوئے ہیں جن پر عام استعمال کے برتنوں کا گمان نہیں ہوتا بلکہ کسی خاص مقصد کے لیے بنائے جانے والے برتنوں کا گمان ہوتا ہے۔ یہ برتن سائز میں ہی چھوٹے نہیں بلکہ ان کی بناوٹ بھی عام استعمال کی دیگر برتنوں سے مختلف ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ برتن علاج معالجے کے کام آتے تھے اور ان میں ادویات کی مقدار ناپی جاتی تھی جبکہ کچھ برتن ایسے بھی ہیں جو دوہرے پیندے والے ہیں جن کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے یہ کوئی دوا یا مکسچر بنانے کے کام آتے تھے۔ شیشے کے بنے ہوئے اس طرح کے برتن دور جدید میں سائنس لیبارٹریوں میں عام ہیں اور ان کا مقصد بھی مکسچر وغیرہ بنانا ہوتا ہے۔

مہرگڑھ کے باسی جہاں دانتوں کی سرجری جیسا پیچیدہ امراض کا علاج کرنا اگر جانتے تھے تو یقیناً وہ دیگر امراض کا علاج بھی بخوبی جانتے ہوں گے۔ ضلع کوہلو کے علاقے دمبِ نصیبو سے مٹی کا ایک ایسا برتن ملا ہے جو اصل میں دو برتن ہیں اور ان کے پیندے بھی الگ الگ ہیں جبکہ درمیان سے دونوں کو ایسے جوڑا گیا ہے جیسے ان میں کوئی پائپ ڈالا گیا ہے۔ یہ برتن یقیناً کسی مکسچر یا دوا بنانے کے کام آتا ہوگا۔ بلوچستان سٹڈی سنٹر کے عجائب گھر میں اس خوبصورت اور

انوکھے طرز اور بناوٹ کے برتن کو محفوظ کیا گیا ہے۔ اس طرز کے کئی دیگر برتن بھی مذکورہ عجائب گھر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

وہ مردوں کو دفنانا جانتے تھے اور ان کی زندگی میں مذہب کا تصور پیدا ہو چکا تھا۔ وہ کسی مخصوص دیوی دیوتا کی پوجا کرتے تھے جسے وہ زمین، ماں اور ایک شفیق مگر رعب دار عورت سے تشبیہہ دیتے تھے۔ بلوچستان کے کئی مقامات سے ایسی مورتیاں برآمد ہوئی ہیں جو مادر ارض کی ہیں۔ بعض مقامات پر یہ ایسی عمارتوں سے برآمد ہوئی ہیں جن پر عبادت گاہوں کا گمان ہوتا ہے۔ ان میں بعض جگہ مورتیوں کو کسی اونچی جگہ پر رکھا گیا تھا اور ان کے قریب سیپوں میں سیندور بھی ملے ہیں جو بلاشبہ ہندو مذہب کا ایک جُزوِ لاینفک ہے۔ یہ مورتیاں اور اس طرح کے مذہبی اشیاء کی برآمدگی اس دعویٰ کی تصدیق کرتی ہیں کہ ہندوؤں کے مذہب کی ابتدا بلوچستان سے ہوئی اور یہیں پر اُن کے قدیم مشاہیر کے ابتدائی مقامات بھی ملے ہیں۔

علاوہ ازیں مہرگڑھ کے باشندوں نے کئی راستے دریافت کیے اور دیگر خطوں میں بودوباش اختیار کرنے والے لوگوں سے رابطے کیے اور آپس کے تعلقات کو فروغ دیا۔ لہٰذا مہرگڑھ سے برآمد ہونے والے برتنوں کے علاوہ مذہبی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والی اشیاء بھی برآمد ہوئی ہیں۔ مہرگڑھ کے مشرق میں واقع ضلع بارکھان اور اس کے مغرب میں واقع ضلع مستونگ کی تحصیل کانک سے مادرارض کی ایسی مورتیاں ملی ہیں جو مہرگڑھ کی مورتیوں سے مشابہ ہی نہیں بلکہ ہوبہو وہی ہیں۔ جو اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ مہرگڑھ کا دائرہ کار کافی وسعت اختیار کرچکا تھا اور اس کی ثقافتی و مذہبی حدود میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ یہ مورتیاں بھی بلوچستان سٹڈی سنٹر کے عجائب گھر میں محفوظ ہیں۔

حتیٰ کہ مہرگڑھ سے انسانی آبادی اور صنعت وحرفت کا یہ سلسلہ پھیلتا گیا اور مشرق و مغرب کی جانب اس کی آبادی منتقل ہوتی گئی جبکہ بلوچستان کے دیگر خطوں میں بھی انسانی بستیاں قائم ہونے لگیں۔ یہ نہیں کہ مہرگڑھ کے باسی ہی ان خطوں میں جاکر بس گئے تھے بلکہ جہاں جہاں انسان اب تک وحشیانہ یا نیم وحشیانہ طرز زندگی گزار رہا تھا وہ آہستہ آہستہ مہذب زندگی کی جانب آنے لگا۔ مہرگڑھ والوں کی تقلید میں دیگر خطوں کے باشندے بھی زمین پر بسنا شروع ہوگئے اور زمین کے علاوہ اپنی ہنر مندیوں سے اپنا رزق حاصل کرنے لگے اور ترقی کی منازل طے کرنے لگے۔

گیارہ ہزار سال قبل جنم لینے والی یہ آبادیاں رفتہ رفتہ بڑھنے لگیں اور بلوچستان کا خطہ گنجان ہوتا گیا۔ آبادیاں مزید پھیلتی گئیں اور بستیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہی پھیلتی ہوئی آبادیاں برادریوں اور قبیلوں کی شکل اختیار کرنے لگیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قبیلوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی اور ان کی افرادی قوت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ وہ قدیم باشندے کون سی زبان بولتے تھے؟ یہ تو نہیں معلوم، بہرحال انہوں نے اپنی زبان میں اپنے علاقوں اور برادریوں کو نام بھی دیے ہوں گے۔ ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ہم اُن قدیم باشندوں کی زبان کے بارے میں کوئی دعویٰ کرسکیں۔ البتہ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ سندھی تہذیب کے عروج اور غلبے تک یہاں کے باشندے اپنی جداگانہ حیثیت قائم کرچکے تھے اور گذشتہ ہزاروں سالوں کے سفر کے بعد وہ ایک وسیع وعریض خطہ پر اپنی سماجی اور سیاسی برتری قائم کرچکے تھے۔

بلوچستان اور موجودہ ایران پر آرین حملوں سے قبل یہ قدیم آبادیاں آپس میں مربوط ہوچکی تھیں حتی کہ ان کا پھیلاؤ انتہائی وسیع وعریض علاقے تک بڑھ چکا تھا۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ قدیم آبادیاں ایسے خطے میں آباد ہونا شروع ہوچکی تھیں جہاں وسائل کی کمیابی تھی اور زیادہ تر

زمین بنجر اور ناقابلِ کاشت تھی۔ پانی کی کمی اور دیگر آبی ذرائع کا فقدان تھا۔ یہ واقعی عجیب اور سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ چونکہ یہ خطہ مشرق و مغرب کے مابین سنگم کی حیثیت رکھتا ہے اور ایران و ہندوستان کے مابین واقع ہے شاید اسی وجہ سے قدیم باشندوں نے یہاں بسنا شروع کیا۔ مگر یہ کوئی معقول وجہ ہرگز نہیں ہے کیونکہ اُس وقت نہ تو بڑی بڑی سلطنتیں قائم تھیں اور نہ ہی انسان کی سیاسی سفر کا آغاز ہوا تھا۔ بلکہ یہ تو انسان کے شعوری زندگی کا آغاز تھا اور وہ ابھی شکاری زندگی چھوڑ کر زمین سے اناج حاصل کرنے کے طریقے سیکھنے لگا تھا۔ بلکہ سب سے پہلے اُس نے اپنی جانوں کی حفاظت کی خاطر چار دیواری اور اُس کے اوپر گھاس پھونس اور گارے کی چھت ڈالنا سیکھا اور پھر اپنی خوراک کے ذرائع تلاش کرنا شروع کیے۔ اس کا یہ سفر بھی کافی طویل تھا۔ اس کے لیے اُس نے یعنی قدیم انسان نے بلوچستان کا انتخاب کیوں کیا؟ اس سے قطع نظر یہ دیکھنا ہے کہ اُس کا سفر غیر ملکی حملہ آوروں کی آمد سے قبل کتنے عرصے تک رہا؟ اور اس نے کتنی معراج حاصل کی؟

بلوچستان کی قدیم آبادی کے باشندے بڑے ہنرمند اور باصلاحیت تھے۔ ان کی آبادی بڑھتی گئی اور اُن کے دیہاتوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ جہاں جہاں پانی کے چھوٹے بڑے ذرائع نظر آئے تو یہ لوگ وہاں آباد ہوتے گئے اور چھوٹے چھوٹے دیہات بنا کر رہنے لگے۔ مگر جوں جوں آبادی بڑھتی گئی وسائل میں بھی کمی آتی گئی۔ بالخصوص خوراک اور زراعت کے ذرائع کم پڑنے لگے۔ لہٰذا قدیم ہنرمند انسان نے اپنے پانی کے وسائل کو بڑھانے کے لیے سائنسی بنیادوں پر کام کیا اور پہاڑی علاقوں میں بندات تعمیر کیے اور کاریزات احداث کیے۔ کاریزات کے پانی کو زمین دوز نالیوں کے ذریعے دیہاتوں تک پہنچایا اور اسے زراعت و آبپاشی کے علاوہ خوراک کے طور پر بھی استعمال کیا۔ اس طرح بلوچستان کے قدیم باشندوں نے اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات پوری

کرنے کے ذرائع تلاش کیے اور نہ صرف اپنی ضروریات پوری کیں بلکہ اس طریقہ آبپاشی کے ذریعے زائد پیداوار بھی حاصل کرنے لگے۔ جبکہ بندات کے ذریعہ پہاڑی علاقوں میں پانی روک کر اسے نہ صرف آبپاشی کے کام میں لایا جاتا تھا بلکہ اس طریقہ سے زیرِ زمین پانی کی مقدار میں بھی اضافہ ہوجاتا اور کاریزات میں معمول سے زیادہ پانی آنے لگتا۔ یقیناً قدیم انسان کا یہ عظیم کارنامہ تھا کہ جو انتہائی کامیاب رہا اور ہزاروں برس تک خطے کے باشندوں کی کفالت اسی طریقہ آبپاشی و زراعت سے ہوتی رہی۔ بلوچستان کے طول و عرض میں ایسے ہزاروں کاریزات اور پہاڑی خطوں میں قدیم بندات عام ملتے ہیں جو یہاں کے قدیم باسیوں کے خطے کی ترقی اور عوام کی خوشحالی کے لیے کیے گئے ایسے اقدامات تھے جن سے عام آدمی نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ بلاشبہ بلوچستان کی آثار قدیمہ میں ان کاریزات اور بندات کی وہی اہمیت ہے جو مصر کے آثار قدیمہ میں فراعین کے اہراموں کی ہے۔ اگر مصریوں کو اپنے آثار قدیمہ میں اہراموں پر فخر ہے تو بلوچستان کے قدیم باشندوں کے احداث کردہ کاریزات اور تعمیر کردہ بندات پر بلوچستان کے باشندوں کو ناز ہے۔

قارئین کرام ایک بات ضرور ذہن نشین کیجیے کہ کاریزات اور بندات تعمیر کرنا کسی فرد واحد کا انفرادی کام نہیں ہوسکتا اور نہ ہی کسی گاؤں کے باشندوں کا فیصلہ ہوسکتا ہے بلکہ یقیناً یہ ترقیاتی اقدامات کسی بڑے فیصلے کے تحت کیے گئے ہوں گے۔ کیونکہ یہ کاریزات اور بندات اِکا دُکا نہیں بلکہ بالترتیب ہزاروں اور سینکڑوں کی تعداد میں ہیں اور پورے بلوچستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ موجودہ بلوچستان کے ماسوائے چند مشرقی اضلاع کے باقی سارے بلوچستان میں قدیم کاریزات کا ایک عظیم الشان جال پھیلا ہوا ہے جن کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ یہ کاریزات اب تقریباً ناکارہ ہوچکے ہیں مگر ان کی اتنی بڑی تعداد سے کئی سوالات جنم لیتے ہیں۔ یعنی یہ کہ اتنی زیادہ تعداد میں ان کاریزات کی موجودگی کا مطلب یہ ہے کہ بلوچستان کی قدیم آبادی بہت زیادہ

ہوگی کیا اتنی زیادہ آبادی بغیر کسی سیاسی نظام کے زندگی گزار رہی ہوگی؟ کیا سینکڑوں کی تعداد میں آباد بستیاں آزاد اور خودسر ہوں گی؟ کیا تمام دیہات اپنی مرضی کی زندگی گزار رہے ہوں گے؟ ایسے کئی سوالات ذہن میں آتے ہیں۔ ان سوالات کا کوئی تحریری جواب یا شہادت بھی نہیں کہ جس کی بناء پر یہ کہا جاسکے کہ ہاں ان درج بالا سوالات کے مطابق گذشتہ باشندوں کی زندگی تھی یا پھر معاملہ اس کے برعکس تھا۔

ان سوالات کے جواب تلاش کرنا اتنا آسان نہیں ہے مگر ناممکن بھی نہیں ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ دستیاب شہادتوں کی بنیاد پر کوئی مفروضہ قائم نہ کیا جاسکے۔ بلوچستان کے طول و عرض میں ایسی سینکڑوں شہادتیں ایستادہ ہیں جو ہمیں ماضی قدیم کے باشندوں کی سیاسی و سماجی نظام زندگی کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتی ہیں۔ بلوچستان کی قدیم باشندوں کی مسمار شدہ اور مٹی کے ٹیلوں میں تبدیل شدہ بستیاں دراصل زمانہ قدیم کے بلوچستان کے بارے میں جاننے کا انمول ذریعہ ہیں۔ مٹی کے ان ٹیلوں میں ماضی قدیم کے باشندوں کی مکمل سیاسی و سماجی زندگی کی کہانی چھپی ہوئی ہے ضرورت صرف اس کہانی کو کھود نکالنے اور منظر عام پر لانے کی ہے۔ بلوچستان کے طول و عرض میں مٹی کے یہ ٹیلے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں جو اب بڑی تیزی کے ساتھ فنا کے گھاٹ اُتر رہے ہیں۔ مٹی کے ان ٹیلوں کی قدامت ہزاروں سال پُرانی ہے اور یہ اُن قدیم باشندوں کی بستیاں تھیں جو زمانہ ماقبل تاریخ میں بلوچستان میں آباد ہوئے اور یہاں اپنے مساکن تعمیر کیے۔

دراصل ان قدیم باشندوں کی بستیوں اور ان سے برآمد ہونے والی اشیاء کو دیکھنے اور ان کا بغور مطالعہ کرنے سے کئی باتیں منظر عام پر آتی ہیں اور کئی مفروضے ذہن میں جنم لیتے ہیں۔ یعنی یہ کہ:

اولین باشندوں نے سول ٹیکنالوجی میں کافی مہارت حاصل کرلی تھی جس کی وجہ سے وہ کاریزات اور بندات تعمیر کرنے کے علاوہ مکانات اور چھوٹے درجے کے قلعہ نما عمارتیں بھی تعمیر کرسکتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ کچے اور پختہ اینٹوں کے علاوہ پتھروں کو تراش کر مکانات بھی تعمیر کرنے لگے تھے۔ اس کے علاوہ وہ دیگر اقسام کی تعمیرات مثلاً گمبد اور مقبرے بھی بنانے لگے تھے۔ وہ اپنے مردوں کو قبروں میں دفن کرتے تھے۔

علاوہ ازیں ماضی قدیم کے یہ باشندے اس حدتک عقلمند اور قابل تھے کہ وہ کیمیا گری بھی بخوبی جانتے تھے اور اس فن میں زبردست مہارت رکھتے تھے۔ وہ میڈیکل سائنس کے علاوہ رنگ سازی میں بھی کافی مہارت حاصل کرچکے تھے۔ وہ اپنے بنائے ہوئے پختہ برتنوں پر مختلف رنگوں سے اقلیدسی اشکال اور دیگر تصویریں بناتے تھے جس کی وجہ سے اُن کے برتنوں میں انفرادیت اور بیحد خوبصورتی آتی تھی اور ان کی مارکیٹ میں مانگ بڑھ جاتی تھی۔ رنگ بنانا بذات خود کیمیا گری ہے جو مختلف اقسام کے کیمیکل اور اشیاء کے مکسچر سے بنتا ہے۔ اس کا بنانا بے شک ایک بہت بڑا فن ہے اور یہ فن ہمارے قدیم اجداد کا عظیم کارنامہ تھا۔ ان کے تیار کردہ اور برتنوں پر استعمال کردہ رنگ اس حدتک پختہ ہیں کہ ہزاروں سال گزرنے، مٹی تلے دفن ہونے، مختلف طرح کے طوفانوں اور موسموں کا سامنا کرنے کے باوجود یہ خراب نہیں ہوئے اور ان پر چڑھا ہوا رنگ بھی اب تک ایسے ہی ہے جیسا کہ بالکل تازہ تازہ رنگے گئے ہوں۔ ہیروڈوٹس کوہِ البرز کے قدیم باشندوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ اپنے کپڑوں پر بھی مختلف رنگوں سے اشکال بناتے تھے جو اتنے پختہ ہوتے تھے کہ کپڑے پھٹ جانے کے باوجود ان رنگوں کی چمک دمک میں کوئی کمی نہیں آتی (ہیروڈوٹس 109:2001)۔

کیمیاگری اور دیگر فنون کے علاوہ قدیم باشندوں کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ دنیا کے اولین زراعت پیشہ اور فن زراعت کو متعارف کرانے والے انسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ شکاری اور خانہ بدوشانہ زندگی چھوڑ دینے کے بعد جب ان قدیم لوگوں نے مہرگڑھ سمیت بلوچستان کے طول و عرض میں اپنی بستیاں قائم کیں تو وہ زمین کے ساتھ وابستہ ہوگئے اور اپنی تمام تر مفادات بھی زمین کے ساتھ وابستہ کیں۔ زمین پر بسنے سے قبل ان قدیم باشندوں کی زندگی خانہ بدوشانہ تھی اور اُن کی خوراک کا زیادہ تر دارومدار شکار پر تھا۔ وہ ابھی تک جانور پالنے کے فن سے ناواقف تھے صرف اپنی دفاع اور خوراک کے حصول تک محدود تھے۔ زمین پر بس جانے کے بعد انہوں نے اپنی خوراک کے حصول کے ذرائع تبدیل کر دیے، گوشت کی بجائے وہ زرعی اجناس، سبزیوں اور پھلوں وغیرہ سے بھی استفادہ کرنے لگے۔ اب وہ خود کفیل ہو چکے تھے اور انہیں نہ صرف پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا تھا بلکہ ضرورت سے زیادہ پیداوار بھی حاصل کرنے لگے تھے لہٰذا اُنہوں نے اپنی زائد پیداوار کو محفوظ کرنے کے طریقے تلاش کیے اور خوراک کو سٹور کرنے کا سامان کیا۔ لہٰذا بلوچستان کے مختلف مقامات پر پائے جانے والے قدیم ٹیلوں سے ایسے بڑے بڑے برتن برآمد ہوئے ہیں جن میں گندم کو سٹور کیا جاتا تھا۔ مقامی بلوچ آبادی گندم سٹور کرنے کے لیے اب بھی ایسے ہی برتن استعمال کرتی ہے جنہیں ''کُولی'' کہا جاتا ہے۔ مہرگڑھ کے کھنڈرات کی کھدائی کے دوران کئی اقسام کے اجناس کے دانے اور بیج ملے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کے قدیم باشندے زراعت کے فن میں بہت عبور حاصل کر چکے تھے اور مختلف اقسام کی زرعی پیداوار حاصل کر کے اپنی تمام تر ضروریات بخوبی حاصل کرنے کے قابل ہو چکے تھے۔ حتیٰ کہ وہ انگور اور کپاس کی کاشت بھی کرتے تھے اور کثیر پیداوار حاصل کرتے تھے۔ مہرگڑھ کے آثار میں انگور اور

کپاس کے بیجوں کی بڑی مقدار ملی ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کے قدیم باشندے ان اجناس اور پھلوں کی پیداوار سے بخوبی واقف تھے اور اس کی باقاعدہ کاشت بھی کرتے تھے۔

درج بالا پیداواری اور تخلیقی صلاحیتوں کے علاوہ قدیم باشندوں نے ایک ایسی عظیم الشان صنعت کی بنیاد رکھی جو بلاشبہ آج بھی بلوچستان کے وسیع و عریض خطے میں رہنے والے باشندوں کی سب سے بڑی صنعت اور وسیلہ روزگار ہے۔ یعنی گلہ بانی اور پالتو جانور پالنے اور ان سے استفادہ کرنے کا فن۔ قارئین کرام آپ یقیناً اس بات کو تسلیم کریں گے کہ اس گئی گزری حالت میں بھی بلوچستان کے موجودہ باشندوں کے حصول روزگار اور خوراک کا سب سے بڑا ذریعہ یہی صنعت ہے جسے بلوچستان کی سب سے بڑی صنعت کا درجہ بھی حاصل ہے۔ لہٰذا قدیم باشندے اس صنعت کے بانی تھے اور وہ صرف بھیڑ بکریاں ہی نہیں پالتے تھے بلکہ ان کے پاس بڑے مویشی یعنی بیل، گائے، بھینسیں، گدھے، اونٹ وغیرہ بھی بڑی تعداد میں ہوتے تھے جن سے وہ خوب استفادہ کرتے تھے۔ وہ ان جانوروں کا دودھ استعمال کرتے تھے، ان سے مکھن اور روغن حاصل کرتے تھے، جانور کی ہڈیوں کو بھی کام میں لایا جاتا تھا اور اس کی کھال تو ان کے نزدیک بے انتہا کارآمد شے ہوتی تھی۔ جس سے لباس اور پوشاک کے علاوہ گدان یعنی جھونپڑا نما گھر بھی بنائے جاتے تھے جو بہت دیرپا ہوتے تھے علاوہ ازیں کھال سے برتن اور بوریاں بھی بنائی جاتی تھیں جو دیرپا اور مختلف اشیاء کو سٹور کرنے کے کام آتی تھیں۔ پانی بھرنے، گھی، مکھن وغیرہ کو محفوظ رکھنے اور لسی بنانے کے لیے بھی چمڑے کے بنائے ہوئے مخصوص برتن استعمال ہوتے تھے جن کا استعمال اب بھی بلوچستان کے دیہی اور نیم خانہ بدوش باشندوں میں مستعمل ہے۔

ہڈیوں سے کئی کارآمد اشیاء اور اوزار بنائی جاتی تھیں۔ دیگر اوزاروں کے علاوہ ایک اہم آلہ جو اِن قدیم باشندوں کی بڑی ایجادات میں شمار ہوتا ہے یعنی ”سوئی“ کی ایجاد۔ لہٰذا مہر گڑھ

سمیت کئی دیگر مقامات پر پائے جانے والے آثار میں ہڈی سے بنائی ہوئی لاتعداد سوئیاں دریافت ہوئی ہیں۔ یقیناً اس ایجاد نے کئی دیگر فنون کو تخلیق کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہو گا مثلاً کپڑے بُننا اور سینا، بوریاں اور اس طرز کے دیگر اشیاء بنانا وغیرہ۔

قدیم باشندوں نے درج بالا مذکورہ فنون کے علاوہ کئی دیگر ہنر مندیوں میں کمال حاصل کر لیا تھا اور ان علوم و فنون کا دائرہ پورے بلوچستان میں پھیلا ہوا تھا۔ قدیم آثار کے مطالعہ سے یہ بات بھی شنید میں آتی ہے کہ ان تمام درج بالا شعبہ جات میں دن بدن جدت آتی جا رہی تھی اور یہ ترقی کے مختلف مدارج آہستگی کے ساتھ طے کرتے جا رہے تھے۔

ان قدیم باشندوں کی سماجی ترقی ایک حد تک پہنچنے کے بعد رُک گئی کیونکہ مشرق و مغرب میں اُس وقت تک بڑی بڑی تہذیبوں نے جنم لیا تھا کہ جن کی نہ صرف افرادی قوت زیادہ تھی بلکہ وہ زیادہ وسائل اور منظم سیاسی نظام کی ابتدا کر چکے تھے۔ پانچویں ہزارویں قبل مسیح کے اختتام تک بلوچستان کی قدیم ثقافت زوال پذیر ہونے لگی اور اس کی صنعت و حرفت آہستہ آہستہ نئی اور جدید تہذیبوں کی ترقی کے سامنے دم توڑتی گئی۔ بعض ماہرین تاریخ اور آثار قدیمہ کا خیال ہے کہ بلوچستان کی قدیم ثقافت آرین حملوں سے دو ہزار سال قبل ہی دم توڑ چکی تھی اور اس پر سندھ کی ابھرتی ہوئی زیادہ ترقی یافتہ شہری تہذیب نے غلبہ حاصل کر لیا تھا۔

بلوچستان کے قدیم باشندے سندھ اور عراق کی تہذیبی زندگی کے جنم لینے سے بھی ہزاروں سال قبل مہذب اور پُر آسائش زندگی کی جانب راغب ہو چکے تھے البتہ دریائی زمینوں سے دور ہونے کی وجہ سے ان قدیم باشندوں کی زندگی دیہی طرز کی تھی اور بلاشبہ اُس زمانے میں بلوچستان کے طول و عرض میں دنیا کا سب سے بڑا دیہی نظام قائم تھا۔ یہاں کوئی بڑا اور وسیع و عریض شہر واقع نہیں تھا البتہ چھوٹے قلعہ بند قصبات کہیں کہیں پر واقع تھے۔ باقی ماندہ بلوچستان

دیہی زندگی پر مشتمل تھی۔ مگر یہ دیہی زندگی بھی ایک منظم اور سادہ نظام کے تحت قائم تھی ایسا ہرگز نہیں تھا کہ یہ دیہات اور قصبات خود مختار اور آزاد تھے اور ہر معاملے میں اپنی مرضی اور منشأ کے مطابق کام کرتے تھے۔ کاریز کھودنا اور کوئی بند تعمیر کرنا، ظروف سازی کی وسیع و عریض صنعت قائم کرنا یا اس نوع کی دیگر مشکل اور وسیع المقاصد کام سرانجام دینا یقینا کسی فرد واحد یا کسی اکلوتے گاؤں کا کارنامہ نہیں ہو سکتا اور نہ ہی گاؤں کے کسی پنچائیت نے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہوگا۔ نہ ہی اتنے مربوط نظام حیات اور ضروریات کے حصول کے مشکل فیصلے کسی ایک گاؤں کے لوگوں کا کام ہو سکتا ہے۔ کاریزات اور بندات سمیت اس طرز کی بڑی تعمیرات کے لیے ہزاروں لوگوں اور بے شمار مالی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے جس کا بوجھ کوئی ایک گاؤں یا چند گاؤں مل کر بھی نہیں اٹھا سکتے۔ علاوہ ازیں یہ معمولی نوعیت کے پروجیکٹ نہیں تھے بلکہ قومی مفاد کے پروجیکٹ تھے جن کا مقصد کسی فرد واحد یا کسی ایک گاؤں کی کفالت کرنا نہیں تھا بلکہ ملکی پیداوار بڑھانا اور وسائل میں بہتری لانا تھا۔ یقینا اتنے بڑے پروجیکٹ کسی بڑے اور بااختیار منظم ادارے اور ریاست کی اجازت کے بغیر نہیں بنائے جا سکتے تھے۔ ایسی ریاست جس کے پاس مال و دولت اور وسائل کے ساتھ ساتھ افرادی قوت کی بھی بہتات ہو۔ لہٰذا وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ بلوچستان کا خطہ ماقبل تاریخ دور میں بھی ایک منظم اور مربوط سیاسی و سماجی نظام کے تحت قائم تھا جہاں اپنے زمانے کے لحاظ سے ایک منظم نظام حکومت قائم تھا اور اس کا دائرہ کار بھی خوب پھیلا ہوا تھا۔ یقینا اسی مربوط اور منظم سیاسی اکائی کے فیصلوں سے بلوچستان بھر میں پانی کے ذرائع میں بہتری لانے اور زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے کاریزات کا جال پھیلایا گیا جس پر اُس زمانے میں کثیر اخراجات آئے ہوں گے جو زرِ نقد کی صورت میں نہ سہی جنس اور دیگر اشیائے ضروریہ کی صورت میں صرف ہوئے ہوں گے۔ بلوچستان کے اُس قدیم نظام کے بارے میں کوئی تحریری مواد

دستیاب نہیں ہے مگر قدیم باشندوں کی لاتعداد نشانیاں اب بھی یہ کہتی ہیں کہ وہ زمانہ انتہائی مربوط و مضبوط نظام پر قائم تھا۔ وہ قدیم حکومت یا سیاسی ڈھانچہ کیا تھا اور کیسا تھا اس کے بارے میں ہمارے پاس کوئی تحریری ثبوت تو نہیں ہے البتہ بعض ایسے شواہد، جو تحقیقات اور ثبوتوں کے بعد سامنے آئے ہیں، اُس قدیم نظام پر کافی حد تک روشنی ڈالتے ہیں۔

بلوچستان کے مختلف ٹیلوں سے کھدائی کے دوران مادرِ ارض کی لاتعداد مورتیاں ملی ہیں جو زمانہ قدیم کے باشندوں کے مذہبی و روحانی اعتقادات کی وضاحت کرتی ہیں۔ ان مورتیوں کی دریافت سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جب یہاں کے باشندے زراعت سے وابستہ ہونے اور اپنی صنعت و حرفت کو فروغ دینے کے بعد کافی آسودہ حال اور متمول ہو گئے تو ان میں مذہب اور روحانیت کے رجحانات بھی پیدا ہونے لگے۔ ان میں مذہبی رسومات اور توہمات نے جنم لیا اور وہ ماورائی قوتوں کے قائل ہوتے گئے۔ بلوچستان کے ٹیلوں سے مادر ارض کی مورتیوں کے علاوہ بیلوں کے مجسمے اور دیگر کئی ایسی اشیاء ملی ہیں جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ قدیم باشندوں کے مذہبی عقائد و رسومات سے متعلق تھے۔ ان اشیاء میں سندُور سے بھری ہوئی سیپیاں، سواستیکا کے نشانات سے مزین برتن، مہریں اور تعویزات وغیرہ بھی کثرت سے شامل ہیں۔ اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ مذہب قدیم باشندوں کی زندگی کا جُزوِ لاینفک بن چکا تھا۔ جس طرح عراق کی سمیریوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا مذہب زرعی دور کی پیداوار تھا اور اُن کے مذہبی رسومات بھی زرعی مقاصد کے تہواروں پر مشتمل ہوتے تھے۔ ممکن ہے کہ بلوچستان کے قدیم باشندے، جو سمیریوں سے بھی قبل کے لوگ تھے، کی مذہبی رسومات بھی مذہبی دور کی پیداوار اور اختراع ہو۔ اس بات کے کافی ثبوت بھی ملتے ہیں کہ جب قدیم باشندے زراعت کے ساتھ وابستہ ہو گئے تو ان میں کسی انجانی قوت کا خوف بھی غالب آنے لگا۔ انہیں خراب موسم سے

ڈر لگتا تھا، بادو باران سے خوف آنے لگا تھا، اولے اور ژالہ باری کو آفت سمجھنے لگے تھے۔ خشک سالی یا بے تحاشہ بارش سے فصلوں کی تباہی اور بربادی کا اندیشہ رہنے لگا تھا۔ سخت سردی یا سخت گرمی سے ان کی فصلیں برباد ہو سکتی تھیں۔ لہٰذا یہ خوف انہیں ہر وقت لاحق رہتا تھا۔ یہی تو وجہ تھی کہ آہستہ آہستہ وہ کسی ماورائی اور انجانی طاقت سے مرعوب ہونے لگے اور اس کی الوہیت کا قائل ہونے لگے۔ اس نظر نہ آنے والی قوت کی کوئی خاص شبیہہ اُن کے سامنے نہیں تھی مگر اُس کے وجود کو قدیم باشندے تسلیم کرنے لگے تھے۔ اور جب اُس کی کوئی واضح صورت ان کی سمجھ میں نہ آئی تو انہوں نے زمین کو عورت یعنی ماں کا درجہ دیا اور اس کی مورتیاں بنا کر اسے ہی معبود کا درجہ دیا۔ بلوچستان کے طول و عرض سے جو مورتیاں ملی ہیں وہ زیادہ تر مادر ارض کی مورتیاں ہیں جو چھوٹے سائز یعنی صرف چھ سے آٹھ انچ تک کی عورتوں کی مورتیاں ہیں۔ مردوں کی مورتیاں بہت کم ملی ہیں جو بعد کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مادر ارض کی مورتیوں سے دو نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

اول: یہ کہ یہ کسی خاتون کی نہیں بلکہ زمین کی مورتیاں ہیں اور زمین کو عورت سے تشبیہہ دی گئی ہے یعنی جس طرح عورت بچے کو جنم دیتی ہے اور اس کی پرورش اپنے تن سے کرتی ہے بالکل زمین کا درجہ بھی ان قدیم باشندوں کی نظر میں یہی تھا کہ زمین ایک ماں کی طرح ہماری پرورش کرتی ہے اور ہمیں زندگی، خوراک، پناہ اور خوشیاں عطا کرتی ہے لہٰذا وہ زمین سے اظہار عقیدت کرتے تھے اور اُسی کو رازق کا درجہ دیتے تھے۔ ان کی نظر میں زمین کی کوئی واضح صورت نہیں تھی لہٰذا اس کی تشبیہی اور مماثلتی صورت میں اُس کی پوجا کی جانے لگی اور وہ تشبیہی صورت عورت کی مورتی کی شکل میں انہوں نے بنائی۔

دوم: یہ کہ عورت کو معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل تھا اور قدیم معاشرہ مدرسری نظام پر قائم تھا۔ عورت کو معاشرے میں سربراہ کی حیثیت حاصل تھی اور اس کا درجہ قبیلہ کے سربراہ کا تھا۔ لہٰذا جو بھی پیداوار حاصل ہوتی اُسے قبیلہ کی سب سے معمر عورت کے پاس لایا جاتا جو قبیلہ کی سربراہ ہوتی تھی۔ وہ انصاف کے ساتھ وسائل کو تقسیم کرتی۔ لہٰذا اُسے بھاگوان یعنی رزق تقسیم کرنے والی کا درجہ حاصل تھا اور قدیم باشندے ماں کی مورتیاں بنا کر اُس کی پوجا کرتے تھے۔ بہرحال ان مورتیوں اور دیگر اسی نوعیت کی اشیاء کی بلوچستان کے ٹیلوں سے برآمدگی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ بلوچستان کے قدیم باشندوں کی زندگی میں مذہب کا دخول ہو چکا تھا۔

اگر ان باشندوں کی زندگی میں مذہب کا دخول ہو چکا تھا تو پھر یقیناً وہ ایک منظم نظامِ حیات کے تحت زندگی بسر کر رہے تھے اور انفرادیت کی بجائے اجتماعی طور پر آپس میں ربط و تعلق رکھتے تھے۔ ان کا سیاسی نظام دورِ حاضرہ کی سیاست کی طرح پیچیدہ اور ذاتی مفادات کے حصول کا ذریعہ نہ تھا بلکہ وہ چند سادہ اصولوں اور تحفظات کے تحت ایک منظم زندگی گزارتے تھے۔ ان میں ابتدائی اشتمالی نظام قائم تھا اور وہ آپس میں جو معاشی تعلق رکھتے تھے اُن میں نقدی اور پیسہ نام کی چیز نہیں تھی بلکہ اشیا کا تبادلہ اشیاء کے ساتھ ہوتا تھا اور لوگ آپس میں اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے تعاون کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ بلوچستان کے حدود میں ایک نہیں کئی حکومتیں ہوں جن کے دائرہ کار بھی متعین ہوں۔ اس کا امکان ہے کیونکہ بلوچستان کے مختلف علاقوں سے ملنے والی مورتیوں اور اشیاء ضروریہ میں کسی حد تک فرق پایا جاتا ہے۔ اب تک کی تحقیقات کے مطابق بلوچستان کی آثار قدیمہ میں چار اقسام کی مادرِ ارض کی مورتیاں ملی ہیں جن کی بناوٹ اور طرز میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ مورتیوں کے ان نمونوں کو بلوچستان سٹڈی سنٹر جامعہ بلوچستان کے عجائب گھر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مکران اور مشکے سے ملنے والی مورتیاں ایک

جیسی ہیں جس کا مطلب ہے کہ مکران میں ایک ایسی ثقافت قائم تھی جس کا دائرہ کار مشکے یعنی آواران تک پھیلا ہوا تھا۔ جھلاوان یعنی خضدار کے علاقوں سے ملنے والی مورتیاں مکران اور دیگر علاقوں کی مورتیوں سے مختلف ہیں جو جھلاوان یعنی خضدار و نال ثقافت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اسی طرح مہر گڑھ، مستونگ اور بارکھان سے ملنے والی مورتیوں میں مکمل مشابہت پائی جاتی ہے جبکہ سوراب کے قریب واقع قصبہ بینچہ کے ایک ٹیلے دمبِ محمودانی سے ملنے والے برتن مہر گڑھ کے برتنوں سے کافی مشابہ ہیں۔ جو اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ مہر گڑھ کا دائرہ کار کوہِ سلیمان کے دامنوں سے لے کر موجودہ علاقہ سراوان اور کوئٹہ تک پھیلا ہوا تھا جبکہ ژوب کی مورتیاں باقی علاقوں کی مورتیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ان مورتیوں اور ظروف گلی کے نمونوں کے علاوہ قدیم باشندوں کی تعمیرات بھی اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ بلوچستان کے طول و عرض میں چار اقسام کی مقامی ثقافتیں جنم لے چکی تھیں۔

قدیم باشندے چاہے ایک ہی سیاسی اکائی کے طور پر منظم تھے یا پھر زیادہ گروہوں میں منقسم تھے مگر اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ ان باشندوں میں آپس میں ربط و تعلق قائم تھا اور اشیاء کا تبادلہ اشیاء کے بدلے ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ آپس میں اپنی سائنس اور ٹیکنالوجی کا بھی تبادلہ کرتے تھے اور ایک دوسرے کے کام آتے تھے۔ قدیم باشندوں کے بارے میں یہ دعویٰ شواہد کی بنیاد پر کیا جاسکتا ہے کہ سندھی تہذیب کے قیام سے قبل بلوچستان کے طول و عرض میں منظم طرزِ زندگی موجود تھی اور اِن قدیم باشندوں کا باقاعدہ سیاسی ڈھانچہ موجود تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑی تہذیبوں کے سامنے سرنگوں ہوتا گیا۔

آرین حملہ آوروں کی ہندوستان میں مداخلت سے قبل بلوچستان کی قدیم تہذیب زوال پذیر ہوچکی تھی اور خطے پر سندھیوں کی بالادستی قائم تھی گو کہ مقامی باشندے قدیم باشندوں کی

اولادیں اور باقیات تھیں مگر سیاسی اور معاشی ڈھانچہ متاثر ہو کر سندھی سیاسی نظام کے ماتحت ہو چکا تھا۔ ملوہا یعنی موہن جو دڑو کی تہذیب کا دائرہ کافی وسعت اختیار کر چکا تھا اور ہندوستان سے لے کر مشرق وسطیٰ تک اس کے تعلقات قائم تھے۔ بلوچستان کی تجارتی شاہراؤں پر اس نے دسترس حاصل کر لی تھی جہاں سے اس کے مشرق وسطیٰ کے ساتھ زمینی اور سمندری راستے سے رابطے بحال ہو چکے تھے۔

اس باب کے گذشتہ سطور میں بلوچستان کے قدیم باشندوں کی معاشرتی زندگی پر ایک سرسری سی نظر ڈالی گئی اور ان کے نظامِ حیات کا جائزہ لیا گیا۔ تو اس مطالعہ سے یہ بات شنید میں آئی کہ ماضی قدیم کے باشندوں نے دنیا کی پہلی دیہی معاشرے کی بنیاد رکھی اور شکاری زندگی ترک کر کے زمین پر آباد ہوئے۔ انہوں نے زراعت اور گلہ بانی کو بطور صنعت اور معاشِ حیات کے طور پر اختیار کیا جس کی وجہ سے انہیں مزید کئی صنعتیں ایجاد کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ زمین پر آباد ہونے کے بعد قدیم باشندے معاشرتی ارتقا کا سفر طے کرتے ہوئے کامیابی کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ ممتاز ماہرین آثار قدیمہ سر مورٹیمر ویلر، سٹیورٹ پگوٹ، ڈی۔ ڈی۔ کوسمبی، بیٹرس ڈی کارڈی اور کئی دیگر اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ بلوچستان میں دنیا کا اولین اور وسیع ترین دیہی نظامِ حیات قائم تھا۔ اس دیہی معاشرے نے دنیا کو جدید ترین ٹیکنالوجی فراہم کی اور انہیں کئی فنونِ ضروریہ سے آشنا کیا۔ ان قدیم باشندوں کے معاشرتی نظام کا ایک معمولی سا عکس گذشتہ اوراق میں پیش کیا گیا کہ انہوں نے اپنی ضروریات کے حصول کے لیے کیسے کیسے مفید اور دیرپا طریقہ کار اختیار کیے اور مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ پورے خطے میں معاشی و معاشرتی مساوات اور برابری قائم کی۔ اس مطالعہ سے یہ بات بھی شنید میں آئی کہ بلوچستان کے قدیم باشندے اشتراکی طرزِ حیات کے قائل تھے اور تمام تر پیداوار پر سب کا

مشترکہ اور برابر کا حق تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ سیدھا سادھا مگر کافی آسودہ اور خوشحال معاشرہ تھا۔ مگر جب معاشی اور معاشرتی ترقی اپنے عروج پر پہنچی تو مدرسری نظام کا خاتمہ ہوا اور مختلف طبقات وجود میں آئے۔ اب جنس کا تبادلہ جنس اور اشیاء کا تبادلہ اشیاء سے ہونے کی بجائے ناپ تول کا نظام معاشرے میں آیا اور اشیاء کے بدلے نقدی کا تصور ابھرا۔ لہٰذا بلوچستان کے کئی مقامات سے ایسی اشیاء برآمد ہوئی ہیں جن کے بارے میں ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ دراصل اوزان کے طور پر استعمال ہوتے تھے اور ان سے اشیاء کا وزن کر کے ان کی قیمتوں کا تعین کیا جاتا تھا۔ ایسے چند اوزان کے نمونے بلوچستان سٹڈی سنٹر کے عجائب گھر میں بھی محفوظ ہیں جو بلوچستان کے علاقہ نال کے قریب پائے جانے والے آثار سے ملے ہیں۔ جبکہ دیگر مقامات سے بھی ایسے کئی اوزان ملے ہیں۔

اس مطالعہ سے یہ بات بھی شنید میں آتی ہے کہ بلوچستان کے قدیم باشندے اپنے وقت کے عظیم معمار اور ترقی یافتہ لوگ تھے۔ جو گو کہ دیہاتوں میں رہتے تھے مگر وہ شہروں میں رہنے والوں سے زیادہ خوشحال اور آسودہ حال تھے۔ ان کے پاس دولت اور وسائل کی فراوانی تھی۔ وہ زرعی قطعات کے علاوہ سینکڑوں بلکہ لاکھوں بھیڑ بکریوں اور مال مویشیوں کے مالک تھے۔ وہ منظم زندگی گزارتے تھے اور زندگی کے اسرار و رموز سے بخوبی آگاہ تھے۔ انہوں نے اپنی زرعی پیداوار کے ساتھ ساتھ دیگر شعبہ ہائے زندگی کو بھی خوب ترقی دی اور اپنے معاشرتی ارتقائی سفر کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھاتے رہے۔ جس وقت مشرق و مغرب میں بڑی بڑی تہذیبوں نے جنم لیا تو اُس وقت تک بلوچستان کی قدیم دیہی ثقافت اپنے نقطہ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ابھی میسوپوٹیمیا یعنی دجلہ و فرات کے قدیم سمیری باشندے اور وادی سندھ یعنی موہنجو دڑو کے دراوڑ باشندے ثقافتی زندگی کے ابجد سے بھی واقف نہیں ہوئے تھے جب بلوچستان کے قدیم باشندے معاشرتی و معاشی ترقی کی معراج پر پہنچ چکے تھے اور ان کی معاشرتی زندگی کا معیار بہت بلند تھا۔

انہوں نے مشرق و مغرب کے راستے تلاش کر لیے تھے اور دجلہ و فرات اور ہندوستان کے قدیم باشندوں تک اپنی صناعی کے نمونے پہنچاتے تھے۔ بلاشبہ حملہ آور اقوام کی بلوچستان میں مداخلت سے قبل یہ خطہ دنیا کا پُرامن اور گنجان ترین خطہ تھا جہاں شہری زندگی تو نہیں تھی مگر زندگی کی تمام آسائشیں یہاں دستیاب تھیں۔

اس کے بعد جب بلوچستان کی قدیم ثقافت زوال پذیر ہوئی اور اس خطہ پر دیگر اقوام کے حملے اور غلبے شروع ہوئے تو جیسے ایک دم سب کچھ ساکت ہوا۔ ترقی جہاں تک پہنچی تھی وہیں پر رُک گئی اور پھر قدیم لوگ اپنی قدیم ثقافت کی دفاع کی جنگ میں ایسے مصروف ہوئے کہ جس نے انہیں کبھی چین سے بیٹھ کر ترقی کے مدارج طے کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ سندھیوں کا غلبہ کچھ عرصہ تک رہا کہ یہ سارا خطہ نئی وحشیوں کی درندگی کی بھینٹ چڑھ گیا اور یہ نئے وحشی آرین تھے جو دوسری ہزارویں قبل مسیح میں وسط ایشیاء کی جانب سے نکل پڑے اور ایران، بلوچستان، افغانستان، سندھ، پنجاب اور شمالی ہندوستان کو پامال کیا اور قدیم دنیا کا تمام تر نقشہ تبدیل کر کے رکھ دیا۔ ان نئے حملہ آوروں کی آمد سے دنیا ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔

آرین حملوں سے لے کر منگول حاکمیت کے خاتمے تک بلوچستان کے حالات پر گذشتہ باب میں تفصیل ساتھ روشنی ڈالی گئی اور یہاں کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا گیا۔ اگر ماضی قدیم کے باشندوں اور آرین حملہ آوروں کے بعد کے زمانے میں بلوچستان کے حالات اور یہاں کی معاشرتی ترقی اور سیاسی حالات کا موازنہ کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ بلوچستان کے ماضی کے باشندوں کے ادوار میں بلوچستان ترقی کی جس معراج پر پہنچا تھا اگر وہ رفتار جاری رہتا اور حملہ آور اقوام اپنی لالچ اور ہوس ملک گیری کی وجہ سے اس قدیم ثقافتی خطے اور اس کے باشندوں کو اپنی طاقت سے مغلوب کرنے کی کوشش نہ کرتے اور اس خطے پر حملہ آور نہ ہوتے تو یقیناً یہ خطہ مزید ترقی کرتا

اور سابقہ ترقی کی رفتار ایک دم سے نہیں رُک پاتی۔ کیونکہ بلوچستان پر جوں ہی سندھی اور بعد ازاں آرین اقوام اور دیگر حملہ آوروں کے حملے اور مداخلت شروع ہوئی تو بلوچستان کی قدیم ثقافت اور ترقی کی رفتار ایک دم جامد ہو گئی۔ پھر یہاں کے باشندے موقع ملنے پر اس جانب توجہ کرتے وگرنہ ان کی زندگی مدافعانہ جنگوں میں گزرنے لگی جو اُن پر مسلط کی گئی تھی۔

آرین حملوں کے بعد بلوچستان مشرق و مغرب میں جنم لینے والی طاقتور قوتوں کے نرغے میں آ گیا اور اس کے قدیم باشندوں کے لیے مدافعانہ جنگ یا مصالحانہ تعلقات کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا۔ گذشتہ ساڑھے تین ہزار سالوں سے یہ خطہ حالت جنگ میں ہے۔ اس طویل عرصہ میں بلوچستان پر مختلف اقوام کے حملے ہوئے اور کئی اقوام نے یہاں اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑھے۔ بعض اقوام نے یہاں طویل جبکہ کچھ اقوام نے قلیل عرصہ کے لیے اقامت اختیار کی اور خطہ کے سیاسی و ریاستی امور اپنے ہاتھ میں لیے۔ مگر بیرونی حملہ آوروں میں سے کسی نے بھی یہاں مستقل قیام نہیں کیا اور زُود یا بدیر اُسے یہاں سے نکلنا پڑا۔ ان حملہ آوروں اور قابضین کے ادوار میں بلوچستان کی ترقی اور معاشرتی ارتقا پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو اس بات کا ادراک ہو گا کہ اس خطے میں جتنی بھی ترقی ہوئی وہ قدیم مقامی باشندوں کی مرہون منت تھی کیونکہ جتنی ترقی حملہ آور اقوام کی خطے میں مداخلت سے قبل قدیم اقوام نے اس خطے کو دی تھی حملہ آور اقوام نے اس کا عشرِ عشیر بھی یہاں کام نہیں کیا بس لوٹ مار اور قتل غارت گری ہی اُن کے مشاغل رہے۔

بلوچستان کا قدیم معاشرہ پُر سکون اور پُر امن معاشرہ تھا۔ ممکن ہے کہ قدیم باشندوں میں بھی آپس میں قتال و جدال ہوتے رہے ہوں مگر ان کی خونریزی اور تباہی ایسی نہیں ہو گی جو تباہی آرین اور ازاں بعد کے بیرونی حملہ آور اقوام اپنے ساتھ لے کر آئے۔ مقامی باشندوں کے پاس سب کچھ تھا مگر جنگی اسلحہ اور سازوسامان نہیں تھا کہ جن کے بل بوتے پر وہ گھڑسوار اور

ہتھیار بردار اقوام کی تباہ کُن یورشوں کا مقابلہ کرتے۔ بلوچستان کے قدیم ٹیلوں میں کھدائی کے دوران کہیں پر بھی جنگی ہتھیار اس تعداد میں برآمد نہیں ہوئے کہ جن کی بناء پر یہ دعویٰ کیا جاسکے کہ قدیم باشندے بھی جنگی جنونیت جانتے تھے۔ اسی طرح قدیم باشندوں کی قلعہ بند بستیاں بھی اس نوعیت کی نہیں تھیں کہ جنہیں جنگی قلعے کہا جاسکتا۔ لہٰذا وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ بلوچستان کا قدیم معاشرہ پُرامن تھا اور جنگی جنونیت کی بجائے تخلیقی صلاحیتوں سے مالامال تھا۔

پھر سندھ کی جانب سے حملے شروع ہوئے اور آہستہ آہستہ سندھیوں کی مداخلت بڑھتی گئی۔ انہیں بلوچستان سے گزرنے والے راستوں کی ضرورت تھی۔ لہٰذا اُن کے حصول کے لیے انہوں نے مقامی باشندوں پر یورشیں کیں اور بزور طاقت ان کے قصبات اور بندرگاہوں پر قبضہ کیا۔ انہوں نے مقامی باشندوں کے قتل عام سے بھی دریغ نہیں کیا۔ ان حملہ آوروں نے مقامی آبادیوں کا ہر طرح سے استحصال کیا۔ مقامی آبادی اب قدیم دور جیسی طاقت ور نہیں تھی کہ ان نوارد مگر زیادہ طاقتور اقوام کا مقابلہ کرتی لہٰذا صدیوں تک خطے کی گزرگاہوں اور بندرگاہوں پر سندھیوں کا تسلط قائم رہا اور وہ ان راستوں کو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کرتے رہے۔ ایسے شواہد عمان کے قدیم آثار کی کھدائیوں کے دوران برآمد ہونے والے کتبات سے ملے ہیں۔ ان کتبات کے مطابق مشرق وسطیٰ کے عکادی اور سندھ کے ملوہا تہذیب کے مابین مکران کے ساحلوں اور اندرون ملک خشکی کے راستوں سے بڑے پیمانے پر تجارت ہوتی تھی۔ تیسری ہزارویں قبل مسیح میں بلوچستان کی تجارتی گزرگاہوں اور سمندری راستوں پر اپنے مفادات اور سرمائے کے حصول کے لیے بڑی طاقتوں کی دلچسپی اور تجارتی اشیاء کی مال برداری کے حوالے سے ایک مصنف لکھتا ہے کہ:

”ملوہا سے آئے ہوئے جہاز
ماگان (ساحلِ مکران) سے آئے ہوئے جہاز

دلمان سے آئے ہوئے جہاز
وہ لنگر انداز ہوئے
اکاد کے گھاٹ پر۔ "
(حمید بلوچ 2009 :83-84)

ڈی۔ڈی۔ کوسمبی موہنجو دڑو کا قدیم نام ہندی آریائی مقدس تحریروں کی روشنی میں نامنی تحریر کرتا ہے (کوسمبی 2012 :113)۔ مکران (بلوچستان) کے ساحلوں میں بڑی طاقتوں کی دلچسپی اور ان کی تجارت کے بارے میں کافی شواہد دستیاب ہوئے ہیں جن کے مطابق سندھی اور مشرق وسطیٰ کے اقوام ان بندرگاہوں کو اپنے تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے اور یہ مصروف ترین سمندری شاہراہ تھی ساحلِ بلوچستان کے راستے ہونے والی نقل و حمل کے بارے میں ڈی۔ڈی۔ کوسمبی لکھتا ہے کہ:

"تاریخی تذکرہ و تبصرہ میں ثقافت سندھ کی لازمی اور بنیادی خصوصیت عموماً نظر انداز کر دی جاتی ہے یعنی یہ ثقافت ہندوستان کے زرخیز اور کافی ترقی یافتہ حصوں تک نہ پہنچ سکی۔ اس کے اثرات کی وسعت تو بہت تھی یعنی شمال سے ساحلِ سمندر تک تقریباً ایک ہزار میل اور شاید سمندر کے کنارے کنارے مغرب کے سمت میں بھی اتنی ہی دور تک۔۔۔ لیکن یہ وسعت ایک خاص نوعیت کی تھی۔ اس ثقافت کی تجارتی بیرونی چوکیوں یا چھوٹی نوآبادیوں کا محل وقوع رفتہ رفتہ معلوم ہو چکا ہے۔ یہ گجرات میں خلیج کھمبات سے لیکر ساحلِ مکران پر ستکگیں ڈھور تک دور دور فاصلہ پر پھیلی ہوئی تھی" (کوسمبی 2012 : 84)۔

ڈی۔ڈی۔ کوسمبی اپنی کتاب "قدیم ہندوستان تہذیب و ثقافت" میں بار بار سندھ کی قدیم تہذیب کے عراقی اور خلیجی عرب کے ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات کا تذکرہ کرتا ہے اور اس تجارت کے دوران ساحل بحر پر واقع ماگان کا تذکرہ اور اس کی اہمیت بھی بیان کرتا ہے کہ

جہاں کاروانوں کے لیے سرائے اور جہازوں کے لنگرانداز ہونے کے لیے گھاٹ (پلیٹ فارم۔ بندرگاہ) موجود تھے۔

سرزمین عراق کے ساتھ ملوہا کے تجارتی تعلقات اور ان کے ان تعلقات کے مابین مکران کی تجارتی اہمیت کے بارے میں ایک محقق مختلف مستند تاریخی حوالوں کی روشنی میں تحریر کرتا ہے کہ:

۱۔ مالوہا سے لکڑیوں کی درآمد۔

۲۔ مالوہا سے سونے کے ذرات کی درآمد۔

۳۔ گودیا کے مہرے پر نقش ہے۔ یلامائٹ (Elamite) ایلام سے اس کے پاس آئے، سوسین (Susian) سوسا (Susa) سے آئے، ماگان و ملوہا اپنے پہاڑوں سے اپنے کاندھوں پر لکڑیاں رکھے اس کے پاس آئے اور جمع ہوئے۔ ننگرسو (Ningirsu) کا گھر بنانے۔ گودیا اور اس کے ہر گرسو (Girsu) کو۔

۴۔ حکمران کے نام، اس کے گھر پر مامور اس کے کارندے کی طرف سے سونے کے ذرات پہاڑوں سے گودیا کے لیے نیچے لائے گئے صاف کیے گئے تانبا ان کے پیالوں سے مالوہا سے کارنیلین (Carnelian) اس پر نچھاور کیے گئے سنگ مرمر کے پہاڑوں سے وہ سنگ سنگ مرمر اس کے لیے لائے۔

۵۔ تانبے کے علاوہ ٹن، Lapiz Lazuli کے بڑے ٹکڑے، صاف کی ہوئی چاندی اور مالوہا کی خالص کارنیلین اس نے تانبے کا ایک بڑا مرتبان بنایا تانبے کا ایک بڑا پیالہ بنایا ایک خالص چاندی کا گلوبند اور ایک تانبے کی صراحی عزت مآب ان (An) کی عبادت گاہ میں ان کی بھینٹ دی تاکہ آسمانوں میں گرجنے والی اپنا سایہ ان پر رکھے" (حمید بلوچ 2009: 83-84)۔

اسی طرح ایک اور اکادی کتبہ پر ماگان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

۱۔ بیلن (بیضوی) شکل کے مہروں میں "مالوہ زبان" کی تشریح بیان کی گئی ہے اس کے علاوہ مختلف شخصیات کے ناموں کا بھی ذکر ہے۔

۲۔ ماگان اور ملوہا سے آئے ہوئے جہاز اکاد بادشاہ سارگان کے بندرگاہ پر لنگر انداز ہوتے ہیں۔

۳۔ نرم سین کی روایت کی بنیاد پر سارگان آف اکاد ماگان اور مالوہا کی فتح کا ذکر کرتے ہیں۔

۴۔ اگاد (Agade) کی بددعا میں تحریر ہے "مالوہا کے لوگ کالے پہاڑوں میں رہتے ہیں اور اپنے ساتھ نادر و نایاب اشیاء لاتے ہیں"۔

۵۔ سارگان آف اکاد کے علاقائی حدود کے بارے میں تحریر ہے "بازا (Baza)" کے پل سے لے کر وادی مالوہا کے تجارتی راستے تک۔ (حمید بلوچ 86-852009)۔

ان طویل بیانات سے ہی اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ سندھی حملہ آور بھی بلوچستان کی زمینی اور بحری راستوں پر قبضہ کرنے کے خواہشمند تھے نا کہ انہیں مقامی آبادی اور ان کی سرزمین کی ترقی سے کوئی دلچسپی تھی۔ لہٰذا کئی صدیوں پر مشتمل اس دور میں سندھ کی حاکمیت نے یہاں اپنے کوئی جوہر نہیں دکھائے بلکہ وہ صرف اپنی تجارت بڑھانے میں مصروف رہا۔ سندھی حاکم طاقت کے بل بوتے پر یہاں کے وسائل لوٹتے رہے جبکہ اُن کے دور میں اگر کوئی ترقی ہوئی تھی تو وہ اُن کے مذہبی عبادت گاہوں کی تعمیر اور لوگوں کو تبدیلی مذہب کی طرف لانے تک محدود تھی وگرنہ انفراسٹرکچر کی ترقی میں سندھیوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ حتیٰ کہ انہوں نے یہاں ایک عدد کاریز یا کوئی بند تک تعمیر نہیں کی۔ ساحلی علاقوں کے قلعوں پر قبضہ کر کے اپنی بے پناہ فوجی طاقت کے ذریعے وہ صرف اپنی تجارت کے فروغ میں مصروف عمل رہے۔

سندھیوں کے زوال پر خطہ آرین حملہ آوروں کی ظلم و بربریت کی بھینٹ چڑھا اور طویل عرصہ تک ایشیاء کا خطہ خاک و خون میں لوٹتا رہا۔ آرین دور میں بلوچستان ان وحشیوں کے لیے پنجاب اور ہندوستان میں داخلے کا دروازہ بن گیا اور یہ وحشی قبائل لاکھوں کی تعداد میں سندھ و

پنجاب کے زرخیز میدانوں میں داخل ہوتے رہے۔ بلوچستان سے گزرتے وقت ان وحشیوں نے یہاں کی بچی کھچی آبادی کو یا تو تہہ تیغ کر دیا یا پھر پہاڑوں کی جانب فرار ہونے پر مجبور کیا۔ ان کے آشیانے جلائے گئے، بستیوں کو اجاڑا گیا، فصلوں کو آگ لگادی گئی، انبار خانوں، مال مویشیوں کو لوٹا گیا اور مقامی باشندوں کو انخلاء اور پہاڑی خطوں کی جانب فرار ہونے پر مجبور کیا۔ مقامی باشندوں نے ان حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت بھی کی مگر اُن کا کوئی بس نہ چلا ہو گا۔ کچھ مار دیے گئے ہوں گے جبکہ باقی گرفتار ہونے والے غلام اور لونڈیاں بنائی گئی ہوں گی۔ جن کو فرار ہونے کا موقع ملا تو انہوں نے پہاڑوں کی پُرپیچ وادیوں میں جا کر دم لیا۔ صدیوں تک آرین حملہ آوروں کا گزر بلوچستان کے دروں کے راستے مشرق کی جانب ہوتا رہا جبکہ مقامی آبادی اپنے ہی خطے میں مہاجرت کرتی رہی۔ گذشتہ ابواب میں آرین حملوں سے لے کر منگول حملوں تک خطے کی صورتحال پر کافی روشنی ڈالی گئی۔ ان حملہ آوروں کی بلوچستان کے حوالے سے جو تاریخ سامنے آتی ہے اُس کے مطابق اس حقیقت کا ادراک ہوتا ہے کہ حملہ آوروں میں سے کسی نے بھی خطے کی ترقی اور یہاں کے باشندوں کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی کام نہیں کیا۔ قدیم باشندوں کے زوال کے بعد جیسے بلوچستان میں ترقی کی رفتار ایک دم سے رُک گئی۔ کسی بھی حملہ آور نے اپنے اخراجات سے نہ سہی مقامی باشندوں سے وصول کردہ ٹیکسوں سے بھی کسی قسم کی کوئی ترقیاتی کام یا عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا۔ بڑی طاقتوں کے زوال پر جب مقامی قبائل اپنی حاکمیت قائم کرتے تو وہ کسی حد تک اپنے تباہ شدہ ملکی ڈھانچے کو بحال کرتے اور زندگی کو دوبارہ خوشحالی کی جانب موڑتے۔ جیسا کہ مید اور ہوت قبائل کی حکومتوں کے دوران بلوچ خطہ کسی حد تک پُرامن رہا اور لوگ بھی خوشحال اور آسودہ تھے مگر جونہی آرین اقوام نے مشرق و مغرب میں اپنی حاکمیت قائم کی تو بلوچ خطہ ایک بار پھر آگ و خون کی نذر ہوا اور غیر ملکی افواج

ایک بار پھر بلوچستان کے پُر امن اور پُر سکون ماحول میں تلاطم پیدا کرنے کی غرض سے اس خطے پر پِل پڑے اور یہاں آگ و خون کا کھیل دوبارہ شروع کیا گیا۔ اس طرح ہزاروں سالوں تک بلوچستان پر حملہ آور بڑی طاقتوں اور مقامی باشندوں کے مابین آنکھ مچولی کا سلسلہ جاری رہا۔

ہندوستان، ایران، یورپ اور وسط ایشیاء پر بھی کئی اقوام نے حملے کیے اور ان خطوں میں اپنی مستحکم حکومتیں بھی قائم کیں۔ ان خطوں میں ان اقوام نے صدیوں تک ڈھیرے جمائے۔ حتیٰ کہ اپنے اصل وطن سے بیگانہ اور انجان ہو گئے۔ ان ممالک میں ان اقوام نے ایسی تہذیبوں کو جنم دیا جو آج بھی زندہ اور تابندہ ہیں۔ انہوں نے ان اجنبی سرزمینوں پر قبضہ کر کے وہاں کے اصل باشندوں کو مار بھگایا یا پھر انہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑا اور خود اُن کی زمینوں پر قابض ہو کر حاکم بن گئے۔ مگر انہوں نے ان خطوں کی ترقی اور عروج کے لیے بے پناہ کام کیا حتیٰ کہ ان کی ترقی اور فروغ کے لیے دیگر اقوام سے لڑائیاں لڑ کر اور خوب خونریزی کر کے دولت حاصل کی۔ اس خونین تاریخ کو بیان کرنے کے لیے کوئی مثال دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جو اقوام ہندوستان پر قابض ہوئے اور وہاں اپنی حاکمیت قائم کی اُن میں سے اکثر نے بلوچستان کو بھی اپنی تسلط میں رکھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہاں آمرانہ طرز حاکمیت اختیار کی گئی جبکہ دیگر خطوں میں وہ شفیق باپ کی طرح حکومت کرتے تھے۔ چاہے یہ اقوام اسلام سے قبل کے ہوں یا بعد از اسلام دور کے مسلمان حاکم۔ اسلامی دور میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کو ہی لے لیں کہ ان کی شفقت اور محبت اہل ہند سے اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ انہوں نے مذہبی پابندیوں کی پرواہ کیے بغیر غیر مسلم عورتوں سے شادیاں کیں اور اُن کی اولادوں کو ولی عہد اور حاکم مقرر کیا۔ ان کی رواداری اور انصاف کی سینکڑوں مثالیں تاریخ کے اوراق پر موجود ہیں۔ جبکہ بلوچستان میں ان اقوام کے حکمرانوں کی رواداری اور انصاف کی کوئی ایک بھی مثال نہیں ملتی۔ ہندوستان، ایران، وسط ایشیاء

سمیت جہاں جہاں بھی ان طاقتور اقوام کے قبضے ہوئے تو وہاں تعمیرات اور ترقی کا جال پھیلایا گیا۔ کشادہ سڑکیں، بڑے بڑے بازار، تجارتی مراکز، بڑے بڑے گنجان اور پُر سہولت شہر، بڑے بڑے باغات اور بڑی سیر گاہیں، فقید المثال عمارتیں، بڑے بڑے تعلیمی و تیکنیکی ادارے وغیرہ۔

مگر ان اقوام کی ان مہربانیوں میں سے ایک بھی نشانی بلوچستان کے طول و عرض میں نظر نہیں آتی۔ حالانکہ کتابوں میں آتا ہے کہ یہ خطے بھی کبھی اُن کی دسترس میں تھے۔ ان مہذب اور اعلیٰ نسل اقوام نے بلوچستان کے باشندوں کو وحشی، ظالم، لٹیرا، قذاق، غیر مہذب اور نجانے کیا کیا قرار دیا۔ ان کے مصنفین اور مورخین نے بھی یہاں کے پُر امن باشندوں اور کچے گھروں میں رہنے والے سادہ لوح لوگوں کو معاف نہیں کیا۔ حالانکہ یہ سادہ لوح اور بقول اُن کے غیر مہذب اور وحشی لوگ، اپنے گھروں اور سرزمین پر آباد تھے۔ انہوں نے نہ تو کسی کا گھر لوٹا تھا اور نہ ہی کسی کے حدودِ مملکت پر حملہ آور ہوئے تھے۔ یہ تو پُر امن اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور جنگ و خونریزی سے کوسوں دور اشتمالی طرز زندگی بسر کر رہے تھے۔ پھر بھی فاتحین کی نظروں میں یہ ظالم اور وہ خدا کے فرستادہ تھے۔ تو ٹھیک ہی ہو گا۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ بلوچستان کے طول و عرض میں خدا کے ان فرستادہ اور نیک و عادل حاکموں کی کوئی بھی عوامی اور ریاستی فلاح و بہبود کی کوئی مثال نہ تو تاریخی کتابوں میں ملتی ہے اور نہ ہی زمین کی سطح پر ایسی کوئی نشانی پائی جاتی ہے۔ البتہ یہاں ان حملہ آور اقوام کے سپاہیوں اور جرنیلوں کے مقبرے ضرور ملتے ہیں جو بلوچستان کے طول و عرض میں کئی مقامات پر واقع ہیں اور مرجع خلائق ہیں۔

ان قابض اقوام کے دور میں کسی حاکم کو یہاں بیٹھ کر ایک عدد کاریز یا پانی کے ذرائع بڑھانے کی خاطر ایک عدد بند باندھنے کا سعادت بھی نصیب نہیں ہوئی۔ نہ تو قدیم باشندوں کی طرح انہوں نے پانی کے ذرائع کو ترقی دی اور نہ ہی زراعت کی ترقی کے لیے کوئی اقدامات کیے۔

انہوں نے نہ تو گلہ بانی کی صنعت کی جانب توجہ دی اور نہ ہی دیگر صنعتوں کو پروان چڑھانے کی کوئی کوشش کی۔ حملہ آور اقوام نے مشرق و مغرب کے بڑے شہروں کو اپنا مرکز بنایا اور وہیں پر اپنی تمام تر توانائیاں صرف کیں۔ عمارتیں، ادارے، سڑکیں، سرائے، علم و ہنر کے مراکز، نہریں، باغات، پُل اور سیر گاہیں تعمیر کیے۔ ان خطوں میں انہوں نے عجوبات عالم تعمیر کیے اور اپنے شہروں کو عروس البلاد بنایا۔ مگر بلوچستان میں مجال ہے کہ انہوں نے ماسوائے کسی فوجی چھاؤنی کے کسی اور عمارت یا فلاحی مرکز کی تعمیر میں کوئی دلچسپی ظاہر کی ہو۔ انہوں نے دشوار گزار پہاڑی چوٹیوں پر مضبوط مورچے اور اور فوجی طرز کی تعمیرات تو کیے مگر اس چوٹی کے دامن میں واقع گاؤں میں انہوں نے کوئی سکول تعمیر نہیں کی۔ حالانکہ جو اخراجات اس دس ہزار فٹ بلند چوٹی پر مورچہ تعمیر کرنے پر صرف ہوئے ہوں گے تو اُس کا عشر عشیر بھی ایک سکول کی تعمیر پر نہ لگتا۔ مگر اُن قابضین کا مقصد یہاں بیٹھ کر سکول یا فلاحی ادارہ قائم کرنا نہیں تھا بلکہ اس خطے کو فوجی نوعیت کا علاقہ قرار دے کر اس کو صرف فوجی مقاصد کے لیے استعمال کرنا ان کا مقصد تھا۔

تاریخ کی کتابوں کے مطالعہ سے بھی یہی بات شنید میں آتی ہے کہ حملہ آور اور قابض اقوام کے مورخین بھی اس خطے کو فوجی نوعیت کا علاقہ قرار دیتے ہیں مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اس وسیع و عریض خطے کے صحرائی نخلستانوں، پہاڑی وادیوں، کٹی پٹی ساحلوں اور لق و دق میدانوں میں بھی لاکھوں کی تعداد میں انسان بستے ہیں جو یہاں گذشتہ ہزاروں سالوں سے سکونت رکھتے ہیں۔ وہ ان انسانوں کو اُس وقت یاد رکھتے تھے جب انہیں خراج، جزیہ، مالیہ، عشر اور دیگر اقسام کے ٹیکس وصول کرنے ہوتے تھے۔ لہٰذا عرب مورخین سمیت تمام مورخین اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ بلوچستان کے مختلف علاقوں سے مالیہ اور خراج وغیرہ وصول کیا جاتا تھا اور یہاں فوجی چھاؤنیاں قائم کر کے افواج کو رکھنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ہیروڈوٹس بھی لکھتا ہے

کہ ان علاقوں کے باشندوں سے ٹیکس لیا جاتا تھا اور ان سے فوجی خدمات بھی لی جاتی تھیں مگر وہ یہ نہیں لکھتا کہ ایران کے حکمرانوں نے ان کے فلاح و بہبود کے لیے کتنے اقدامات کیے۔ عرب مورخین بھی لکھتے ہیں کہ فلاں علاقے سے اتنا مالیہ وصول کیا جاتا تھا جبکہ فلاں علاقے سے دو سالوں میں اتنے غلام اور لونڈیاں حاصل ہوئیں۔ مگر عرب کے مشہور و معروف مسلمان مفسرین قرآن اور مورخین اسلام بھی یہ لکھنے سے اجتناب کرتے ہیں کہ عربوں نے بلوچ علاقوں پر حملے کیوں کیے؟ جبکہ اُن کی جنگ سندھ اور ایران سے تھی۔ دوم یہ کہ انہوں نے اس لوٹ مار اور قبضے کے بعد جو مالیہ اور لونڈی غلام حاصل کیے ان کے بدلے میں بلوچستان میں کتنے نہر جاری کیے، کتنے کاریزات کھدوائے، کتنے پُل تعمیر کیے، کتنی درس گاہیں قائم کیے، کتنے بندات بنائے، کتنی سڑکیں تعمیر کیں، کتنی بندرگاہوں کو ترقی دی اور لوگوں کو کس حد تک ان کے حقوق دیے؟ یقیناً اسلامی عہد میں بھی یہاں کے باشندوں کے ساتھ ایک مفتوح جیسا سلوک کیا گیا اور ان کے تمام حقوق سلب کر لیے گئے۔ یہی تو وجہ تھی کہ بار بار ان علاقوں میں لوگ اپنے عرب حاکموں کے خلاف ہتھیار اٹھاتے اور ان کی حاکمیت کے خاتمے کے درپے ہوتے۔ اسلامی عہد ہو یا اس سے قبل کے مختلف اقوام کے ادوار، بلوچستان کو صرف ایک فوجی زون خیال کیا جاتا تھا اور یہاں صرف اور صرف فوجی مقاصد کے اقدامات کیے جاتے تھے اور لوگوں سے ان کی بساط سے بڑھ کر ٹیکس وصول کیا جاتا تھا جبکہ دیگر اقسام کی جبری مشقت کا کام بھی اُن سے لیا جاتا تھا۔

بیرونی حملہ آوروں اور قابض اقوام کی جانب سے بلوچستان کو اس انداز میں نظر انداز کرنے سے کئی سوالات بھی جنم لیتے ہیں اور کئی شکوک و شبہات بھی۔ یعنی پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی بھی حاکم کسی مقبوضہ علاقے کو اس حد تک نظر انداز نہیں کرتا بلکہ مقبوضہ علاقوں میں ایسے اقدامات کیے جاتے ہیں کہ جن کی وجہ سے عوام کا دل جیتا جا سکے اور ان کی مخالفانہ رویوں میں

تبدیلی لائی جاسکے۔ جیسا کہ ہندوستان میں کیا گیا یا دنیا کے دیگر ایسے ممالک میں جہاں کسی بیرونی حملہ آور نے اپنا قبضہ جمایا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر بلوچستان بھی ان اقوام کا مقبوضہ علاقہ تھا تو اسے کیوں اس حد تک نظر انداز کیا گیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ بلوچستان پر ان اقوام کا قبضہ کامیاب ہی نہیں ہوا تھا اور انہیں مسلسل جنگوں اور مخالفانہ خونریز رویوں کا سامنا رہا۔ لہٰذا ان حملہ آوروں نے ہمیشہ یہاں فوجی نوعیت کے اقدامات کیے اور دیگر ترقیاتی کاموں سے اجتناب کیا۔ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ حملہ آور یہاں قابض بھی تھے تو اُن کا قبضہ زیادہ سے زیادہ شاہراہوں کے آس پاس تک محدود تھا جبکہ اندرونِ ملک انہیں کوئی رسائی حاصل نہیں تھی۔ وہ صرف شاہراہوں کی حفاظت کرتے تھے تاکہ سندھ و پنجاب کی جانب جانے والے راستے محفوظ ہوں اور اسی طرح ایران جانے والے راستوں کا تحفظ بھی مقصد تھا۔ لہٰذا بلوچستان سے گزرنے والی قدیم شاہراہوں کے آس پاس ہی اِن حملہ آور اقوام کے بنائے ہوئے فوجی قلعے اور مورچے اب بھی ملتے ہیں جبکہ انہی شاہراہوں کے آس پاس ان کے لاتعداد قبرستان بھی ملتے ہیں۔ جو اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ حملہ آور صرف شاہراہوں پر قبضہ کرنے تک محدود تھے جبکہ اندرونِ بلوچستان کے باشندے ان کی دسترس اور یورشوں سے محفوظ و مامون تھے۔ شاہراہوں پر بھی ان کے قافلے محفوظ نہیں ہوتے تھے بلکہ اکثر و بیشتر مقامی جنگجوؤں کے شب خون کا شکار بن جاتے اور انہیں شدید نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا۔ تاریخ میں بالخصوص عرب اور ایرانی اقوام کے حملوں کے دوران یہاں کے باشندوں کی جانفشانی اور بہادری کی مثالیں خود ان اقوام کی مورخین نے اپنی کتابوں میں رقم کی ہیں۔ ممکن ہے یہی وجوہات ہوں جن کی بناء پر بلوچستان کو حملہ آور اقوام نے ترقی کی دوڑ میں پیچھے رکھا اور اس جانب ماسوائے فوجی کاروائیوں کے اور کسی طرح کی توجہ نہیں دی۔

اگر اس مفروضہ کو درست مان لیا جائے کہ اول تو حملہ آور اقوام کا یہاں قبضہ کبھی مکمل نہ ہو سکا اور دوم ان قابضین کی نظریں صرف شاہراہوں پر مرکوز تھیں لہٰذا انہوں نے صرف شاہراہوں کی حفاظت کی خاطر یہاں فوری نوعیت کے اقدامات کیے اور شاہراہوں کی حفاظت کی خاطر چھاؤنیاں قائم کیں تو اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بلوچستان کا خطہ ہمیشہ یہاں کے مختلف قبائل کے ماتحت متحد رہا ہے اور یہاں پر ہمیشہ یہاں کے باشندے ہی حاکمیت کرتے رہے ہیں۔ ان پر جتنے بھی بیرونی اقوام نے حملے کیے یا یہاں اپنا تسلط قائم کیا تو اُن کا دورانیہ مختصر رہا اور ان کی حکومتیں صرف عبوری دور کے طور پر دیکھے جاتے ہیں وگرنہ یہاں کی ساری تاریخ یہاں کے مقامی اور قدیم قبائل کے ارد گرد گھومتی ہے۔

البتہ ایران کے ہخامنشی حکمرانوں کے بارے میں مورخین کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنے تمام مقبوضات کو اہمیت دی اور عوامی فلاح و بہبود کے کام کر کے اپنے سیاسی مقاصد بخوبی حاصل کیے۔ بلوچستان کے چند مقامات پر پائے جانے والے کاریزات اور قدیم ٹیلوں کے ناموں سے یہی گمان ہوتا ہے کہ ان کی تعمیر ہخامنشی عہد میں ہوئی ہے وگرنہ ایرانی اقوام کا یہ مقبوضہ علاقہ دیگر علاقوں کی نسبت حکمرانوں کے لطف و کرم اور عنایتوں سے محروم ہی رہا۔

حملہ آور اقوام نے بلوچ خطے کو جہاں زندگی کے دیگر شعبوں میں ترقی سے محروم رکھا تو وہاں ایک بہت بڑا ظلم یہ کیا کہ ان کی زبان و ادب کو کبھی بھی پنپنے کا موقع نہیں دیا بلکہ ہر حملہ آور نے ان پر اپنی زبان اور اپنی رسم التحریر و تقریر کو مسلط کیا۔ لہٰذا مقامی قبائل کی زبان میں ماضی قدیم سے لے کر ماضی قریب تک کوئی مسودہ دستیاب نہیں کہ جن کے مطالعہ سے ان قدیم باشندوں کی اصل زبان اور ان کی تاریخ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کیا جا سکتا۔ قدیم کتابوں میں ان قبائل کے تذکرے ملتے ہیں، ان کے رسوم و رواجات اور رہن سہن کے بارے

میں بھی کافی مواد دستیاب ہے مگر ان کی زبان کے بارے میں کوئی بھی اہم مواد دستیاب نہیں کہ جس کو دیکھ کر ان کی زبان کی اصلیت اور لب و لہجہ کے بارے میں کچھ کہا جاسکتا۔ ماضی کے مورخین صرف یہ لکھتے ہیں کہ یہاں کے باشندوں کی زبان خطے کی دیگر زبانوں سے مختلف تھی۔ ہر حملہ آور قوم نے جب بھی ایشیاء پر اپنی بالادستی قائم کی تو اُس نے پورے خطے میں اپنی زبان کو رواج دیا۔ عربوں سے قبل پورے خطے میں فارسی زبان بولی اور تحریر کی جاتی تھی جبکہ خطے کی لاتعداد دیگر علاقائی زبانوں کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ وہ زبانیں صرف گھروں اور گلی محلوں تک محدود ہو کر رہ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ارتقائی سفر بہت سست روی کا شکار رہا بلکہ کئی زبانیں حوادث زمانہ کا شکار ہو کر فنا ہو گئیں اور ان کا ایک بولنے اور سمجھنے والا بھی باقی نہیں رہا۔ دیگر زبانیں بھی حملہ آوروں کی زبان سے اتنا متاثر ہوئے کہ وہ اپنی اصلیت سے بالکل کٹ گئے۔ یہ قدیم زبانیں قابضین کی زبانوں کی زد میں رہے اور ہمیشہ تبدیلی کے عمل سے دوچار ہوتے رہے۔ لہٰذا آج اس خطے میں جو بلوچی اور دیگر چھوٹی مقامی زبانیں بولی جاتی ہیں وہ بالکل وہ زبانیں نہیں ہیں جو ماضی میں بولی جاتی تھیں۔ آج جو بلوچی بولی جاتی ہے اس پر فارسی زبان کی اتنی چھاپ لگی ہے کہ کوئی عام شخص اسے سن کر فارسی ہی سمجھنے لگتا ہے۔ صرف لہجہ ایسی چیز ہے کہ جس کی وجہ سے بلوچی اور فارسی میں فرق واضح کرتا ہے وگرنہ فارسی زبان کی چھاپ مقامی براہوئی اور پشتو زبانوں پر بھی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ فارسیوں کے بعد طویل عرصہ تک عربوں نے یہاں قبضہ جمائے رکھا اور بطور مسلمان یہ فرض کیا گیا کہ ہر ایک کو عربی زبان سیکھنا چاہیے۔ لہٰذا عربی خطے کی مرکزی زبان بن گئی۔ یقینی بات ہے کہ اس طرح مقامی زبانیں مزید متاثر ہوئی ہوں گی۔ عربوں کے بعد ترک ادوار میں دوبارہ فارسی کو مرکزیت مل گئی اس طرح مقامی زبانیں کبھی ایک طرف جھولتی رہیں تو کبھی دوسری طرف۔ ان مقامی اور قدیم زبانوں میں کچھ بھی تحریر نہیں کیا

جاتا تھا اور نہ ہی ان کے لیے کسی رسم الخط کی ضرورت محسوس کی گئی۔ لہٰذا جب بلوچی، براہوئی اور پشتو سمیت دیگر مقامی زبانوں میں لکھنے کا رواج شروع ہوا تو ان کے ماہرین نے بھی تحریر کے لیے عربی اور فارسی کے طرز تحریر کو اختیار کیا حتیٰ کہ ابجد کے لیے بھی انھی زبانوں کے گرائمر سے استفادہ کیا گیا۔ حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بلوچ قبائل کی زبانیں (بلوچی اور براہوئی) عربوں اور فارسیوں کی زبانوں سے زیادہ قدیم ہیں۔ بہر حال حملہ آور تو اپنی جگہ، مقامی حاکموں نے بھی کبھی اپنی زبان کی ترقی اور ترویج کی جانب توجہ نہیں دی۔ جب مقامی قبائل برسرِ اقتدار تھے تو انہیں اس جانب ضرور توجہ دینا چاہیے تھا مگر بدقسمتی سے جب یہ مقامی قبائل یعنی مید، ہوت، آشکانی، کشانی، کرد، رند، لاشار، بلیدی، ملک، گچکی، کمبرانی وغیرہ اس خطے میں مختلف اوقات میں برسرِ اقتدار آئے تو انہوں نے بھی خط و کتابت اور سرکاری امور کے لیے فارسی زبان کا سہارا لیا اور اسی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ انہوں نے بھی کبھی اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ بلوچ قبائل کی اپنی زبان اور اپنی سرزمین ہے۔ اسے اپنی سرزمین اور اپنی زبان کے متعلق سوچنا چاہیے تاکہ آنے والے وقتوں میں اپنی نسلوں کو بہتر ادب اور ماضی کی تحریری یادیں دی جاسکیں۔ آج بلوچ مشاہیر کی داستانیں فارسی، عربی، یونانی اور انگریزی زبانوں میں تو دستیاب ہیں مگر بلوچی زبان میں ابھی تک انہیں تحریری صورت نہیں دی جاسکی ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ماضی میں اگر اس زبان کو سرکاری سرپرستی ملتی اور اسے قومی زبان کا درجہ دیا جاتا تو یقیناً آج بلوچی زبان و ادب کی صورتحال مختلف ہوتی۔

بلوچستان کے ساتھ حملہ آور غیر مقامی حکمرانوں نے جو سب سے بدترین سلوک کیا وہ اس خطہ بے کراں کی وسعتوں کو سمیٹنا اور اس کے سپوتوں کو تقسیم کرنا تھا۔ یقیناً یہ ایک انتہائی ناروا اور ناقابل برداشت سلوک تھا جو غیر ملکی حملہ آور حکمرانوں کی جانب سے تاریخ کے ہر دور

میں دہرایا گیا۔ یہ حکمران کوئی ترقیاتی کام نہ کرتے، کوئی تعلیم ادارہ نہ کھولتے، ہر طرح کی لوٹ کھسوٹ کرتے، لوگوں کو مارتے اور قتل کرتے، گھروں اور بستیوں کو جلا دیتے، زبان کے بولنے اور ترقی و ترویج پر مکمل پابندی عائد کرتے، راستوں کو تجارت اور عسکری مقاصد کے لیے استعمال کرتے اور ہر طرح سے انسانی حقوق کی پائمالی کرتے مگر۔۔۔ مگر انہیں ہرگز اس بات کا حق نہیں تھا اور نہ ہی بحیثیت حکمران یہ انہیں زیب دیتا تھا کہ اپنی سلطنت میں زبردستی شامل کیے جانے والے ایک منظم اور مضبوط گروہ کو یوں مختلف سیاسی و جغرافیائی اکائیوں میں تقسیم کریں اور ان کے نہ صرف وطن کا حلیہ بگاڑ دیں بلکہ ایک منظم اور مضبوط قدیم قومی ثقافتی گروہ کو بھی کئی حصوں میں بانٹ کر ان کا شیرازہ بکھیر دیں۔ گذشتہ باب میں بلوچستان کی سیاسی تاریخ کے حوالے سے بلوچستان پر مختلف اقوام کی حکومتوں کا جائزہ لیا گیا جس کے مطالعہ سے یہ بات شنید میں آئی کہ ہر بیرونی حملہ آور نے اپنی ریاستی انتظامی سہولت کی خاطر بلوچستان اور بلوچ خطوں کو تقسیم کیا اور انہیں مختلف انتظامی یونٹوں میں بانٹتا گیا۔ بلوچ خطے کی بندر بانٹ سے بلوچ قوم کو بحیثیت قومی وحدت اور ثقافتی گروہ کے شدید نقصان پہنچا اور ان کے سیاسی اور قومی ادارے تباہ ہو گئے۔ بحیثیت قوم وہ مختلف یونٹوں میں تقسیم ہو گئے اور ہر جگہ اقلیت کا شکار ہو کر اکثریت کے ہاتھوں بدترین غلاموں جیسی زندگی بسر کرنے لگے۔ ایسی کئی مثالیں بلوچستان کی تاریخ میں ملتی ہیں کہ جب مقامی بلوچ قبائل خطے میں بالادستی حاصل کرتے تو وہ خالص بلوچ علاقوں کی یک جہتی کی کوشش کرتے جبکہ بیرونی حملہ آور ہر بار اس قومی اور سیاسی وحدت کو پارہ پارہ کرتے۔ بالآخر بلوچستان کو قومی اور سیاسی وحدت بھی یہاں کے مقامی اور حقیقی باشندوں نے دی اور اس کے جغرافیائی حدود متعین کیے۔

جو بلوچستان نصیر خان نوری کے عہد حکومت یعنی اٹھارہویں صدی عیسوی میں قائم ہوئی گو کہ وہ بھی بلوچ قوم کا نامکمل جغرافیہ تھا مگر پھر بھی اس میں کئی اہم اور قدیم بلوچ علاقے شامل تھے۔ لیکن انگریزوں نے اس خطے کے ایسے حصے بخرے کر ڈالے کہ جس کی وجہ سے بلوچستان تین مختلف ممالک میں تقسیم ہوا اور اسی مناسبت سے بلوچ قوم کی قومی یک جہتی بھی تین حصوں میں بٹ گئی۔

سامراجی عزائم رکھنے والے طاقتور ممالک نے بلوچ قومی جغرافیہ کو کبھی بھی یکجا نہیں ہونے دیا اور ان کی جغرافیائی وحدت کو ہمیشہ نقصان پہنچانے کے درپے رہے۔ زمانہ قدیم سے لے کر تاحال یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ اس تقسیم در تقسیم کے عمل کا سب سے زیادہ نقصان بحیثیت یک قومی وحدت کے بلوچوں کو ہوا کیونکہ اس عمل سے ان کی قومی طاقت اور افرادی قوت بٹتی چلی گئی۔ دورِ حاضر میں اگر دیکھا جائے تو بلوچ بحیثیت قوم تین یونٹوں میں منقسم ہے اور اس کی آبادی کا بڑا حصہ ایران، افغانستان اور پاکستان کے علاوہ عرب، یورپی اور ایشیائی ممالک میں منقسم ہے۔ افغانستان، ایران اور پاکستان میں بلوچ قوم اپنے آبائی زمینوں پر آباد ہیں۔

علاوہ ازیں اس تقسیم نے بلوچ قوم کو ایک اور نقصان بھی پہنچایا یعنی اس وقت بلوچ قوم تین مختلف اور جداگانہ قومی یونٹوں میں بھی تقسیم ہوگئی ہے۔ مغرب میں جہاں بلوچوں کا ایک اہم ترین بنیادی اور قدیم طائفہ کُرد جدوجہد آزادی میں مصروف ہے اور اپنے قدیم آبائی خطے کو مختلف قابض اقوام سے چھڑانے میں مصروف پیکار ہے جبکہ مشرق میں بلوچوں کے کئی قبائل کو نئے قومی نام سرائیکی سے مخاطب کیا جارہا جو بلاشبہ پاکستان کی سب سے کثیر آبادی یعنی بلوچ قوم کی قومی یک جہتی کو ایک بار پھر پارہ پارہ کرنے کی استعماری کوشش ہے۔

بلوچستان کی اہمیت بحیرہ بلوچ (بحیرہ عرب) اور ساحل مکران و لسبیلہ کی وجہ سے مزید بڑھ جاتی ہے۔ بلوچستان کے سمندر کی خوبی یہ ہے کہ یہ گرم پانیوں والا سمندر ہے جس میں سارا سال کشتی رانی اور ماہی گیری ممکن ہے۔ دوم یہ کہ یہ خلیج فارس کے دھانے پر واقع ہے جہاں سے روزانہ سینکڑوں مال بردار جہاز مختلف سمتوں میں محو سفر ہو کر یہاں سے گزرتے ہیں۔ سوم یہ کہ یہ بحر ہند کے کھلے سمندر میں جا کر شامل ہو جاتا ہے۔ چہارم یہ کہ یہ سمندر کئی ممالک بلکہ برِ اعظم افریقہ اور مشرق بعید کے ساتھ بھی منسلک ہے۔ لہٰذا اس کی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے ماضی قدیم سے اس کی اہمیت عالمی طاقتیں محسوس کرتی رہی ہیں۔ اگر گذشتہ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات شنید میں آتی ہے کہ ماضی قدیم سے لے کر تا حال اس سمندر کے حصول کے لیے بڑی طاقتیں ہمیشہ سرگرم رہی ہیں۔ قدیم سندھی بھی ان سمندروں کے حصول میں سرگرم رہے اور ان پر قبضہ جمانے کی خاطر ساحل مکران اور اندرونِ ملک کے مقامی باشندوں کا بڑی بے دردی کے ساتھ استحصال کیا۔ ہخامنشی اور ساسانی بھی ان سمندروں کے لیے مکران پر حملہ آور ہوئے اور ان ساحلوں کو اپنے مقاصد کی خاطر استعمال کیا۔ رائے اور برہمن بھی ان سمندروں کے لیے مقامی باشندوں کے ساتھ برسرِ پیکار رہے جبکہ عربوں نے بارہا ان ساحلوں کے حصول کی خاطر یہاں حملے کیے اور مقامی مید اور ہوت قبائل کے ساتھ خونریز جنگیں لڑیں۔ بعد ازاں بھی غیر ملکی حملہ آور اقوام ان ساحلوں کے حصول میں مگن رہے۔

برطانوی عہد میں ان ساحلوں کی اہمیت مزید بڑھ گئی اور برطانوی سامراجی نمائندے ان کے حصول کے لیے سرگرم اور کوشاں ہو گئے۔ برطانوی حملہ آوروں کو معلوم تھا کہ ان بلوچ ساحلوں پر بیٹھ کر پورے ایشیاء پر راج کیا جا سکتا ہے اور تمام تجارتی راستوں پر قابض ہوا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ان ساحلوں کا حصول برطانیہ کے لیے موت و زیست کا مسئلہ بن گیا اور جب تک اس

نے مکران کے ساحلوں پر اپنا قبضہ مستحکم نہیں کیا تب تک اُس نے افغانستان کی جانب قدم نہیں بڑھائے۔ اس ساحلِ بحر پر بیٹھ کر برطانوی حکام ایران کی جانب سے فرانس اور جرمنی کی ہندوستان پر ہونے والے ممکنہ حملے کا سدِباب بھی کر سکتے تھے۔ لٰہذا سمندر کے حصول کی وجہ سے غیر ملکی حملہ آوروں کو مقامی باشندوں سے وحشیانہ سلوک اور غیر انسانی رویہ اختیار کرنا پڑا اور ان سمندروں کے لیے ان حملہ آوروں کو زبردست خونریزی کرنی پڑی۔

الغرض غیر مقامی حکمرانوں نے جس حد تک ممکن ہو سکا بلوچستان کو سیاسی، جغرافیائی اور معاشرتی طور پر نقصان پہنچانے کی کوشش کی اور اس کے حصے بخرے کیے۔ ان حکمرانوں نے بلوچستان میں کوئی ترقیاتی پیکج تو نہیں دیا مگر یہاں کے باشندوں سے اپنی جیلیں اور زندان بھر دیے۔ یہاں پر کوئی فلاحی ادارہ تو قائم نہ کر سکے مگر یہاں کی بیش بہا دولت کو لوٹتے رہے۔ یہاں کاریزات اور بندات تو تعمیر نہ کر سکے مگر یہاں کی کھڑی فصلوں کو آگ ضرور لگائی۔ حتیٰ کہ بلوچستان کو اپنے قبضہ و اختیار میں رکھنے کی خاطر بالادست اور حکمران طبقات نے ہمیشہ یہاں سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا جال پھیلائے رکھا اور جو کام طاقت کے ذریعے سر انجام نہ پا سکا تو اس کے لیے حیلہ اور مکاری سے کام لیا۔ بہرحال بالادست طاقتوں نے اپنے ایجنڈے کی تکمیل کی خاطر اپنی منصوبہ بندیوں پر عمل کروایا اور آج وہ بلوچستان جو کبھی ایک عظیم الشان جغرافیہ اور سیاسی و ثقافتی حد بندی کا حامل تھا تین مختلف اکائیوں میں منقسم ہے اور ہر حصہ جداگانہ طور پر بلوچستان کہلانے کے باوجود اتحاد و انضمام اور سیاسی، معاشرتی اور قومی یکجہتی سے محروم ہے۔

کتابیات:

آزاد۔ ابوالکلام۔ مولانا(2012):اصحابِ کہف ویاجوج ماجوج، مکتبہ جمال، لاہور

ابنِ ابی اصیبعہ (1299 ھجری): عیون الابناء فی طبقات الاطبأ (جلد دوئم)، بیروت، لبنان

ابنِ حوقل۔ ابی الا قاسم بن حوقل النصیبی(1892):صورۃ الارض، منشورات دار مکتبۃ الحیاۃ۔ بیروت

ابنِ خرداذبہ، ابی القاسم عبید اللہ بن عبداللہ ابنِ خرداذبہ مولیٰ امیر المومنین) 1889 :(المسالک الممالک، فی مدینۃ لیدن المحروسۃ، بمطبعۃ بریل

ابنِ خلدون۔ عبدالرحمن، علامہ (2009) تاریخ ابنِ خلدون جلد سوم، دارالاشاعت۔ کراچی

ابن خلدون، عبدالرحمان (1971): تاریخ ابن خلدون جلد ششم، نفیس اکیڈمی، کراچی

ابنِ رستہ۔ ابنِ علی احمد بن عمر (1892): کتاب الاعلاف النفیسۃ، فی مدینۃ لیدن المحروسۃ، بمطبعۃ بریل

ابن سعد، محمد (1983 تیسری اشاعت) طبقات ابنِ سعد: مترجم: علامہ عبداللہ العمادی، نفیس اکیڈمی، کراچی

ابنِ کثیر۔ حافظ عمادالدین ابوالفدا اسماعیل (2008): تاریخ ابنِ کثیر (البدایۃوالنھاویۃ) (جلد چہارم: حصہ ہفتم وہشتم): مترجم: مولاناعامر شہزاد، مولاناابوطلحہ محمد اصغر مغل، دارالاشاعت، کراچی

ابنِ قتیبہ۔ ابومحمد عبداللہ بن مسلم (1967) عیون الاخبار: جلد دوئم، مطبوعہ مصر

ابی یعقوب، احمد بن جعفر بن وہب ابنِ واضح (1992) کتاب البلدان (اصل نسخہ تاریخ یعقوبی)، فی مدینۃ لیدن المحروسۃ، بمطبعۃ بریل

ابی یعقوب، احمد بن جعفر بن وہب ابنِ واضح، تاریخ یعقوبی (سال اشاعت ندارد): مترجم: مولانااختر فتح پوری، نفیس اکیڈمی، کراچی

احمد ذہبی۔ امام ابوعبداللہ شمس الدین محمد بن (1892): تاریخ الاسلام طبقات المشاہیر الاعوام: جلد دوئم، مصر

اصطخری۔ ابواسحاق ابراہیم بن محمد الفارسی۔ (1870): مسالک الممالک، لیڈن

اطہرپوری۔ قاضی مبارک (سال اشاعت ندارد): ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، مکتبہ عارفین، کراچی

اطہرپوری۔ قاضی مبارک (1986): خلافت امویہ اور ہندوستان، فکرونظر پبلیکیشنز، سکھر

الازہری۔ پیر کرم شاہ (1415 ہجری): ضیاء النبی ﷺ: جلد اول، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور

البلاذری۔ احمد بن یحییٰ بن جابر بن الشہیر (2010): فتوح البلدان، مترجم: سید ابو الخیر مودودی، تخلیقات، لاہور

البیرونی (2002) آثار الباقیہ عن القرون الخالیہ، ترجمہ: ڈاکٹر سید علی رضا نقوی، مقتدرہ قومی زبان۔ اسلام آباد پاکستان۔

الھراوی، سیف بن محمد بن یعقوب (2009)، تاریخ نامہ ہرات، مترجم: پروفیسر سلطان الطاف علی، الفیصل ناشران و تاجران، لاہور

المقدسی۔ شمس الدین ابی عبد اللہ محمد بن احمد بن ابی بکر۔ البنا الشامی المقدسی المعروف بالبشاری :(1906) احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، فی مدینۃ لیدن المحروسۃ، بمطبعۃ بریل

امجد۔ یحییٰ (1989): تاریخ پاکستان (قدیم دور)، سنگ میل پبلشرز، لاہور

اوغلو، ابراہیم، کیفس و دیگر (2002): مترجم: منور علی خان، ترک اسلامی ریاستوں کی ایک مختصر تاریخ (ماسوائے سلطنت عثمانیہ)، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، سینٹر آف ایکسیلینس، قائد اعظم یونیورسٹی، اسلام آباد۔ پاکستان

ایٹکن (1986 ری پرنٹ): گزیٹیئر آف دی پروونس سندھ، انڈس پبلیکیشنز، کراچی

ای۔ سی۔ راس (1987): میمورنڈم آن مکران۔ ممبئ

ظہیر الدین بابر مترجم رشید اختر ندوی، "تزک بابری (اردو)" سنگ میل، پبلیکیشنز، لاہور، 1995

بدخشانی۔ مقبول بیگ۔ مرزا (1967): تاریخ ایران از قوم ماد تا آلِ ساسان، مجلس ترقی ادب، لاہور

برٹن۔ رچرڈ۔ ایف (1999 ری پرنٹ): سندھ: اینڈ دے ریسز دیٹ اِنہیبٹ دی ویلی آف دی انڈس، وین گارڈ بکس لمیٹڈ، لاہور

براہوئی۔ عبد الرحمن۔ ڈاکٹر (1990): بلوچستان میں عربوں کی فتوحات اور حکومتیں، زمرد پبلیکیشنز، مستونگ

بجارانی۔ مری۔ میر خدا بخش۔ جسٹس (1989 تیسرا ایڈیشن): بلوچستان تاریخ کے آئینے میں، مترجم: سعید احمد رفیق، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ

بغدادی۔ ابو علی بن اسماعیل بن قاسم۔ قاقلی (سال اشاعت ندارد): الامالی لابی علی التعالیٰ : جلد سوئم، قائرہ۔ مصر

بغدادی۔ یاقوت بن عبد اللہ حموی (1979): معجم البلدان: جلد ہشتم، دارلاحیاألتراث العربی، بیروت۔ لبنان

بلوچ۔ حمید (2009): مکران عہدِ قدیم سے عہد جدید تک، سید ہاشمی ریفرنس لائبریری، کراچی

بلوچ۔ صادق (2009): تاریخ بلوچانِ ہند، تخلیقات، لاہور

بلوچ۔ عنایت اللہ (1987): دی پرابلم آف گریٹر بلوچستان، جی۔ ایم۔ بی۔ ایچ۔ سٹٹگرٹ، جرمنی

بلوچ۔ عبد الحق۔ مولوی (1992): ذکری مسئلہ، اشاعت دارالحدیث، تربت / لاہور

بلوچ۔ فاروق (2012): بلوچستان کے تہذیبی نقوش، فکشن ہاؤس، لاہور

بلوچ۔ فاروق (2013): قدیم بلوچی شاعری کے ہیرو: باباحمزہ بلوچ، فکشن ہاؤس، لاہور

بلوچ۔ فاروق (2012): میر نصیر خان نوری حکومت وسیاست، شخصیت وکردار، فکشن ہاؤس، لاہور

بلوچ۔ فاروق (2014): ریلیشنز آف سندھ اینڈ بلوچستان ان دی ہسٹوریکل پرسپیکٹیو آف دی فینس لوسٹوری آف سسی آف بھمبورسٹی اینڈ پنوں آف کیچ مکران، بلوچستان ریویو، والیم XXX :، نمبر: 1، بلوچستان سٹڈی سنٹر، یونیورسٹی آف بلوچستان

بلوچ۔ فاروق، وحید رزاق (2013) :New discovered Archaeological sites in Noshki District of Balochistan, A field report, Bi-Annual Research Journal,"Balochistan Review" Balochistan Study Centre, University of Balochistan Quetta, ISSN No. 1810-2174, Vol: XXVIII, No. 1

بلوچ۔ محمد سردار خان (1977): اے لٹریری ہسٹری آف بلوچیز، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ

بلوچ۔ محمد سردار خان (1980): بلوچ قوم کی تاریخ، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ

بلوچ۔ محمد سردار خان (سال اشاعت ندارد): چاکر دی گریٹ، (چاکراعظم) مترجم : عبد الغفار ندیم، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ

بلوچ، محمد سردار خان، (1958) ہسٹری آف بلوچ ریس، گوشۂ ادب۔ کوئٹہ

بیلیو۔ڈاکٹر(1891):ایتھنوگرافی آف افغانستان،لندن

بیہقی دبیر۔خواجہ ابوالفضل محمد بن حسین (1383ھجری، سیکنڈایڈیشن): تاریخ بیہقی، تصحیح کنندہ :ڈاکٹر علی اکبر فیاض، دانشگاہِ فردوسی، مشہد۔ایران

بئیں، پولی(2012):رائز آف رومن ایمپائر، شکاگو

پوٹینگر۔ ہنری(1976):ٹریول اِن سندھ اینڈ بلوچستان، انڈس پبلیکیشنز، کراچی

ٹھٹھوی۔ قانع میر علی شیر (2002سیکنڈایڈیشن): تحفۃ الکرام، مترجم: اختر رضوی، تصحیح کنندہ:ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد۔سندھ

ٹیٹ۔جی۔پی(1979):سیستان، نساءٹریڈرز، کوئٹہ

الثعلبی، ابو منصور، عبدالمالک بن محمد بن اسماعیل (سال اشاعت ندارد): شاہنامہ ثعلبی، مترجم: محمود ہدایت، بیروت

جلال پوری۔ علی عباس(2002):روایات تمدن قدیم، تخلیقات، لاہور

حسن پیرینا(سال اشاعت ندارد):ایران باستان: جلد سوئم، تہران۔ایران

خان۔میر احمد یار(1974):تاریخ خوانین بلوچ، اسلامیہ پریس، کوئٹہ

دہوار۔محمد سعید(1990):تاریخ بلوچستان، نساءٹریڈرز، کوئٹہ

ڈیمز۔لانگ ورتھ(1977):پاپولر پوئیٹری آف بلوچز، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ

ریورٹی۔ ایچ۔جی(1991):نوٹس آن افغانستان اینڈ بلوچستان (سرزمینِ افغان و بلوچ) مترجم: پروفیسر سعید احمد خالد سپنزر پرنٹرز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کوئٹہ

ساہنی۔ایم آر(2004):انسانی ارتقا، بک ہوم، لاہور

سائیکس۔پرسی مونسورتھ(1968):ہسٹری آف پرشیا، آکسفورڈ پرنٹنگ پریس، لندن

سٹرینج۔جی۔لی(1986):جغرافیہ خلافت مشرقی، مترجم: محمد جمیل الرحمان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

سجاد ظہیر۔نگار۔ڈاکٹر(2012):مسلمانوں میں انتہاپسندی کا آغاز، ”خوارج“ ایک مطالعہ، قرطاس پبلشرز، کراچی

سعید الدین احمد۔ قاضی (1971): اردو دائرہ معارف اسلامیہ: جلد پنجم "پارتھیا"، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

سمتھ۔ اے۔ ونسنٹ (2001): قدیم تاریخ ہند، ترجمہ محمد جمیل الرحمان، تخلیقات، لاہور

شفیع عقیل (2002): سسی پنوں (ہاشم شاہ)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

صابر۔ غوث بخش (1996): بلوچی لوک داستانیں، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ

صابر۔ عبدالرحیم۔ قاضی (1967): مکران تاریخ کے آئینے میں، کراچی

صدیقی۔ محمد اسماعیل۔ بریگیڈیئر ریٹائرڈ (2008) آئینہ بلوچستان، دوست پبلیکیشنز، لاہور

طبری۔ ابی جعفر محمد بن جریر۔ علامہ (2003) تاریخ طبری: جلد اول، مترجم: سید عاصم محمود، الفیصل پبلشرز، لاہور

عبدالقدوس۔ سید (1992): دی ٹرائبل بلوچستان، فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور

عسکری۔ ناصر (1995)، تاریخ سیستان، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ

عقیل۔ شفیع (2002): سسی پنوں (ہاشم شاہ)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

غرشین۔ یعقوب شاہ (2005): گوادر ساحل بلوچستان، ماضی، حال، مستقبل، قلات پبلشرز، کوئٹہ

فردوسی۔ ابوالقاسم (سال اشاعت ندارد): شاہنامہ فردوسی، چھاپ شدہ در ماسکو، روس

فریدون بیگ۔ مرزا قلیچ بیگ (1985): چچ نامہ (انگریزی)، وین گارڈ بکس لمیٹڈ، لاہور

فریدی۔ نور احمد۔ مولانا (سال اشاعت ندارد): بلوچ قوم اور اس کی تاریخ، ملتان

قادری۔ اخلاق احمد (سال اشاعت ندارد): تاریخ و تمدن ملتان، مکتبہ علم و عرفان، لاہور

قاضی۔ تورا کینہ (سال اشاعت ندارد): سائرس اعظم، شاہکار بک فاؤنڈیشن، کراچی

قدوسی۔ اعجاز الحق (1985): تاریخ سندھ، جلد اول، اردو سائنس بورڈ، لاہور

قمبرانی، نادر (1985): قلم قبیلہ کوئٹہ (میگزین)

قیصرانی۔ شاہین۔ محمد اشرف (1994): بلوچستان تاریخ و مذہب، ادارہ تدریس، کوئٹہ

کمبرانی۔ احمد زئی۔ آغا نصیر خان (1982): تاریخ بلوچ و بلوچستان (جلد اول) بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ

کوثر، انعام الحق، ڈاکٹر (1997)، بلوچستان آزادی کے بعد، مشاورہ تعلیمی تحقیق، کوئٹہ

کوسمبی۔ ڈی۔ڈی (2012): قدیم ہندوستان: تہذیب و تمدن، بک ہوم، لاہور

کیرو۔ اولف۔ سر (2009، سترہویں ایڈیشن): دی پٹھانز، آکسفورڈ پرنٹنگ پریس، کراچی

کیرو۔ اولف۔ سر (1996): دی پٹھانز، آکسفورڈ پرنٹنگ پریس، کراچی

گنکوفسکی۔ یورو (1976): پاکستان کی قومیتیں، دارلاشاعت ترقی، ماسکو

لینگر۔ ایل۔ ولیم (1968، تھرڈ ایڈیشن): مترجم: مولانا غلام رسول مہر، انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم، جلد اول، تاریخ اسلام، شیخ غلام علی اینڈ سنز، پرنٹرز و پبلشرز، لاہور

مارٹن گلمین، والکاٹ (2004): سوشیطان، تخلیقات، لاہور

مجیب۔ محمد (2005): دنیا کی تاریخ، سٹی بک پوائنٹ، کراچی

محمد قاسم فرشتہ (2008): تاریخ فرشتہ، جلد اول: مترجم: عبدالحئی خواجہ (مشفق خواجہ) المیزان ناشران و تاجران کتب، لاہور

محمد لطیف۔ سید (1896) آگرہ ہسٹوریکل اینڈ ڈسکرپٹو، کلکتہ سینٹرل پریس کمپنی لمیٹڈ

مری۔ شاہ محمد (2000) بلوچ قوم، قدیم سے عصر حاضر تک، تخلیقات، لاہور

ملک الشعرأ۔ بہار (1366 ھجری): تاریخ سیستان، مطبوعہ دولتی ایران، تہران

میک کرنڈل۔ جارج (1986): انویژن آف انڈیا، بائی الیگزینڈر دی گریٹ، انڈس پبلیکیشنز، کراچی،

میکانگی (1997 ری پرنٹ): بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیر: مکران، سیلز اینڈ سروسز، کوئٹہ

میوزیم بلوچستان سٹڈی سنٹر، جامعہ بلوچستان، سریاب روڈ۔ کوئٹہ

ناصر عسکری (1995): تاریخ سیستان، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ

ندوی۔ سلیمان۔ سید (سال اشاعت ندارد): عرب و ہند کے تعلقات، مشتاق بک کارنر، لاہور

نصیر۔ گل خان۔ میر (1984): بلوچستان قدیم وجدید تاریخ کی روشنی میں، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ

نصیر۔ گل خان۔ میر (1976): بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ

نصیر۔ گل خان۔ میر (1990): تاریخ بلوچستان، قلات پبلشرز، کوئٹہ

نصیر۔ گل خان۔ میر (1999): کوچ و بلوچ، گوشہ ادب، کوئٹہ

نعمانی۔ شبلی۔ علامہ (سال اشاعت ندارد) الفاروق، نذیر بک ڈپو، نیو دہلی، انڈیا

وی۔ ایف۔ پیاسن ٹینی (1988) انٹر نیشنل انڈین او شین روٹس اینڈ گوادر کوہِ باتیل سیٹلمنٹ اِن مکران، نووار وِستا، سٹوریکا، والیم۔ LXX-ii

ہارٹ۔ لارنس لاک (2007): نادر شاہ، مترجم: طاہر منصور فاروقی، تخلیقات، لاہور

ہاشمی۔ ظہور شاہ۔ سید (1986): بلوچی زبان و ادب کی تاریخ: ایک جائزہ، سید ہاشمی اکیڈمی، کراچی

ہولم۔ ایڈولف (1987): یونان کی قدیم تاریخ جلد: اول، سوم، نفیس اکیڈمی، کراچی

ہیرلڈ لیم۔ (2010) سکندر اعظم، مترجم: ہاشم فرید آبادی، فکشن ہاؤس، لاہور

ہیرلڈ لیم۔ (2012) سائرس اعظم، مترجم: ہاشم فرید آبادی، فکشن ہاؤس، لاہور

ہیروڈوٹس۔ (2001): دنیا کی قدیم ترین تاریخ، مترجم: یاسر جواد، نگارشات، لاہور

نقشہ جات

MAP OF PERSIA

The Oriental Empires
Median Empire
Thrace
Parthia
Aria
Persis
Arabia

SCYTHIANS
SCYTHIANS
CAUCASUS
MACEDONIA
THRACE
GREECE
Royal Road
PHRYGIA
ARMENIA
CHORASMIA
LYDIA
CARIA
CAPPADOCIA
CILICIA
DAHAE
MARGIANA
SOGDIANA
GANDHARA
HYRCANIA
BACTRIA
SATTAGYDIA
CYPRUS
PHOENICIA
ASSYRIA
SYRIA
MEDIA
PARTHIA
Ecbatana
ARACHOSIA
ARIA
LIBYA
PALESTINE
ELAM
Babylon
Susa
BABYLONIA
DRANGIANA
Memphis
EGYPT
Pasargadae
Persepolis
CARMANIA
PERSIS
ARABIA
SIND
INDIA
SAHARA
MAKA
0 200 400 mi
0 300 600 km
ELEPHANTINE
ETHIOPIA
Achaemenid Empire

IRAQ
KUWAIT
IRAN
SAUDI ARABIA
PERSIAN GULF
QATAR
U.A.E.
OMAN

The Persian Empire
Libya
Arabia
Cilicia
Parthia
Aria
Bactria
Carmania
Persis
Gedrosia

PERSIAN EMPIRE
THRACE
MACEDONIA
GREECE
LYDIA
CILICIA
ARMENIA
MEDIA
BABYLONIA
CHORASMIA
BACTRIA
PARTHIA
ARIA
CARMANIA
GEDROSIA
PERSIS
LIBYA
EGYPT
ARABIA